
خالی گھر
انوار علیگی

پیش لفظ

خالی گھر میرا مقبول ترین ناول ہے۔ یہ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں قسط وار چھپا تھا۔ بعد میں ''اخبار جہاں پبلی کیشنز'' نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔اس ناول کی اب تک پچیس ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

اس ناول کا مرکزی خیال ایک جن کے گرد گھومتا ہے۔ آپ نے بھوت، پریت، بگولا، سرانا، چڑیل، ڈائن، پچھل پائی کے بارے میں بے شمار قصے سنے ہوں گے لیکن ان کے وجود کے سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی جبکہ جنات کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا وجود قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ فرشتوں اور انسانوں کی طرح جنات بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان میں مسلم بھی ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ محبت کرنے والے اور نفرت کرنے والے بھی۔ شرارتی اور شریف بھی۔ ان کا رزق انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہڈیاں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ کسی بھی قالب میں خود کو ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انسان مٹی سے بنا ہے تو یہ آگ سے۔ شیطانِ اعظم ابلیس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ یہ ہماری دنیا میں ہی خلا میں آباد ہیں اور ان کی تعداد اتنی ہے کہ اگر آسمان سے ایک سوئی پھینکی جائے تو وہ کسی نہ کسی جن کے سر پر گرے گی۔ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے جبکہ یہ ہمیں دیکھتے ہیں۔ جن جب انسان کی صورت اختیار کرتے ہیں تب ہی انہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ انسان کے روپ میں موجود جن کو بس ہاتھ ملا کر پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح ہوتا ہے۔ ہاتھ میں ہڈی نہیں ہوتی۔ خیر یہاں جنات پر کوئی علمی یا تحقیقی بحث مقصود نہیں اور نہ ہی اس کتاب کا تعلق جنات پر تحقیق سے ہے۔ یہ ایک ناول ہے۔ ایک جن کا فسانہ ہے۔ ایسے جن کا قصہ جو ایک حسین لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوا۔ پھر اُس نے اس پر اپنا تسلط جمالیا۔ اس ناول کا مرکزی خیال حقیقت پر مبنی ہے۔ باقی کہانی کا تانا بانا میری تخلیق ہے، اور تخلیق بھی ایسی کہ اس پر سچ کا گماں ہو۔

انوار علیگی

7

دسمبر کی ٹھٹھرتی رات تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ گہری کہر نے چودھویں کے چاند کو اپنی آغوش
ں لے رکھا تھا۔ دور تک پُرہیبت سناٹا طاری تھا۔ جنگل بھی جیسے سو گیا تھا۔ بستی کے گھروں میں
رھیرا چھایا ہوا تھا۔ جلتے چراغ ٹمٹما کر بجھ گئے تھے۔ لالٹین دُھندلا گئی تھی۔ لوگ لحافوں میں گھسے دن
ں نا آسودہ زندگی کو آسودگی بخش رہے تھے۔ وہ پُرکیف خواب دیکھنے میں مشغول تھے۔
کوئی بارہ کا عمل تھا۔

بستی کے باہر جنگل میں، جہاں سے ریل کی پٹڑی گزرتی تھی، ایک نالے کی پلیا پر کالا بلا بیٹھا تھا۔
س ٹھٹھرتی رات میں یہ واحد جانور تھا جو جاگ رہا تھا، نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ اگلے پاؤں پھیلائے
س طرح اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے دسمبر کی رات نہ ہو، مارچ کی کوئی رات ہو۔ خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا
چل رہی ہو، چاند پورے شباب پر ہو اور دور تک پُرکیف چاندنی برس رہی ہو۔

اس کالے بلے کو قطعاً سردی نہیں لگ رہی تھی جبکہ جنگل کے دوسرے جانور اپنے اپنے ٹھکانوں
میں سکڑے سمٹے سو رہے تھے۔

سب سو رہے تھے، پوری فضا پر نیند طاری تھی۔ چاند بھی کہر میں ڈوبا ہوا اونگھ رہا تھا۔

لیکن وہ کالا بلا، اپنے اگلے دونوں پاؤں بڑے مزے سے چاٹ رہا تھا، جیسے اس کے پاؤں پر
شہد لگا ہو۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ریل کی پٹڑی پر جمی ہوئی تھیں اور کان کچھ سننے کی کوشش
کر رہے تھے۔

تب کہیں دور سے اسے وہ آواز سنائی دی جس کا وہ منتظر تھا۔

وہ ایک ایکسپریس ٹرین تھی۔ ابھی وہ دور تھی۔ اس کی دھیمی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی

آواز بڑھتی گئی اور اچانک اس پر ہیبت سناٹے میں چیخ گونجی ۔ یہ ٹرین کی سیٹی کی آواز تھی ۔ پھر کہر میں ڈوبا ہوا، ایک روشنی کا دھبہ سا دکھائی دینے لگا۔

ٹرین نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔ ٹرین کی دھڑ دھڑاہٹ اور انجن کی پیشانی پر لگی روشنی، دونوں صاف سنائی اور دکھائی دے رہی تھیں۔

چند لمحوں میں گاڑی اس چھوٹی سی پلیا سے گزرنے والی تھی، تب وہ کالا بلا غرا کر کھڑا ہو گیا، اس نے اپنی نظریں انجن پر گاڑ دیں۔

اسی وقت ٹرین کو بریک لگنے شروع ہو گئے۔ ڈرائیور کو کئی انسان، سفید چادروں میں لپٹے ہوئے نظر آئے تھے۔ وہ برابر پٹری پر سر رکھے لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اسے اچانک ہی دکھائی دیئے تھے۔ کہر اتنی گہری تھی کہ قریب کی چیز بھی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور کو جب یہ انسان پٹری پر لیٹے ہوئے نظر آئے تو گاڑی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں اب ٹرین کے نیچے آنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ پھر بھی ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائے۔ گاڑی رکتے رکتے بھی ان سفید لاشوں سے گزر گئی۔

گاڑی کی آخری بوگی پلیا کے سامنے رکی۔ کالے بلے نے پلیا سے چھلانگ لگائی اور گارڈ کے کمپارٹمنٹ کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ گارڈ اشرف احمد جو اونگھ گیا تھا، گاڑی کے رکتے ہی چونک گیا۔ اس نے کھڑکی کو اُٹھا کر دیکھا، دور تک کسی اسٹیشن کے آثار نہ تھے اس کے حساب سے ابھی اسٹیشن آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر یہ گاڑی کہاں رک گئی؟

اشرف احمد نے جلدی سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی، لائٹ اُٹھا کر دروازہ کھولا اور دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ چاندنی رات کے باوجود اسے کہر کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا، وہ اپنے ڈبے سے نیچے اُترا تا کہ ڈرائیور کے پاس جا کر صورتحال معلوم کرے۔

ابھی اس نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں ''میاؤں'' کی آواز آئی۔

اشرف احمد کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس ٹھٹھرتی رات میں یہ بلی کہاں سے آ گئی۔ یہ وقت زیادہ سوچنے کا نہ تھا۔ اس نے لائٹ کا رخ کالے بلے کی طرف کیا۔ اور اس پر سرسری سی نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اس کے سر پر یہ فکر سوار تھی کہ گاڑی کیوں رکی۔

گارڈ کے آگے جانے کے بعد کالے بلے نے ایک چھلانگ لگائی اور گارڈ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔

اشرف احمد بڑے دل گردے کا آدمی تھا لیکن اسے آگے جاتے ہوئے اچانک خوف سا محسوس ہوا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ چند قدم آگے بڑھانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ

کر دیکھا۔ اس جگہ لائٹ ڈالی جہاں ''بلی'' دکھائی دی تھی مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔

پھر وہ اپنے خوف کو جھٹک کر تیز تیز انجن کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی اشرف احمد دور نہ گیا تھا کہ اسے سامنے سے کوئی ٹارچ لئے بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ انجن ڈرائیور صادق حسین تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی ٹرین کے نیچے ڈالتا ہوا تیزی سے بھاگا آ رہا تھا۔ گارڈ اشرف احمد کو دیکھ کر رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' اشرف احمد نے صادق حسین کو پہچان کر پوچھا۔ ''کیا کسی نے زنجیر کھینچی ہے۔''

''نہیں، سر گاڑی میں نے خود روکی ہے۔'' صادق حسین نے ہانپتے اور کانپتے ہوئے کہا۔

''کیوں خیر تو ہے؟'' اشرف احمد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''خیر نہیں ہے سر، مجھے یقین ہے، وہ سب مر گئے ہوں گے۔'' صادق حسین بہت پریشان تھا۔

''کون مر گئے ہوں گے، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' اشرف احمد نے گھبرا کر پوچھا۔

''میرے ساتھ آ جائیے، آگے چل کر دیکھتے ہیں۔'' صادق حسین، اشرف احمد کے ڈبے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

''پر ہوا کیا، کچھ بتاؤ تو۔'' اشرف احمد نے پوچھا۔

''سر خدا کی قسم میں نے جان بوجھ کر انہیں نہیں مارا، وہ لوگ مجھے اچانک نظر آئے تھے اور جب نظر آئے، اس وقت گاڑی ان کے سروں پر پہنچ چکی تھی۔'' صادق حسین اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔

''کون تھے وہ لوگ، اس ٹھٹھرتی رات میں، ایسے جنگل میں وہ کیا کر رہے تھے۔'' اشرف احمد اس کے ساتھ ساتھ گاڑی کے نیچے پٹریوں پر روشنی ڈالتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

''وہ کئی تھے اور سفید چادروں میں لپٹے ہوئے، سر پٹری پر رکھے لیٹے تھے۔ بس میں نے اتنا ہی دیکھا تھا۔'' صادق حسین نے بتایا۔

اب اشرف احمد کا ڈبہ آ چکا تھا۔ اب تک اُنہیں کچھ نظر نہ آیا تھا۔

''صادق، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' اشرف احمد نے پٹریوں پر دور تک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''سر، تھوڑا سا آگے بڑھ کر اور دیکھ لیں۔'' صادق حسین نے کہا۔

تب آگے بڑھ کر اشرف احمد نے صادق حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''یار، خدا کا کچھ خوف کھاؤ، اس سردی میں کون پٹری پر سر رکھ کر لیٹے گا اور وہ بھی سفید چادروں میں...... اگر کسی کو خودکشی کرنا ہی تھی تو اسے ٹرین کی ضرورت نہ تھی۔ اس جنگل میں بندہ لیٹے لیٹے ہی اللہ کو پیارا ہو سکتا ہے۔''

''سر، میں سچ کہتا ہوں، میں نے ان آنکھوں سے چار پانچ آدمیوں کو پٹری پر سر رکھے لیٹے ہوئے دیکھا تھا...... تب ہی تو میں نے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔'' صادق حسین نے بڑے یقین سے کہا۔

''اچھا، اب جو حماقت ہونا تھی وہ ہو گئی، گاڑی چلاؤ...... اور یہ دس منٹ تم نے جو برباد کئے

ہیں...... اسے برابر کرو۔ گاڑی کو اسٹیشن پر رائٹ ٹائم پہنچنا چاہئے۔" یہ کہہ کر اشرف احمد ڈبے میں چڑھ گیا۔

صادق حسین نادم ہوتا ہوا، انجن کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی نظروں پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس نے دیکھا کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تھی جو انسانوں کا روپ دھار لیتی۔

بہرحال وہ فریب نظر کا شکار ہوا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی۔

گاڑی رکنے کے بعد، جب اسٹیشن آنے کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے تو کئی مسافروں نے ٹھنڈی ہوا کی پروا کئے بغیر کھڑکیاں اُٹھائیں، باہر انہیں پر ہیبت سناٹے اور دُھند کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ حیران رہ گئے کہ جنگل میں آخر گاڑی کس لئے رُکی۔

کسی نے کہا۔ "یار، کہیں ڈاکو نہ آگئے ہوں۔"

کوئی بولا۔ "کیا پتہ کسی نے زنجیر ہی کھینچی ہو۔"

ایک مسافر نے جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، اس نے ڈرائیور صادق حسین کو ٹارچ لئے گزرتے دیکھا تو سمجھا، گارڈ ہے، وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"گارڈ صاحب کیا ہوا؟"

"بھائی ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔"

"پھر گاڑی کیوں رُکی ہوئی ہے؟"

"میں اسے ابھی چلاتا ہوں جاکر، آپ فوراً کھڑکی بند کرلیں۔" صادق حسین یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

صادق حسین کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مسافر خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کرلی۔

چند منٹوں کے بعد گاڑی نے حرکت کی اور پھر اس نے بہت جلد رفتار پکڑ لی۔ صادق حسین نے ٹرین کی اسپیڈ بڑھا کر اگلے اسٹیشن پر رائٹ ٹائم پہنچا دیا۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی گارڈ اشرف احمد اپنے ڈبے سے باہر آیا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ اشرف احمد کے دانت بج رہے تھے۔ اس اسٹیشن پر گاڑی دس منٹ ٹھہرتی تھی۔ اس نے سوچا چل کر چائے کے اسٹال پر چائے پی جائے۔

گارڈ کے اُترنے کے بعد وہ کالا بلا بھی ڈبے سے باہر آیا۔ گارڈ کا ڈبہ پلیٹ فارم سے پیچھے تھا۔ کالے بلے نے ڈبے سے زمین پر چھلانگ لگائی۔

چھلانگ لگاتے ہی جیسے وہ فضا میں تحلیل ہوگیا، وہ زمین پر نہیں گرا...... ہاں، البتہ ایک لحیم شحیم شخص کمبل اوڑھے پلیٹ فارم کی طرف چلتا ہوا نظر آرہا تھا۔

اس اسٹیشن پر چند مسافر بھی ڈبے سے باہر آئے...... یہ زیادہ تر چائے کی فکر میں ہی اُترے تھے۔ ایک دو مونگ پھلی کے ٹھیلے کی طرف بھی بڑھے۔

اس لحیم شحیم شخص نے پلیٹ فارم پر آکر گاڑی کے ڈبے پر نظر ڈالی۔ اس ڈبے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پورے اطمینان سے ڈبے میں داخل ہوگیا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ بس ناک اور منہ کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی چال ڈھال اور لباس سے کوئی مزدور دکھائی دے رہا تھا۔ کسی مسافر نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

یہ دراز قد، لمبا چوڑا آدمی جس ڈبے میں چڑھا تھا، اس سے ملحق بوگی میں ایک بارات جارہی تھی۔ بوگی ریزرو تھی۔ اس میں باراتیوں کے علاوہ کوئی مسافر نہ تھا، راستے میں بہت سے مسافروں نے بوگی خالی دیکھ کر اس میں چڑھنے کی کوشش کی تھی تو انہیں بڑی مشکل سے روکا گیا تھا۔ اب بھی بڑے اسٹیشن پر جو مسافر ادھر آنے کی کوشش کرتے تھے، اب ان لوگوں نے بوگی کے دروازے اندر سے بند کرلئے تھے۔ کوئی کتنا ہی دروازہ پیٹتا یہ نہ کھولتے۔

بوگی میں خوب ہنگامہ ہو رہا تھا۔ باراتی اپنی اپنی پسند کی ٹولی بنائے بیٹھے تھے۔ لڑکے تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ لڑکیاں گانوں میں مصروف تھیں۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ پوری رات کوئی سوئے گا نہیں۔ یوں ٹرین میں ویسے بھی نیند کہاں آتی ہے لیکن کچھ نیند کے رسیا ایسے بھی تھے جنہیں سولی پر بھی نیند آجاتی تھی۔ جب ایسے لوگ سونے کی کوشش کرتے تو انہیں فوراً اُٹھا دیا جاتا۔ ان کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا جاتا یا لڑکیوں سے ڈھولک لے کر ان کے کان پر بجائی جاتی تو وہ بے چارہ کھسیا کر اُٹھ جاتا اور کہتا۔ "میں سو تھوڑا ہی رہا تھا، میں تو ایسے ہی لیٹا تھا۔"

لڑکوں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ پوری بوگی میں گھوم پھر کر دیکھے اور اسے جہاں بھی کوئی سوتا ہوا نظر آئے فوراً "تھانے" میں آکر اطلاع دے۔

اس بارات کے معمر لوگ یعنی دولہا کے ابا، تایا، چچا اور ماموں وغیرہ یا ان لوگوں کے ہم عمر دوست بوگی کے ایک کونے میں اپنی محفل جمائے ہوئے تھے۔

قصے کہانیاں چل رہی تھیں، آپ بیتی اور جگ بیتیاں سنائی جارہی تھیں۔ پھر طے ہوا کہ ہر شخص اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنائے پھر بات ہوتے ہوتے جنات پر ٹھہری۔

"سب سے پہلے میں آپ کو ایک واقعہ نہیں، دو واقعات سناؤں گا۔" فرقان ماموں نے اپنے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں واقعات سچے ہیں، میں بذات خود ان کا عینی شاہد ہوں۔"

"ماموں، کیا آپ نے جن دیکھے ہیں؟" دولہا اکبر نے پوچھا۔ اکبر کو قصے کہانیوں سے بہت دلچسپی تھی، اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ بڑوں کی محفل میں قصے کہانیاں چل رہی ہیں اور قصے بھی

جنات کے تو وہ فوراً چھوٹوں کی محفل چھوڑ کر اِدھر آ گیا۔

’’ہاں، اکبر نہ صرف میں نے جن دیکھے ہیں بلکہ میں نے ان کی آواز بھی سنی ہے۔‘‘ فرقان ماموں گویا ہوئے۔ ’’یہ علی گڑھ کی بات ہے اور ان دنوں کا ذکر ہے جب میری عمر چودہ پندرہ سال ہوگی۔ ہمارے محلے کے ایک بزرگ صوفی امجد حسین فجر کے وقت گلی کے لوگوں کو نماز کیلئے بیدار کرنے آیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ جس گھر کے سامنے پہنچتے پہلے اس گھر کے دروازے پر ڈنڈے برساتے، پھر اس گھر کے مکین کا نام لے کر پکارتے۔ ’’ارے، خواجہ صاحب اُٹھ جاؤ، نماز کا وقت ہوگیا ہے۔‘‘ اور جب تک اندر سے آواز نہ آجاتی کہ اچھا صوفی صاحب اُٹھ گیا، اس وقت تک وہ آگے نہ بڑھتے۔ صوفی امجد کو معلوم تھا کہ اس محلے کے کتنے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جو نماز پڑھنے کے عادی نہ تھے، بخشتے وہ انہیں بھی نہ تھے۔ ان کا دروازہ بھی اس وقت تک پیٹے جاتے جب تک جواب نہ مل جاتا۔ نیند تو ان کی خراب ہوتی تھی لیکن وہ صوفی صاحب کا بگاڑ کچھ نہیں سکتے تھے بس لحاف میں تلملا کر رہ جاتے۔ صوفی امجد کو سب سے زیادہ ڈاکٹر طارق کو اُٹھانے میں دقت پیش آتی تھی۔ ڈاکٹر طارق بھی مزے کی چیز تھے۔ پتہ نہیں انہیں کیا بیماری تھی کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ مریض کی نبض پر ان کا ہاتھ ہے، مریض بڑی شد و مد سے اپنا حال بیان کر رہا ہے اور ڈاکٹر طارق کی گردن جھکتی چلی جارہی ہے، مریض سمجھ رہا ہے کہ وہ نبض پر ہاتھ رکھے بڑی توجہ سے ان کا حال سن رہے ہیں لیکن وہ حال سے بے خبر کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے ہوتے۔ مریض چونکتا اس وقت تھا جب ڈاکٹر صاحب کی گرفت نبض پر ڈھیلی پڑ جاتی اور ان کا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے ڈھلک جاتا اور ڈاکٹر صاحب کے خراٹے سنائی دینے لگتے۔ مریض بے چارہ انہیں ہلاتا ڈاکٹر صاحب چونک کر اُٹھتے اور اس سے پوچھتے۔ ’’اچھا یہ بتاؤ کھانسی تو نہیں۔‘‘ بے چارہ مریض پھر سے شروع ہو جاتا۔ ان ڈاکٹر صاحب کے خراٹے بڑے مشہور تھے ان کا گھر ہمارے گھر کے سامنے تھا۔ وہ خراٹے اتنی زور سے لیتے تھے کہ ہمارے گھر تک ان کی آواز آتی بلکہ پوری گلی میں ان کے خراٹے گونجتے۔ ان ڈاکٹر طارق کو صوفی امجد کو اُٹھانے میں بڑی دقت پیش آتی کیونکہ دروازہ پیٹے جانے کی آواز اور خود ان کی آواز، ڈاکٹر طارق کے خراٹوں میں دب جاتی۔ صوفی امجد، بے چارے اُٹھا اُٹھا کر تنگ آجاتے تب کہیں جا کر ڈاکٹر طارق کی مریل سی آواز آتی۔ ’’اچھا، صوفی صاحب شکریہ۔‘‘ ان کی آواز سن کر صوفی صاحب کہتے دیکھو، دوبارہ سو جانا۔ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔‘‘

’’کیا، وہ اُٹھ کر دوبارہ سو جاتے تھے۔‘‘ اکبر نے پوچھا۔

’’ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا۔‘‘ فرقان ماموں نے جواب دیا۔ ’’صوفی صاحب جب لوگوں کو اُٹھا کر واپس آتے تو ڈاکٹر طارق کا دروازہ ایک مرتبہ اور بجا کر گزر جاتے۔ صوفی صاحب کے علاوہ ایک پارٹی اور نمازیوں کو اُٹھانے آتی تھی۔ یہ لوگ صوفی صاحب سے بہت پہلے آتے تھے۔ اس وقت گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہوتا تھا۔ یہ لوگ ڈھولک کی تھاپ پر کچھ گاتے ہوئے گزر جاتے۔ وہ کیا گاتے تھے یہ سمجھ نہ آتا۔ آوازوں سے محسوس ہوتا کہ تین چار آدمی ہیں۔ یہ لوگ گاتے بجاتے تیزی سے گلی سے گزر جاتے۔ یہ کون لوگ تھے، کسی کو معلوم نہ تھا۔ محلے کے سب لوگ انہیں فقیر ہی سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں آٹھویں یا نویں میں پڑھتا ہوں گا۔ میرے ہم عمر لڑکوں نے ایک دن پروگرام بنایا کہ ہمیں بھی محلے کے لوگوں کو اُٹھانے کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔ ڈھولک کسی سے ملنا تو مشکل تھی، لہٰذا یہ پروگرام بنا کہ ٹین کے کنستر سے ڈھولک کا کام لیا جائے اور کوئی قوالی گاتے ہوئے گلیوں سے گزر جائیں۔ خیر صبح کو جب میری ڈھولک اور گانے کی آواز سے آنکھ کھلی تو میں خاموشی سے اوپر سے اُتر آیا اور دروازے کی کنڈی کھول کر چپ چاپ ان لوگوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے گھر کا دروازہ نہ کھولا تھا، دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، میرا پروگرام یہ تھا کہ میرے دوست جیسے ہی قریب آئیں گے میں فوراً دروازہ کھول کر شور مچاتا ان کے سامنے آجاؤں گا، میں انہیں دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا، وہ لوگ گاتے بجاتے جیسے ہی میرے گھر کے سامنے آئے میں نے تیزی سے دروازہ کھولا اور چیخ مار کر ان لوگوں کے اوپر کود گیا۔ ان لوگوں کے اوپر کودتے ہی گانے بجانے کی آواز بند ہوگئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیپ کو ہائی اسپیڈ پر چلا دیا گیا ہو۔ بس ’’چیں، چوں، چاں‘‘ کی سی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دوست بڑے شرارتی تھے، میں نے سوچا کہ یہ خود ڈرنے کے بجائے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گلی میں گہرا اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں انہیں پکڑنے کیلئے ایسے ہی اِدھر اُدھر ہاتھ چلائے تو میرے کانوں میں ایک اجنبی آواز پڑی۔

’’وہ نہیں ہیں، تمہارے دوست پیچھے آ رہے ہیں۔‘‘

اس آواز کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر ہوں، میرے دوست ابھی نہیں آئے تھے، میں فقیروں کی ٹولی کو اپنے دوست سمجھ کر انہیں ڈرا دیا تھا۔ میں گلی کی اس سمت بڑھا جدھر سے ان لوگوں نے آنا تھا۔ چند منٹوں کے بعد میں نے گلی کے اگلے سرے پر پھر گانے بجانے کی آوازیں سنیں، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ یہ فقیروں کی ٹولی نہیں تھی۔ میرے اپنے ہی دوست تھے مجھے جل دے گئے تھے۔ مجھے ان کی اس شرارت پر بڑا غصہ آیا۔ میں فوراً واپس آیا اور پھر دوڑتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں نے غصے سے کہا۔

’’[illegible] مجھے پریشان مت کرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔‘‘

’’اچھا تم مانو گے نہیں آجاؤ پھر ہمارے ساتھ۔‘‘

گانے بجانے کی پھر آواز آنے لگی۔ یہ آواز ذرا فاصلے سے آ رہی تھی۔ میں پھر ان کے پیچھے بھاگا،

اب مجھے تاؤ آ گیا تھا کہ اس مرتبہ نہیں چھوڑوں گا، ان میں سے کسی ایک کو قابو کرلوں گا۔ میں جیسے ہی نزدیک پہنچا، گانا بجانا پھر بند ہو گیا اور آواز آئی۔ ''یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے پکڑ کر اُٹھاؤ۔''

پھر مجھے بازوؤں سے دولڑکوں نے پکڑ لیا اور تیزی سے مجھے بھگا کر لے چلے کہ مجھے یہ احساس ہو کہ جیسے میں اُڑ رہا ہوں۔ میرے گھر سے کافی آگے انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے ہیں، اب دور تک کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا، شاید مسجد پہنچ گئے ہوں گے۔ مسجد نزدیک ہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ مسجد کے دروازے میں بلب جل رہا تھا۔ میں نے دروازے میں کھڑا ہو کر مسجد کے اندر دیکھا۔ وہ بہت چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس میں مشکل سے چالیس پچاس نمازیوں کی گنجائش ہوگی۔ مسجد خالی پڑی تھی۔ میں واپس ہونے لگا تو میں نے مسجد کے پیش امام مولوی مختار کو دروازے کی طرف آتے دیکھا، میں فوراً رک گیا۔ میں نے سوچا کہ مولوی مختار سے پوچھ لوں کہ یہاں میرے دوست تو نہیں آئے۔ مولوی صاحب نزدیک آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ کچھ غصے میں ہیں۔ میرے کچھ سوال کرنے سے پہلے ہی بولے۔ ''جاؤ گھر، ابھی ہماری نماز ہو رہی ہے۔''

ان کے غصے سے ڈر کر، میں وہاں سے بھاگ آیا اور سیدھا اپنے گھر آ کر سو گیا۔ صبح جب اسکول جانے کے لئے قیصر میرے گھر آیا تو میں نے دروازے سے نکلتے ہی اس سے شکایت کی۔ ''یار تم لوگ عجیب ہو مجھے چھوڑ کر تم لوگ کہاں چلے گئے تھے، مجھے اگر ساتھ نہیں لے جانا تھا تو مجھ سے ساتھ چلنے کے لئے کیوں کہا تھا۔''

قیصر میری بات سن کر حیران رہ گیا، بولا۔ ''فرقان، ہم لوگ صبح آئے کب؟ میں حمید کے گھر گیا وہ اُٹھا ہی نہیں۔ آوازیں دے دے کر تھک گیا۔ اس کے بعد راشد کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو بخار ہو گیا تھا۔ بس پھر میں کیا کرتا بور ہو گیا تمہارے گھر بھی نہ آیا میں جا کر خاموشی سے سو گیا۔''

''قیصر جھوٹ مت بولو۔'' یہ کہہ کر میں نے تفصیل سے پورا واقعہ سنایا اور آخر میں کہا۔ ''میں نے لوگوں کو مسجد تک جا کر تلاش کیا۔''

''خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ چلو راشد کے گھر چلو، وہاں تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

قیصر ٹھیک کہہ رہا تھا اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس بات کی تصدیق راشد اور حمید سے مل کر ہو گئی۔ اب میں بڑا پریشان ہوا کہ وہ لوگ کون تھے جن سے فجر کے وقت میری ملاقات ہوئی تھی۔

اسکول سے آ کر میں نے کھانا وانا کھایا اور پھر ظہر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ مسجد پہنچا تو وہاں امامت محلے کے ایک بزرگ نے کی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے ایک نمازی سے مولوی مختار کے بارے میں پوچھا۔ ''مولوی صاحب کہاں ہیں؟''

اس نمازی نے بتایا۔ ''مولوی مختار بیمار ہیں۔''

''بیمار ہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''صبح تو میں نے انہیں مسجد میں دیکھا تھا۔''

''صبح تم نے کیسے مسجد میں دیکھ لیا جبکہ وہ صبح مسجد آئے نہیں۔ صبح چوہدری صاحب نے نماز پڑھائی تھی۔''

اب میں بڑا چکرایا مولوی مختار اگر مسجد آئے نہیں تو صبح میں نے کس کو دیکھا تھا۔ انہوں نے بڑے غصے سے کہا۔ ''جاؤ گھر، ابھی ہماری نماز ہو رہی ہے۔'' تو وہ نماز کس کی ہو رہی تھی۔

فرقان ماموں جب یہ واقعہ سنا کر خاموش ہوئے تو سب کے چہرے پر یہ سوال تھا کہ وہ نماز کس کی ہو رہی تھی۔ وہ اگر لڑکے نہیں تھے تو پھر کون تھے۔

''فرقان ماموں، وہ کون تھے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''وہ جن تھے!'' فرقان ماموں نے اپنے گرد کمبل کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے مسجد میں مولوی مختار کی صورت میں جو شخص آپ کے سامنے آیا وہ بھی جن تھا۔''

''بے شک، کیونکہ مولوی مختار اس صبح بیمار تھے وہ گھر سے نماز پڑھانے نکلے ہی نہیں۔'' فرقان ماموں نے کہا۔

''کیا جن بھی نماز پڑھتے ہیں۔'' اکبر نے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں، انسانوں کی طرح جن بھی مسلمان ہوتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔''

''ماموں، آپ نے بتایا کہ جب آپ دروازہ کھول کر اچانک باہر آئے تو آپ نے چوں، چاں کی آوازیں سنیں وہ کیا تھیں۔'' اکبر نے سوال کیا۔

''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جنوں کی زبان تھی۔ ان کے بولنے کا انداز بالکل اسی طرح کا تھا جیسے ٹیپ کو ہائی اسپیڈ میں چلا دیا جائے تو آواز سمجھ میں نہیں آتی۔ بس چوں، چاں کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔'' فرقان ماموں نے کہا۔

''اچھا ماموں، اب دوسرا واقعہ سنائیں۔'' اکبر پرشوق لہجے میں بولا۔

''دوسرا واقعہ، یونیورسٹی کے زمانے کا ہے۔'' فرقان ماموں نے کہنا شروع کیا۔ ''اس وقت ہم نئے نئے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے گھر سے یونیورسٹی کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہوگی۔ ہم اس وقت پیدل آیا جایا کرتے۔ سائیکل ہمارے پاس ایک دو سال کے بعد آئی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر ہماری چار پانچ لڑکوں کی ٹولی ہوتی تھی۔ ہم راستے بھر شرارتیں کرتے آتے۔ علی گڑھ میں نئی بستی کے نام سے ایک محلہ ہے اس کے پاس ایک مسجد تھی۔ اس مسجد میں ایک تہہ خانہ تھا، ہم جب بھی وہاں سے

گزرتے تو میری خواہش ہوتی کہ اس تہہ خانے کے اندر جا کر دیکھوں۔ ایک دن ہم ایک گرگٹ کا پیچھا کرتے مسجد کے قریب پہنچ گئے۔ گرگٹ تہہ خانے کے روشن دان میں غائب ہو گیا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تہہ خانے کے اندر جاؤں یا نہ جاؤں کہ مجھے تہہ خانے کی سیڑھیوں سے باہر آتا سرور نظر آیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بلا کر کہا۔ ”آؤ فرقان اندر چل کر تہہ خانہ دیکھو گے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر میں سرور کے پیچھے چلا جو اب واپس ہو کر سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ تہہ خانے کی ابتدائی سیڑھیوں پر روشنی تھی، میں تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، روشنی غائب ہوتی گئی۔ سرور اتنی تیزی سے سیڑھیاں اُترا تھا، میں چاہتا تھا کہ اسے پکڑ لوں تا کہ تہہ خانے میں مجھے ڈر نہ لگے۔ میں نے تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے اندر کچھ ہیولے سے دیکھے۔ یہ ہیولے محرابوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ جب میں سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو میرے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔

”ارے، یہ کون آ رہا ہے۔“

”یہ تو انسان کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔“

”اسے کون لایا یہاں؟“

”یہ (کوئی نام لیا گیا، جواب مجھے یاد نہیں) کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔“

سرور کا دور تک پتہ نہ تھا۔ تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ بس اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔

”ارے بھاگو یہاں سے، تمہارے ساتھی چلے گئے۔“ پھر کسی نے کہا۔ یہ آواز سرور کی ہرگز نہ تھی۔

اب اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے بے حد ڈر لگا۔ میں اُلٹے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ باہر آ کر دیکھا تو میرے سارے ساتھی غائب تھے۔ میں نے دوڑ لگائی لیکن مجھے راستے میں کوئی نہ ملا۔ یہاں تک کہ میرا گھر آ گیا اور میں گھر میں داخل ہو گیا۔

دوسرے دن یونیورسٹی پہنچ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے شکایت کی کہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میری شکایت سن کر انہوں نے اُلٹا مجھے ڈانٹا اور پوچھا کہ ہم تو کتنی دیر تک تمہارا انتظار کرتے رہے تم خود ہی غائب ہو گئے تھے۔

میں نے سرور سے کہا۔ ”سرور، میں کہاں غائب ہوا تھا۔ تم تو میرے ساتھ تھے، تم ہی تو مجھے تہہ خانے میں لے گئے تھے۔“

سرور نے میری شکل دیکھی اور ہنس کر بولا۔ ”واہ بھئی، میں کب تمہیں تہہ خانے میں لے گیا تھا کیا بے پر کی اُڑا رہے ہو۔“

”سرور کیا تم وہ نہیں تھے، تم وہ نہیں تھے تو پھر وہ کون تھا جو مجھے تہہ خانے میں لے گیا تھا؟“

”کون بھئی، کس کی بات کر رہے ہو؟“ سرور نے پوچھا۔

جواب میں، میں نے اپنے دوستوں کو ساری روداد سنا دی۔ میری بات سن کر سب پریشان ہو گئے اور ہم سب نے طے کر لیا کہ آئندہ اس مسجد کے احاطے میں نہیں جائیں گے۔ اس تہہ خانے میں دراصل جن رہتے تھے۔ ہم لوگ روزانہ مسجد کے قریب سے گزرتے تھے اور کبھی کبھی مسجد کے اندر بھی چلے جاتے تھے۔ میں جب اندر جاتا تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ تہہ خانے کو اندر سے دیکھوں۔ اس دن بھی جب ہم گرگٹ کے تعاقب میں مسجد کے اندر چلے گئے تھے تو میرے دل میں یہ خواہش موجود تھی۔ بس اسی وقت کسی جن کے بچے نے سرور کی شکل اختیار کر لی اور وہ شرارتی بچہ مجھے اندر لے گیا۔“

ماموں فرقان نے اپنا قصہ ختم کیا تو چند لمحوں کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ بس گاڑی چلنے کی آواز آ رہی تھی یا لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب بھی کسی محفل میں جنات کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں آس پاس ہی کوئی جن ضرور موجود ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ بات صحیح نہ ہو، محض لوگوں کا خیال ہو لیکن اس وقت یہ بات بالکل صحیح تھی۔ اس بوگی میں جنات کا ذکر ہو رہا تھا تو برابر کی بوگی میں ایک جن موجود تھا۔

وہ لمبا چوڑا آدمی، کمبل اوڑھے بڑی خاموشی سے گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس بوگی میں ٹکٹ کلکٹر لوگوں کے ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ ٹکٹ چیک کرتے کرتے وہ اس لمبے چوڑے آدمی کے نزدیک آیا اور بولا۔ ”اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔“

اس لمبے چوڑے آدمی نے جیسے سنا ہی نہیں، خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

تب کلکٹر نے اس کے کمبل کا کونا پکڑ کر ہلایا اور کہا۔ ”بھئی، ٹکٹ دکھاؤ۔“

اب اس لمبے چوڑے آدمی نے اپنا سر اُٹھایا اور خالی خالی نظروں سے ٹکٹ کلکٹر کو دیکھا۔ زبان پھر بھی نہ ہلائی۔

”میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، جلدی سے ٹکٹ دکھاؤ۔“ ٹکٹ کلکٹر نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

”ٹکٹ!“ اس لمبے چوڑے آدمی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں بھئی ٹکٹ، کیا تم نے کبھی ٹکٹ نہیں دیکھا؟“

”نا جی، مجھے تو نہیں معلوم کہ ٹکٹ کیا ہوتا ہے، میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ذرا دکھائیں تو کیسا ہوتا ہے ٹکٹ؟“ اس کے لہجے میں بڑی معصومیت تھی۔

ٹکٹ کلکٹر کو یہ سن کر غصہ بھی آیا، ہنسی بھی آئی کہ کس دیہاتی سے پالا پڑ گیا۔ اس نے برابر بیٹھے ایک مسافر سے کہا جس کا ٹکٹ وہ ابھی چیک کر چکا تھا۔

"ذرا اپنا ٹکٹ انہیں دکھانا۔" اب وہ تفریح کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"اچھا جی۔" اس مسافر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن ٹکٹ نہ تھا۔ پھر اس مسافر نے اپنی ساری جیبیں ٹٹول لیں لیکن ٹکٹ نہ ملا۔

"پتہ نہیں جی کدھر گیا۔ ابھی تو میں نے جیب میں ہی رکھا تھا۔" مسافر بولا۔

اس مسافر سے مایوس ہو کر ٹکٹ کلکٹر نے ایک اور مسافر سے کہا۔ "آپ اپنا ٹکٹ دکھائیں۔"

اس مسافر نے بھی اپنی جیبیں ٹٹولیں لیکن ٹکٹ اسے بھی نہ ملا۔

اس طرح ایک ایک کر کے ٹکٹ کلکٹر نے سب مسافروں سے پوچھ ڈالا لیکن کسی کی بھی جیب سے ٹکٹ نہ نکلا۔ وہ جس سے بھی ٹکٹ کیلئے کہتا، وہ مسافر بس اپنی جیبیں ٹٹول کر رہ جاتا۔

پھر ٹکٹ کلکٹر کو خیال آیا کہ اس کی جیب میں بھی کچھ ٹکٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر ایک ایک کر کے سب جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن ٹکٹ نہ ملنے تھے نہ ملے۔

ٹکٹ کلکٹر کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ ایسی صورتحال کبھی پیدا نہ ہوئی تھی کہ پوری بوگی میں ایک مسافر کے پاس بھی ٹکٹ نہ تھا جبکہ کچھ دیر پہلے سب نے اپنے اپنے ٹکٹ دکھائے تھے۔

"کیا ہوا جی، آپ نے مجھے ٹکٹ دکھایا نہیں۔" اس لمبے چوڑے آدمی نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ کسی چھپکلی کی طرح بالکل زرد تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے فوراً اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر جانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہوا۔

"ٹھہرو میں دوسری بوگی سے ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ٹکٹ کلکٹر دوسری بوگی میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ لمبا چوڑا آدمی بھی اُٹھا اور مسافروں نے اسے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ پانچ منٹ بعد وہ ٹکٹ کلکٹر واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں کئی ٹکٹ تھے لیکن اس لمبے چوڑے آدمی کی جگہ خالی تھی۔

"کدھر گیا یہ؟" ٹکٹ کلکٹر نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا۔

"وہ جی دروازے کی طرف گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

ٹکٹ کلکٹر دروازے کی طرف آیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا، وہاں بھی کوئی نہ تھا۔

گاڑی برق رفتاری سے چل رہی تھی۔ چلتی گاڑی سے اُترنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ٹکٹ کلکٹر نے برابر کی بوگی بھی چھان ماری مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر ٹکٹ کلکٹر واپس آیا۔ اب وہ اس بوگی میں آیا جس میں بارات سفر کر رہی تھی۔ یہ بوگی اس بوگی سے ملحق تھی جس میں وہ لمبا چوڑا آدمی بیٹھا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے سوچا ہو سکتا ہے وہ پیچھے والی بوگی میں نہ گیا ہو، آگے والی بوگی میں گیا ہو۔

جب وہ اس بارات والی بوگی میں آیا تو ماموں فرقان اپنا قصہ ختم کر چکے تھے اور سب دم بخود بیٹھے تھے۔ ٹکٹ کلکٹر نے اس لمبے چوڑے آدمی کے بارے میں ان لوگوں سے استفسار کیا۔

"نہیں جناب ادھر کوئی ایسا آدمی نہیں آیا۔" ماموں فرقان نے ٹکٹ کلکٹر کو بتایا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا وہ اتنی سی دیر میں کہاں غائب ہو گیا۔"

"کیوں کیا ہوا کوئی خاص مسئلہ ہو گیا؟"

"بڑا خاص مسئلہ ہے جناب میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔" ٹکٹ کلکٹر نے پڑھے لکھے آدمی دیکھ کر سوچا کہ ان لوگوں کو وہ تفصیل سے اس آدمی کے بارے میں بتائے۔ ان لوگوں نے ٹکٹ کلکٹر کو اپنے درمیان جگہ دے دی۔

تب ٹکٹ کلکٹر نے جو اس پر گزری تھی کہہ سنائی۔

اس کا قصہ سن کر سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"آپ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی تو نہیں کی۔" کچھ دیر کے بعد ماموں فرقان نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے اس سے صرف ٹکٹ ہی مانگا تھا۔ جب اس نے کہا کہ کیسا ہوتا ہے، ٹکٹ ذرا دکھاؤ تو۔ میں نے اس کے برابر والے مسافر سے ٹکٹ مانگا۔ پھر میں پوری بوگی کے مسافروں سے ٹکٹ مانگتا چلا گیا لیکن کسی کے پاس ٹکٹ نہ ملا حتیٰ کہ جو ٹکٹ میری جیب میں پڑے ہوئے تھے وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔"

"پھر آپ ایک دوسری بوگی میں ٹکٹ لینے چلے گئے اور جب وہاں سے ٹکٹ لے کر آئے تو وہ آدمی غائب تھا۔" فرقان ماموں نے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی ورنہ مشکل میں پڑ جاتے۔"

"کیوں ماموں کیا ہو جاتا؟" اس مرتبہ اکبر بولا۔

"جانے کیا ہو جاتا۔" ماموں فرقان بولے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جی۔" ٹکٹ کلکٹر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کون تھا؟" ماموں فرقان نے سوال کیا۔

"نہیں جی۔" ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔

"وہ جن تھا۔" ماموں فرقان نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اس انکشاف پر سارے باراتیوں کی سٹی گم ہو گئی۔ ٹکٹ کلکٹر کے جسم میں اچانک سردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کپکپانے لگا۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ "جن۔"

"پھر یہ خبر بڑی تیزی سے گاڑی میں پھیل گئی کہ گاڑی میں جن آ گیا ہے۔"

''گاڑی میں جن۔'' اس خبر کو جو بھی سنتا کپکپا کر رہ جاتا۔

یہ خبر ایک مسافر سے دوسرے مسافر، پھر بوگی سے دوسری بوگی میں، یہاں تک کہ گارڈ تک پہنچ گئی۔

گاڑی اپنی برق رفتاری سے اُڑی جارہی تھی۔ سردی نے اور شدت اختیار کر لی تھی۔

اس زرد رو آدمی کو پوری گاڑی میں تلاش کرلیا گیا تھا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تھا۔ جتنے مسافر بھی کمبل اوڑھے بیٹھے یا لیٹے تھے ان سب کے چہرے اچھی طرح دیکھ لئے گئے تھے لیکن اس چھپکلی جیسی رنگت والے پراسرار آدمی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ریلوے پولیس کا عملہ جو اس گاڑی کے ساتھ چل رہا تھا، اس نے ٹکٹ کلکٹر کے ساتھ اچھی طرح ایک ایک ڈبہ، ایک ایک مسافر چیک کرلیا تھا لیکن وہ پراسرار بندہ ہاتھ نہ آیا تھا۔

بارات والی بوگی میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ خواتین گانا بھول گئی تھیں اور کمبلوں اور لحافوں میں گھسی ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔

بوگی کے دروازے تو بند تھے ہی اب وہ دروازے بھی بند کر لیے گئے تھے جو ایک بوگی کو دوسری سے ملاتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک بڑا اسٹیشن آنے والا تھا۔ لڑکوں نے بھی تاش کھیلنے بند کر دیئے تھے اور اب بستروں میں گھسے بیٹھے تھے۔

رات کے تین بجے تھے۔ گاڑی کسی سنسناتی گولی کی طرح اُڑی جارہی تھی۔

راشدہ ٹوائلٹ جانے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ راشدہ دولہا اکبر کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی امی سے کہا۔ ''امی میرے ساتھ ٹوائلٹ چلیں، میں اکیلی نہیں جاسکتی، مجھے خوف آرہا ہے۔''

''ارے خوف کس بات کا۔'' راشدہ کی امی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ماموں فرقان کو تو ہر جگہ جن نظر آتے ہیں۔ لوگ چاند پر پہنچ چکے ہیں اور ہم لوگ ابھی تک جن بھوتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

راشدہ کی امی ٹوائلٹ تک اس کے ساتھ گئیں، پھر انہوں نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اور بولیں۔ ''جاؤ۔''

''امی آپ یہیں کھڑی رہیں، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر راشدہ ٹوائلٹ میں داخل ہوگئی اور دروازہ بند کرلیا۔

دروازہ بند کئے ایک لمحہ بھی نہ ہوا تھا کہ راشدہ بری طرح چیختی ہوئی ٹوائلٹ سے نکل آئی۔

راشدہ کی چیخ سن کر امی بھی بدحواس ہوگئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر راشدہ کو تھام لیا اور پریشان ہو کر بولیں۔ ''اری کیا ہوا؟''

''امی۔'' راشدہ ٹوائلٹ سے کچھ اس طرح چیختی ہوئی نکلی جیسے اس نے کوئی بہت خوفناک چیز دیکھ لی

ہو۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، بولنا محال تھا۔ آواز حلق میں پھنس رہی تھی، وہ بمشکل بولی۔ ''امی وہ۔''

''اری، کیا وہ، کیا اندر کوئی چھپکلی ہے۔'' راشدہ کی امی نے ذرا اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میرا گلا تو چھوڑ تُو مجھ سے اس طرح چمٹ گئی ہے جیسے اندر سچ مچ جن دیکھ لیا ہو۔''

راشدہ چھپکلی سے بہت ڈرتی تھی۔ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے اگر اسے کہیں چھپکلی نظر آجاتی تو وہ کچھ اس طرح چیخ مار کر وہاں سے نکلتی کہ گھر والے دہل کر رہ جاتے۔ اس کی امی کو راشدہ کی ان چیخوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ جھنجلا کر کہتیں۔ ''راشدہ، آخر تُو کب بڑی ہوگی۔ ڈھینگ کی ڈھینگ ہوگئی لیکن تو نے چھپکلیوں سے ڈرنا نہیں چھوڑا۔ آخر تُو اس بے ضرر جانور سے اتنا کیوں ڈرتی ہے۔ اری جھاڑو اُٹھا اور اسے مار دے اگر مارنے کی تجھ میں ہمت نہیں ہے تو کسی بہن بھائی کو آکر بتادے وہ مار دے گا۔ تجھے آخر اس قدر چیخنے چلانے اور اُچھلنے کودنے کی ضرورت کیا ہے؟''

امی اسے نصیحتیں کرتی رہتیں، اسے ڈانٹ پلاتی رہتیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اسے جہاں کہیں بھی چھپکلی نظر آتی وہ ایک زوردار چیخ مارتی اور دس گز دور جا کھڑی ہوتی۔ اس وقت بھی جب راشدہ چیختی ہوئی ٹوائلٹ سے نکلی تو اس کی امی نے یہی سمجھا تھا کہ اس نے اندر کوئی چھپکلی دیکھ لی ہے۔

راشدہ کی امی نے راشدہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کیا اور ٹوائلٹ کی طرف بڑھیں۔

''امی، اندر نہ جائیں، وہاں ایک خوفناک کالا بلا ہے۔'' راشدہ نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اری، کیا بکواس کر رہی ہے جب میں نے دروازہ کھولا تھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

''وہ دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، آپ نے پورا دروازہ کب کھولا تھا۔''

''اب تُو بلیوں سے بھی ڈرنے لگی ہے۔'' راشدہ کی امی کو غصہ آگیا۔ ''تُو نے ٹوائلٹ جانا ہے تو جا ورنہ میں واپس جارہی ہوں۔''

''امی، وہ بہت خوفناک ہے، وہ مجھے دیکھ کر اس طرح غرایا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔'' راشدہ کا وہ منظر یاد کر کے دل دھک دھک کرنے لگا۔

''اری، تُو میرا ہاتھ چھوڑ، میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر امی نے راشدہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹوائلٹ کے دروازے کو ایک مرتبہ پھر کھولا۔ ابھی انہوں نے دروازہ تھوڑا سا ہی کھولا تھا کہ اندر سے کسی بلے کے غرانے کی آواز آئی۔ اس آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ راشدہ کی امی جو خاندان بھر میں بڑی نڈر مشہور تھیں، اس آواز کو سن کر، ایک لمحے کو لرز کر رہ گئیں۔

وہ کافی ہمت والی اور نڈر خاتون تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دروازے کو زور سے

''گاڑی میں جن۔'' اس خبر کو جو بھی سنتا کپکپا کر رہ جاتا۔

یہ خبر ایک مسافر سے دوسرے مسافر، پھر بوگی سے دوسری بوگی میں، یہاں تک کہ گارڈ تک پہنچ گئی۔

گاڑی اپنی برق رفتاری سے اُڑی جا رہی تھی۔ سردی نے اور شدت اختیار کر لی تھی۔

اس زرد رو آدمی کو پوری گاڑی میں تلاش کر لیا گیا تھا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تھا۔ جتنے مسافر بھی کمبل اوڑھے بیٹھے یا لیٹے تھے ان سب کے چہرے اچھی طرح دیکھ لئے گئے تھے لیکن اس چھپکلی جیسی رنگت والے پراسرار آدمی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ریلوے پولیس کا عملہ جو اس گاڑی کے ساتھ چل رہا تھا، اس نے ٹکٹ کلکٹر کے ساتھ اچھی طرح ایک ایک ڈبہ، ایک ایک مسافر چیک کر لیا تھا لیکن وہ پراسرار بندہ ہاتھ نہ آیا تھا۔

بارات والی بوگی میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ خواتین گانا بھول گئی تھیں اور کمبلوں اور لحافوں میں گھسی ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔

بوگی کے دروازے تو بند تھے ہی اب وہ دروازے بھی بند کر لیے گئے تھے جو ایک بوگی کو دوسری سے ملاتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک بڑا اسٹیشن آنے والا تھا۔ لڑکوں نے بھی تاش کھیلنے بند کر دیئے تھے اور اب بستروں میں گھسے بیٹھے تھے۔

رات کے تین بجے تھے۔ گاڑی کسی سنسناتی گولی کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔

راشدہ ٹوائلٹ جانے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ راشدہ دولہا اکبر کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی امی سے کہا۔ ''امی میرے ساتھ ٹوائلٹ چلیں، میں اکیلی نہیں جا سکتی، مجھے خوف آ رہا ہے۔''

''ارے خوف کس بات کا۔'' راشدہ کی امی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ماموں فرقان کو تو ہر جگہ جن نظر آتے ہیں۔ لوگ چاند پر پہنچ چکے ہیں اور ہم لوگ ابھی تک جن بھوتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ آ، میرے ساتھ۔''

راشدہ کی امی ٹوائلٹ تک اس کے ساتھ گئیں پھر انہوں نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اور بولیں۔ ''جاؤ۔''

''امی آپ یہیں کھڑی رہیں، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر راشدہ ٹوائلٹ میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

دروازہ بند کئے ایک لمحہ بھی نہ ہوا تھا کہ راشدہ بری طرح چیختی ہوئی ٹوائلٹ سے نکل آئی۔

راشدہ کی چیخ سن کر امی بھی بدحواس ہو گئیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر راشدہ کو تھام لیا اور پریشان ہو کر بولیں۔ ''اری کیا ہوا؟''

''امی۔'' راشدہ ٹوائلٹ سے کچھ اس طرح چیختی ہوئی نکلی جیسے اس نے کوئی بہت خوفناک چیز دیکھ لی

ہو۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، بولنا محال تھا۔ آواز حلق میں پھنس رہی تھی، وہ بمشکل بولی۔ ''امی وہ۔''

''اری، کیا وہ، کیا اندر کوئی چھپکلی ہے۔'' راشدہ کی امی نے ذرا اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میرا گلا تو چھوڑ تو مجھ سے اس طرح چمٹ گئی ہے جیسے اندر سچ مچ جن دیکھ لیا ہو۔''

راشدہ چھپکلی سے بہت ڈرتی تھی۔ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے اگر اسے کہیں چھپکلی نظر آ جاتی تو وہ کچھ اس طرح چیخ مار کر وہاں سے نکلتی کہ گھر والے دہل کر رہ جاتے۔ اس کی امی کو راشدہ کی ان چیخوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر کہتیں۔ ''راشدہ، آخر تو کب بڑی ہو گی۔ ڈھینگ ڈھینگ ہو گئی لیکن تو نے چھپکلیوں سے ڈرنا نہیں چھوڑا۔ آخر تو اس بے ضرر جانور سے اتنا کیوں ڈرتی ہے۔ اری جھاڑو اُٹھا اور اسے مار دے اگر مارنے کی تجھ میں ہمت نہیں ہے تو کسی بہن بھائی کو آ کر بتا دے وہ مار دے گا۔ تجھے آخر اس قدر چیخنے چلانے اور اُچھلنے کودنے کی ضرورت کیا ہے؟''

امی اسے نصیحتیں کرتی رہتیں، اسے ڈانٹ پلاتی رہتیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اسے جہاں کہیں بھی چھپکلی نظر آتی وہ ایک زوردار چیخ مارتی اور دس گز دور جا کھڑی ہوتی۔ اس وقت بھی جب راشدہ چیختی ہوئی ٹوائلٹ سے نکلی تو اس کی امی نے یہی سمجھا تھا کہ اس نے اندر کوئی چھپکلی دیکھ لی ہے۔

راشدہ کی امی نے راشدہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کیا اور ٹوائلٹ کی طرف بڑھیں۔

''امی، اندر نہ جائیں، وہاں ایک خوفناک کالا بلا ہے۔'' راشدہ نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ارے، کیا بکواس کر رہی ہے جب میں نے دروازہ کھولا تھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

''وہ دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، آپ نے پورا دروازہ کب کھولا تھا۔''

''اب تو بلیوں سے بھی ڈرنے لگی ہے۔'' راشدہ کی امی کو غصہ آ گیا۔ ''تو نے ٹوائلٹ جانا ہے تو جا ورنہ میں واپس جا رہی ہوں۔''

''امی، وہ بہت خوفناک ہے، وہ مجھے دیکھ کر اس طرح غرایا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔'' راشدہ کا وہ منظر یاد کر کے دل دھک دھک کرنے لگا۔

''اری، تو میرا ہاتھ چھوڑ، میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر امی نے راشدہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ٹوائلٹ کے دروازے کو ایک مرتبہ پھر کھولا۔ ابھی انہوں نے دروازہ تھوڑا سا ہی کھولا تھا کہ اندر سے کسی بلے کے غرانے کی آواز آئی۔ اس آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ راشدہ کی امی جو خاندان بھر میں بڑی نڈر مشہور تھیں، اس آواز کو سن کر، ایک لمحے کو لرز کر رہ گئیں۔

وہ کافی ہمت والی اور نڈر خاتون تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دروازے کو زور سے

دھکا دے کر کھول دیا۔ دروازہ دھاڑ سے دیوار سے جالگا۔

کالا بلا غراتا ہوا باہر آیا اور اس نے دروازے پر رک کر راشدہ کی امی کو دیکھا۔

اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور پورا جسم کوئلے کی طرح سیاہ تھا۔ وہ جسیم بلا تھا اس کی جسامت کسی چھوٹے کتے سے کم نہ تھی۔

راشدہ کی امی نے فوراً اس پر سے نظریں ہٹالیں اور اس کے سامنے سے ہٹ گئیں تا کہ وہ ٹوائلٹ سے باہر نکل جائے۔ راشدہ کا اس بلے کو دیکھ کر دم اٹکا جا رہا تھا، وہ امی کے پیچھے دبکی ہوئی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کالا بلا انہیں دیکھ کر ایک بار پھر غرایا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہوئے راشدہ کی ٹانگوں سے ٹکرایا، راشدہ چیخ مار کر امی کی گردن میں جھول گئی۔ راشدہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں سے کوئی لوہے کی چیز ٹکراتی ہوئی نکل گئی ہو۔

امی نے اس کالے بلے کو بوگی کے اندر جاتے دیکھا، پھر انہوں نے مڑ کر راشدہ سے کہا۔ ”جاؤ اب ٹوائلٹ ہو آؤ۔“

”امی مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے آپ یہیں کھڑی رہیں۔“

”ہاں، میں یہی کھڑی ہوں، تم جلدی سے فارغ ہو کر آؤ۔“

راشدہ لرزتی ہوئی اندر گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا مگر چٹخنی نہیں لگائی اسے کھلا چھوڑ دیا تا کہ یہاں سے باہر نکلنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

تین چار منٹ کے بعد وہ باہر نکلی۔ امی کو دروازے پر دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امی چلیں۔“

راشدہ اور اس کی امی ایک ساتھ ہی کمبل میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمبل سکڑا ہوا سیٹ پر پڑا تھا۔ راشدہ نے بیٹھنے کیلئے جیسے ہی کمبل اُٹھایا تو اس کی فلک شگاف چیخیں بوگی میں بلند ہونے لگیں وہ کچھ اس طرح ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی کہ اگر امی برتھ کی زنجیر نہ تھام لیتی تو زمین پر جا گرتیں۔

وہ کالا بلا کمبل کے اندر بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کمبل کے اُٹھاتے ہی اس نے زمین پر چھلانگ لگائی اور برتھ کے نیچے چلا گیا۔

راشدہ کی چیخیں سن کر برابر کے پارٹیشن سے اکبر نے اوپر کی برتھ سے چھلانگ لگائی اور خواتین والے حصے میں آگیا۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے امی سے پوچھا۔

”جانے کہاں سے کمبخت ایک بلا آگیا ہے، ابھی ٹوائلٹ میں تھا وہاں سے بھگایا تو ہمارے کمبل میں گھس کر بیٹھ گیا۔“ امی نے بتایا۔ ”اب کمبل سے نکل کر برتھ کے نیچے جا گھسا ہے۔“

جن کی خبر نے پہلے ہی خواتین میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی، ساری خواتین اپنے اپنے کمبلوں میں بیٹھی یا لیٹی تھیں۔ راشدہ کی دلدوز چیخوں اور کالے بلے کی آمد نے انہیں اور خوفزدہ کر دیا۔ ساری خواتین نے اپنے آپ کو لحافوں اور کمبلوں میں اچھی طرح چھپالیا تھا۔

بلے کی خبر پا کر خاندان اور کئی لڑکے بھی اُٹھ کر اِدھر آ گئے تھے۔ اکبر نے برتھ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ برتھ کے نیچے ہلکا اندھیرا تھا اس ہلکے اندھیرے میں اسے ایک کونے میں بلے کی لال لال آنکھیں دہکتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر اس نے غرانے کی آواز سنی۔

اکبر نے قریب ہی پڑا ہوا اونچی ایڑی کا سینڈل اُٹھایا اور جھک کر اس کالے بلے کے دے مارا۔

وہ سینڈل اس کے سر پر لگا، کالا بلا برتھ کے نیچے سے غراتا ہوا بھاگا اور اب سامنے والی سیٹ کے نیچے گھس گیا۔

”کدھر گیا۔“ اکبر نے اب دوسرا جوتا ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”اِدھر سیٹ کے نیچے۔“ ایک لڑکے نے بتایا۔

اکبر نے اس مرتبہ جھانک کر دیکھنے کے بجائے اندازے سے جوتا پھینک کر مارا۔ اس کی کالی دُم سیٹ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ جوتا کالے بلے کے پیٹ پر پڑا، وہ وہاں سے پھر غراتا ہوا نکلا اور اس مرتبہ لڑکوں والے حصے میں ایک برتھ کے نیچے چلا گیا۔

بوگی میں بلے کی آمد سے اچھی خاصی کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ بلا جوتا کھا کر ایک سیٹ سے نکل کر دوسری سیٹ کے نیچے چلا جاتا۔

بوگی میں مسلسل ”کدھر گیا...... کدھر گیا“ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شور سن کر فرقان ماموں اُٹھ کر اپنے پارٹیشن سے باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر گھمسان کا رَن پڑا ہے۔ ہر لڑکے کے ہاتھ میں ایک جوتا اور نظریں زمین پر تھیں۔

”کیا ہوا بھئی۔“ ماموں فرقان نے پوچھا۔

”ایک بلے نے پریشان کر رکھا ہے ماموں۔“ اکبر نے کہا۔ ”اِدھر سے مارتے ہیں تو اُدھر گھس جاتا ہے، وہاں سے بھگاتے ہیں تو اِدھر آ جاتا ہے۔“

”مارو نہیں اسے۔“ ماموں فرقان نے ہدایت کی۔ ”ایسے ہی گھیر کر باہر نکال دو۔“ پھر انہیں خیال آیا کہ ڈبے کے تمام دروازے بند ہیں، گاڑی چل رہی ہے، ایسے میں اسے باہر نکالنا ممکن نہ تھا پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”ایسا کرو، ٹوائلٹ کا دروازہ کھول دو اور اسے اس میں بند کر کے باہر سے دروازہ بند کر دو۔“

ماموں فرقان کی یہ تجویز اچھی تھی۔ سارے لڑکے اس کالے بلے کو مارنے پر تلے ہوئے تھے کسی

نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں غور نہ کیا تھا اس سے چھٹکارا ماموں فرقان کی تجویز پر عمل کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

تب اکبر نے اپنے خاندان کے لڑکوں اور دوستوں کو اس طرح کھڑا کیا کہ بلا سیٹ کے نیچے سے نکلے تو اس کا رُخ ٹوائلٹ کی طرف ہو جائے۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد اکبر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کالے بلے کو ٹوائلٹ میں گھسانے میں کامیاب ہو گیا۔

بلے کے ٹوائلٹ میں جاتے ہی اکبر نے اس کا دروازہ بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس بوگی میں سارے اپنے ہی لوگ تھے اس لئے یہ خطرہ نہ تھا کہ کوئی ٹوائلٹ کا دروازہ کھول دے گا۔ بوگی کے تمام لوگوں کو بتا دیا گیا کہ اس ٹوائلٹ میں بلا بند ہے۔ لہٰذا دوسرا ٹوائلٹ استعمال کریں۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی اس بلے کو دروازہ کھول کر باہر نکال دیں گے۔

لیکن ہوا یہ کہ کئی اسٹیشن آئے اور چلے گئے لیکن اس بلے کو ٹوائلٹ سے باہر نکالنے کے لئے کوئی نہ اُٹھا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ رات اپنی بکھری زلفوں کو سمیٹ رہی تھی۔ صبح ہونے کو تھی۔ رات بھر باراتیوں نے اودھم مچایا تھا اب سب نیند کی لپیٹ میں تھے اور لحافوں اور کمبلوں میں دُبکے نیند کے مزے لے رہے تھے۔

صبح کے وقت گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی۔ راشدہ کی امی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے راشدہ کو اُٹھایا پھر ایک ایک کر کے سارے باراتی جاگ گئے۔

اکبر کو فوراً بلے کا خیال آیا۔ وہ اپنی برتھ سے نیچے کودا اور ٹوائلٹ کی طرف چلا اس کے ساتھ خاندان کے ایک دو لڑکے بھی ہو گئے۔ ٹوائلٹ کا دروازہ کھولنے سے پہلے اکبر نے بوگی کا دروازہ کھولا تا کہ بلا ٹوائلٹ سے باہر آئے تو سیدھا دروازے سے پلیٹ فارم پر چلا جائے۔

اکبر نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اس کا خیال تھا کہ دروازہ کھلتے ہی وہ کالا بلا فوراً باہر آئے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ تب اکبر نے ٹوائلٹ میں جھانک کر دیکھا۔

اندر کوئی نہ تھا۔ ٹوائلٹ خالی پڑا تھا۔

''یار کدھر گیا۔'' اکبر نے اپنے چچازاد بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

ابھی اس کا چچازاد بھائی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اندر سے غرانے کی آواز آئی۔ کالا بلا ٹنکی کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہاں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا اکبر کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

اس کالے بلے میں اتنا وزن تھا کہ اکبر کھڑا نہ رہ سکا، وہ فوراً فرش پر بیٹھ گیا۔ تب بلے نے کھلے دروازے سے باہر چھلانگ لگائی اور پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔

اکبر فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کندھے سہلانے لگا۔ ''یار یہ کیا چیز تھی۔'' اس نے اپنے چچازاد

بھائی کو مخاطب کیا۔

''بھائی، وہ چیز نہیں، بلا تھا، بلا۔''

''یار، اتنا وزنی بلا، جب وہ میرے کندھے پر آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دو من کی بوری میرے کندھے پر لاد دی گئی ہو۔''

''اتنا وزن تھا اس میں۔'' چچازاد بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔ ''بلا تھا یا کوئی گدھا تھا۔''

''اللہ جانے کیا چیز تھی۔ اتنا وزنی بلا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔''

''وہ گیا کدھر۔'' اس کے چچازاد بھائی نے دروازے سے باہر جھانکا لیکن دور تک اسے بلے نام کی کوئی چیز نہ دکھائی دی۔

''چل یار، فرقان ماموں کو بتاتے ہیں۔'' اکبر نے کہا اور پھر وہ بوگی کا دروازہ بند کر کے فرقان ماموں کے پارٹیشن کی طرف چلے۔

فرقان ماموں، جو کھڑکی سے باہر گزرتے پلیٹ فارم کو دیکھ رہے تھے اکبر کی آواز سن کر انہوں نے اپنا رُخ ادھر پھیرا اور بولے۔ ''ہاں، بھئی، اکبر بلے کو آزاد کر دیا۔''

''ماموں مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بلا جانے کیا چیز تھا۔'' اکبر کے لہجے میں خوف تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ماموں فرقان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ماموں اس بلے کی جسامت تو کسی کتے سے کم نہ تھی لیکن اس کا وزن بھی کسی گدھے کے برابر تھا۔ ماموں میرے کندھے اب تک دُکھ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اکبر نے ساری تفصیل بتا دی۔

''اچھا۔'' ماموں فرقان نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بولے۔ ''ذرا ادھر آؤ۔''

اکبر ان کے قریب چلا گیا۔ فرقان ماموں نے اس کے کندھے کو سونگھ کر دیکھا۔ پھر اس کی قمیض ہٹا کر کندھا دیکھا۔ اس کے کندھے پر گردن کے نیچے ایک ہلکا سا خراش کا نشان تھا۔ جیسے وہاں اس بلے کا ناخن لگا ہو، کھال چھل گئی تھی اور خون کی ایک باریک لکیر بن گئی تھی۔

''اکبر، تمہیں ایسے ہی وہم ہو رہا ہے۔ ایک بلے میں بھلا اتنا وزن کیسے ہو سکتا ہے۔ اصل میں وہ تمہارے اوپر کودا اس انداز میں ہو گا کہ تم توازن برقرار نہ رکھ سکے۔'' فرقان ماموں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن خود ان کے چہرے پر فکر کی لکیر گہری ہوتی جا رہی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اکبر جس کی شادی ہونے جا رہی تھی کسی ڈر، خوف میں مبتلا ہو جائے۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہ کالا بلا کیا شے تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ وہ بغیر کوئی نقصان پہنچائے اس بوگی سے چلا گیا تھا جبکہ ان لڑکوں نے اس کی جوتوں سے خوب پٹائی بھی کی تھی۔ اسے ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔

فرقان ماموں بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ ساٹھ باسٹھ سال کے ہوں گے لیکن دیکھنے میں پچاس سے زیادہ کے نہ لگتے تھے۔ کسرتی بدن کے مالک تھے، خوب چاق و چوبند تھے۔ وہ مشکل سے ہی بیمار ہوتے تھے۔ بیمار ہوتے تو کبھی ڈاکٹر، حکیم کے پاس نہ جاتے ٹونے ٹوٹکوں سے اپنا علاج خود ہی کر لیتے۔

فرقان ماموں، جگت ماموں تھے۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا سب انہیں ماموں کہتے تھے۔ چھوٹے بچے خیر انہیں کہتے ہی ماموں تھے لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ ان بچوں کے دادا بھی اُنہیں ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔ فرقان ماموں مست ملنگ آدمی تھے۔ اپنے سے بڑوں کے "ماموں" کہنے پر ناراض نہ ہوتے۔ وہ روزے نماز کے پابند تھے۔ کچھ عملیات سے بھی واقف تھے۔ جھاڑ پھونک بھی کر لیا کرتے تھے لیکن یہ عملیات، یہ جھاڑ پھونک صرف خاندان تک محدود تھی۔ کراچی کی ایک پر رونق مارکیٹ میں ان کے کپڑے کی دکان تھی۔ علی گڑھ میں ان کا تالوں کا کارخانہ تھا۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے یہاں بھی تالے بنانے کی کوشش کی لیکن کاریگروں کی عدم دستیابی کی بنا پر انہوں نے اپنا کارخانہ بند کر دیا اور کپڑے کی دُکان کھول لی۔ کپڑے کی وہ دکان جو شروع میں ایک چھوٹی سی دکان پر مشتمل تھی اب چار دُکانوں تک وسعت اختیار کر گئی تھی۔ نیک نیت آدمی تھے اس لئے پُرسکون اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ہر شخص کے دکھ سکھ میں کام آنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ خاندان کی کوئی تقریب ان کے بغیر پھیکی رہتی تھی۔ وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ بچوں میں بچے بن جاتے بڑوں میں بڑے ہو جاتے۔ قصے، کہانیاں انہیں بہت یاد تھے۔ جنوں سے انہیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ علی گڑھ میں جس گھر میں ان کا بچپن اور جوانی گزری تھی اس گھر میں بھی اثر تھا۔

گرمیوں کے دن میں، جب وہ کھلی چھت پر سونے کے لئے لیٹتے تو کبھی کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی سایہ سا ان کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ چاندنی راتوں میں خاص طور پر ایسا ہوتا۔ ایک دن رات کو دو بجے کے قریب انہوں نے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سنی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کبوتر چھت سے اُڑ کر گیا ہو۔ ان کا گھر تین منزلوں پر مشتمل تھا۔ گھر والوں کی رہائش زیادہ تر دوسری منزل پر تھی۔ نیچے والا گھر تقریباً خالی پڑا رہتا تھا۔ کوئی مہمان وغیرہ آ جاتا تو آباد ہوتا یا کوئی ملنے جلنے والا آ جاتا تو کچھ دیر کے لئے بیٹھک کھل ہو جاتی۔ ہاں، گرمیوں کے دنوں میں، گھر والے دوپہر کو نیچے والے گھر میں آ جاتے تھے کیونکہ نیچے کا گھر، علی گڑھ کی جھلسا دینے والی گرمی اور آگ لگا دینے والی لُو میں گوشۂ عافیت سمجھا جاتا۔

اس سفید داڑھی والے آدمی کو فرقان ماموں نے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ دوپہر کو سوتے سوتے اچانک ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ شخص ان کی پائنتی پہ بیٹھا نظر آتا۔ وہ کوئی لمبا چوڑا آدمی تھا۔ اندھیرے کمرے میں وہ صاف نظر آتا۔ اس کا سیدھا ہاتھ کندھے تک اُٹھا ہوتا اور انگلیاں اس طرح مڑی ہوتیں جیسے کوئی پنجہ لڑانے کے لئے ہاتھ بڑھائے وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں نظر آتا تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا، ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ اسے دیکھ کر ماموں فرقان کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ ان میں ہلنے یا چیخنے کی ہمت بھی نہ رہتی جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ جب وہ پوری طرح جاگ جاتے (وہ آدمی ہمیشہ نیم غنودگی کی حالت میں نظر آتا تھا) تو وہ اُٹھ کر فوراً کھڑکی کھولتے روشنی ہوتے ہی وہاں کچھ نہ رہتا۔ اس پراسرار آدمی نے انہیں کبھی نقصان نہ پہنچایا تھا۔

اس پراسرار آدمی کے علاوہ اس نیچے والے گھر میں انہیں چھوٹے چھوٹے آدمی بھی نظر آتے تھے۔ وہ رات کو اپنے والد کے کسی مہمان یا اپنے دوست کو بیٹھک میں بٹھانے کے لئے نیچے والے گھر میں جاتے تو کبھی کبھی انہیں اندھیرے میں وہ بونے بھی دکھائی دیتے جو انہیں دیکھ کر اِدھر اُدھر چھپ جاتے۔ ان بونے آدمیوں کو انہوں نے کئی مرتبہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان بونوں نے بھی کبھی انہیں نقصان نہ پہنچایا تھا۔ اب فرقان ماموں نے وتیرہ یہ بنالیا تھا کہ انہیں اگر نیچے جا کر بیٹھک کھولنا ہوتی تو نیچے والے گھر کا تالا کھول کر وہ چند لمحے توقف کرتے پھر دروازہ کھول کر اندر جاتے تا کہ وہ بونے تالا کھولنے کی آواز سن کر اِدھر اُدھر چھپ جائیں۔

یہ گھر بہت پرانا تھا۔ یہ گھر فرقان ماموں کے دادا نے بنایا تھا۔ کہتے تھے اس زمانے میں دور تک کوئی آبادی نہ تھی، بس چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ قریب ہی ایک قبرستان بھی تھا، پھر آہستہ آہستہ رسل گنج کے اس علاقے پر آبادی اُبھرنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آبادی سارے کھیتوں کو نگل گئی، بس قبرستان باقی رہ گیا۔

فرقان ماموں کو اپنے والد کے بجائے اپنے دادا سے لگاؤ زیادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور زیادہ تر دوروں پر رہتے تھے جبکہ دادا ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ہمہ وقت گھر پر ہوتے۔ دادا کو بھی فرقان ماموں سے بہت محبت تھی۔ وہ انہیں ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے۔ گھر سے باہر جاتے تو فرقان ماموں ان کے ساتھ انگلی پکڑے چلے جا رہے ہیں۔ دادا انہیں اپنے سینے پر بٹھائے ہوئے ہیں۔ ماموں فرقان نے قرآن شریف اپنے دادا سے ہی پڑھا تھا۔ ان کے دادا ریلوے میں گارڈ تھے۔ انہیں پیروں، فقیروں سے بڑی دلچسپی تھی جب تک وہ زندہ رہے، گھر میں عجیب عجیب قسم کے لوگ آتے رہے، کبھی گھر کے آنگن میں قوالیاں ہو رہی ہیں، کبھی وظیفے وظائف پڑھے جا رہے ہیں۔ فرقان ماموں کا بچپن اسی فضا میں گزرا۔ انہیں بھی وظیفے وظائف اور عملیات سے دلچسپی ہو گئی۔

فرقان ماموں کے دادا جنات کے بہت سے قصے سناتے تھے۔ انہیں میں ایک قصہ دادی کا بھی تھا۔ یہ قصہ ان کی شادی سے پہلے کا تھا۔ شادی کے بعد بھی دادی پر کچھ عرصہ اثر رہا جسے دادا نے ایک

مشہور عامل سے دور کروایا۔

ہوا یہ کہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دادی چھت پر نہا رہی تھیں کہ یکا یک ان کی آنکھوں میں اندھ
چھا گیا پھر جب آنکھوں کا اندھیرا دور ہوا تو انہوں نے اپنے سر پر لاکھوں کبوتر اُڑتے دیکھے۔ ی
اتنی تعداد میں تھے کہ دوپہر ہونے کے باوجود سورج ان اُڑتے کبوتروں کی اوٹ میں چھپ گیا ت
چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔

اس منظر کی دہشت سے دادی اپنے ہوش گنوا بیٹھیں۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے خود ک
چار پائی پر پایا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ وہ تو چھت پر نہا رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے جسم کو د
وہاں کپڑے موجود تھے اور سامنے ان کی والدہ بیٹھی تھیں۔

انہوں نے دادی کو بتایا کہ جب تم بہت دیر تک اوپر سے نہا کر نہیں اُتریں تو مجھے تشویش ہوئی۔
میں نے نیچے سے ہی تمہیں آوازیں دیں لیکن تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تمہارا جواب نہ پا کر، میر
پریشان ہوگئی، جلدی سے بھاگی ہوئی اوپر آئی تو دیکھا تم بے ہوش پڑی ہو۔ میں نے نیچے سے
رفیقہ اور سلطانہ کو آواز دی۔ ان کی مدد سے تمہاری حالت درست کی پھر تمہیں کچھ ہوش آیا تو ہم تم
نیچے اُتار لائے۔ نیچے آ کر تم پھر بے ہوش ہوگئیں۔ اب تمہیں دوبارہ ہوش آیا ہے۔ آخر تمہیں ک
تھا۔ میں نے تمہیں ہزار مرتبہ منع کیا ہے کہ اوپر چھت پر جا کر نہ نہایا کرو اور وہ بھی بھری دوپہر میں،
تم باز ہی نہیں آتیں۔

دادی نے اپنی والدہ کو ساری تفصیل بتا دی کہ نہاتے نہاتے ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔
دنوں دادی ٹھیک رہیں۔ گھر والوں نے بھی اس واقعہ کو بھلا دیا لیکن پھر ایک دن اچانک ان کی حا
بگڑ گئی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کر دیا۔ دادی کے بال بہت لمبے اور ریشم کی طرح نرم
تھے۔ ان کی چوٹی، گھٹنوں سے نیچے لہراتی رہتی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے جب جھومنا شروع کیا تو ا
چوٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ سر کی جنبش کے ساتھ ایک دائرے میں گھوم رہی تھی پھر وہ چوٹی خود بخو
شروع ہوئی چند منٹوں میں ان کے بال بالکل کھل گئے اور ان کا چہرہ بالوں سے ڈھک گیا لیکن جھ
ابھی تک جاری تھا۔

بچے خوفزدہ ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گئے تھے۔ دادی کی چھوٹی بہن رفیقہ بھی اس منظر کی تا
نہ لا سکی تھی۔ البتہ رفیقہ سے بڑی بہن سلطانہ کمرے میں ٹھہری رہی۔ دادی کی والدہ بھی موجود تھیں
اس وقت گھر پر کوئی مرد نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کیا کرتا۔

جب دادی کو جھومتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو ان کی والدہ آگے بڑھیں اور انہوں نے دادی
قریب بیٹھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں لینا چاہا تو دادی نے انہیں ایک جھٹکا دے کر الگ کر دیا اور

ے سے بولیں۔ "کیا کرتی ہے، الگ ہٹ۔ دیکھتی نہیں ہے کہ ہم آئے ہوئے ہیں۔"

یہ دادی کی آواز نہ تھی، یہ کوئی مردانہ آواز تھی۔ دادی کی آواز کے ساتھ شکل بھی بدل گئی تھی۔
انہیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ منہ بری طرح پھٹا ہوا تھا۔

دادی کے منہ سے جو مردانہ آواز سنی تو ان کی بہن سلطانہ اُٹھ کر بھاگیں اب کمرے میں دادی کی
الدہ رہ گئیں۔

"تو بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے تُو بھی جا اور اس وقت تک اندر نہ آنا جب تک ہم یہاں ہیں۔"
ای نے غصے سے کہا۔

دادی کی والدہ نے دادی کا نام لے کر پکارا۔ "کلثوم۔"

اپنا نام سن کر دادی نے گردن گھما کر اپنی والدہ کو دیکھا ان کی شکل دیکھ کر والدہ کو پسینہ آ گیا۔ وہ
ای کی شکل نہ تھی۔ وہ جانے کس خبیث کی شکل تھی۔

ادی کی والدہ کو خوفزدہ دیکھ کر دادی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ "جا بڑھیا جا، ہمیں اکیلا چھوڑ دے۔"

دادی کی والدہ کو اگرچہ خوف محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں تب دادی نے
پنی والدہ کی چوٹی پکڑی اور کھڑی ہوگئیں، پھر انہوں نے اپنی والدہ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ
وازے میں جا کر گریں۔

اس زمانے میں دادی جان دھان پان سی لڑکی تھیں جبکہ ان کی والدہ بھاری بھرکم خاتون تھیں لیکن
ان نے اپنی والدہ کو جس آسانی سے دروازے کی طرف دھکیلا تھا اس سے ان کی بے پناہ طاقت کا
ازہ ہوتا تھا۔ ان کی والدہ کمرے سے دوسری بہنوں کو بلانے کے لئے نکلیں تو دادی نے جلدی سے
ے بڑھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

دادی کی والدہ اور ان کی بہنوں نے بہتیرا دروازہ کھٹکھٹایا مگر انہوں نے نہ کھولا۔ کمرے میں مکمل
ثی طاری تھی۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ پھر دادی نے دو تین گھنٹے بعد دروازہ کھولا اور
اتی ہوئی باہر آئیں، والدہ نے جب ان سے پوچھا۔ "کلثوم، تمہیں کیا ہوگیا تھا۔"

تو انہوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اماں، مجھے کیا ہوتا ہے میں تو کمرے میں سو رہی تھی۔"

"اری تجھے کچھ یاد نہیں۔" دادی کی والدہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ایا ہوا، آخر کچھ بتائیں تو۔" اپنی والدہ کی بات سن کر دادی خود بھی پریشان ہوگئیں۔

"تو نے مجھے دھکا دیا تھا، اتنی جان تجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔" ان کی والدہ نے پوچھا۔

"اماں، میں نے آپ کو دھکا دیا تھا۔" دادی اُلجھن میں پڑ گئیں۔ "میں تمہیں دھکا دوں گی،
نے لماؤں گی۔"

''تیری صورت بھی بدل گئی تھی، تیری آواز بھی مردانہ ہوگئی تھی۔'' دادی کی اماں بولیں۔

''نہیں اماں ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' دادی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''تیری بندھی ہوئی چوٹی خود بخود کھل گئی تھی۔'' دادی کی والدہ نے انکشاف کیا۔

یہ سن کر دادی نے اپنی چوٹی پیچھے سے آگے کی اور والدہ کو دکھا کر بولیں۔ ''اماں، یہ تو بندھی ہے۔

''تُو نے بعد میں باندھ لی ہوگی۔''

''اماں، یہ چوٹی میں نے صبح باندھی تھی اس کے بعد میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' دادی نے بتایا

غرض دادی کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ان پر کیا گزری تھی، انہیں کچھ پتہ نہ تھا۔

بس پھر اسی طرح چلتا رہا۔ دادی کچھ دن ٹھیک رہتیں پھر بیٹھے بیٹھے جھومنے لگتیں اور پھر غیر ارا طور پر ان سے جو حرکات سرزد ہوتیں وہ ہوش آنے کے بعد یاد نہ رہتیں۔

ایک دن دادی چولہے کے پاس بیٹھی تھیں کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگیں، دادی کی والدہ روٹی پکا میں مصروف تھیں۔ انہوں نے دادی کو جو جھومتے دیکھا تو فوراً روٹیاں چھوڑ کر انہیں چولہے کے سے اُٹھانے لگیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں ان کے بال چولہے کی آگ کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ ا دادی کی والدہ نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دادی غرا کر بولیں۔ ''اپنے گندے ہاتھ پرے رکھ، معلوم نہیں کہ ہم آگئے ہیں۔''

''آپ اندر چلیں جی۔'' والدہ نے بڑے احترام کے ساتھ کہا۔ ''کمرے میں بیٹھیں، یہاں جل نہ جائے۔''

''ہمارے ہوتے ہوئے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اے بڑھیا، یہ بتا کیا تو بین سنے گ دادی نے مسکراتے ہوئے والدہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں، سنوں گی، کیوں نہیں سنوں گی لیکن یہاں تو کوئی بین نہیں ہے۔'' دادی کی اماں بولیں

''بین نہیں ہے۔'' دادی نے والدہ کا مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ جو ہے۔''

''یہ تو پھکنی ہے۔''

''اری، تُو کیا جانے یہ کیا ہے، لا اِدھر دے مجھے۔'' یہ کہہ کر دادی نے اپنی والدہ سے پھکنی چھین پھر دادی نے اس پھکنی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر منہ میں دبالی اور جب پھونک ماری تو وہ سپیرے کی بین کی طرح بج اُٹھی۔ دادی بہت دیر تک اس پھکنی کو بین بنائے بجاتی رہیں۔

پورا گھر اکٹھا ہوگیا، بین کی آواز سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آگئے لیکن انہیں کسی کی پروا وہ اپنی دھن میں مگن بین بجائے جارہی تھیں۔

پھر ایک گھنٹے تک مسلسل بین بجانے کے بعد وہ تھک کر زمین پر لیٹ گئیں اور بے ہوش ہو گئ

جب دو گھنٹے کے بعد وہ ہوش میں آئیں تو انہیں کچھ یاد نہ تھا۔

دادی کی والدہ نے کہا بھی۔ ''اری کلثوم تو نے بڑی اچھی بین بجائی تھی، ذرا اب تو بجا کر دکھا۔''

تو یہ سن کر دادی ہنسنے لگیں۔ ''اماں، اب تم بھی مذاق کرنے لگی ہو۔''

دادی کو کیا پتہ تھا کہ اماں کے دل پر کیا بیت رہی ہے، وہ مذاق کررہی تھیں یا مسکرا کر اپنے آنسو پی رہی تھیں۔ دادی کی ماں کو دادی کی شادی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ دادا سے ان کا نکاح ہو چکا تھا۔ صرف رخصتی باقی تھی اور رخصتی سے پہلے ہی ان پر سایہ ہوگیا تھا۔ یہ والدین کے لئے ایسا غم تھا جس کا کوئی مداوا نہ تھا۔

دادی، کبھی بالکل ٹھیک ہو جاتیں، پندرہ پندرہ دن تک ان پر کوئی دورہ نہ پڑتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کبھی ان پر کوئی اثر ہوا ہی نہ ہو لیکن پھر اچانک ایک ایسا وقت آتا کہ دادی اپنے آپے میں نہ رہتیں اور وہ کر گزرتیں جس کی ایک ہوشمند انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

دادی کے والد مسلسل ان کا علاج کروارہے تھے جہاں بھی کسی پیر، فقیر کا پتہ چلتا، وہ اس کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ اس روحانی علاج سے انہیں کافی افاقہ ہوا۔ پھر دادا انہیں رخصت کرالائے۔ شادی کے بعد ان پر کوئی بڑا دورہ نہ پڑا وہ آہستہ آہستہ نارمل ہوتی گئیں۔

دادی کے والدین نے دادی کے بارے میں کچھ نہ چھپایا تھا، ایک ایک بات بتادی تھی، ساری روداد سنادی تھی۔ اس لئے دادا نے ان کا اور خیال رکھا اور وہ اپنی طرف سے بھی ان کا علاج کراتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دادی چھ ماہ کے اندر اندر بالکل صحت یاب ہوگئیں۔ پھر جب تک زندہ رہیں، ان پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا۔ دادا ہنس کر کہتے۔ ''بھئی اب تمہاری دادی پر اثر کیسے باقی رہتا وہ ایک بڑے جن کے زیر سایہ جو آگئی تھیں۔''

دادا جب بھی دادی کے اثر کی بات کسی کو سناتے تو دادی فوراً اُٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ دادی نے آج تک اپنی زبان سے کسی کو اپنی کہانی نہ سنائی تھی اگر ان سے کوئی پوچھتا بھی تو وہ ہنس کر ٹال دیتی تھیں لیکن اصل میں وہ خوفزدہ ہوجاتی تھیں۔

دادا کی زندگی میں ہی دادی کا انتقال ہوا۔ دادا تنہا ہوگئے۔ ان کے ایک ہی اولاد تھی یعنی فرقان ماموں کے والد جو ایک سرکاری افسر تھے اور عموماً دوروں پر رہتے تھے۔ جب دادا کا انتقال ہوا تو فرقان ماموں کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال ہوگی۔ دادا کی موت، فرقان ماموں کے لئے ذہنی کرب کا باعث بنی۔ انہیں محسوس ہوا، جیسے ان کا دادا نہ مرا ہو، باپ مر گیا ہو۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزر رہے تھے۔ اب لاہور ایک آرہا تھا۔ فرقان ماموں کی آنکھوں میں یادوں کے دیئے بجھنے لگے تھے۔ کالے بلے کی آمد نے

انہیں یہ واقعہ یاد دلا دیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آئندہ کچھ ہونے والا ہو۔

جب گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رکی تو وہاں بارات کے استقبال کے لئے لوگ موجود تھے۔ اسٹیشن کے باہر ایک لمبی بس کھڑی تھی۔ سب لوگ آرام سے بس میں سوار ہو گئے اور بس سمن آباد کی طرف روانہ ہوگئی۔

وہ کالا بلا اچانک ہی کہیں سے نکلا تھا اور بس کے چلتے ہی اس نے چھلانگ لگائی تھی اور سیڑھی کے ذریعے وہ بس کی چھت پر پہنچ گیا تھا اور کسی کو احساس تک نہ تھا کہ وہ کالا بلا بس کی چھت پر آرام سے لیٹا ان کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔

سمن آباد پہنچ کر جب بس ایک گھر کے سامنے رکی تو باراتیوں کے اُترنے سے پہلے اس کالے بلے نے بس کی چھت سے دیوار پہ چھلانگ لگائی اور دوڑتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

بارات کے لئے ایک پورا مکان خالی کرالیا گیا تھا۔ اس مکان کے برابر ہی دلہن کا گھر تھا۔ بارات میں آنے والی خواتین کیلئے ،دلہن والے گھر میں ایک بڑا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی یہ گھر اکبر کی امی کیلئے نیا نہ تھا۔ اکبر کی جس لڑکی سے شادی ہو رہی تھی وہ ان کی بہن کی لڑکی تھی، ان لوگوں کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اکبر نے نیلم کو، اور نیلم نے اکبر کو دیکھ رکھا تھا۔

اکبر، نیلم کو ''نیلم پری'' کہتا تھا اور نیلم تھی بھی ایسی ہی۔ وہ کسی پری کی طرح حسین تھی۔ اس کے سحر انگیز حُسن سے متاثر ہو کر خاندان کے کئی لڑکے اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن نیلم، اکبر کے کھاتے میں لکھی گئی تھی، اس لئے اکبر اسے لینے آپہنچا تھا۔

عصر کے وقت، نکاح سے پہلے جب اکبر کی امی سے بری دینے کو کہا گیا تو انہوں نے راشدہ کو آواز دی۔ ''راشدہ، ذرا بری والا سوٹ کیس اُٹھاؤ۔''

''جی اچھا امی۔'' راشدہ نے دیوار سے لگا ہوا سوٹ کیس اپنی امی کے سامنے لا رکھا، امی نے اپنے پرس سے چابیاں نکالیں اور سوٹ کیس کھولنے لگیں۔

ابھی انہوں نے سوٹ کیس کا ڈھکن اُٹھایا ہی تھا کہ ایک دَم اُنہیں چکر سا آ گیا۔ انہوں نے فور اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔

بری والے سوٹ کیس کا ڈھکن اُٹھاتے ہی راشدہ کی امی کو جو چکر آیا تھا وہ صرف انہیں کو نہیں آیا تھا بلکہ اس وقت کمرے میں جتنی خواتین بھی موجود تھیں سب ہی کا یہ حشر ہوا تھا۔ سب نے جلدی جلدی اپنی ناکوں پر دوپٹے رکھ لئے تھے۔ راشدہ کا برا حال تھا اسے نہ صرف چکر آیا تھا بلکہ ایک دَم جی متلا اُٹھا تھا۔ وہ ''اواو'' کرتی باتھ روم کی طرف بھاگی تھی اور وہاں اس کی ساری آنتیں سمٹ کر حلق میں

آ گئی تھیں۔

راشدہ کو بدبو کی برداشت نہ تھی۔ ذرا سی بدبو اس کا دماغ اُلٹ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت پرفیوم میں نہائی رہتی تھی۔ سوٹ کیس سے برآمد ہونے والی بدبو ایسی تھی کہ اس نے دماغ میں گھس کر نسوں تک کو جلا دیا تھا۔

سوٹ کیس میں موجود بری کے جوڑوں کی بُری حالت تھی۔ وہ سب غلاظت میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ان جوڑوں کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات کوئی ان کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ اب کمرے میں موجود دوسری خواتین کو بھی اُبکائیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کمرے سے ساری خواتین بھاگ گئی تھیں لیکن راشدہ کی امی موجود تھیں۔ انہوں نے بدبو سے بچنے کیلئے اپنے منہ پر اچھی طرح دوپٹہ باندھ لیا تھا لیکن بدبو تھی کہ پھر بھی گھسی چلی آ رہی تھی۔

راشدہ کی امی بہت پریشان تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بند سوٹ کیس میں یہ غلاظت کہاں سے بھر گئی۔ امی نے چٹکی سے اُٹھا کر سارے جوڑوں کو دیکھ ڈالا۔ ایک جوڑا بھی صاف نہ تھا۔ نیچے تک ہر جوڑا غلاظت سے بھرا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے زیورات کے ڈبے نکالے انہیں کھول کر دیکھا ان کا بھی وہی حال تھا۔ اندر غلاظت بھری ہوئی تھی۔

بری کے جوڑوں اور زیورات کا یہ حشر دیکھ کر راشدہ کی امی صدمے سے دوچار تھیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہوئی تھی، سوٹ کیس میں کس نے غلاظت بھر دی تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اچانک کمرے میں ''میاؤں'' کی آواز سنائی دی۔

امی نے لپک کر دیکھا تو ایک کالا بلا الماری کے پیچھے سے نکل رہا تھا۔ وہ باہر نکلا اس نے اپنے اگلے پاؤں پر جھک کر ایک زوردار انگڑائی لی اور امی کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

راشدہ کی امی اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھیں۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھیں لیکن اس کالے بلے کی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے محسوس ہوتے معلوم ہوئے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گئیں۔

''راشدہ! اے راشدہ!'' انہوں نے کمرے سے باہر آ کر آواز دی۔ راشدہ ابھی تک باتھ روم میں تھی، وہ امی کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئی۔

''جی امی۔'' اس نے اپنی ناک پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

''جا اپنے ابو اور ماموں فرقان کو بلا کر لا۔'' امی نے پریشان لہجے میں کہا۔

بارات برابر والے مکان میں ٹھہری ہوئی تھی۔ نکاح کا وقت قریب تھا لہٰذا سب تیار ہونے میں لگے ہوئے تھے۔ راشدہ کے ابو بابر علی نے اپنی بیٹی کو اس طرح بدحواسی سے کمرے میں آتے دیکھا تو

وہ پریشان ہوگئے۔انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔"کیا ہوا؟"
"ابو آپ کو امی بلا رہی ہیں جلدی چلیں۔" پھر راشدہ نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی گ
ماموں فرقان نظر نہ آئے۔"ابو! ماموں کہاں ہیں؟"
"ابھی تو یہیں تھے شاید باتھ روم......" ابھی بابر علی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ماموں فرقان باتھ رو
سے نکل آئے۔"لو وہ آگئے۔"
"خیریت۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔
"ماموں خیریت نہیں،امی نے آپ کو اور ابو کو بلایا ہے جلدی چلیں۔" راشدہ نے گھبرا کر کہا۔
"کیوں بلایا ہے؟" ماموں فرقان نے اپنے ہاتھ تولیے سے پونچھتے ہوئے پوچھا۔
"بَری کے جوڑوں کا ستیاناس لگ گیا ہے۔سوٹ کیس غلاظت سے بھرا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر راشا
نے فوراً اپنے منہ پر دوپٹہ رکھ لیا۔
"ارے۔" ماموں فرقان چونک پڑے۔"آؤ باہر جلدی چلو۔"
یہ لوگ تیزی سے باہر نکلے۔راشدہ کی امی صابرہ گیٹ پر ہی کھڑی تھیں۔وہ شدید صدمے ۔
دوچار تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔صدمے کی بات بھی تھی۔نکاح کا وقت سر پر تھا اور ا
محنت اور پیار سے بنائی ہوئی بَری کا ناس لگ گیا تھا۔
"سوٹ کیس کہاں ہے؟" بابر علی نے پوچھا۔"ایسا کیسے ہوگیا۔"
"وہ اندر ہے کمرے میں۔" صابرہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔"مجھے معلوم نہیں
یہ غلاظت اس میں کہاں سے آئی۔"
"آؤ دیکھتے ہیں،تم پریشان مت ہو۔" ماموں فرقان نے صابرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی
"میں نے اتنی محنت سے بَری تیار کی تھی۔اتنے شوق سے ایک ایک جوڑا بنایا تھا۔" صابرہ ۔
ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔"سب برباد ہوگیا۔"
جس کمرے میں سوٹ کیس تھا وہاں کوئی نہ تھا۔اس واقعہ نے گھر کی تمام خواتین کو خوف میں
کر دیا تھا۔ماموں فرقان نے آگے قدم بڑھائے ان کے پیچھے بابر علی تھے۔کمرے میں داخل ہو۔
ہی بدبو کا ایک تیز بھپکا آیا حالانکہ سوٹ کیس بند تھا۔
ماموں فرقان نے فوراً اپنا سانس روک لیا اور تیزی سے ناک پر رومال رکھ لیا۔بابر علی کا بھی
حال تھا،وہ بھی اپنی ناک رومال سے ڈھک چکے تھے۔صابرہ کمرے میں نہ آئی تھیں وہ درواز ۔
کھڑی تھیں۔
ماموں فرقان نے سوٹ کیس کا ڈھکن اُٹھایا۔ڈھکن اُٹھاتے ہی بدبو کا طوفان اُٹھا۔ناک

ہونے کے باوجود فرقان کو اپنے دماغ کی نسیں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔غلاظت کو دیکھ کر ان کا جی متلا
اُٹھا۔انہوں نے فوراً سوٹ کیس بند کر دیا۔
پھر وہ سوٹ کیس کو کھینچ کر باہر صحن میں لے آئے۔صحن میں ایک باتھ روم تھا۔انہوں نے سوٹ
کیس اس کے دروازے میں کھسکا دیا۔
"گھر میں کوئی پانی کا پائپ نہیں؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔
پاس کھڑی صابرہ نے اپنی بہن واجدہ کی طرف دیکھا وہ فوراً بولی۔"جی ہے۔"
"ذرا لائیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔
پائپ آنے کے بعد انہوں نے صحن میں لگے نلکے میں لگایا اور نلکا کھول کر دیکھا۔پانی بڑے پریشر
سے آرہا تھا۔پائپ سے خاصی موٹی دھار برآمد ہوئی۔
"ماموں کیا کرنا ہے؟" صابرہ نے پوچھا۔
"غلاظت دھونی ہے اور کیا کرنا ہے۔"
"ماموں آپ ٹھہریں میں ملازمہ کو بھیجتی ہوں۔" اس مرتبہ واجدہ نے کہا اور اندر چلی گئیں۔
چند لمحوں بعد ایک ملازمہ باہر آئی۔اس نے دوپٹے کو اچھی طرح ڈھاٹا بنا کر باندھا ہوا تھا۔
ماموں نے بھی ایک بڑا کپڑا لے کر اپنے منہ پر اچھی طرح ڈھاٹا باندھ لیا۔اب چہرے پر صرف
ان کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔
ماموں فرقان نے پائپ لے کر کپڑوں پر پانی کی موٹی دھار ڈالنا شروع کی۔
ملازمہ ایک ایک جوڑا باہر نکالتی گئی،ان کھلے جوڑوں سے اس قدر شدید بدبو اُٹھ رہی تھی کہ پاس
ں کے مکین بھی پریشان ہوکر باہر آگئے تھے اور حیران و پریشان ہوکر دیکھ رہے تھے کہ یہ بدبو کہاں
سے آرہی ہے۔
کپڑوں سے جب اچھی طرح غلاظت دور ہوگئی تو ان کپڑوں کو سرف کے پانی میں ڈالا گیا۔اس
کے بعد زیورات کے ڈبوں کو بھی اسی طرح پانی سے دھویا گیا۔
نکاح جو عصر کے بعد ہونے والا تھا اسے ملتوی کر کے عشاء کے بعد رکھا گیا۔
نکاح کے جوڑے کو جلدی جلدی استری سے سکھانے کی کوشش کی گئی۔جوڑا تو سوکھ گیا لیکن اس
س سے بدبو نہ گئی۔اس صورتحال نے پھر گھر والوں کو پریشان کر دیا۔ماموں فرقان نے مشورہ دیا کہ
ن اچھے ڈرائی کلینرز سے جوڑا ارجنٹ ڈرائی کلین کروا لیا جائے۔نکاح تو عشاء تک ملتوی کر دیا تھا۔
می وقت تھا۔
ایک بندے کو گاڑی پر شہر کے ایک بڑے ڈرائی کلینرز کی طرف بھگایا گیا۔وہ ایک گھنٹے میں کپڑے

واپس لے کر آیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ کپڑوں سے اب بھی ہلکی ہلکی بدبو آ رہی تھی۔ زیورات کا بھی یہی حال تھا۔ انہیں اچھی طرح سرف میں دھونے کے باوجود ان کی بدبو نہ نکلی تھی۔ پتا نہیں یہ کس قسم کی بدبو تھی۔

''اب کیا کریں۔'' صابرہ نے بابر علی سے کہا۔ ''جوڑا اس قابل ہے کہ اسے پہنایا جائے اور نہ زیورات۔ ویسے واجدہ کہہ رہی ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نیلم کے پاس بہت جوڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی پہن لے گی۔''

''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' بابر علی نے کہا۔ ''کیوں ماموں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ دلہن کو ہمارے یہاں کا جوڑا پہننا چاہئے۔'' ماموں فرقان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔''

''لیکن اتنی جلدی نیا جوڑا کیسے بن جائے گا۔'' بابر علی نے ماموں فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کل بازار میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ یہ ہمارے وقتوں کا زمانہ نہیں ہے کہ مہینوں شادی کی تیاری کرنا پڑتی تھی اب تو چار دن میں شادی کی پوری تیاری ہو سکتی ہے۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

''ٹھیک ہے پھر بازار سے جا کر ایک جوڑا اور زیورات کا ایک سیٹ خرید کر لاتے ہیں۔'' بابر علی نے کہا۔ ''کیوں صابرہ ٹھیک ہے نا؟''

''جی بالکل ٹھیک ہے لیکن کچھ پیسوں کا مسئلہ ہوگا۔'' صابرہ نے فکر مند ہو کر کہا۔

''پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں، میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں میرے پاس پیسے بہت ہیں۔'' ماموں فرقان نے اپنی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان تقریباً تیار ہی تھے۔ بس دوسرے مکان میں جا کر انہوں نے اپنا کوٹ پہنا اور اپنے سوٹ کیس میں سے مزید پیسے نکال کر جیب میں رکھ لئے اس وقت ان کی جیب میں اچھے خاصے پیسے تھے۔ دس ہزار صابرہ نے اپنے پرس میں رکھ لئے تھے۔

جب واجدہ اور ان کے شوہر کو پتہ چلا کہ یہ لوگ بری کے جوڑے اور زیور خریدنے کے لئے بازار جا رہے ہیں تو انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن بابر علی اور فرقان ماموں نہیں مانے اور وہ لوگ گاڑی لے کر انار کلی کی طرف چل دیئے۔

اکبر کو جب یہ معلوم ہوا کہ بری کے جوڑوں اور زیورات کا کیا حشر ہوا ہے تو وہ پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سوٹ کیس میں غلاظت کس نے بھر دی۔ یہ سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہو گیا پھر اسے فکر ہوئی کہ

اب بری کے جوڑوں کا کیا ہوگا، کہاں سے آئیں گے؟

پھر اسے کسی نے بتایا کہ ماموں فرقان تمہارے امی ابو کو لے کر انار کلی گئے ہیں۔ بری کا جوڑا اور زیورات لینے تو اس کی کچھ جان میں جان آئی ورنہ اسے تو شادی خطرے میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ بری کے بغیر کیسے ہوتی شادی۔

گاڑی سمن آباد سے نکلی تو ماموں فرقان جو اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے مڑ کر بابر علی سے مخاطب ہوئے۔

''بھئی بابر تمہاری بیوی توجنات پر یقین رکھتی نہیں ہے یہ تو مجھے بھی تو ہم پرست کہتی ہے لیکن اب تم دونوں مجھے یہ بتاؤ کہ یہ غلاظت سوٹ کیس میں کہاں سے آئی؟''

پچھلی سیٹ پر بابر علی کے ساتھ صابرہ بیٹھی ہوئی تھیں ماموں فرقان کی بات سن کر اس نے کہا۔ ''ماموں فرقان میں تو چکرا کر رہ گئی ہوں سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہ عقل کو دنگ کرنے والے واقعات پے در پے کیوں ہو رہے ہیں؟''

''صابرہ تم نے ٹرین میں کالے بلے کو دیکھا تھا؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''جی دیکھا تھا۔'' صابرہ نے جواب دیا

''تمہیں اسے دیکھ کر کیا محسوس ہوا؟'' ماموں فرقان نے دوسرا سوال کیا۔

''مجھے اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک کالا بلا ہے۔'' صابرہ نے بڑے اطمنان سے جواب دیا۔

''وہ کالا بلا تمہارے اکبر کے کندھے پر کودا تھا۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''اچھا پھر۔'' صابرہ نے ماموں فرقان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بیٹے نے اس کا وزن ایک گدھے کے برابر محسوس کیا تھا...... میں اسی وقت کھٹک گیا تھا لیکن میں نے اکبر سے کچھ نہیں کہا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہو جائے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' صابرہ نے بغیر پریشان ہوئے پوچھا۔

''وہ کالا بلا محض کالا بلا نہ تھا...... کچھ اور تھا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''وہ کالا بلا تو مجھے گھر میں بھی نظر آیا تھا وہ اس وقت الماری کے پیچھے سے نکل کر کمرے کے باہر چلا گیا تھا جب میں نے سوٹ کیس کھولا تھا۔'' صابرہ نے بتایا۔

''اب کچھ یقین آیا۔'' ماموں فرقان بولے۔

''پھر تو مجھے لگا تھا اسے دیکھ کر خاص کر اس کی سرخ آنکھوں میں کچھ تھا لیکن پھر وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ لیکن ماموں فرقان وہ بلا نہیں تو اور کیا ہے۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بلا نہیں ہے وہ کوئی اور مخلوق ہے اب کیا ہے اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں بتا سکتا...... ایک آدھ بار اسے دیکھ لوں پھر ہی کچھ بتا سکوں گا۔''

''کیا آج کے زمانے میں بھی بھوت پریت ہوتے ہیں۔'' اس مرتبہ ڈرائیور بولا اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ ''مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے جی۔''

''بھائی بھوت پریت کا تو پتہ نہیں میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا...... لیکن جن ضرور ہوتے ہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا...... میں نے خود جن دیکھے ہیں۔'' ماموں فرقان نے ڈرائیور کو بتایا۔

''ہیں جی آپ نے۔'' ڈرائیور ایک دم پریشان ہو گیا اس کی گھبراہٹ میں ایک سائیکل والا لپیٹ میں آتے آتے رہ گیا۔

''کیا کرتے ہو...... گاڑی سامنے دیکھ کر چلاؤ۔'' صابرہ نے اسے پیچھے سے ڈانٹا۔ ''ماموں فرقان خدا کے واسطے سے جنات کے واقعات سنانے نہ بیٹھ جانا...... ورنہ اس کا ضرور ہارٹ فیل ہو جائے گا۔''

یہ سن کر ماموں فرقان نے قہقہہ لگایا اور خاموش ہو گئے۔ ڈرائیور انہیں اس طرح مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے انہوں نے جن نہ دیکھے ہوں بلکہ وہ خود جن ہوں۔

تھوڑی دیر بعد بازار آ گیا اور وہ لوگ انارکلی کی ایک بڑی دکان میں داخل ہوئے اور سیلز مین سے بَری کا جوڑا دکھانے کو کہا۔ سیلز مین نے جلدی جلدی ان کے سامنے کئی جوڑے رکھ دیئے۔

ایک جوڑا صابرہ کو پسند آ گیا اس نے تھوڑا بھاؤ تاؤ کیا اور اس کی قیمت طے کر کے پیکنگ کے لئے کہہ دیا۔ پھر جب کاؤنٹر پر ادائیگی کیلئے پرس میں ہاتھ ڈالا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

صابرہ نے جلدی جلدی پرس کی تمام جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن بے سود اس کی آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا گھر سے چلتے ہوئے اس نے دس ہزار روپے پرس میں ڈالے تھے لیکن اب پرس دس ہزار تو بڑی بات ہے دس روپے بھی نہ تھے اس کا پرس خالی پڑا تھا۔

صابرہ کو پریشان دیکھ کر ماموں فرقان آگے بڑھے اور صابرہ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ماموں پرس سے پیسے غائب ہیں۔'' صابرہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرے خیال میں تم جلدی جلدی میں پیسے گھر پر ہی چھوڑ آئیں۔'' فرقان ماموں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں ماموں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پیسے میں نے پرس میں رکھے تھے۔''

''چلو کوئی مسئلہ نہیں فی الحال میں رقم ادا کئے دیتا ہوں۔'' ماموں فرقان نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم پیسے گھر بھول آئی ہو۔'' یہ کہتے کہتے فرقان ماموں کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ انہوں نے گھبرا کر جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور پھر ایک ایک کر کے تمام جیبیں چھان ماریں لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

ان کی جیب سے بھی سارے پیسے غائب تھے۔

بَری کا جوڑا کاؤنٹر پر پیک رکھا رہ گیا۔ وہ تینوں دکاندار سے معذرت کر کے باہر آ گئے۔ صابرہ نے واپس آتے ہوئے اپنے پرس کو بار بار ٹٹولا۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بھی اپنی جیبیں دیکھنے کو کہا۔ بابر علی نے بھی اپنی جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن رقم برآمد نہ ہوئی۔ صابرہ بہت پریشان تھی اس کا نقصان پر نقصان ہوا جا رہا تھا ابھی بَری کے جوڑوں اور زیورات کا ستیاناس ہوا تھا کہ اس کے بعد فوراً دس ہزار روپے کی چپت لگ گئی۔ یہ پیسے کہاں غائب ہو گئے تھے، کیسے غائب ہو گئے تھے، کسی کی عقل کام نہ کر رہی تھی۔

جب وہ لوگ سمن آباد واپس پہنچے اور منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوئے تو واجدہ تیزی سے آگے بڑھی اس نے صابرہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا صابرہ خیر تو ہے۔''

''خیر کہاں، سارے پیسے غائب ہو گئے۔'' صابرہ نے پھر واقعہ کی تفصیل بتائی۔

''حیرت ہے۔'' واجدہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خیر غم نہ کرو نیلم کے پاس تیس چالیس جوڑے ہیں، پندرہ بیس سلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک پسند کر لو، وہ ہم بَری کا جوڑا سمجھ کر بنا دیں گے۔ تم اپنا دل نہ دکھاؤ۔''

''اچھا۔'' صابرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

جوڑے کا مسئلہ حل ہوا تو ایک دوسرا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ نکاح کا وقت ہوا تو ایک بندہ نکاح خواں کو لینے گیا عین اس وقت جب سب لوگ قاضی کا انتظار کر رہے تھے وہ شخص جو نکاح خواہ کو لینے گیا تھا مایوس ہو کر شامیانے میں داخل ہوا۔

نیلم کے والد نے اس شخص کو تنہا دیکھ کر پوچھا۔ ''کہاں ہیں قاضی صاحب؟''

''وہ تو نہیں آسکیں گے جی...... انہوں نے معذرت کر لی ہے۔ انہیں ایک سو چار درجے کا بخار ہے۔'' اس نے نیلم کے والد فیاض حسین کو بتایا۔

''انہیں بھی آج ہی بخار ہونا تھا۔'' فیاض حسین نے غصے سے کہا۔

پھر ایمرجنسی میں ایک اور نکاح خواں کا انتظام کیا گیا، جیسے تیسے ہانپتے کانپتے دوسرے قاضی صاحب آئے۔ اسٹیج پر پہنچ کر انہوں نے کاغذات کھولے، نکاح کے رجسٹر پر ضروری اندراج کیا۔ اندراج کرتے ہوئے بار بار ان کا ہاتھ رک جاتا اور وہ گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔

کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ان کی توجہ بٹا رہی تھی لیکن ان کی سمجھ میں خود یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ اندراج کرتے کرتے کس کو گردن اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔

خدا خدا کر کے اندراج پورا ہوا تب قاضی صاحب نے ایجاب و قبول کا سلسلہ شروع کیا۔

اِدھر ایجاب و قبول کا سلسلہ شروع ہوا، اِدھر وہ شامیانے میں داخل ہوا اور اچھل کر اسٹیج پر چڑھا پھر

وہ خاموشی سے صوفے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اسی صوفے پر اکبر سہرا باندھے بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں اور اس کے پاؤں کے درمیان دو تین انچ کا فاصلہ تھا۔

قاضی صاحب نے ایک جھرجھری سی لی۔ انہیں اچانک ہی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے جلدی سے دولہا کے سامنے ایجاب وقبول کیلئے لڑکی کا نام، ولدیت اور مہر وغیرہ دہرائی مگر ان سے کوئی غلطی ہوگئی۔

انہوں نے نیلم کے والد کا نام فیاض حسین کے بجائے سرفراز حسین کہا۔ پھر ہر بار وہ غلطی کرنے لگے کبھی لڑکی کا نام بھول جاتے، کبھی مہر کی رقم غلط بتاتے۔ بار بار غلطی کرنے پر وہ خود شرمندہ ہو رہے تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ رجسٹر میں دیکھ کر کوائف بول رہے تھے لیکن آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں وہ زبان پر نہیں آ رہا تھا۔

اسٹیج پر جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ سب پریشان ہو رہے تھے۔ نیلم کے والد فیاض حسین کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔

پھر خدا خدا کر کے ایجاب وقبول مکمل ہوا۔ اکبر نے سر اُٹھایا اور شامیانے میں مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔ لوگ دولہا سے گلے ملنے اور مبارکباد دینے اسٹیج پر آنے لگے۔

وہ جو صوفے کے نیچے بیٹھا تھا وہاں سے نکلا، اسٹیج سے کودا، اس نے منہ ڈال کر قنات اُٹھائی اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

قاضی کی بڑی عجیب حالت تھی ان کے جسم میں کپکپی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے کھانا بھی نہ کھایا نکاح پڑھایا، اپنے پیسے وصول کئے اور ہانپتے کانپتے شامیانے سے نکل گئے۔

نکاح کے بعد بارات نے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد دلہن رخصت ہوئی۔ وہ رخصت ہو کر برابر والے مکان میں آگئی۔ اس مکان میں جہاں بارات ٹھہری تھی۔ اس مکان کے ایک کمرے کو دولہا دلہن کیلئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اسے اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ گلاب کے تازہ پھولوں سے خوب مہکایا گیا تھا۔

صابرہ اور واجدہ دلہن کے پاس بیٹھی تھیں اور آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ آج دن بھر جو بیتی تھی اس کی روداد صابرہ بتا رہی تھی۔ نیلم ان کے پیچھے خاموش بیٹھی تھی۔ وہ یہ ساری باتیں سن کر پریشان ہو رہی تھی۔

اِدھر دوسرے کمرے میں فرقان ماموں، بابر علی اور فیاض کے سامنے بیٹھے تھے۔ اکبر اپنے خاندان کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ تیسرے کمرے میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

فرقان ماموں نے کھانا کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا، پیٹ پر کسی ہوئی پینٹ انہیں پریشان کر رہی تھی۔

انہوں نے سوچا کہ کپڑے تبدیل کر کے ذرا ایزی ہوا جائے۔

"بابر میں کپڑے بدل کر ابھی آیا۔" فرقان ماموں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔" بابر علی نے کہا۔

فرقان ماموں نے اپنا کوٹ اُتار کر ہینگر پر لٹکایا۔ کوٹ کو ہینگر پر لٹکاتے ہوئے ان کی نظر اندرونی جیب پر پڑی۔ اس جیب میں انہیں کچھ نوٹ رکھے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ان کے ہاتھ میں نوٹوں کی موٹی گڈی موجود تھی۔

ماموں فرقان نے جلدی جلدی نوٹ گنے، پیسے پورے تھے۔

"ارے بابر کمال ہوگیا۔" ماموں فرقان نے دور ہی سے آواز لگائی۔

"کیا ہوا ماموں۔" بابر علی نے چونک کر کہا۔

"بابر پیسے تو یہ رہے۔" ماموں فرقان نے قریب آ کر نوٹ دکھائے۔

"یہ کہاں سے ملے؟" بابر علی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کوٹ کی جیب میں سے۔" فرقان ماموں نے بتایا۔

"ماموں اسی کوٹ کی جیب میں سے جو آپ نے ابھی پہن رکھا تھا۔" بابر علی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں، اسی کوٹ کی جیب میں سے۔" فرقان ماموں نے اثبات میں گردن ہلائی...... "بازار جاتے ہوئے میں نے کوٹ کی اسی جیب میں پیسے رکھے تھے اور اب اسی جیب سے ملے ہیں...... ہاں پر تو میں نے ساری جیبیں ٹٹول ڈالی تھیں مگر پیسوں کا پتہ نہ تھا۔"

"ماموں فرقان یہ کیا ہو رہا ہے؟" بابر علی کی پیشانی فکر آلود ہوگئی۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" ماموں فرقان نے گہرا سانس لیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "صابرہ کہاں ہے؟"

"وہ دلہن والے کمرے میں ہیں۔" کسی نے بتایا۔

تب ماموں فرقان حجلۂ عروسی کی طرف آئے اور دروازے پر رک کر آواز دی۔ "صابرہ۔"

"جی آئی ماموں۔" صابرہ کی اندر سے آواز آئی پھر وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ "جی ماموں آپ اندر آجائیں آپ سے کیا پردہ۔"

"صابرہ تمہارا پرس کہاں ہے؟" ماموں نے کہا۔

"اندر کمرے میں ہے۔" صابرہ نے ماموں فرقان کا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا۔

"ذرا اُٹھا کر لانا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"اچھا میں لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر صابرہ اندر چلی گئی پھر فوراً ہی واپس آئی اس کے ہاتھ میں پرس

تھا۔ "یہ رہا ماموں پرس..... کیا کرنا ہے۔"

"ذرا اسے کھول کر دیکھو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"خالی پرس کو کیا کھول کر دیکھنا۔" صابرہ نے پرس کی زپ کھولی۔

زپ کھولتے ہی اس کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔ "ارے ماموں پیسے..... اس میں تو پیسے موجو ہیں۔" صابرہ نے جلدی سے پیسے نکال کر انہیں گنا..... پورے دس ہزار تھے۔

"ماموں پورے دس ہزار ہیں۔" صابرہ خوشی سے چلائی۔

لیکن فرقان ماموں اب وہاں موجود نہ تھے وہ یہ خبر سنانے بابر علی کے پاس جا چکے تھے۔

"بابر، صابرہ کے پرس میں بھی سارے پیسے موجود ہیں۔" انہوں نے کمرے میں پہنچ کر بابر کو بتایا۔

"واقعی۔" بابر علی خوش ہو کر بولا۔

"ہاں واقعی۔" صابرہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "ماموں کیا آپ کے پیسے بھی مل گئے۔"

"ہاں، ماموں کو بھی مل گئے۔" بابر علی نے بتایا۔

"صابرہ، اب کیا کہتی ہو۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو بغور دیکھا۔

"میں کیا کہوں ماموں، پیسے مل گئے یہ میرے لئے سب سے بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"یہ پیسے غائب کہاں ہو گئے تھے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔

"ویسے یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ آپ دونوں کے پاس سے رقم غائب ہو گئی۔" اس مرتبہ فیاض حسین بولے۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ بازار میں کسی نے اُڑا لی..... اگر یہ پیسے نہ ملتے تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا۔"

"اب کیا سمجھ رہے ہیں؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"میرے خیال میں آپ لوگوں نے اپنی جیب اور پرس اچھی طرح نہ دیکھا۔" فیاض حسین نے رائے دی۔

"بھائی صاحب کیا بات کرتے ہیں؟" بابر علی نے کہا۔

"صابرہ نے تو میری جیبیں بھی کھنگال ڈالی تھیں۔"

"فیاض صاحب آپ کو جنوں وغیرہ پر یقین ہے۔" فرقان ماموں نے اب صاف لفظوں میں پوچھا۔

"مجھے تو بس پیسے پر یقین ہے یہ پیسہ اتنا بڑا جن ہے کہ سب کو تگنی کا ناچ نچا دیتا ہے۔" فیاض حسین نے ایک قیمتی سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔

ان کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ فیاض حسین ایک بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں

اپنی زندگی میں بس ایک ہی چیز پر یقین کیا تھا اور وہ تھا پیسہ..... پیسہ ان کا ایمان تھا۔ وہ جن
ں سے نہیں ڈرتے تھے البتہ ڈوبتی ہوئی رقم سے ان کی جان جاتی تھی اور آتی ہوئی رقم سے ان کے
یں جان پڑ جاتی تھی۔ وہ دو اور دو چار کے آدمی تھے۔ ہندسوں میں ان کیلئے بڑی کشش تھی۔ یہی
ی کہ انہوں نے ماموں فرقان کی بات کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی۔

ماموں فرقان نے سوچا جو آدمی پیسے کے علاوہ کسی بات پر یقین ہی نہ رکھتا ہو اس سے بات کرنے
ہا فائدہ۔

البر کو جب پیسے ملنے کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا ورنہ جب سے وہ لوگ گھر سے چلے تھے کچھ نہ کچھ
باتیں ہو رہی تھیں جو ذہنی پریشانی کا باعث تھیں۔ ٹرین میں ایک کالے بلے نے پریشان کئے
گھر آئے تو بری کے سوٹوں میں غلاظت بھر گئی۔ غلاظت بھی ایسی کہ ڈرائی کلیننگ کے بعد بھی ان
ں میں سے بو نہ گئی، پھر نیا جوڑا خریدنے بازار گئے تو صابرہ کے پرس اور ماموں فرقان کی جیب
پیسے غائب ہو گئے، جن قاضی کو بلایا گیا تھا وہ اچانک بخار میں مبتلا ہو گیا، نکاح پڑھانے نہ آسکا،
میں ایک اور قاضی کا انتظام کیا گیا وہ نکاح خواں تھا بھی یا نہیں بڑی مشکلوں سے اٹک اٹک کر
نے نکاح پڑھایا۔ یہ واقعات کی وہ کڑیاں تھیں جو ایک کے بعد ایک ظہور پذیر ہو کر اکبر کے دل کا
لوٹ رہی تھیں۔

یلم سے شادی اس کا خواب تھی۔ اس نے کراچی میں اپنے گھر کے لوگوں اور خاندان والوں سے
ے حسن کے چرچے سنے تھے اور وہ اسے دیکھے بغیر ہی اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ اس کے خواب
اگا تھا اور جب نیلم لاہور سے کراچی آئی اور اکبر نے پہلی بار اسے دیکھا تو اپنی سانس رکتی ہوئی
وں کی۔ وہ اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھی، اس قدر حسین کہ اس کے منہ بے اختیار نکلا۔

"یہ نیلم نہیں..... نیلم پری ہے۔"

ایسا ملکوتی حسن انسانوں میں کہاں ہوتا ہے۔ یہ انسان نہیں پری ہے پری..... اکبر نے بچپن میں
اں کے بہت قصے پڑھے تھے۔ نیلم کو دیکھا تو اسے فوراً خیال آیا کہ نیلم کے پَر نہیں ہیں۔ حسن تو ویسا
ہ اگر اس کے پَر لگے ہوتے تو یہ نیلم پری ہو جاتی۔

اسی دن سے اس نے دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ اے اللہ! میری شادی نیلم
ے۔ جوڑے آسمانوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اللہ نے اکبر کی دعا قبول کر لی اور خوش ہو کر نیلم
ں کے نام لکھ دیا۔

خاندان میں لڑکوں کی کمی نہ تھی۔ لاہور، کراچی اور دیگر شہروں میں ایک سے ایک لڑکا پڑا تھا۔ نیلم
ام پر سب اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار تھے لیکن قرعۂ فال نکلا اکبر کے نام اور یہ صرف اس

وجہ سے ہوا کہ وہ اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

اب وہ وقت بہت نزدیک تھا۔ جب اس کا مقدر کھلنے والا تھا۔ اُس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اکبر اس انتظار میں تھا کہ کب وہ لمحہ آئے اور کب وہ حجلۂ عروسی میں پہنچے۔

اب وہ وقت قریب تھا۔ اکبر کی بہن راشدہ نیلم کو بنا سنوار رہی تھی، ہلکی لپ اسٹک کو اور گہرا کیے جا رہا تھا، لباس درست کیا جا رہا تھا، نیلم کی امی واجدہ نے کمرے میں مٹھائی، پھل اور ایک بڑا گلاس دودھ سے بھرا رکھ دیا تھا۔ راشدہ اپنے بھائی کو لینے جا چکی تھی۔

واجدہ، نیلم کو گلے سے لگا کر کمرے سے نکل رہی تھیں۔ ''اچھا چندا صبح ملاقات ہوگی۔''

ابھی وہ کمرے سے باہر نہ نکل پائی تھیں کہ انہوں نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔

پلٹ کر دیکھا تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے زور سے چیخ ماری۔ واجدہ کی چیخ سن کر نیلم پریشان ہوگئی۔ اس نے وہ منظر نہ دیکھا تھا۔ اس لئے فوراً اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ امی نے کیوں چیخ ماری ہے۔ جب اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنا دلہن ہونا بھول ہوگئی اور گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی۔ اکبر دروازے کے نزدیک آچکا تھا۔ اس نے اپنی ساس کو بدحواس اور اپنی دلہن کو بے حال دیکھا تو اس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوب گیا۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''وہ......وہ'' واجدہ نے کمرے کے اندر اشارہ کیا۔ راشدہ نے آگے بڑھ کر نیلم کو سنبھالا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اکبر نے جلدی سے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے دیکھا کہ کالا بلا ٹرے میں گرا ہوا دودھ اپنی سرخ سرخ زبان سے لپ لپ پی رہا ہے۔ اس نے دودھ سے بھرا گلاس ٹرے میں اُلٹا دیا تھا۔

یہ دیکھ کر اکبر کو بڑا غصہ آیا۔ اس کالے بلے نے اس کی آنکھوں سے میٹھے میٹھے خواب چھین لئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کالے بلے کی دُم پکڑ کر پہلے اسے خوب چکر دے اور پھر زور سے گھما کر دیوار میں دے مارے۔

وہ کالا بلا اکبر کے غصے سے بے نیاز بڑے آرام سے دودھ پی رہا تھا اور جب تک اس نے دودھ کا ایک ایک قطرہ ٹرے میں سے نہیں چاٹ لیا اس نے سر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اکبر نے آگے بڑھنا چاہا مگر جیسے اس کے قدم جم گئے تھے۔ اس وقت خوف نہ تھا، شدید غصہ تھا۔ وہ اس بلے کی ڈھٹائی پر حیران تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اکبر کمرے میں آگیا ہے اور چار قدم کے فاصلے پر ہے اس کی دم پکڑ کر گھما سکتا ہے۔ مگر اس کالے بلے کو ذرا پروا نہ تھی۔ وہ لپ لپ دودھ پیئے جا رہا تھا

اور اکبر اسے مارنے کی شدید خواہش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ اس کے پاؤں جیسے فرش سے ناپلٹ گئے تھے۔ بس یہ کچھ لمحوں کی بات تھی، دودھ پینے کے بعد اس کالے بلے نے سائیڈ ٹیبل سے پھلانگ لگائی۔ اب وہ اکبر کے مقابل تھا اور اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

اکبر نے ٹھوکر مارنے کے لئے اپنی ٹانگ اُٹھائی اور اسے ٹھوکر مارنے ہی والا تھا کہ وہ بلا بجلی کی تیزی سے اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل گیا۔ اس بلے کی رگڑ سے اکبر غیر متوازن ہوگیا۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا نہیں تو زمین پر گر پڑتا۔ اس کالے بلے کی رگڑ بڑی آہنی تھی۔ اکبر کو ایسا لگا جیسے کوئی لوہے کی چیز اس کی ٹانگوں سے رگڑتی ہوئی نکل گئی ہو۔

کالے بلے کے جانے کے بعد دلہن کو پھر سے بیڈ پر بٹھایا گیا۔ ٹرے صاف کر کے ایک گلاس دودھ اور رکھا گیا۔ دلہن جب سج بن کر بیٹھ گئی تو سب خواتین کمرے سے نکل آئیں۔

تب راشدہ نے اپنے بھائی اکبر سے کہا۔ ''جائیے صاحب، دلہن آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''

''شکریہ، جناب آپ کا بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر اکبر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ نیلم سر جھکائے بیڈ کے درمیان بیر بہوٹی بنی بیٹھی تھی۔

اکبر نے پلٹ کر دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور مسکراتا ہوا دلہن کی طرف پلٹا۔

اب جو بیڈ پر نظر پڑی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔

وہ ہوش کیوں نہ گنواتا۔ بات ہی ایسی تھی۔

اس کے سامنے ایک دلہن نہیں، دو دلہنیں بیٹھی تھیں اور یہ دونوں دلہنیں نیلم ہرگز نہ تھیں، کوئی خبیث عورتیں تھیں ایسی صورتیں کہ آدمی دیکھے تو گر کر بے ہوش ہو جائے۔

وہ کالی بھجنگ عورتیں تھیں، دونوں کی صورتیں ایک جیسی تھیں۔ ایک فٹ لمبی زبان، ایک دم سرخ جیسے ابھی کسی کا خون چاٹا ہو۔ لال زبانیں کتوں کی طرح اندر باہر ہو رہی تھیں اور زبانوں کے دائیں بائیں سے لمبے لمبے دو دانت جھانک رہے تھے۔ ان عورتوں کی ناک نہیں تھی، ناکوں کی جگہ دو گہرے سوراخ تھے۔ ان کی آنکھوں میں سے شعلے خارج ہو رہے تھے۔ اس قدر بڑی اور ڈراؤنی آنکھیں تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہ جائے، آدمی دیکھے تو غش کھائے۔

دونوں عورتیں دلہن کے روپ میں تھیں۔ سرخ جوڑا اور زیور سے آراستہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کے قریب بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر گھونگھٹ نہ تھے۔ اکبر کو دیکھ کر انہوں نے بڑی تیزی سے اپنی زبانیں جلدی جلدی اندر باہر کیں اور اس طرح غراتی ہوئی اُٹھیں جیسے اسے پکڑ کر کچا چبا جائیں گی۔ اکبر گھبرا کر دروازے کی طرف لپکا۔ پلک جھپکتے میں اس نے چٹخنی کھولی اور دروازے سے [illegible]

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہوگیا تھا۔خواتین ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ اکبر پہنچ گیا۔اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پکارا۔''امی۔''

صابرہ نے اکبر کی آواز سنی تو وہ تڑپ کر پلٹیں۔انہوں نے دیکھا کہ ان کا بیٹا اس کڑاکے کی میں پسینے میں نہایا ہوا ہے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

''ارے میرا بیٹا۔'' صابرہ نے اکبر کو اپنے گلے سے لگالیا۔''کیا ہوا میرے بیٹے کو۔''

اکبر ابھی کچھ کہنے کے قابل نہ تھا۔وہ زبان سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا تو اس کی زبان ا کر رہ جاتی۔کسی نے اسے ایک گلاس پانی دیا جسے اکبر اس طرح پی گیا جیسے برسوں سے پیاسا ہو۔ پانی پی کر جب ذرا اس کی کچھ حالت سدھری تو اس نے صابرہ سے کہا۔''امی، وہاں نیلم ہے۔دو چڑیلیں بیٹھی ہیں۔''

''اکبر، تجھے کیا ہوگیا ہے، کیا بکواس کر رہا ہے۔'' صابرہ نے اکبر کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے

''امی، میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں نیلم نہیں ہے، وہاں دو خوفناک عورتیں بیٹھی ہیں، ان کی زبانیں تھیں اور کتوں کی طرح ہل رہی تھیں۔''

یہ بات سن کر وہاں جتنی عورتیں تھی سب کی سٹی گم ہوگئی۔کسی میں اتنی ہمت نہ رہی کہ دلہن کمرے میں جا کر دیکھیں۔

صابرہ ایک نڈر خاتون تھیں۔انہیں جن بھوتوں پر یقین بھی نہ تھا لیکن اس وقت اکبر کی حالت کر وہ بھی ہمت نہ کر پائیں کہ تنہا اندر جا کر دیکھیں۔انہوں نے نیلم کی امی سے مخاطب ہو کر کہا۔ واجدہ میرے ساتھ نیلم کے کمرے میں چلو۔''

''ہائے نہیں صابرہ مجھ سے اکیلے نہیں جایا جائے گا۔'' واجدہ نے سہم کر کہا۔''اِدھر سے کسی مرد کو بلا

واجدہ کی یہ تجویز صابرہ کے دل کو لگی۔اندر سے وہ بھی یہ چاہ رہی تھی کہ کوئی مردان کے چلے۔انہوں نے فوراً راشدہ کو اشارہ کیا۔''راشدہ جاؤ، ذرا فرقان ماموں کو بلا لاؤ۔''

راشدہ پہلے ہی ڈری ہوئی تھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ڈرائنگ روم تک تنہا چلی جائے پریشان ہو کر بولی۔''امی میں۔''

''اری، تُو اتنی ڈرپوک کیوں ہے۔تُو سامنے کے کمرے سے ماموں فرقان کو بلا کر نہیں لا سکی صابرہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔پھر انہوں نے اپنی بھتیجی شکیلہ کو مخاطب کر کے کہا۔''شکیلہ تم اس ساتھ چلی جاؤ۔''

راشدہ اور شکیلہ دونوں مل کر کمرے سے نکلیں۔مرد جس کمرے میں ٹھہرائے گئے تھے۔و پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔یہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے راہداری سے گزریں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن اندر اندھیرا تھا۔ان دونوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اندھیرے میں کمرے میں اندر جائیں۔اندر جا کر لائٹ جلائیں اور پھر یہ دیکھیں کہ فرقان ماموں کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ کمرے سے فرنیچر نکال کر فرش کر دیا گیا تھا اور فرش پر بستر بچھا دیئے گئے تے۔سب لوگ کمبل اور لحاف اوڑھے لمبے لمبے پڑے تھے۔اندھیرے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے برابر قبریں بنی ہوں۔

''شکیلہ اندر تو اندھیرا ہے، اندر کیسے جائیں۔'' راشدہ نے کہا۔

''تجھے معلوم ہے لائٹ کا سوئچ کہاں ہے؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔'' راشدہ نے جواب دیا۔

فرقان ماموں دروازے کے نزدیک ہی سوئے ہوئے تھے۔ابھی وہ پوری طرح سو نہ پائے تھے کہ ان لڑکیوں کی آوازیں سن کر ان کی آنکھ کھل گئی۔انہوں نے اپنے چہرے سے لحاف ہٹایا تو دیکھا دروازے میں راشدہ اور شکیلہ کھڑی ہیں۔وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''بھئی کیا ہوا؟'' ماموں فرقان کی اچانک آواز سن کر لڑکیاں اور ڈر گئیں۔وہ ایک دوسرے کے قریب ہوگئیں۔

''راشدہ خیریت تو ہے۔'' فرقان ماموں لحاف سے نکلتے ہوئے بولے۔

''فرقان ماموں جلدی چلئے، آپ کو امی نے بلایا ہے۔'' راشدہ نے جلدی سے کہا۔

''اچھا چلو، کہاں ہیں، تمہاری امی۔'' فرقان ماموں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان جب راشدہ اور شکیلہ کے ساتھ خواتین کے کمرے میں پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ساری خواتین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔پھر سب سے عجیب بات تھی کہ دولہا میاں بھی ان خواتین کے درمیان موجود تھے جبکہ انہیں یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔اکبر بھی احمق بنا ہوا تھا۔ماموں فرقان کو دیکھ کر سب کے چہروں پر ایک اطمینان کی لہر اُبھری۔

''اکبر کیا ہوا؟'' ماموں فرقان نے براہِ راست اکبر سے سوال کیا۔

''ماموں اسے ہم لوگ ابھی دلہن کے کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے، مگر یہ وہاں سے ڈر کر آ گیا ہے۔'' جواب صابرہ نے دیا۔

''وہ کیوں؟'' ماموں فرقان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ماموں وہاں نیلم نہیں ہے۔'' اس مرتبہ اکبر بولا، ہمت کر کے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔'' ماموں فرقان پریشان ہو گئے۔

''ہاں، ماموں میں سچ کہہ رہا ہوں، وہاں نیلم نہیں ہے، وہاں دو چڑیلیں بیٹھی ہیں۔'' اکبر نے بتایا۔

"یہ کیا فضول بات کر رہے ہو۔" ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ۔"

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اُٹھایا اور کمرے کی طرف بڑھے۔

"صابرہ تم بھی آؤ۔" ماموں فرقان نے صابرہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اکبر بھاگا ہی اس بُری طرح سے تھا۔ فرقان ماموں اکبر کو پیچھے کیا اور خود آگے بڑھے۔ کھلے دروازے سے انہوں نے جو منظر دیکھا اس میں کوئی خوف نہیں تھی، نیلم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا سر جھکا ہوا نہ تھا، اُٹھا ہوا تھا اور اس کی نظ دروازے پر تھیں۔

دروازے پر فرقان ماموں کو دیکھ کر نیلم نے سر جھکا لیا اور سمٹ سکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اکبر یہاں تو کچھ نہیں۔" فرقان ماموں نے پلٹ کر اکبر سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طر کھینچا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے، پیچھے صابرہ تھیں۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر سے پہلے نیلم کو دیکھا، بیڈ پر بیٹھ کر صابرہ نے نیلم کا ذرا سا گھونگھٹ ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ گھونگھٹ اندر نیلم ہی تھی۔ وہ صابرہ کو دیکھ کر مسکرائی۔ صابرہ نے محسوس کیا کہ نیلم کی آنکھوں میں کچھ فکرمندی مو ہے۔ صابرہ نے نیلم کو قریب کر کے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور پیار سے بولی۔ "میری بچی۔"

صابرہ کو نیلم سے باتیں کرتے دیکھ کر فرقان ماموں، اکبر کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے نکل تا کہ وہ اطمینان سے باتیں کر سکیں۔

"خالہ انہیں کیا ہوا تھا؟" نیلم نے دونوں کے باہر نکلتے ہی صابرہ سے سوال کیا۔

صابرہ، نیلم کا سوال سن کر عجیب اُلجھن میں پڑ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔

"یہ کمرے میں آ کر کیوں بھاگ گئے تھے؟" نیلم نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

اس سوال کا جواب صابرہ کے پاس تھا لیکن وہ خاموش رہیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ نیلم کو حقیقت کر کسی دہشت میں مبتلا کر دیں۔ اگر دونوں ہی دہشت زدہ ہو گئے تو پھر اس سنہری رات کا ستیاناس ہو جائے گا۔

"اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔" صابرہ نے اصل بات کو گول کر دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" نیلم نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ صابرہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نیلم اس سلسلے میں مزید سوالات نہیں کیے۔ نیلم بہت کم گو مشہور تھی اس وقت اس کی کم گوئی اس کے حق بہتر ثابت ہوئی تھی۔

ماموں فرقان اور اکبر کے نکلنے کے بعد کمرے میں خواتین کی یلغار ہو گئی۔ واجدہ کچھ پوچھنا

رہی تھیں لیکن صابرہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش کر دیا۔ سب خواتین سمجھ گئیں کہ یہاں نیلم کے سامنے کوئی بات نہیں کرنی۔

تھوڑی دیر کے بعد دلہن کا کمرہ خالی کر دیا گیا۔

اکبر کو ایک مرتبہ پھر کمرے میں جانے کا "ویزا" مل گیا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ چند لمحے وہ دروازے پر کھڑا رہا۔ نیلم اس کی آنکھوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اپنی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا، ابھی وہ دروازے کی چٹخنی چڑھا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں "میاؤں" کی آواز آئی۔

اکبر چٹخنی چڑھاتے چڑھاتے رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اسے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ کمرے میں زیادہ سامان نہ تھا۔ بیڈ کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبلیں تھیں، ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی، باقی کوئی ایسا سامان نہ تھا جس کے پیچھے وہ غائب ہو سکتا۔

اکبر نے پورا کمرہ کھنگال ڈالا۔ مگر اسے وہ کہیں نظر نہ آیا پھر "میاؤں" کی آواز کہاں سے آئی تھی۔

اس نے سوچا، یہ اس کا وہم ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے پھر دروازہ بولٹ کرنا چاہا۔

ابھی اس کا ہاتھ چٹخنی پر ہی تھا کہ اسے پھر "میاؤں" کی آواز سنائی دی۔

اس مرتبہ اسے یہ آواز اپنے قدموں کے نیچے سے سنائی دی تھی۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے چاروں طرف تیزی سے گھوم کر دیکھا اسے وہ کہیں نظر نہ آیا۔

نیلم اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا شوہر اس کی طرف آنے کے بجائے کونے بچالوں میں کیا دیکھتا پھر رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے مگر پھر شرم آ گئی۔ وہ دلہن تھی وہ بات چیت میں پہلے کیسے کرتی؟

ادھر اکبر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اکبر، نیلم کے بیڈ کے نزدیک آیا۔ اس نے ذرا سا جھک کر نیلم سے پوچھا۔ "نیلم کیا تم نے کوئی آواز سنی ہے۔"

یہ وہ پہلا مکالمہ تھا جو اکبر کو اپنی نئی نویلی دلہن سے بولنا پڑا۔ اس رات کے اس نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ جانے کیا کیا سوچا تھا کہ یوں کمرے میں داخل ہوگا، یوں اس کے سامنے کھڑا ہوگا، سلام کرے گا پھر بیڈ پر بیٹھے گا، دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اُٹھائے گا۔ کن لفظوں میں اس کے حسن کی تعریف کرے گا، وہ لفظ بھی اس نے سوچ لئے تھے۔ پھر منہ دکھائی میں سونے کی ایک خوبصورت انگوٹھی دے گا جس میں ایک ننھا سا ہیرا لگا ہوا ہوگا۔

لیکن سارے پلان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سہاگ رات، خواب رات بن گئی۔ ایسا بھیانک

خواب جس نے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی تھی۔

''کیسی آواز؟'' نیلم نے سر جھکا کے دھیرے سے پوچھا۔

اسی وقت ''میاؤں'' کی آواز آئی۔ اس مرتبہ یہ آواز بیڈ کے نیچے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ، یہ۔'' اکبر نے گھبرا کر کہا۔ ''کسی بلے کے بولنے کی آواز۔''

''مجھے تو کوئی آواز نہیں سنائی دی۔'' نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

''ارے، حیرت ہے۔'' اکبر نے کہا اور جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ پھر وہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس کمرے میں، میں مسلسل بلے کی آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے بلا کہیں نظ دکھائی دے رہا ہے۔ جانے وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اس بلے نے تو میری زندگی عذاب کر دی ہے۔

''اس سے پہلے جب آپ کمرے میں آئے تھے تو گھبرا کر بھاگ کیوں گئے تھے۔ اس وقت کی تھا آپ کو۔'' نیلم نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھا کر اکبر کو دیکھا۔ اس کی تیکھی نظروں میں بڑا شکوہ تھا۔

''وہ اس وقت۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نیلم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ صابرہ نے اکبر کو منع کرد کہ وہ دلہن کو کچھ نہ بتائے۔ خواہ مخواہ وہ ڈرے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیا کہے ا چہرہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس گھونگھٹ میں نیلم نہ تھی۔ وہ لمبی زبان والی خوفناک عورت تھی جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھ اکبر کے لئے اب اس کمرے میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا، وہ ایک مرتبہ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

اس مرتبہ وہ عورتوں کی طرف نہ گیا، ماموں فرقان کے پاس پہنچا۔ ماموں فرقان اپنے کمرے بجلی بجھا کر لحاف میں گھس چکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

''ماموں فرقان۔'' اکبر نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

اکبر کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ماموں فرقان نے لحاف ایک طرف پھینکا۔ جلدی سے اُٹھ کمرے کی لائٹ جلائی اور بولے۔ ''اب کیا ہوا؟''

''ماموں وہ کمرے میں موجود ہے۔ اس مرتبہ وہ اکیلی ہے اس کے علاوہ کمرے سے میا میاؤں کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔'' اکبر نے جلدی جلدی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لئے۔

کمرے میں پہنچ کر انہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ ہوئی۔ نیلم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کا دروازے کی طرف تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔

فرقان ماموں نے کمرے میں چاروں طرف چکر لگایا۔ سارے کونے کھدرے دیکھ ڈالے مگر ا وہاں بلے کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ فرقان ماموں نے سوالیہ نگاہوں سے اکبر کی طرف دی

اکبر ان کی سوالیہ نگاہوں کا کیا جواب دیتا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا، اس وقت کمرے میں نیلم موجود تھی اور کوئی نہ تھا۔

اکبر جب فرقان ماموں کو بلانے آیا تھا تو اس کی آواز خواتین کے کمرے تک پہنچ گئی تھی۔ صابرہ فوراً کمرے سے نکل آئی تھیں، پیچھے پیچھے واجدہ بھی تھیں۔

صابرہ کو دروازے پر دیکھ کر فرقان ماموں نے کہا۔ ''صابرہ، ذرا دلہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''پھر کچھ ہوا کیا؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' واجدہ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ''آؤ بیٹی باہر چلو۔''

دلہن کے باہر جانے کے بعد فرقان ماموں نے اکبر سے کہا۔ ''تم بھی جاؤ۔''

پھر اس کے جانے کے بعد فرقان ماموں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد جب وہ کمرے سے باہر آئے تو ان کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے صابرہ کو علیحدہ لے جا کر اس سے کہا۔ ''صابرہ وہ کمرہ ٹھیک نہیں۔''

''کیوں ماموں وہاں کیا ہے؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''وہ آسیب زدہ ہے۔'' فرقان ماموں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اس بات کو نہیں سمجھو گی اب میرا مشورہ یہ ہے کہ دولہا دلہن کو کوئی اور کمرے دے دو۔ وہ کمرہ اس گھر میں نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔''

''اچھا ماموں ٹھیک ہے۔'' خلاف توقع صابرہ نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا بیٹا اس وقت جس عذاب میں مبتلا تھا اسے دیکھ کر کچھ نہ ماننا اتنا آسان نہ تھا۔

پھر واجدہ نے تجویز پیش کی کہ نیلم کو اس کے اپنے کمرے میں پہنچائے دیتے ہیں۔ جلدی جلدی اس کے کمرے کو ٹھیک کیا گیا اور نیلم کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس وقت نیلم کے پاس راشدہ موجود تھی۔ وہ اسے بٹھا کر اس کا گھونگھٹ وغیرہ درست کر رہی تھی۔ نیلم نے راشدہ سے پوچھا۔ ''راشدہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھے تو معلوم نہیں۔'' راشدہ نے صاف جھوٹ بولا۔ ''امی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔''

''آؤ راشدہ باہر آ جاؤ۔'' صابرہ نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

''اچھا امی آئی۔'' راشدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھابھی صبح تک کے لئے خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔

راشدہ کے جانے کے بعد نیلم کی نظریں کھلے دروازے پر بچھ گئیں۔ پھر اسے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اکبر اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا اور گٹھری بن کر بیٹھ گئی۔

اکبر کھلے دروازے میں داخل ہوا، دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ اس مرتبہ اس نے فوراً پلٹ کر

دروازہ نہیں بند کیا۔ وہ دودھ کا جلا تھا اس لئے چھاچ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ کچھ لمحے کھڑے ہو کر وہ نیلم کو دیکھتا رہا۔ نیلم سر جھکائے گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

''نیلم۔'' اکبر نے دور ہی سے کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

اس کی آواز سن کر نیلم نے سر اُٹھایا اور آہستہ سے بولی۔ ''جی۔''

اس کے سر اُٹھانے پر اس کے چہرے کا خاصا حصہ اسے نظر آیا تھا۔ وہ نیلم ہی تھی۔ یہاں تک خیریت تھی۔ پھر اکبر نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ شاید کہیں وہ اُسے بیٹھا نظر آ جائے لیکن اس وقت وہ کمرے میں نہ تھا۔ اکبر نے احتیاطاً کمرے کے وہ کونے بچالے بھی دیکھ ڈالے جہاں اس کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہ کہیں نہ تھا۔ کمرے میں اس کی آواز بھی سنائی نہ دی تھی۔

اب اکبر کو کچھ اطمینان ہوا۔ ہوائیاں اُڑتے چہرے پر تھوڑی سی خوشی لہرائی۔ اب وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند کیا، دروازے کو لاک کرنے سے پہلے اس نے ایک نظر نیلم کو دیکھا وہ اپنی جگہ پر تھی تب اس نے دروازہ لاک کر دیا اور مسکراتا ہوا واپس نیلم کی طرف بڑھا۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج رہے تھے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ ٹھٹھرتی سرد رات اب آخری دَموں پر تھی۔

اکبر کو اس سنہری رات کے ضائع ہونے کا بڑا دکھ تھا۔ ایسی راتیں زندگی میں بار بار کہاں آتی ہیں۔ ایسی راتوں کے لڑکے خواب دیکھتے ہیں۔ شادی کی پہلی رات کس قدر سحر انگیز ہوتی ہے۔ یہ رات بڑے انتظار کے بعد آتی ہے۔ قدم قدم پر دل دھڑکتا ہے، ہر آہٹ پر دل اُچھلتا ہے، آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تب کان، آنکھیں بن جاتے ہیں، جو دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ گویا سارے حواس سماعت میں سمٹ آتے ہیں، ہر آواز پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، ہر آواز میں ان کی خوشبو آتی ہے۔

آج وہی رات تھی جو زندگی کے زنگ آلود تالوں کو کھولتی ہے، دل کی کلیاں کھلاتی ہے، محبت کی پھوار پڑتی ہے تو ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوتی ہیں۔

اکبر اور نیلم کے ساتھ قسمت نے عجیب کھیل کھیلا تھا۔ وہ ایک ہونے کے باوجود ایک نہ ہو سکے تھے۔ ایک بندھن میں بندھنے کے باوجود ان میں صدیوں کے فاصلے تھے۔ خوشی جیسے ان سے روٹھ گئی تھی۔ خوف و ہراس کا چاروں طرف راج تھا۔

گھر اور کمرہ تبدیل ہونے کی وجہ سے اکبر کو امید تھی کہ آئندہ اسے خوشی کے لمحات میسر آ جائیں گے، نیلم کو پانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ ابھی کچھ نہ بگڑا تھا، ابھی وقت تھا، یہ ٹھیک ہے کہ رات اپنے پَر سمیٹ رہی تھی۔ اُڑنے کے لئے پَر تول رہی تھی لیکن اسے اُڑتے اُڑتے بھی وقت لگتا۔ ابھی تین بجے تھے۔ ابھی سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں کچھ وقت تھا۔ اتنا وقت ضرور تھا کہ وہ اپنا حال دل

نیلم کو سنا سکے۔

بیڈ پر بیٹھ کر، اکبر نے نیلم کا پری چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھایا پھر اس کا گھونگھٹ پلٹ دیا۔ اچانک کمرے میں روشنی ہو گئی، نیلم کا چہرہ چاند کی طرح جگمگا اُٹھا۔

اکبر اس کے ملکوتی حسن میں کھو سا گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ماشاءاللہ۔''

نیلم نے شرما کر اپنے چاند چہرے کو بازو کے حصار میں چھپا لیا۔ نیلم کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

''نیلم تم اس قدر حسین کیوں ہو؟'' اکبر نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''یہ حسن تم نے کہاں سے پایا۔ تم اس دنیا کی لگتی ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوہ قاف سے آئی ہو۔ میرے لئے اُتری ہو، میری نیلم پری۔'' یہ کہہ کر اکبر نے اس کا ریشمیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''میں اتنی خوبصورت کہاں؟'' نیلم نے اپنے یاقوتی لب کھولے، اس کی آواز میں بڑا سحر تھا۔

''آپ کو شاید کسی نے بہکا دیا ہے۔''

''مجھے کسی نے نہیں بہکایا، مجھے تمہارے حُسن نے بہکا دیا ہے، میں نے تمہارے کتنے خواب دیکھے، تمہیں پانے کی کیسی کیسی آرزوئیں کی ہیں، تم کیا جانو۔ میں تمہیں پانے کی خوشی میں ہزاروں میل کا سفر کر کے آیا ہوں۔ اس پتھر وقت کو جو کسی طرح آگے کھسکتا ہی نہ تھا، کس طرح گزارہ ہے تم کیا جانو۔'' اکبر کے لہجے کی سچائی اس کے دل پر اثر کر رہی تھی۔

نیلم نے اپنی بھاری پلکوں کی جھالر کو دھیرے سے اُٹھایا اور اپنی ہیرے کی طرح جگمگاتی آنکھوں سے اکبر کو دیکھا۔ ''بہت پسند کرتے مجھے۔''

''پسند نہیں، عشق کہو عشق۔ میں مرتا ہوں تم پر۔ تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں۔'' اس کی وارفتگی برقرار تھی۔

''ابھی تو ابتداء ہے۔'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی تو مرنے جینے کی باتیں نہ کریں۔''

''یہ ابتداء ہے تو میں انتہا کر دوں گا، تمہیں اتنا چاہوں گا کہ لوگ نظیریں دیں گے۔''

پھر اکبر کو خیال آیا کہ اس نے ابھی تک نیلم کو منہ دکھائی تو دی نہیں۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ جگمگاتی انگوٹھی نکالی اور بولا۔ ''نیلم تمہارے حُسن کا خراج پیار کا پہلا تحفہ۔ اسے قبول کرو، لاؤ اپنا سیدھا ہاتھ۔ اسے میں تمہاری انگلی میں پہنا دوں۔''

نیلم نے جگمگاتی انگوٹھی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''لیجئے۔''

ابھی اکبر نے وہ جگمگاتی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی ہی تھی کہ وہ اکبر کے ہاتھ پر گری۔

وہ ایک موٹی سی، کالی سی خوفناک چھپکلی تھی۔ اکبر نے فوراً اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ نیلم چیخ مار کر کھڑی

ہوگئی اور پھر بیڈ سے زمین پر کود گئی۔ اُس کی انگلی سے انگوٹھی نکل کر دور جا گری۔

اکبر بھی فوراً اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بیڈ پر پڑی ہے۔ نیلم خوف سے لرزتی ہوئی اکبر کے پیچھے آگئی۔ اس نے اکبر کے دونوں بازو تھام لئے تھے۔

''اکبر اسے مارو۔'' وہ گھبرا کر چیخی۔

''کس چیز سے ماروں۔'' اکبر نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میرا سینڈل لے لو۔'' نیلم نے کہا۔

''اسے بیڈ پر مارا تو چادر خراب ہو جائے گی۔'' اکبر نے سینڈل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہو جانے دو، اسے فوراً مار دو، دیکھو یہ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' نیلم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

ابھی اکبر نے چھپکلی مارنے کو سینڈل اوپر اُٹھایا ہی تھا اور اسے پھینک کر مارنے والا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اکبر یہ کیا؟'' نیلم نے اس کے بازو سے جھولتے ہوئے کہا۔ وہ چھپکلی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اکبر نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بغیر مارے ہی زخمی ہوگئی تھی۔ اس کے اردگرد سیاہی مائل سیال پھیل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھپکلی گھل گئی اور چادر پر ایک بڑا سا دھبہ رہ گیا۔

نیلم سے یہ سب نہ دیکھا گیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اپنے ہوش گنوا بیٹھی اور بے ہوش ہو کر قالین پر گر گئی۔

اکبر کیلئے یہ لمحے بڑا عذاب ناک تھے۔ ایک طرف اس نے چھپکلی کو برف کی طرح پگھلتے دیکھا تھا۔ اس منظر کی خوفناکی ابھی اس کے جسم سے نہ نکلی تھی کہ نیلم بے ہوش ہوگئی۔

وہ چکرا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔

اکبر قالین پر بیٹھ گیا، اس نے نیلم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے ہلایا جلایا۔

''نیلم، نیلم، آنکھیں کھولو۔'' اس نے کئی مرتبہ کہا مگر نیلم نے آنکھیں نہ کھولیں اس پر گہری بے ہوشی طاری تھی۔

اکبر کی عجیب حالت تھی، کبھی وہ سفید چادر پر پڑے سیاہی مائل دھبے کو دیکھتا، کبھی نیلم کے چاند چہرے پر نظر ڈالتا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

جو خواب اس کی آنکھوں میں جاگے تھے، وہ اب سسک رہے تھے، ایک ایک کر کے مرتے جا رہے تھے۔

اب سے کچھ دیر پہلے اس کمرے کا کس قدر رومانی ماحول تھا، اکبر اور نیلم کس قدر خوش تھے۔ وہ ان خواب بھرے لمحوں کے ابدی ہونے کی تمنا کر رہے تھے کہ خوشیوں کے کسی دشمن نے ایک لمحے میں ان

ے سب کچھ چھین لیا۔

اب اس کمرے میں گنگناتی فضا کے بجائے خوف رہ گیا تھا۔ لرزتے ہاتھ رہ گئے تھے اور شکستہ اعصاب رہ گئے تھے۔ ایک عذاب تھا جو اکبر کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کوئی مکڑی کا جالا تھا س میں اکبر کے حواسوں کو جکڑا جا رہا تھا۔

وہ کون تھا ایسا کیوں کر رہا تھا؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

اب اکبر کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اُٹھے اور اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کر سو جائے، اس کا مقدر سو یا تھا۔ وہ کس طرح جاگتا۔ وہ اُٹھا شکستہ قدموں سے چل کر اس نے دروازہ کھولا۔ یہ دروازہ تو اس نے کھولنا ہی تھا۔ آخر وہ کب تک اس کمرے میں بند رہتا لیکن یہ دروازہ وہ اس وقت کھولتا جب اس ے دل کا دروازہ کھل جاتا، کلیاں چٹکتیں، گلوں کی خوشبو فضا میں مہکتی، سورج کی کرنیں ان مدہوش تے لوگوں کے چہرے گدگداتیں، تب وہ مسکرا کر اُٹھتا اور دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا، لیکن آہ ایسا ہو سکا۔

وہ من کی من میں لئے، اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتا باہر نکلا۔ باہر نکل کر اس نے ایک بند دروازہ کھٹکھٹایا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کمرے میں کون سو رہا ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ کوئی سو ضرور رہا ہے۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

دروازے پر واجدہ نمودار ہوئیں، ان کے پیچھے صابرہ تھیں۔ اکبر کو دروازے پر دیکھا تو دونوں کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے قیاس کر لیا کہ پھر کچھ ہو گیا ہے۔

''کیا ہوا؟'' دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''وہ نیلم بے ہوش ہوگئی ہے۔'' اکبر نے بڑی آزردگی سے کہا۔

''لیکن کیسے؟ کیا ہوا اسے؟'' واجدہ نے پوچھا۔

''چھت سے ایک چھپکلی میرے ہاتھ پر گری تھی، جانے وہ کیسی چھپکلی تھی۔ میرے ہاتھ سے اُچھل کر بیڈ پر گئی اور ابھی میں نے اسے مارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پانی بن کر بہہ گئی۔ وہ چند لمحوں میں گھل گئی۔ چادر پر ایک سیاہی مائل دھبہ رہ گیا۔ نیلم اس منظر کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئی۔'' اکبر نے جلدی جلدی ساری روداد سنا دی۔

''ہائے میرے اللہ۔'' واجدہ نے اپنا دل تھام لیا۔ ''ارے فیاض کو اُٹھاؤ۔''

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' صابرہ نے فکرمند ہو کر کہا۔ ''جاؤ ذرا اپنے باپ کو بلاؤ۔''

پھر تھوڑی دیر میں یہاں سے وہاں تک سب اُٹھ گئے۔ نیلم کے والد بھی اُٹھ گئے۔ فرقان ماموں کو

بھی بلا لیا گیا۔ کچھ خواتین بھی اُٹھ گئیں۔ بابر علی گہری نیند سو رہے تھے۔ انہیں نہ اُٹھایا گیا۔

نیلم کے منہ پر ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے دیئے گئے، اسے ہلایا جلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اپنی ماں کی گود میں پایا۔ پھر اِدھر اُدھر نظر گھمائیں تو کمرے میں بہت سے لوگوں کو پایا۔ وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''لیٹی رہو بیٹی۔'' واجدہ نے پھر اسے اپنی گود میں لٹانا چاہا۔

''نہیں امی میں ٹھیک ہوں۔''

نیلم تو ہوش میں آ گئی۔ ٹھیک ہو گئی پھر وہ چھپکلی موضوع بحث بن گئی۔ چھپکلی کا معمہ حل نہ ہو سکا۔ کس قسم کی چھپکلی تھی، وہ کہاں سے آئی تھی؟ کس طرح اس کے ہاتھ پر گری، پھر چند لمحوں میں کیَ سیال مادے میں تبدیل ہو گئی۔ سب سوچتے رہے۔ اپنی اپنی کہتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اس گفتگو کے دوران وہ باتیں بھی نیلم کے سامنے آ گئیں جو اب تک اس سے چھپی ہوئی تھیں، جوا لئے اسے اب تک نہیں بتائی گئی تھیں کہ وہ ڈر جائے گی، دہشت زدہ ہو جائے گی۔

ٹرین سے اب تک کے واقعات جب نیلم کے سامنے آئے تو وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی۔ وہ اپنی ما کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''امی مجھے اکیلا نہ چھوڑیں میرے ساتھ رہیں۔''

اذان کب کی ہو چکی تھی۔ ہر سُو روشنی پھیلنے والی تھی۔ اب اسے چھوڑنے کا کیا جواز تھا بھلا۔ واج کے کچھ کہنے سے پہلے صابرہ نے کہا۔ ''نہیں بیٹی تم پریشان نہ ہو میں رہوں گی تمہارے پاس۔''

''یہ اکبر کہاں ہیں؟'' واجدہ کو اپنے داماد کی فکر ہوئی۔

''وہ ماموں فرقان کے بستر میں گھسے ہوئے ہیں۔'' راشدہ نے بتایا۔

''ارے اِدھر فیاض کے کمرے میں لیٹ جاتے۔'' واجدہ نے کہا۔ ''جاؤ بلا لاؤ۔''

راشدہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ تنہا اس مکان سے اُس مکان میں چلی جاتی۔ وہ بولی۔ ''خالہ مَی اکیلی جاؤں، ویسے وہ اب تک سو چکے ہوں گے، وہ نیند کے بہت پکے ہیں۔''

تب واجدہ نے فیاض حسین کو اُدھر بھیجا، وہ دوسرے مکان میں پہنچے تو اکبر واقعی ماموں فرقان ـَ بستر میں گھسا سو رہا تھا۔ ماموں فرقان نماز پڑھنے کے بعد تسبیح پڑھ رہے تھے۔

فیاض نے بے خبر سوتے ہوئے اپنے داماد کو اُٹھانا مناسب خیال نہ کیا۔ وہ خاموشی سے واپس آ گئے۔

اب نیلم کو بھی سخت قسم کی نیند آ رہی تھی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں لیٹ گئی اور چند منٹوں میں ہی نیندَ آغوش میں چلی گئی۔ صابرہ اور واجدہ کو بھی پریشان ہوتے ہوئے پوری رات ہو گئی تھی۔ انَ آنکھوں میں بھی نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی اسی کمرے میں نیلم کے ساتھ ہی لیٹ گئیں۔

نیلم قالین پر لیٹی تھی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لئے کمبل اوڑھ لیا تھا جبکہ صابرہ بیڈ پر لیٹ گ

تھیں اور واجدہ، نیلم کے برابر ہی سو گئی تھیں۔

دروازہ بند نہ تھا تب وہ کھلے دروازے سے دبے پاؤں اندر آیا اور نیلم کے کمبل میں گھس گیا۔ نیلم بہت گہری نیند سو چکی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خوفناک کالا بلا اس کے خوبصورت مہندی لگے پیروں سے لپٹ کر سونے کی کوشش میں ہے۔

فرقان ماموں نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر سیر کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنے کانوں سے مفلر اچھی طرح لپیٹا، کوٹ پہنا پھر بھی سردی محسوس ہوئی تو ایک ہلکا سا کمبل اوڑھ لیا اور مکان سے باہر نکل گئے۔

باہر کہر چھائی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ ابھی تک جل رہی تھیں۔ وہ اپنے منہ سے بھاپ اُڑاتے تیز تیز سڑک پر چلنے لگے۔ سڑک تقریباً سنسان تھی۔ اِکا دُکا گاڑی کبھی گزر جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ بھاری قدموں کی آواز آ رہی تھی اور یہ بھاری قدم فرقان ماموں سے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔

فرقان ماموں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ گہری دُھند میں انہیں بس ایک ہیولا سا نظر آیا تھا۔ شاید وہ کسی گہرے رنگ کے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اب وہ ان کے بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ دو چار قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر یہ فاصلہ بھی مٹ گیا اور وہ ان کے برابر آ گیا۔

فرقان ماموں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ لیکن وہ نظر نہ آ سکا کیونکہ اس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ اب وہ ان کے برابر چل رہا تھا۔ فرقان ماموں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کر لی تا کہ وہ آگے نکل جائے لیکن وہ آگے نہ نکلا۔ اس نے بھی اپنی رفتار کم کر لی وہ دس پندرہ قدم خاموشی سے ان کے ساتھ چلا۔ دو تین بار اس نے مڑ کر فرقان ماموں کو دیکھا جیسے وہ ان کی صورت پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اچانک بولا۔ ''آپ فیاض حسین کے گھر سے نکلے ہیں۔''

''میں فیاض کے گھر سے نہیں بلکہ ان کے برابر والے مکان سے نکلا ہوں۔'' فرقان ماموں نے جواب دیا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس شخص نے لاپروائی سے کہا۔ ''بارات میں آئے ہوئے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' فرقان ماموں بولے۔

''آپ لڑکے کے کون ہیں؟'' سوال پوچھا گیا۔

''میں لڑکے کا رشتے میں دادا لگتا ہوں لیکن وہ مجھے کہتا ماموں ہے...... اور وہ کیا مجھے تو سب ہی ماموں کہتے ہیں...... آپ بھی چاہیں تو ماموں کہہ لیں...... ویسے میں اکبر کے باپ بابر کا سگا ماموں

ہوں۔'' ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔''میں نے تو اپنا تعارف کروا دیا، اب آ
فرمائیں آپ کون ہیں؟''

''میں فیاض کا پڑوسی ہوں میرا نام دلدار بٹ ہے جس مکان میں بارات ٹھہری ہے میں اس مکا
کے سامنے رہتا ہوں۔ آپ کو گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بھی آپ کے پیچھے ہولیا...... آپ کو شاید میر
طرح صبح سیر کرنے کی عادت ہے۔''

''جی ہاں، نماز پڑھ کر میں ایک دو میل پیدل چلنے کا عادی ہوں۔'' فرقان ماموں نے سادگی سے کہا۔

''آپ کراچی سے آئے ہیں۔'' دلدار نے پھر سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' فرقان ماموں نے جواب دیا۔

اس نے اپنا کمبل اب تھوڑا سا سر کے پیچھے کرلیا تھا وہ گول چہرے کا ایک صحت مند شخص تھا۔ چہر۔
پر بھاری مونچھیں تھیں۔ ان مونچھوں نے اس کے چہرے کو بارعب بنا دیا تھا۔ وہ ماموں فرقان ۔
ایسے ہی اِدھر اُدھر کے سوالات کئے جا رہا تھا۔ ماموں فرقان سمجھ رہے تھے کہ وہ ان سے ضرور کوئی خا
بات کرنا چاہتا ہے لیکن شاید اسے اپنی بات کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا پھر وہ ا
تذبذب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی بات کہے یا نہ کہے۔

کچھ دیر وہ اسی طرح کے بے ضرر سے سوالات کرتا رہا۔ پھر بات کرتے کرتے اچانک خامو
ہوگیا چند لمحے خاموش رہا پھر اچانک بولا۔''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''

''فرمائیں۔'' ماموں فرقان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' دلدار بٹ نے براہِ راست سوال کیا۔

''کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟'' فرقان ماموں فوراً محتاط ہوگئے۔

''میں نیلم کی بات کر رہا ہوں جناب۔'' دلدار نے سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

''دیکھئے دلدار صاحب! اگر آپ اس لڑکی کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہتے ہیں تو براہِ کرم ا
کچھ نہ بتایئے...... اس لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ وہ اب جیسی بھی ہے ہماری بہو ہے، ہماری عز
ہے۔'' فرقان ماموں نے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔

فرقان ماموں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے موقعوں پر پاس پڑوس کے لوگ کیا گل
کھلایا کرتے ہیں۔ گھر کا بیدی ہمیشہ لنکا ڈھانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات پڑوسی بھی اسی قسم
کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''جناب آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کی بہو پر کسی قسم کی کیچڑ اُچھالنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے غا
سمجھے ہیں میں تو صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔'' دلدار نے بات صاف کرنے

لی۔
اچھا کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' بالآخر ماموں فرقان سننے کے لئے تیار ہوگئے۔
آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ نیلم فیاض حسین کی اکلوتی اولاد ہے۔'' دلدار نے کہنا شروع کیا۔
جی ہاں معلوم ہے۔'' فرقان ماموں نے فوراً جواب دیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاہتا

لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ......''
دار بٹ نے فرقان ماموں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے جو بات کہی وہ واقعی ان کی
میں اضافہ ثابت ہوئی۔ فرقان ماموں وہ بات سن کر حیران رہ گئے۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے
نہیں ہوسکتا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔
وہ شخص جس کا نام دلدار بٹ تھا، ان کی معلومات میں اضافہ کرکے آگے بڑھ گیا۔ فرقان
ں آگے نکل آئے تھے۔ اب کچھ دھند چھٹ گئی تھی اور زرد زرد سی مریل دھوپ نکل آئی تھی۔
اموں نے واپسی کے لئے قدم اُٹھالئے۔
وہ واپس گھر میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ جاگ گئے تھے اور کچھ لوگ ابھی پڑے سوتے
اکبر بھی بے خبر سو رہا تھا۔ فرقان ماموں ایک خالی بستر دیکھ کر اس میں گھس گئے۔
ابھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جسم میں ہلکی سی کپکپی تھی۔
نے اچھی طرح اپنے گرد لحاف لپیٹ لیا اور اس شخص کی باتوں پر غور کرنے لگے۔
سب سچ تھا تو بڑی حیرت کی بات تھی، سب سے زیادہ حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ یہ بات
لے صابرہ سے کیوں چھپائی تھی۔ ایک طرح سے یہ بات اہم بھی تھی اور غیر اہم بھی...... بات
چھپانے کی تھی اور جہاں اتنا قریبی رشتہ ہو، وہاں کچھ چھپانا ایک طرح سے جرم کے
تھا۔
رقان ماموں نے سوچا کہ ابھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ بات وہ کراچی پہنچ کر کریں گے
ں نے فوراً اس راز کو کھول دیا تو ہوسکتا ہے کہ بدمزگی ہوجائے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شادی کا
ال کا گھر کسی اذیت سے دوچار ہوجائے۔
تک جو کچھ ہوچکا تھا وہ کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کتنی
ں کا ڈکار ہونا پڑا تھا۔ اکبر کیلئے یہ کتنی بدنصیبی کی بات تھی کہ اس کا نصیبہ کھلنے کے باوجود اس کے
دا آیا تھا۔ بالآخر وہ بے چارہ تھک ہار کر سو گیا تھا۔
ا ۵ ۔ پہر کو بارات کی واپسی تھی۔ فرقان ماموں دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ یہ سفر بخیر و

عافیت تمام ہو جائے۔

اب خاصے باراتی جاگ گئے تھے۔ بابر علی بھی اُٹھ چکے تھے۔ انہوں نے بستر سے نکل سے پہلے فرقان ماموں کے بستر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک سو رہے تھے۔ انہیں حیرت ماموں فرقان جو صبح اُٹھنے کے عادی تھے۔ وہ خود اُٹھ کر دوسروں کو اُٹھانے کے عادی تھے اب تک سوئے پڑے تھے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ ماموں فرقان پر سبقت لے جانے کا...... انہوں نے آ کر ان کے منہ سے لحاف ہٹایا۔ لحاف ہٹایا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ ماموں فرقان کے بستر کا اپنا بیٹا اکبر سو رہا تھا۔ ارے، یہ کیسے یہاں سو رہا ہے اسے تو "وہاں" ہونا چاہئے تھا۔ انہو سوچا یہ یہاں سو رہا ہے تو ماموں فرقان کہاں گئے۔

"بھئی یہ ماموں فرقان کہاں گئے؟" بابر علی نے کسی سے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ماموں فرقان نے بابر علی کی آواز سن کر فوراً اپنے منہ سے لحاف ہٹایا۔

"ارے، آپ وہاں کہاں لیٹے ہیں؟" بابر علی نے ان کے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بھئی کیا کروں، تمہارے بیٹے نے میرے بستر پر قبضہ کر رکھا ہے۔" ماموں فرقا ہوئے بولے۔

"یہ یہاں کیوں ہے؟" بابر علی نے پوچھا۔

"تو پھر یہ کیا کرے بے چارہ، کہاں جائے۔" ماموں فرقان نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔" بابر علی حیرت سے بولے۔

"تم سمجھو گے بھی نہیں۔ رات بھر خراٹے جو بھرتے رہے ہو۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہو "اِدھر آ جاؤ میرے پاس، تمہیں رات کی ساری کہانی سناتا ہوں۔"

رات کو اس قدر ہنگامہ ہوا تھا کہ سب ہی جاگ گئے تھے۔ ایک نہیں جاگے تھے تو بابر علی۔ گہری نیند سونے کے عادی تھے۔ سونے کے بعد ان کے سر پر دھماکے بھی ہوتے رہیں تو وہ اس نہیں کرتے تھے۔ ان کی عجیب عادت تھی۔ سونے کے بعد اگر انہیں کچی نیند میں جگا دیا جائے کے سر میں فوراً شدید قسم کا درد ہو جاتا تھا۔ رات کو جب نیلم بے ہوش ہوئی تھی تو صابرہ نے چاہا بابر علی اُٹھا لیا جائے لیکن ماموں فرقان کیونکہ بابر کی عادت سے واقف تھے۔ اس لئے انہو اسے اُٹھانے سے منع کر دیا تھا۔

جب رات بھر کی روداد ماموں فرقان سے بابر علی نے سنی تو وہ فکر مند ہو گئے لیکن حالا واقعات ایسے تھے کہ اس میں کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

اور جو کر سکتا تھا وہ ابھی تک نیلم کے قدموں میں پڑا تھا۔ نیلم گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ پوری را

ل ہوئی، پھر پے در پے واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے نیند کی گولی ل گئی تا کہ اس کے ذہن کو کچھ سکون مل جائے۔ ابھی اسے ایک لمبا سفر بھی کرنا تھا۔

نیلم گہری نیند سو رہی تھی اور وہ اس کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔ نیلم کو کچھ ہوش نہ تھا اگر اسے یہ ام ہو جاتا کہ ایک خوفناک بلا اس کے پیروں میں لیٹا ہے تو شاید اس کی جان ہی نکل جاتی۔

اس سے پہلے کہ اس کمرے میں لوگ جاگتے۔ وہ کالا بلا نیلم کے پیروں سے اپنا جسم رگڑتا ہوا۔ ے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور اطمینان سے چلتا ہوا دروازے آیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

نیلم کوئی دس گیارہ بجے تک سوتی رہی۔ کسی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش بھی نہ کی۔ خود ہی اس کی ملی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ خواب آور گولی کا نشہ یا تھا لیکن اس کے اثرات باقی تھے۔ تھوڑی دیر وہ یونہی خاموشی سے لیٹی رہی۔ کبھی وہ آنکھیں ل لیتی۔ کبھی بند کر لیتی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک ایک بات تازہ ہو گئی۔ وہ اپنے حواسوں میں ب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیسی بھیانک رات گزاری ہے۔

ے شادی کا بڑا چاؤ تھا اور جتنا شوق تھا اتنا ہی اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا۔ وہ سنہری رات جس لڑکیاں دن گنتی ہیں، کیسی لمحہ لمحہ عذاب بن کر اس پر ٹوٹی تھی۔ رات گزر گئی تھی لیکن اس کے تم نہ ہوئے تھے جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

ابھی وہ جانے کتنی دیر یوں ہی آنکھیں موندی پڑی رہتی کہ اس کی امی اندر آئیں۔ انہوں نے یہ ے لئے کہ نیلم ابھی سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے، اسے آواز دی۔ "اری نیلم۔"

"جی امی۔" نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب اُٹھ جاؤ بیٹی ناشتہ وغیرہ کر لو۔" واجدہ نے پیار سے کہا۔

"جی امی، اُٹھ رہی ہوں۔" نیلم نے آہستگی سے کہا۔

"اب تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" واجدہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

"جی امی طبیعت تو ٹھیک ہے بس ذرا سر بھاری ہو رہا ہے۔"

"وہ گولی کی وجہ سے ہو گا، چائے وائے پیئو گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"امی یہ خواب آور گولیوں کی مجھے بالکل برداشت نہیں ہے، وہ تو میں نے ابو کی وجہ سے گولی لی، ورنہ کبھی نہ کھاتی۔"

"نیلم آج تو ہم سے جدا ہو جائے گی، تجھے کچھ معلوم ہے۔" واجدہ کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی۔

"امی جانتی ہوں۔" نیلم نے افسردگی سے کہا۔ "آپ نے مجھے بیاہ بھی اتنی دور دیا کہ کوئی

جلدی آنا بھی چاہے تو نہ آسکے، کیا امی میں آپ کو اتنی بُری لگتی تھی۔"

"اکبر، بہت اچھا لڑکا ہے وہ تیرا بہت خیال رکھے گا۔" واجدہ نے اسے تسلی دی۔

"ہاں امی میں یہ بھی جانتی ہوں۔" نیلم نے تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ یکلخت ہوگئی۔ "امی، آپ اور ابو مجھے بہت یاد آئیں گے۔"

"ہمارا گھر تو سُونا ہو جائے گا۔ اس گھر میں تیرے سوا اور تھا کون۔ اب اس گھر میں وہ ہوں میں ہوں گی۔ اور وہ بھی کہاں ہوں گے وہ تو دن بھر کاروبار میں مصروف ہوں گے۔ میں اکیلی پر اِدھر اُدھر گھومتی پھروں گی۔"

"امی کوئی مصروفیت نکال لینا ورنہ بور ہو جاؤ گی۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

"ہاں، کروں گی کچھ ورنہ یہ اکیلا گھر تو مجھے کاٹنے کو دوڑے گا۔" واجدہ نے نیلم کو پیار سے ہوئے کہا۔

"تم اپنا خیال رکھنا۔ مجھ سے فون پر دوسرے تیسرے روز بات کر لیا کرنا۔ میں بھی تمہیں کر لیا کروں گی۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں اتنی دور بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے پوری اُمید وہاں پر خوش رہو گی، وہ گھر تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ وہاں تم کئی مرتبہ رہ آئی ہو۔ اکبر تمہار بھالا لڑکا ہے وہ تم سے شادی کرنے کا شدید خواہشمند تھا۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر خوش رکھے گا۔ لیکن یاد رکھنا کہ اسے تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اس سلسلے میں ہر ممکن طور پر اپنی زبان بند ورنہ پیچیدگیاں بڑھ جائیں گی۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

"جی امی سمجھ رہی ہوں۔" نیلم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی تک کوئی ان حالات سے واقف نہیں ہے اور تمہیں کراچی بیاہنے میں یہ حکمت ع کارفرما تھی کہ کوئی ان حالات سے واقف نہ ہو سکے۔ ہم دونوں کی جان تمہارے اندر ہے۔ تمہ ابو تمہیں ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میری محبت سے تو تم واقف ہی ہو۔ اگر وہ سب نہ ہوا ہوتا تو ہم کبھی کراچی نہ بھیجتے۔ اس شہر میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے لیکن ہم نے جان بوجھ کر تمہیں اپنے سے دور تاکہ تم سدا سکھی رہ سکو۔ تمہاری خوشی ہمارے لئے اوّلین ہے، ہم تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا ہیں۔" واجدہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"میں اندر آجاؤں۔" ابھی یہ دونوں بات کر ہی رہے تھے کہ دروازے سے صابرہ نے جھانک

"ہاں خالہ آجائیں۔" نیلم نے بڑے احترام اور بڑی محبت سے کہا۔

"بھئی کوئی پرائیویٹ بات تو نہیں ہو رہی تھی۔" صابرہ نے چھیڑا۔

"جی ہاں بڑی پرائیویٹ قسم کی بات ہو رہی تھی۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر میں واپس لوٹ جاؤں۔" صابرہ نے نیلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے خالہ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔" نیلم سنجیدہ ہوگئی۔

"نیلم تو مذاق کر رہی تھی۔" واجدہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا ہمارے درمیان کوئی ایسی بات بھی ہوسکتی ہے جو تم سے چھپائی جائے...... راز رکھی جائے۔"

"ہاں ہوسکتی ہے ماں بیٹیوں میں ہزار باتیں ایسی ہوسکتی ہے جو چھپائی جائیں۔"

"یہاں چھپانے کو کچھ نہیں ہے، ایک نیلم تھی جسے اب تک اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا تھا تم سے بھی نہ دیکھا گیا آخر ہم سے چھین کر لے چلی نا اپنے ساتھ۔" واجدہ نے بات کا رخ بڑی خوبصورتی سے موڑ دیا۔

"تم نے اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا نا، ہم اسے کراچی لے جا کر اپنے دل میں چھپا کر رکھیں گے۔ تم کیا سمجھتی ہو ایک تمہی محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہو، اس دنیا میں۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔

"سن لیا تُو نے یہی بات میں تجھ سے کہہ رہی تھی کہ میری بہن تجھے اپنے دل میں چھپا کر رکھے گی۔"

"یہ پریشان ہو رہی تھی کیا؟" صابرہ نے پوچھا۔

"نہیں پریشان نہیں ہو رہی تھی بلکہ یہ کہہ رہی تھی کہ اتنی دور مجھے کیوں بیاہ دیا...... آپ سے ملنے میں بھی دُشواری ہوگی۔" واجدہ نے بتایا۔

"واہ نیلم تم نے خوب فکر کی۔" صابرہ نے نیلم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارا جی چاہے لاہور آجانا۔ لاہور امریکا میں تو نہیں ہے۔ لاہور پاکستان میں ہی ہے، جہاز گھنٹے سوا گھنٹے میں تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔"

کچھ دیر اور اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں پھر نیلم منہ ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھ گئی۔ ناشتہ تیار تھا جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان کے ساتھ نیلم نے ناشتہ کیا۔ باقی رہنے والوں میں اکبر بھی تھا۔

اکبر کی موجودگی میں نیلم کو ناشتہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر تو جا نہیں سکتی تھی، خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کرتی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بارات نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ گھڑی بھی آپہنچی جو والدین کیلئے متضاد جذبات لے کر آتی ہے۔ بیٹی جب گھر سے رخصت ہوتی ہے تو ایک طرف والدین کو اپنے فرض سے سبکدوشی کی خوشی ہوتی ہے، دوسری طرف انہیں اپنے لختِ جگر سے دور ہونے کا غم کسی عذاب سے کم نہیں محسوس ہوتا۔ لڑکیاں پرائی ہوتی ہیں، انہیں ایک دن گھر سے جانا ہی ہوتا ہے۔ بابل کے آنگن کی چڑیوں کو ایک دن اُڑنا ہی ہوتا ہے۔

نیلم اپنے ابو امی کے گلے لگ کر خوب روئی۔ اس طرح کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، بری حالت

ہوگئی۔ ماں باپ سے دور ہونے کا غم ایک دم ہی بارش کی طرح برسا تھا۔ وہ بہت دور جا رہی تھی۔ یہ احساس شدت سے اس کی روح کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔

رودھو کر وہ گاڑی میں بیٹھی اس کے پاس، اب جس نے زندگی بھر اس کے آنسو پونچھنے تھے۔ ایک رشتہ ٹوٹا تھا تو دوسرا جڑ گیا تھا۔ ایک گھر چھوٹا تھا دوسرا مل گیا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے اب ہمیشہ رہنا تھا۔

گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔ گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔

اچانک ہی وہ کالا بلا کہیں سے نمودار ہوا اور چلتی ٹرین میں چھلانگ لگا کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔

فرقان ماموں کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ گاڑی چلی تو انہوں نے کھڑکی سے باہر منہ نکال لیا اور ایسے ہی باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ تب ان کی نظر اس کالے بلے پر پڑی۔ انہوں نے اسے برابر والے ڈبے میں چڑھتا دیکھ لیا۔

گاڑی نے اب رفتار پکڑ لی تھی۔ ماموں فرقان نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کیا اور فکرمندی سے بابر علی کو دیکھنے لگے۔ بابر علی ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا ماموں؟'' بابر علی نے ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' ماموں نے برتھ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اِدھر چل کر بات کرتے ہیں۔''

بابر علی فوراً ہی ان کے ساتھ ہولئے۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے بوگی کا دروزہ اندر سے بند کیا، یہ پوری بوگی ریزرو تھی۔ اس میں باراتیوں کے سوا کوئی باہر کا آدمی نہ تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے فرقان ماموں نے کہا۔ ''میں نے اسے گاڑی میں چڑھتے دیکھا ہے؟''

''کس کو ماموں؟'' بابر علی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کالے بلے کو۔'' ماموں فرقان نے آہستہ سے کہا۔

''کون سا کالا بلا۔'' بابر علی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

''یہ وہی بلا ہے جو ہمارے ساتھ لاہور گیا تھا، اب یہ پھر ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔ بوگی کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر دو تاکہ وہ بلا اس بوگی میں نہ آسکے اور یہ بات کسی کو بتانی بھی نہیں ہے۔ میں اسی لئے تمہیں اپنے ساتھ اُٹھا کر لایا ہوں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

کھڑکیاں، دروازے تو خیر بند کر دیئے گئے لیکن بوگی کے درمیان کے دروازے جو ایک بوگی کو دوسری بوگی سے ملاتے ہیں اور جن سے بیرے اور ٹکٹ چیکر وغیرہ گزرتے رہتے ہیں، انہیں بند کرنا آسان نہ تھا۔ ان دروازوں پر نظر رکھنے کے لئے ضروری تھا، وہاں کوئی آدمی مستقل بیٹھے اور یہ نگرانی کا کام لڑکے ہی اچھی طرح کر سکتے تھے۔ لہٰذا اب ضروری ہوگیا کہ خاندان کے دو تین لڑکوں کو اعتماد

میں لے کر انہیں کالے بلے کی نگرانی پر مامور کر دیا جائے۔

فرقان ماموں نے دو تین لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہے۔ باراتیوں کو بالخصوص خواتین کو یہ بات ہرگز نہیں بتانا ہے کہ وہ خبیث بلا پھر ہمارا شریک سفر ہے۔ خواہ مخواہ بوگی میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ اتنا لمبا سفر ہے، ابھی سے عذاب بن جائے گا۔

فرقان ماموں کی خفیہ فورس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ماموں فرقان اور بابر علی بھی بوگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا لیتے تھے، نگرانی ٹھیک طرح جاری تھی۔

شام ڈھلنے لگی پھر رات آئی۔ یہ ایک اچھی خاصی سرد رات تھی۔ گاڑی میں غیر معمولی سردی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند ہونے کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بوگی میں برف بھری ہو۔

خدا خدا کر کے یہ رات گزری، فرقان ماموں ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بوگی کے درمیان میں کمبل اوڑھے بیٹھے رہے۔ ان کی نظریں بوگی کے راستے پر دائیں بائیں گھومتی رہیں اور ان کے ہونٹ ہلتے رہے، وہ مستقل کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے۔

دن نکلا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔ وہ کالا بلا اس بوگی میں داخل نہ ہو سکا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب گاڑی کراچی کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ سفر تمام ہوا، سارے باراتی ایک ایک کر کے ٹرین سے اُتر آئے۔ ان اُترنے والوں میں ماموں فرقان بھی تھے۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر انہوں نے دور تک جہاں تک وہ دیکھ سکتے تھے، دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ انہیں کہیں نظر نہ آیا۔ فرقان ماموں نے اطمینان کا سانس لیا اور پُل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بارات کو گھر تک لے جانے کے لئے اسٹیشن کے باہر ایک بس موجود تھی لیکن بہت سے باراتی اسٹیشن سے ہی رخصت ہو گئے۔ بس میں صرف وہ لوگ رہ گئے جن کے گھر بس کے روٹ پر تھے یا گھر جانا چاہتے تھے۔

بس چلی تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کالا بلا کب بس کے دروازے سے چھلانگ لگا کر اندر آ گیا اور بڑے اطمینان سے ایک سیٹ کے نیچے پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ فرقان ماموں پہلے آگے بیٹھے تھے پھر جانے کیا سوچ کر وہ پیچھے اُٹھ آئے اور اسی سیٹ پر بیٹھ گئے جس کے نیچے بلا لیٹا تھا۔ ان کے اور بلے کے پیروں کے درمیان مشکل سے دو تین انچ کا فاصلہ ہوگا۔ اگر وہ کالا بلا چاہتا تو ماموں فرقان کی ٹانگ پر اپنا پنجہ مار سکتا تھا۔ اپنے ساتھ انہوں نے بابر علی کو بھی بلا لیا تھا۔ اب وہ دونوں پیچھے بیٹھے سفر بخوبی ختم ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ اور نیچے وہ کالا بلا لیٹا ہوا بار بار اپنی دُم کو بس کے فرش

پر مار رہا تھا جیسے تنبیہہ کر رہا ہو کہ یہ سفر ابھی شروع ہوا ہے۔

''چلو اس بلے سے تو جان چھٹی۔'' ماموں فرقان نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

کالے بلے نے پھر اپنی موٹی دُم بس کے فرش پر ماری جیسے کہہ رہا ہو کہ ابھی کہاں جان چھٹی ابھی تو جان عذاب میں آنا شروع ہوگی۔

''ماموں، اس بلے نے واقعی جان عذاب میں ڈال دی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے پیچھے لگ گیا تھا۔'' بابر علی نے بس سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عجیب بلا تھا وہ۔''

''تم دادا غفور کو جانتے ہو؟'' فرقان ماموں نے بابر علی سے پوچھا۔

''ہاں جانتا ہوں وہ جو برنس روڈ پر رہتے ہیں۔'' بابر علی نے تصدیق چاہی۔

''ہاں وہی میں ان کے پاس جاؤں گا...... وہ ان معاملات میں بڑے ماہر ہیں ان سے بات کروں گا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں ان سے کوئی تعویذ وغیرہ لے لیں۔'' بابر علی نے تجویز پیش کی۔

''میں ان سے بات کرتا ہوں وہ جو بتائیں گے ویسا کریں گے۔ یہ معاملہ ویسے تعویذوں سے حل ہونے والا نہیں ہے، اس کے لئے عمل کرنا پڑے گا۔''

''ماموں آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' بابر علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ بات اگلے دو تین دن میں معلوم ہو جائے گی۔'' ماموں فرقان بولے۔

''کیا پھر کچھ ہوگا۔'' بابر علی نے فکرمندی سے پوچھا۔

''اگر اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں تو وہ ہر صورت میں ظاہر ہوں گے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''ماموں آپ دو تین دن میرے گھر پر ہی رہیں۔'' بابر علی نے کہا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو اب کچھ نہیں ہوگا اور اگر کچھ ہوا تو میں تم سے کون سا دور ہوں۔ مجھے ٹیلیفون کر دینا میں فوراً آ جاؤں گا ویسے پرسوں ولیمے پر ملاقات ہوگی، انشاء اللہ سب ٹھیک رہے گا۔'' ماموں فرقان نے تسلی دی۔

لیکن کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ فرقان ماموں کے سارے اندازے غلط نکلے ان کا خیال تھا کہ کالے بلے سے نجات مل گئی ہے لیکن ایسا نہ تھا۔

ماموں فرقان تو حسن اسکوائر پر اُتر گئے انہیں عزیز آباد جانا تھا۔ بابر علی نے انہیں وہاں اُترنے سے منع بھی کیا کہ گھر چلیں وہاں سے آپ کو گاڑی کے ذریعے گھر بھجوا دوں گا لیکن ماموں فرقان نہ مانے کہ خواہ مخواہ زحمت ہوگی، وہ بس سے اُتر گئے اور ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گئے۔

ماموں فرقان کے اُترتے ہی کالے بلے نے پورے اطمینان سے پاؤں پھیلا لئے جیسے فرقان

ماموں کے اُترنے سے اسے سکون ملا ہو۔

بابر علی کی رہائش گاہ گلشن اقبال میں تھی بس جب گلشن پہنچی تو اس میں بہت کم باراتی رہ گئے تھے، زیادہ تر گھر کے افراد تھے یا وہ مہمان تھے جو حیدرآباد اور ٹھٹھہ سے آئے ہوئے تھے۔

بس خالی ہونے کے بعد کالے بلے نے بھی سیٹ کے نیچے سے اپنا منہ نکالا۔ گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا بس میں کوئی نہ تھا۔ وہ پورے اطمینان سے ''مہمان خصوصی'' کی طرح شان سے نیچے اُترا اور گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

شادی کی پہلی رات تو اس کالے بلے کی نذر ہو گئی تھی، دوسری رات ٹرین میں گزری۔ آج تیسری رات تھی۔ اکبر ذہنی طور پر بہت اُلجھا ہوا تھا۔ ان عجیب و غریب واقعات نے اس کے اعصاب شکستہ کر دیئے تھے۔ اوپر سے سفر کی تکان تھی۔ گھر پہنچ کر اکبر نے تیز گرم پانی کا شاور لیا، ایک خواب آور گولی کھائی، چائے پی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس نے راشدہ کو ہدایت کر دی کہ شام ہونے سے پہلے اسے کوئی نہ اُٹھائے۔

اپنے بیڈ پر لیٹ کر اسے ایک طرح کی آسودگی کا احساس ہوا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی اوپر سے نیند کی گولی کا نشہ...... جلد ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے لحاف اپنے اوپر کھینچا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ جانے وہ کتنی دیر سویا ہوگا کہ اچانک اس کی کسی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شام ہو چکی ہے کوئی زور زور سے دروازہ بجا رہا تھا، اکبر نے سوچا وہ اندر سے دروازہ بند کر کے تو نہیں سویا تھا پھر یہ کون اس بیہودگی سے دروازہ پیٹ رہا ہے...... اندر کیوں نہیں آ جاتا۔ وہ لحاف پھینک کر غصے سے اُٹھا کہ دیکھے تو سہی کون ہے دروازے پر......!

ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔

''ارے بھئی آ جاؤ، کون ہے؟'' اکبر نے ذرا غصے سے کہا۔

پورا دروازہ کھل گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اکبر کو اور غصہ آیا کہ ایک تو دروازہ پیٹ کر اسے اُٹھا دیا اور اب مزید اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تاکہ دیکھ سکے کہ باہر کون ہے۔ چار قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ اسے دیکھ کر اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ اکبر جلدی سے اُلٹے قدموں پیچھے بھاگا اور جلدی سے لحاف میں گھس گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کی نظریں اس چیز پر تھیں جو اندر آ رہی تھی۔

وہ کوئی بڑی ہیبت ناک شے تھی۔ اس کی لمبائی کوئی دو فٹ رہی ہوگی۔ ایک فٹ کے پاؤں ہوں گے اور ان پاؤں کے اوپر سر تھا۔ اس کا دھڑ نہیں تھا نہ ہاتھ تھے، سر چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس میں سے ایک ہیبت ناک چہرہ جھلک رہا تھا۔

اس عجیب الخلقت چیز کو دیکھ کر اکبر کی چیخ گلے میں پھنس گئی، وہ لاکھ چیخنا چاہ رہا تھا لیکن چیخ تھی کہ گلے سے نکل ہی نہ رہی تھی اور عجیب الخلقت چیز اپنے پاؤں پر اُچھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔

تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خود کو بری طرح چیختے ہوئے پایا، وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، اس کا حلق خشک تھا اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا نہ تھا کسی نے اندر آ کر لائٹ جلا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ کمرے میں روشنی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا، اس نے گردن گھما کر چاروں طرف کمرے میں دیکھا وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے خوفزدہ ہوا جاتا۔ اس کا مطلب ہے اس نے جو کچھ دیکھا تھا خواب میں دیکھا تھا لیکن جانے کیوں اسے احساس محسوس ہوا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا خواب نہ تھا بلکہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اب وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ابھی باتھ روم جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ راشدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''اُٹھ گئے آپ، شکر ہے۔'' راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے دوست آئے ہیں، اِدھر ہی بھیج دوں۔ ڈرائنگ روم تو اس وقت خالی نہیں ہے۔''

''ہاں اِدھر ہی بھیج دو۔'' اکبر نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں پھر چائے بھیج دینا۔''

''جی اچھا۔'' راشدہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اکبر کے دوست آفاق اور گلزار کمرے میں داخل ہوئے۔ اکبر ابھی باتھ روم میں تھا۔ انہوں نے ایک کالے بلے کو اکبر کے بیڈ کے نیچے سے نکلتے دیکھا۔ کالے بلے کی سرخ سرخ آنکھیں اور بڑا قد دیکھ کر وہ دونوں سہم گئے۔ کالے بلے نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور ٹہلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''یار یہ کس قسم کا بلا تھا۔'' آفاق نے گلزار سے کہا۔

اتنے میں اکبر تولیہ سے منہ پونچھتا باتھ روم سے باہر آ گیا۔ آفاق نے کہا۔ ''یار وہ عجیب قسم کا بلا تھا، ڈراؤنا اور اتنا لمبا چوڑا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

کالے بلے کا ذکر سن کر اکبر کے پسینے چھوٹ گئے، اس نے جلدی سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کالا بلا کہیں نظر نہ آیا۔ اکبر واپس کمرے میں آیا اور خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا بھئی تو کیوں اتنی خاموشی سے بیٹھ گیا۔'' گلزار نے اسے چھیڑا۔

''ہاں بھئی سنا کچھ رات کا فسانہ۔'' آفاق نے گرہ لگائی۔

اکبر کے یہ دونوں دوست بارات میں نہیں گئے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ اکبر کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ وہ کرید کرید کر اس سے ''رات کا فسانہ'' پوچھتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر انہیں ٹالتا رہا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔

اکبر کپڑے پہن کر اپنے دوستوں کو لے کر باہر نکل گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ گھر واپس آیا پھر اس نے کھانا کھایا اور کھانا کھا کر اپنے ایک اور دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہاں سے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپسی ہوئی۔

گھر واپس آیا تو گھر والے اس کے منتظر تھے۔ کچھ دیر کے بعد اسے نیلم کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو دیوار پر لگی گھڑی نے بارہ گھنٹے بجائے۔ اکبر نے پہلے بارہ بجاتی گھڑی اور پھر نیلم کو دیکھا۔ نیلم نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پھر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ جب وہ قریب آیا تو نیلم نے اپنا سر بھی جھکا لیا۔ اکبر بیڈ پر بیٹھا اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اُٹھایا اور قریب ہونے لگا۔

لیکن قربت اُس کے نصیب میں نہ تھی۔

وہ اچانک چیخ اُٹھا۔ ''نیلم، میری آنکھیں۔''

جب اکبر نے گھبرا کر کہا۔ ''نیلم میری آنکھیں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں کو ڈھک لیا تو نیلم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا...... ہاتھ پاؤں میں جان نہ رہی، اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''ہائے، اکبر تمہیں کیا ہوا؟''

اکبر کچھ نہ بولا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مَل رہا تھا۔ تب نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس نے کہا۔ ''اکبر، ہاتھ تو ہٹائیں۔''

اکبر نے اپنے ہاتھوں پر نیلم کی نرم ملائم ریشم سی انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ چند ثانیے کو اسے سکون ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیا۔ آنکھیں کھول کر نیلم کی طرف دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں شدت کی تکلیف ہوئی۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

''اکبر خدا کے لئے، اپنی آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھیں۔'' نیلم نے اس کا ذرا سا ہاتھ دبا کر کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اکبر، نیلم کے اس جملے پر قربان ہو جاتا اسے اس طرح دیکھتا کہ پھر اسے دید کی حسرت نہ رہتی لیکن اس وقت تو وہ بڑی مشکل میں تھا۔ اس نے پھر تھوڑی سی آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن آنکھوں کے چراغ جل نہ سکے۔ روشنی کے باوجود ہر طرف دُھند سی چھائی رہی۔

''نیلم آنکھیں نہیں کھل رہیں۔'' اکبر نے ایک کرب کے عالم میں کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' نیلم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''آنکھوں میں شدید مرچیں لگ رہی ہیں۔''

"ابھی تو آپ ٹھیک تھے۔"

"ہاں، ابھی تو میں ٹھیک تھا۔" اکبر نے کہا۔

"پھر یہ مرچیں کہاں سے آ گئیں۔" نیلم نے پوچھا۔

"بس، مجھے اچانک ہی یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے مٹھی بھر کر پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں...... اس قدر شدید تکلیف ہے کہ بتا نہیں سکتا۔" اکبر کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

"آپ باتھ روم میں جا کر آنکھیں دھو لیں۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

"ہاں، یہی کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اکبر اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی نیلم بھی اُٹھی اس نے سہارا دے کر اکبر کو باتھ روم کا راستہ دکھایا۔

اکبر نے واش بیسن کے نلکے سے اچھی طرح اپنی آنکھیں دھوئیں، درد میں بہت معمولی سا فرق پڑا۔ اس نے کھڑے ہو کر آنکھیں دیکھیں...... اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس قدر سرخی تھی کہ لگتا تھا جیسے آنکھوں میں خون بھر گیا ہو اور اتنی شدید جلن تھی جیسے کوئی اس کی آنکھوں پر بلیڈ پھیر رہا ہو۔

باتھ روم سے واپس آ کر وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسے کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود کمرے میں جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کی آنکھوں میں تیزاب بن کر ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنا منہ بیڈ کے گدے میں چھپا لیا، چین پھر بھی نہ ملا۔

"کیا لائٹ بجھا دوں۔" نیلم نے اسے گدے میں منہ چھپائے دیکھ کر پوچھا۔

نیلم کا یہ جملہ بھی مر مٹنے والا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں نہ بھری ہوتیں تو وہ اس جملے سے لطف اُٹھاتا لیکن اس وقت تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے سادگی سے کہا۔ "ہاں، بجھا دو۔"

نیلم نے لائٹ بجھا دی لیکن اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ تکلیف اپنی جگہ جوں کی توں برقرار رہی۔ پھر نیلم نے باتھ روم کی لائٹ جلا کر دروازہ کھول دیا اس نے تولیہ پانی میں تر کیا اور اس گیلے تولیہ کو اس کی آنکھوں پر رکھ کر بہت آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لگ رہا تھا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اسے تھوڑا سا سکون پہنچایا۔

لیکن یہ سکون بھی لمحاتی ثابت ہوا، دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے لیکن کسی طرح سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ تب نیلم نے پریشان ہو کر کہا۔ "کیا خالہ کو بلا کر لاؤں؟"

"نہیں، تم رہنے دو میں خود جاتا ہوں۔" اکبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "نیلم، بہت شدید قسم کی تکلیف ہے۔"

"آپ جائیں، جا کر کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

اکبر آنکھوں پر ہاتھ رکھے اندازے سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ پھر اس نے اپنے امی ابو کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔

اکبر کو اس طرح اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے آتے دیکھ کر صابرہ نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

"یا اللہ خیر۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ابو، میری آنکھیں دیکھیں۔" اکبر نے کہا۔

"کیا ہوا تمہاری آنکھوں کو۔" بابر علی لپک کر اس کی طرف بڑھے۔

انہوں نے جلدی سے اسے اپنے بیڈ پر بٹھایا۔ صابرہ نے اکبر کا ہاتھ ہٹا کر اس کی ایک آنکھ کھول کر دیکھی۔ "ارے، یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا، ایک دم لال انگارہ ہو رہی ہیں۔"

"امی بس اچانک ہی ایسا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ڈھیر ساری پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں۔"

"اپنی آنکھیں دھو لو۔" بابر علی نے کہا۔

"ابو بہت اچھی طرح دھو لی ہیں، گیلے تولیے سے بھی مسلسل رگڑی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔"

اکبر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سنیں۔" صابرہ، بابر علی سے مخاطب ہوئیں۔ "اسے اسپتال لے جائیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے؟" یہ کہہ کر بابر علی نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے، گاڑی نکالی اور اکبر کو بٹھا کر اپنے علاقے کے ایک اچھے اسپتال میں لے گئے۔

وہاں ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ آنکھوں کو اچھی طرح دھو کر ایک ٹیوب سے مرہم لگا دیا۔ کھانے کو کچھ دوائیں لکھ کر دیں، لگانے کو دو قسم کی ٹیوب تجویز کر دیں۔

بابر علی کے دریافت کرنے پر کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اچانک آنکھوں کا یہ حال کیسے ہو گیا تو ڈاکٹر نے بتایا۔ "یہ ایک طرح کی الرجی ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

لیکن اکبر کی آنکھیں ایک دو دن میں ٹھیک نہ ہوئیں...... البتہ تکلیف کچھ کم ہو گئی لیکن بالکل ختم نہ ہوئی۔

ماموں فرقان کو دوسرے دن بابر علی نے فون پر صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ماموں فرقان، اکبر کی آنکھوں کی تکلیف کے بارے میں سن کر فکر مند ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا۔

"کسی آنکھوں کے اسپیشلسٹ کو دکھاؤ، ہو سکتا ہے اس ڈاکٹر کی رائے صحیح ہو۔ واقعی اس کی آنکھوں میں الرجی ہو گئی ہو لیکن اسپیشلسٹ کو دکھاؤ ضرور تا کہ تسلی ہو جائے۔"

''ماموں، میں نے شام کو ایک بڑے ڈاکٹر سے وقت لیا ہے، اسے لے کر جاؤں گا۔''

''تم اکبر کو ڈاکٹر کو دکھاؤ میں رات کو اِدھر آؤں گا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''دکان سے اُٹھ کر پہلے میں دادا غفور کی طرف جاؤں گا، ان سے ذرا بات کر کے دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اچھا ماموں ٹھیک ہے میں رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر بابر علی نے ریسیور رکھ دیا۔

بابر علی کے ریسیور رکھنے کے بعد بھی ماموں فرقان چند لمحوں تک ریسیور اپنے ہاتھ میں تھامے رہے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں پھر انہوں نے گہرا سانس لے کر ریسیور زور سے کریڈل پر رکھ دیا۔

شام کو جلدی اپنی دکان سے اُٹھے تا کہ دادا غفور سے بات کر کے وہ گلشن پہنچ سکیں۔ پھر گلشن سے انہیں اپنے گھر واپس بھی آنا تھا۔ لیاقت آباد کی مارکیٹ میں ماموں فرقان کی کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی اور خوب چلتی تھی۔ لیاقت آباد سے ٹیکسی پکڑ کر وہ برنس روڈ دادا غفور کے پاس پہنچے۔

دادا غفور ماموں فرقان کے دور کے رشتے داروں میں سے تھے لیکن ان سے دادا غفور کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ ماموں فرقان کو جب بھی فرصت ہوتی وہ ان سے ملنے ضرور جاتے۔ دادا غفور بھی ماموں فرقان کو بہت پسند کرتے تھے وہ اگر کبھی ملاقات کو نہ آتے تو دادا غفور انہیں اپنے بیٹے سے فون کروا کر بلوا لیا کرتے تھے۔ دادا غفور کی عمر 72 سال سے کم نہ ہو گی لیکن ان کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ وہ چشمہ نہیں لگاتے تھے اور اُڑتے کبوتر کو دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ کس نسل کا ہے۔ سماعت بھی بالکل ٹھیک تھی۔ صرف قدموں کی چاپ سے بندے کو پہچان لیا کرتے تھے۔ البتہ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا، تھوڑی بہت گردن بھی ہلنے لگی تھی۔ دبلے پتلے تھے، رنگ گورا چٹا تھا۔ جوانی میں سرخی مائل رہا ہو گا۔ اب تھوڑا سا زردی مائل ہو گیا تھا۔ سفید ریشمیں داڑھی، گہری سیاہ آنکھیں، مسکراتے ہونٹ، کڑک دار آواز وہ ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

ماموں فرقان، دادا غفور کے فلیٹ پر پہنچے تو وہ دستر خوان پر بیٹھ چکے تھے۔ کھانا مغرب کے فوراً بعد کھا لیا کرتے تھے۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر خوش ہوئے، بڑی محبت سے بولے۔ ''آؤ بھئی، فرقان بہت اچھے وقت پر آئے......کھانا کھاؤ۔''

ماموں فرقان اگرچہ عشاء کے بعد کھانا کھانے کے عادی تھے لیکن دادا غفور کی دعوت پر ان کا ساتھ دینے کیلئے فوراً دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ دو چار لقمے کھا کر اُٹھ جائیں گے لیکن دستر خوان پر ان کی پسند کی چیز موجود تھی۔ پائے وہ بہت شوق سے کھاتے تھے اور دادا غفور کے گھر کے پایوں کا تو کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ وہ کھانے بیٹھے تو کھاتے چلے گئے پھر پورا پیٹ بھر کر اُٹھے۔ دادا غفور کو ماموں فرقان کی یہی بے تکلفی بہت پسند تھی۔

کھانے کے بعد دادا کمرے میں چہل قدمی فرمانے لگے۔ دادا کو کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی۔ ٹہلنے کے لئے وہ باہر نہ جاتے تھے۔ گھر میں ہی آدھا گھنٹہ ٹہل لیا کرتے تھے۔ ماموں فرقان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور دادا غفور ٹہلتے ہوئے بولے۔ ''بھئی فرقان تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے۔''

''ٹھیک ہے دادا اللہ کا بڑا احسان ہے۔'' ماموں فرقان نے موقع غنیمت جانا۔ دادا اب ان کی بات سننے کے موڈ میں تھے۔ وہ فوراً بولے۔ ''دادا مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔''

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے۔'' دادا غفور نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے انہیں مسکرا کر دیکھا۔

''ارے نہیں دادا۔'' ماموں فرقان ہنس کر بولے۔

''پھر کیا معاملہ ہے؟'' دادا غفور اب سنجیدہ ہو گئے۔

''میرا بھانجا ہے بابر علی فرنیچر کا کاروبار کرتا ہے اچھا بزنس ہے اس کا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''ابھی اس کے بیٹے کی شادی تھی گزشتہ کل ہی بارات لاہور سے واپس آئی ہے اور کل اس کا ولیمہ ہے۔''

''اچھا پھر۔'' دادا غفور نے ٹہلتے ٹہلتے ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔

''اس شادی میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ سب چکرا کر رہ گئے ہیں۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''مسئلہ کیا ہے۔'' دادا غفور نے پوچھا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

تب ماموں فرقان نے الف سے لے کر یے تک ساری داستان پوری تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دی۔ دادا غفور ٹہلتے رہے اور ماموں فرقان کی بات پوری توجہ سے سنتے رہے۔ ماموں فرقان جب تک خود خاموش نہ ہو گئے، دادا غفور نے انہیں درمیان میں ٹوکا نہ کوئی سوال کیا جب وہ چپ ہو گئے تو دادا غفور نے پوچھا۔ ''تمہاری سمجھ میں کیا آیا۔''

''میری سمجھ میں، تو یہ آ رہا ہے کہ نیلم پر اثر ہے۔ اثر کس قسم کا ہے۔ یہ آپ بتائیں گے؟''

''اچھا۔'' دادا غفور اچانک ٹہلتے ٹہلتے رک گئے، پھر وہیں کھڑے کھڑے اپنے پوتے ساجد کو آواز دی۔ ''ساجد۔''

ان کی آواز سن کر دس بارہ سال کا ایک لڑکا فوراً اندر آیا۔ ''جی دادا۔''

''بیٹا، ایک شیشے کا گلاس اچھی طرح دھو کر اس میں پانی لاؤ۔'' دادا غفور نے کہا۔

''جی دادا۔'' ساجد نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور اندر چلا گیا۔

دادا غفور عملیات کے ماہر تھے۔ ماموں فرقان اور دادا غفور کی دوستی کا راز بھی انہی عملیات میں مضمر تھا۔ دونوں اکٹھا بیٹھتے تو نہ جانے کب کب کے قصے چھڑ جاتے۔ دادا غفور اپنے پیر کے قصے سناتے

جن کے یہاں جنوں کے بچے قرآن شریف پڑھنے آتے تھے۔

حاضرات کا علم، دادا غفور نے انہی سے سیکھا تھا۔ ان کے پیر ہاتھ کے انگوٹھے پر حاضرات کیا کرتے تھے اور ذرا سے ناخن کے انگوٹھے پر دنیا دیکھ لیا کرتے تھے۔ دادا غفور اس علم کو پانی سے بھرے گلاس پر کیا کرتے تھے۔

ساجد پانی سے بھرا شیشے کا چمکتا گلاس ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر چلا گیا۔

دادا غفور نے وضو کیا پھر باوضو ہو کر چوکی پر بیٹھ گئے۔ سودانے والی تسبیح نکالی تسبیح کا ایک چکر کیا پھر ہاتھ کے اشارے سے ماموں فرقان کو گلاس اپنے سامنے چوکی پر رکھنے کو کہا۔ ماموں فرقان نے بہت احتیاط سے گلاس اُٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ دادا غفور نے گلاس کو اپنے آگے کھسکا کر اور اپنے اوپر ایک سفید چادر ڈال لی۔ چادر انہوں نے اس طرح اپنے اوپر ڈالی تھی کہ وہ بالکل ڈھک گئے تھے۔

ماموں فرقان پورے اطمینان سے بیٹھے ان کو دیکھتے رہے، وہ اس عمل کو بار ہا اپنے سامنے ہوتے دیکھتے رہے تھے۔ ہاں کوئی نیا آدمی ہوتا تو بڑا حیران و پریشان ہوتا، ہوسکتا ہے کہ وہ ڈر کر کمرے سے بھاگ جاتا۔

چادر سے اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن ماموں فرقان کو معلوم تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ وہ ان کا سر ہلتے دیکھ رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ گھر والوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔

پھر اچانک انہوں نے چادر اُلٹ دی۔ ایسی سخت سردی میں بھی ان کی پیشانی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ماموں فرقان کی نظر جب پانی کے گلاس پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو سہم کر رہ گئے۔ پانی کا رنگ سرخ ہو چکا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے گلاس میں تازہ تازہ خون بھرا ہو۔

''یہ کیا دادا!'' ماموں فرقان نے پریشان ہو کر کہا۔

''کوئی فکر کی بات نہیں۔'' پسینے میں نہائے ہوئے ہونے کے باوجود وہ مسکرا کر بولے۔ ''ذرا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔''

''کون ہے وہ۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ابھی صرف دھواں ہے۔'' دادا غفور گلاس پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔

''دھواں۔'' ماموں فرقان نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہاں دھواں۔'' دادا غفور نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔ ''خیر کوئی بات نہیں، کب تک دھواں بنا رہے گا، کب تک سامنے نہیں آئے گا۔ میں دیکھتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ نیلم پر کوئی اثر ضرور ہے۔''

''ہاں دلہن کسی کے زیر اثر ہے۔'' دادا غفور نے یقین سے کہا۔ ''یہی وجہ ہے کہ وہ دولہا کو دلہن کے پاس جانے نہیں دے رہا ہے، جب بھی دولہا، دلہن سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ شعبدہ دکھا کر اسے ڈرا دیتا ہے، اسے دور کر دیتا ہے۔''

''آنکھوں کی بیماری بھی کیا دلہن سے دور رکھنے کی کوشش ہے۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''حالات تو یہی بتاتے ہیں...... خیر کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں ایک فلیتہ دیتا ہوں...... تم جا کر ذرا دلہن کے سامنے جلاؤ۔ پھر آ کر مجھے بتاؤ اور ہاں آتے ہوئے دلہن کا کوئی استعمال شدہ کپڑا لیتے آنا کوئی قمیض یا دوپٹہ وغیرہ۔'' دادا غفور نے کہا۔

''اور دولہا کے بارے میں کیا حکم ہے۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس سے کہو ذرا صبر سے کام لے...... دلہن کے نزدیک نہ جائے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کا اندیشہ ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے اب شعبدہ بازی سے براہ راست نقصان پہنچانے پر اُتر آیا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے دادا، میں اسے ہدایت کر دوں گا۔'' یہ کہتے کہتے ان کی نظر گلاس پر پڑی تو وہ ایک دم چونک پڑے۔ ''ارے یہ کیا؟''

''بس دیکھتے رہو۔'' دادا غفور نے بڑے اطمینان سے کہا اور خود بھی گلاس کو غور سے دیکھنے لگے۔ گلاس کی سرخی غائب ہوتی جا رہی تھی۔ گلاس کا پانی اوپر سے سفید ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پورا گلاس سفید ہو گیا۔ دادا غفور نے ماموں فرقان کو مسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسے شعبدے میں نے بہت دیکھے ہیں۔

پھر دادا غفور نے ایک پیلے رنگ کا کاغذ اپنی الماری سے نکالا اور اس پر قلم سے کچھ لکھا اور کاغذ کی اس طرح پڑیا بنا دی جیسے چنے بیچنے والے بناتے ہیں۔ اس لمبی سی بتی پر انہوں نے ایک لال دھاگا لپیٹ دیا۔ دھاگا لپیٹتے ہوئے وہ کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔

''یہ لو فرقان۔'' دادا غفور نے وہ فلیتہ ماموں کی طرف بڑھایا۔ ''اسے دلہن کے سامنے جلانا اور اس سے کہنا کہ اس جلتے ہوئے فلیتے کو دیکھے۔ فلیتے کو جلانے سے پہلے کمرے کو بند کر لینا۔'' دادا غفور نے ہدایت کی۔

''کیا دلہن کو اس جلتے فلیتے میں کچھ نظر آئے گا۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ہاں نظر تو آنا چاہئے۔'' پھر دادا غفور نے ماموں فرقان کو کچھ پڑھنے کو بتایا۔

ماموں فرقان نے اس فلیتے کو اپنی کوٹ کی جیب میں رکھا اور دوسرے دن ''رپورٹ'' دینے کا وعدہ کر کے ان کے فلیٹ سے نکل آئے۔

اتفاق کی بات کہ بلڈنگ کی سیڑھیاں اُترتے ہی نیچے سڑک پر ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور اس نے گلشن چلنے پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا۔ ایسے حسین اتفاق کراچی میں کم ہی میسر آتے ہیں۔

گلشن پہنچے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے عشاء کی نماز پڑھی۔ نما سے فارغ ہوئے تو بابر علی نے کہا۔ ''ماموں کھانا میز پر لگ چکا ہے...... آپ کا انتظار ہے۔''

''بھئی میں دادا غفور کے ہاں سے کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔ تم لوگ کھاؤ مجھے ابھی کچھ پڑھنا ہے۔''

''اچھا ماموں ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر بابر علی کمرے سے نکل گئے۔

ماموں فرقان عشاء کی نماز کے بعد جو پڑھتے تھے وہ تو انہوں نے پڑھا ہی، وہ بھی پڑھا جو دادا غفو نے بتایا تھا۔ اِدھر ماموں فرقان اپنے پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوئے اِدھر وہ لوگ کھانا کھا کر ا کمرے میں آ گئے۔

بابر اور صابرہ کو دیکھ کر ماموں فرقان نے پوچھا۔ ''اکبر کہاں ہے؟''

''وہ کمرے میں ہے، آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔'' صابرہ نے بتایا۔

''ذرا بلاؤ اسے۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''اچھا میں بلاتی ہوں۔'' صابرہ اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''دادا غفور سے آپ کی کوئی بات ہوئی؟'' بابر علی نے صابرہ کے جانے کے بعد پوچھا۔

''ہاں بڑی تفصیل سے ہوئی ہے معاملہ بڑا سنگین ہے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''کیا مطلب۔'' بابر علی فکر مند ہو گئے۔

''مطلب یہ کہ نیلم پر اثر ہے۔'' ماموں فرقان نے وضاحت کی۔

اتنے میں کمرے میں اکبر داخل ہوا۔ اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ ا نے ماموں فرقان کو دیکھ کر سلام کیا اور ایک صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''ہاں جی، اکبر صاحب کا کیا حال ہے۔'' ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ماموں بہت برا حال ہے...... آنکھوں کی تکلیف ابھی ختم نہیں ہوئی۔'' اکبر نے افسردگی سے کہا۔

''ذرا آنکھیں دکھاؤ۔'' ماموں فرقان بولے۔

اکبر نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا دیا۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ اور گلی گلی سی ہو رہی تھیں کہ ماموا فرقان سے دیکھا نہ گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا۔

''تمہاری آنکھیں تو بہت خراب ہو رہی ہیں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ا سامنے رکھا ہوا پانی اکبر کی طرف بڑھایا۔ ''لو اسے پی لو۔''

اکبر نے پڑھا ہوا پانی پیا تو اسے اپنی آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

''ماموں یہ پانی تو بہت اچھا ہے، میری آنکھوں میں ایک دَم ٹھنڈک سی پڑ گئی۔'' اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

''میں ابھی اور پانی پڑھ دوں گا...... تم اسے بوتل میں ڈال کر رکھ لینا اور اسے بغیر پڑھے پانی میں اال کر پیتے رہنا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''دو تین دن میں تمہاری آنکھیں صاف ہو جائیں گی۔ اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ نیلم کے کمرے میں دو تین دن نہ جاؤ تو اچھا ہے۔''

ماموں فرقان کا اتنا کہنا کافی تھا۔ اکبر ان کی بات کو سمجھ گیا۔ ماموں فرقان کی بات سمجھ کر اس پر اوس پڑ گئی لیکن اب مجبوری تھی۔ حالات اور واقعات جس طرح پیش آ رہے تھے اس کے پیش نظر نیلم سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

ہ جو کوئی بھی تھا یہی چاہتا تھا۔ اکبر اپنی بد نصیبی کو کوستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''ماموں فرقان، دادا غفور کے پاس سے آ رہے ہیں۔'' بابر علی، اکبر کے جانے کے بعد صابرہ سے مخاطب ہوئے۔ ''ان کا خیال ہے نیلم پر اثر ہے۔ کیوں ماموں۔''

''ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر ماموں فرقان نے دادا غفور کے یہاں جو کچھ ہوا تھا اور ں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب پوری تفصیل کے ساتھ دونوں میاں بیوی کو بتا دیا۔

ساری باتیں سن کر بابر علی پریشان ہو گئے لیکن صابرہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

''ماموں میں نہیں مانتی اس اثر وثر کو۔''

''ہاں تم مت مانو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مانو...... تمہارے ماننے سے اثر ختم ہو جائے تو شاید میں اصرار بھی کرتا۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔ ''تم بس اتنا کرو کہ دو تین دن نیلم کو اپنے پاس سلاؤ۔ اکبر کو اس سے دور رکھنا ہے ورنہ اسے کوئی شدید قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی۔ ''خاصا وقت ہو گیا ہے مجھے گھر پہنچنا ہے۔ تم اب مجھے نیلم کے کمرے میں لے چلو مجھے وہ جانا ہے۔''

''اچھا میں کمرہ خالی کراتی ہوں کچھ پڑوس کی لڑکیاں آئی ہوئی ہیں۔'' یہ کہہ کر صابرہ کمرے سے نکل گئیں۔

''ماموں، یہ صابرہ عجیب مٹی کی بنی ہے...... کسی چیز کو مانتی ہی نہیں۔'' بابر علی نے کہا۔

''بھئی تمہیں تو مانتی ہے...... کیا اتنا کافی نہیں۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر جواب دیا۔

''آئیے ماموں۔'' صابرہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

''اچھا۔'' ماموں فرقان اُٹھتے ہوئے بولے۔ ''نیلم کس کمرے میں ہے۔''

''آئیے میرے ساتھ۔'' صابرہ نے کہا۔

ماموں فرقان، نیلم کے کمرے میں پہنچے تو وہاں راشدہ بھی موجود تھی۔ دونوں نے ماموں فرقان کو سلام کیا۔ ماموں نے سلام کا جواب دے کر راشدہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ راشدہ خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ صابرہ اور بابر علی بھی کمرے سے باہر نکل آئے اور دروازہ باہر سے بند کر لیا۔

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی نیلم کی حالت ایک دَم بدل گئی۔ ابھی وہ لجائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس نے اپنا سر اُٹھایا اور غصے بھری نظروں سے ماموں کو دیکھا۔

ماموں فرقان نے اس غصے بھری نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کوٹ کی جیب سے فلیتہ نکالا۔

فلیتے کو دیکھ کر نیلم زور سے ہنسی...... بڑی ہذیانی سی ہنسی تھی اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ ماموں فرقان نے سیدھے ہاتھ میں فلیتہ پکڑ لیا اور بائیں ہاتھ سے جیب سے ماچس نکالنے لگے۔

اب نیلم نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنا دوپٹہ سر سے اُتار کر دور پھینک دیا۔ غصے سے ایک مرتبہ پھر ماموں فرقان کو دیکھا اور بولی۔ ''کیا کرتا ہے۔'' یہ آواز نیلم کی نہ تھی۔ ایک مردانہ آواز تھی۔

''کچھ نہیں فلیتہ جلا رہا ہوں۔'' ماموں فرقان نے بڑے سکون سے کہا۔ ''تم کیوں ناراض ہو رہی ہو۔''

''ہو نہیں رہی، ہو رہا ہوں۔'' نیلم نے پھر کرخت مردانہ آواز میں جواب دیا۔

''کون ہو تم؟'' ماموں فرقان نے دیا سلائی جلاتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ فرقان ہمارے معاملے میں نہ پڑ ورنہ بہت پچھتائے گا۔'' نیلم نے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں جلتی تیلی پر تھیں تبھی تیلی بھڑک کر بجھ گئی۔

''اچھا، شعبدے بازی شروع ہو گئی۔'' ماموں فرقان نے بجھتی ہوئی تیلی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو میں اکبر نہیں ہوں۔''

''ہاں جانتا ہوں تُو اکبر نہیں ہے، تُو اکبر کا دادا ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو کنارہ کش ہو جا۔''

ماموں فرقان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے خاموشی سے تیلی جلائی اور اس کے شعلے کو فلیتے کے قریب لے آئے تبھی تیلی بجھ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دی حالانکہ نیلم اپنی جگہ سے ہلی نہیں تھی۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' ماموں فرقان کو بھی غصہ آ گیا۔ ''اب بجھا کر دکھا تو جانوں۔'' یہ کہہ کر ماموں فرقان نے ماچس سے ایک تیلی اور نکالی اور اس کے مصالحے پر کچھ پڑھ کر پھونکا پھر تیلی جلانے سے پہلے بولے۔ ''تُو کون ہے؟''

لیکن نیلم نے ماموں فرقان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ بڑی حیرت سے تیلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ماموں فرقان نے ماچس پر تیلی رگڑی، شعلہ بھڑکا اس سے پہلے کہ تیلی بجھانے کی کوشش کی جاتی۔ ماموں فرقان نے فلیتے کو آگ دِکھا دی۔ فلیتہ جل اُٹھا۔ ماموں فرقان نے جلتے فلیتے کو نیلم کی آنکھوں کے سامنے کیا اور سختی سے بولے۔ ''ہاں اب بتا کون ہے تُو؟''

''میں سیّد پور کا جن ہوں، فرقان مجھ سے ٹکر نہ لے دیکھ میں تیری زندگی خراب کر دوں گا۔'' نیلم نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بے ہوش ہو گئی۔

فلیتہ اب پورا جل چکا تھا۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں تھا۔ اتنا دھواں کہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کمرے کے اندر آگ لگ گئی ہو۔

ماموں فرقان تب دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ ماموں فرقان نے ہاتھ سے دروازہ بجایا فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا۔

''کیا ہوا ماموں؟'' صابرہ کی پریشان صورت نظر آئی۔

''کچھ نہیں ایک گلاس میں پانی لاؤ۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

صابرہ جلدی سے پانی لے کر آ گئیں۔ بابر علی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ نیلم بے ہوش پڑی ہے اور کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہے۔

ماموں فرقان نے صابرہ سے گلاس ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا۔ پانی پر پھونکیں ماریں اور نیلم کے منہ پر کئی بار چھینٹے دیئے۔ چند لمحوں کے بعد نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔ حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا پھر فوراً ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماموں فرقان نے گلاس اس کی طرف بڑھایا اور بولے۔ ''لو بیٹی پانی پی لو۔''

نیلم نے ماموں فرقان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور صدیوں کے پیاسے کی طرح غٹ غٹ پانی پی گئی اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ زبان پر جیسے کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ پانی پیا تو کچھ ہوش بحال ہوئے۔

''مجھے کچھ ہو گیا تھا کیا۔'' نیلم نے صابرہ سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''یہ کمرے میں دھواں کیسا بھرا ہے؟''

''ابھی نکل جائے گا۔ تم پریشان مت ہو۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں، ابھی آپ میرے کمرے میں آئے تھے پھر خالہ، خالو باہر چلے گئے تھے۔ اتنا مجھے یاد ہے اس کے بعد کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں...... میں بے ہوش ہو گئی تھی۔'' نیلم پریشان ہو کر بولی۔

''ہاں میں تم سے کچھ بات کر رہا تھا کہ تم بات کرتے کرتے بے ہوش ہو گئیں۔'' ماموں فرقان

نے بات ٹالنے کیلئے کہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نیلم کو ابھی یہ بتایا جائے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''نیلم تم پریشان مت ہو، ماموں فرقان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

پھر انہوں نے نیلم کے کمرے سے باہر آ کر بابر، صابرہ اور اکبر کے سامنے بند کمرے کی روداد سنائی۔ صابرہ نے کوئی بات پوچھنا چاہی تو بابر علی نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ''صابرہ پلیز، اب کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ کرنا معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔''

صابرہ نے یہ سن کر خاموشی اختیار کر لی جو کچھ انہوں نے فرقان ماموں کے منہ سے سنا تھا۔ اس پر انہیں یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ماموں فرقان تھوڑی دیر وہاں اور ٹھہرے۔ انہوں نے نیلم کا استعمال شدہ دوپٹہ لیا اور کل ولیمے میں ملاقات کا وعدہ کر کے گھر سے نکلنا چاہا تو بابر علی نے انہیں روکا۔

''ٹھہریں ماموں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ راشدہ ذرا گاڑی کی چابی لانا۔''

ماموں فرقان نے منع بھی کیا کہ وہ آرام سے چلے جائیں گے کوئی ٹیکسی لے کر لیکن بابر علی نہ مانے وہ انہیں ان کے گھر تک چھوڑ کر گئے۔

دوسرے دن وہ شام ولیمے میں شرکت سے پہلے دادا غفور کے یہاں پہنچے۔ انہوں نے دادا غفور کو نیلم کا دوپٹہ دیا اور فلیتہ جلانے سے پہلے اور جلانے کے بعد جو کچھ نیلم سے گفتگو ہوئی وہ دادا غفور کے گوش گزار کر دی۔ دادا غفور نے فرقان ماموں کی ایک ایک بات غور سے سنی۔

''میرا خیال تھا کہ بکارنے میں کچھ وقت لے گا لیکن وہ تو فلیتہ ہی دیکھ کر بکار اُٹھا۔'' دادا غفور نے ماموں فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو وہ سیّد پور کا جن ہے، نام نہیں بتایا اس نے۔''

''نہیں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''نام پوچھنے سے پہلے ہی وہ نیلم کا جسم چھوڑ گیا۔''

''فرقان کچھ کرنا پڑے گا بھئی۔'' دادا غفور نے فکرمند ہو کر کہا۔ ''نہیں تو وہ لڑکی کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ تم نے دولہا کو تو دور رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔''

''جی دادا۔'' فرقان ماموں نے جواب دیا۔ ''زندگی لڑکی کی ہی نہیں لڑکے کی بھی تباہ ہو گی۔''

''اچھا تم یوں کرو نیلم کا دوپٹہ چھوڑ جاؤ میں ذرا اثرات کی گہرائی کا اندازہ کر لوں۔ پھر کچھ کریں گے۔ ہمیں بہرحال دولہا دلہن کو اس خبیث سے نجات دلانا ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، پھر میں کل آؤں گا۔'' ماموں فرقان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''سنو وہ دولہا دلہن کے نام کیا ہے۔'' دادا غفور نے پوچھا۔

''دلہن کا نام نیلم ہے اور دولہا کا نام اکبر۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''اور نیلم کی ماں کا کیا نام ہے۔'' دادا غفور نے پھر پوچھا۔

''واجدہ۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''اکبر کی والدہ کا نام کیا ہے۔'' دادا غفور نے دوبارہ پوچھا۔

''صابرہ۔'' ماموں فرقان نے پھر بتایا۔

''نام سے تو یہ دونوں بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔'' دادا غفور نے خیال ظاہر کیا۔

''جی ہاں واجدہ اور صابرہ آپس میں سگی بہنیں ہیں۔'' ماموں فرقان نے تصدیق کی۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ پھر کل ملاقات ہو گی۔'' دادا غفور نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

ماموں فرقان جب دادا غفور کے فلیٹ سے نیچے اُتر رہے تھے تو سیڑھی پر ان کا توازن بگڑا انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے اُنہیں دھکا دیا ہو۔ سیڑھیوں پر زیادہ روشنی نہ تھی۔ انہوں نے فوراً دیوار کا سہارا لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ماموں فرقان اسے اپنا وہم سمجھ کر محتاط طریقے سے سیڑھیاں اُترنے لگے۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر اچانک انہیں دلدار بٹ یاد آ گیا۔ دلدار بٹ نے انہیں جو کچھ بتایا تھا اس کا تذکرہ انہوں نے ابھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ خیال آیا کہ دادا غفور کو بتا دینا چاہئے تھا۔ خیر کوئی بات نہیں کل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

ولیمہ راشد منہاس روڈ پر بنے بہت سے شادی ہالوں میں سے ایک میں تھا۔ فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی اور اندازہ لگایا کہ ابھی یہ لوگ شادی ہال پر نہیں پہنچے ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ گھر ہی چلا جائے۔

گھر پہنچے تو فرقان ماموں کو معلوم ہوا کہ لاہور سے بھی مہمان پہنچ چکے ہیں۔

اب یہ وقت تھا کہ وہ تمام حقائق سے بابر علی کو آگاہ کر دیں۔ ماموں فرقان، بابر علی کو گھر سے باہر لے آئے اور بولے۔ ''مجھے تنہائی میں تم سے کچھ بات کرنا تھی۔''

''جی ماموں فرمائیں، اس وقت یہاں میرے آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔'' بابر علی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''لاہور میں جب میں صبح کی سیر کو نکلا تھا تو مجھے ایک شخص ملا تھا۔ وہ خود کو فیاض کا پڑوسی کہتا تھا اور نام اس کا دلدار بٹ تھا۔ اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''وہ کیا ماموں؟'' بابر علی نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ نیلم، واجدہ اور فیاض حسین کی سگی بیٹی نہیں ہے۔'' ماموں فرقان نے انکشاف کیا اور یہ انکشاف کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔

یہ انکشاف اتنا حیرت میں ڈالنے والا تھا کہ بابر علی چکرا کر رہ گئے۔

''نہیں ماموں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا...... اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''گویا آپ کو دلدار بٹ کی بات کا یقین ہے۔'' بابر علی نے کہا۔ ''ماموں ذرا سوچیں تو واجدہ، صابرہ کی سگی بہن ہے، وہ اپنی بہن کی آنکھوں میں کس طرح دھول جھونک سکتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے واجدہ سے اس مسئلے پر کبھی پوچھا ہی نہ گیا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ از خود یہ سوچ لیا ہو کہ نیلم، واجدہ کی ہی بیٹی ہے۔''

''نہیں ہم نے از خود نہیں سوچا۔ خود یہ قیاس کر کے نہیں بیٹھ گئے کہ نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی ہوگی۔ بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نیلم مری میں پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے واجدہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی صحت افزاء مقام پر رہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر ہی واجدہ مری چلی گئی تھی اور وہاں نیلم پیدا ہوئی تھی۔ مری سے واپسی پر اس کا خط آیا تھا۔ جس میں نیلم کے بخیر و عافیت پیدا ہونے کا ذکر تھا۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ نیلم، واجدہ کی بیٹی نہیں ہے، میں اس بات کو کس طرح مان لوں۔''

''ماننے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا۔ میں نے بھی اس معاملے میں اس سے بہت بحث کی تھی کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ تب اس نے بتایا تھا کہ وہ نیلم کی اصل ماں کو جانتا ہے۔ اور اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ مجھے اس کی اصل ماں سے ملوا دیتا۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''مجبوری کیا تھی؟'' بابر علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس کی اصل ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''چلو جی قصہ ہی ختم ہوا۔'' بابر علی نے مذاق کے انداز میں کہا۔ ''اور باپ؟''

''وہ ماں کے مرنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔''

''ماموں پھر بھی آپ نے اس بدمعاش کی بات پر یقین کر لیا۔ ماموں یہ صرف تعلقات خراب کرانے کی کوشش ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایک طرف الزام لگا دیا کہ نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی نہیں، دوسری طرف اس کے والدین کو مار دیا۔ اب کر لو کیا کرو گے۔ کس طرح تصدیق کرو گے۔'' بابر علی نے غصے سے کہا۔ ''ماموں آپ نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتایا، میں ذرا اس کمینے سے نمٹتا۔''

''میں نے اس لئے نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہوگی۔''

''بدمزگی تو اس صورت میں ہوتی اگر یہ بات سچی ہوتی، اسی وقت اگر آپ بتا دیتے تو وہ دلدار کا بچہ فوراً ایکسپوز ہو جاتا۔ اس کے عزائم سامنے آجاتے۔ ساری بات کھل کر فیاض کے سامنے ہو جاتی۔''

''بس میں نے چاہا نہیں ویسے اس طرح کی بات پر یقین نہ تھا مجھے میں نے اسے ایک پڑوسی کی ...ی پر محمول سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی تھی۔''

''لیکن اس وقت تو آپ اس انداز سے بات کر رہے ہیں جیسے آپ کو بھی نیلم، واجدہ کی سگی اولاد نہ ہونے کا یقین ہو۔'' بابر علی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے، مجھے اب شبہ ہونے لگا ہے کہ نیلم واقعی واجدہ کی بیٹی نہیں ہے، اب ہمیں چاہئے کہ اس معاملے کی کھوج کریں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اگر نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی نہ نکلے تو اسے فوراً طلاق دلوا دی جائے، ایسی احمقانہ بات میں تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔ اب وہ واجدہ کی بیٹی ہے یا نہیں ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔''

''ماموں آپ کے اس شبہ کی وجہ کیا ہے؟'' بابر علی نے پوچھا۔

''بابر تم کسی سیّد پور سے واقف ہو۔''

''نہیں ماموں میں نہیں جانتا کہ سیّد پور کہاں ہے؟''

''سیّد پور کا خیر مجھے بھی معلوم نہیں۔ کہاں ہے لیکن دلدار نے بتایا تھا کہ نیلم کی ماں سیّد پور کی رہنے والی تھی۔ اور نیلم پر جس جن کا سایہ ہے وہ بھی سیّد پور کا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جن نیلم پر سیّد پور سے آنا شروع ہوا۔ اب اس بات کا سراغ لگانا چاہئے کہ نیلم کا سیّد پور سے کیا تعلق ہے۔''

''اس کا سیّد پور سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟'' بابر علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نیلم کا سیّد پور سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ تم ذرا اس مسئلے پر واجدہ سے بات کر کے دیکھو۔''

''بات تو خیر میں ابھی آپ کے سامنے کر لیتا بس ذرا ولیمے کا خیال ہے۔ ولیمہ ہو جائے پھر رات کو بات کروں گا، اور صبح میں آپ کو بتا دوں گا، ٹھیک ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے، بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ جھگڑا نہ بڑھے۔'' ماموں فرقان نے ہدایت کی۔

''نہیں جھگڑا نہیں بڑھے گا، جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ پہلے تو میں باتوں باتوں میں یہ معلوم کروں گا، یہ سیّد پور کہاں ہے؟ سیّد پور کے پیچھے کوئی کہانی موجود ہے تو واجدہ چونکے بغیر نہ رہ سکے گی۔ واجدہ کے رویے سے معلوم ہو جائے گا کہ سیّد پور کا کیا چکر ہے۔''

''ہاں یہ طریقہ اچھا ہے واجدہ سے انجان بن کر بات کرنا، جو ہوگا سامنے آجائے گا۔''

''اگر یہ بات آپ کے سامنے ہوتی تو اچھا ہوتا۔ آپ کو دلدار بٹ کے حوالے سے بات کرنے میں آسانی ہوتی۔''

''نہیں، ابھی میں سامنے نہیں آنا چاہتا۔ تم فی الحال سیّد پور کا بم چھوڑ کر واجدہ اور فیاض حسین کا

ردعمل دیکھو۔ بلکہ واجدہ اور فیاض حسین سے الگ الگ بات کرو تو زیادہ بہتر ہے اگر کوئی نتیجہ برآمد ہوتو پھر میں درمیان میں آؤں گا اور براہِ راست اس مسئلے پر بات کروں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے؟" بابر علی نے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آیئے، گھر چلیں، وہاں ہماری ڈھونڈ پڑی ہوگی۔" بابر علی اور ماموں فرقان گھر کے اندر پہنچے تو واقعی ان کی ڈھونڈ مچی تھی۔

صابرہ، بابر علی کو ماموں فرقان کے ساتھ دیکھ کر خاموش ہوگئی، انہیں اپنے شوہر کے اس طرح غائب ہوجانے پر بڑا غصہ آرہا تھا، بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ لوگ ولیمے میں جانے کے لئے کھڑے ہیں اور وہ جناب غائب ہوگئے۔ ماموں فرقان نے صابرہ کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اسے اس وقت غصہ آرہا ہے، وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "اس غریب کو معاف کردو یہ میرے ساتھ تھا۔"

"کوئی بات نہیں ماموں۔" صابرہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "آیئے چلیں، سب تیار ہیں۔"

شادی ہال پر پہنچے تو خاصے مہمان آچکے تھے۔ دس بجے کے قریب کھانا شروع ہوا، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد تصویریں اُتاری گئیں، اکبر کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ دیکھکر سب کو پریشانی ہوئی سب نے اس سے باری باری پوچھا۔ وہ بے چارہ آنکھوں کا حال بتاتا بتاتا بے حال ہوگیا۔

کیمروں پر چڑھی فلیش گنوں کے شعلے بار بار اس کی آنکھوں میں کوند رہے تھے۔ تاریک شیشوں کا چشمہ چڑھانے کے باوجود فلیش گنوں کی لائٹ اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھ رہی تھی لیکن وہ تصویریں اُتروانے پر مجبور تھا۔

ولیمہ بخیر و عافیت ہوگیا۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ لوگ اپنے گھر پہنچ گئے۔ فرقان ماموں کھانے کے فوراً بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنے گھر عزیز آباد چلے گئے۔

کوئی ایک بجے تک سب لوگ کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کافی کا دور بھی چلا۔ اس گفتگو کے دوران بابر علی خاصے بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ کسی طرح واجدہ کمرے میں تنہا رہ جائے تو وہ اس سے سیّد پور کا ذکر چھیڑیں لیکن واجدہ کے تنہا رہ جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ آہستہ آہستہ کمرے میں رش کم ہوگیا۔

اب کمرے میں وہ چاروں رہ گئے۔ واجدہ اور فیاض حسین، صابرہ اور بابر علی۔

بابر علی کے دل سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ جب ماموں فرقان نے نیلم کے سلسلے میں انکشاف کیا تھا۔ بابر علی کو یہ جان کو بہت افسوس ہوا تھا۔ افسوس اس بات کا زیادہ تھا کہ بہن نے بہن کو دھوکا دیا تھا اگرچہ ابھی اس بات کی تصدیق نہ ہو پائی تھی لیکن جانے کیوں انہیں یقین سا ہوتا جارہا تھا کہ ماموں فرقان نے جو کچھ کہا ہے حقائق پر مبنی ہے۔ بابر علی اکیلے ہی اس آگ میں جل رہے تھے، ابھی انہوں نے اپنی بیوی صابرہ کو اس میں شامل نہ کیا تھا۔ ولیمے کے دوران کئی بار ان کے جی میں آئی کہ

اس جان لیوا انکشاف کے بارے میں اپنی بیوی کو بتادیں لیکن ہر بار رک گئے۔ یا بتانا بھی چاہا تو کوئی مہمان درمیان میں آگیا۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ پہلے واجدہ سے بات کریں، یا بات کرنے سے پہلے حقیقت صابرہ پر کھول دیں۔

اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ کیا کریں کہ فیاض حسین کو جماہی پہ جماہی آنے لگیں وہ یہ کہہ کر اُٹھ گئے۔

"انہماں میں تو چلا مجھے آرہی ہے نیند۔"

"بھئی مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی آپ چلیں میں آتی ہوں۔" واجدہ نے کہا۔

بابر علی نے فیاض حسین کے کمرے سے نکلنے پر شکر ادا کیا۔ قدرت نے انہیں ایک گولڈن چانس عطا کر دیا تھا۔ اب وہ پورے اطمینان سے واجدہ سے بات کر سکتے تھے۔

بابر علی نے دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر انہوں نے صابرہ کو چائے بنانے کے بہانے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اب وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔

"واجدہ ایک بات تو بتائیں۔" بابر علی نے فوراً اپنی پٹاری کھولی۔

"جی پوچھیں۔" واجدہ نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی خاص بات پوچھنا ہے کیا؟"

"ہاں میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ سیّد پور لاہور سے کتنی دور ہے۔"

"سیّد پور۔" واجدہ نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر بابر علی کو دیکھا جیسے سامنے بابر علی نہ ہو کوئی ہ شیر بیٹھا ہو لیکن یہ کیفیت چند لمحوں تک ہی رہی۔ واجدہ نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ "کون سا سیّد پور مجھے نہیں معلوم آپ کس سیّد پور کی بات کررہے ہیں۔"

"اچھا تم دلدار بٹ کو جانتی ہو۔" اس مرتبہ بابر علی نے دوسری پٹاری کھولی۔

"کون دلدار بٹ؟" واجدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارے تم دلدار بٹ کو بھی نہیں جانتیں۔" بابر علی نے اب واجدہ کے چہرے کا رنگ اُڑتا ہوا محسوس کرلیا تھا۔ سیّد پور کے نام پر وہ چونکی تھی اور دلدار بٹ کے نام پر اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ دال میں کچھ کالا تھا لیکن بابر علی نے اپنی بے نیازی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی وہ تمہارا ...ادانہیں ہے۔"

"لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں۔" واجدہ نے ذرا سا پریشان ہوکر پوچھا۔

"میری اس سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے....." بابر علی نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ پاگل آدمی ہے۔ کئی ماہ تک پاگل خانے میں رہ چکا ہے، پچھلے ہی دنوں وہاں سے واپس آیا ہے۔ اس کی ذہنی حالت اب بھی ٹھیک نہیں۔ وہ لوگوں کو پکڑ کر ان سے عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ آپ

سے بھی کچھ کہہ دیا ہوگا اس نے؟'' واجدہ نے جلدی جلدی بتایا۔

''اچھا۔'' بابر علی نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھ سے اس نے بڑی دلچسپ بات کہی۔''

''وہ کیا۔'' واجدہ کے چہرے پر پھر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

''اس نے مجھے بتایا کہ نیلم تم لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے۔'' بابر علی نے واجدہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں صابرہ چائے کی ٹرے ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی زبان سے نکلنے والا جملہ سن لیا تھا۔ یہ سن کر ان کے ہاتھ میں ٹرے لرز کر رہ گئی۔

''ہیں بابر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس نے کہی آپ سے یہ بات۔''

انہوں نے بمشکل چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور جلدی سے بابر علی کے برابر آکر بیٹھ گئیں اور پریشان ہوکر بابر علی کی صورت تکنے لگیں۔ اب بابر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے چاہئے تھا کہ جیسے ہی نیلم کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ فوراً صابرہ کو بتا دیتا اور اگر اس مسئلے کو راز ہی رکھنا تھا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ صابرہ کے کانوں میں کوئی بات نہ پڑے۔ لیکن دونوں ہی باتیں نہ ہو سکی تھیں۔ نہ تو بابر علی، صابرہ کو پہلے سے کچھ بتا سکا تھا اور نہ اس مسئلے کو راز رکھ سکا تھا اور یہ صورتحال ایسی تھی جو اس کی بیوی صابرہ کے لئے دُکھ کا باعث بن سکتی تھی اور ناراضگی کا سبب بھی۔

تب بابر علی نے اس نازک صورتحال کو قابو میں کرنے کے لئے پینترا بدلا پہلے بابر علی نے ایک زوردار مصنوعی قہقہہ لگایا۔ صابرہ بھی پریشان ہوگئیں وہ بولیں۔ ''ہائے کیا ہو گیا آپ کو۔''

''بھئی صابرہ مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔'' بابر علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لاہور میں مجھے واجدہ کا ایک پڑوسی دلدار بٹ ملا تھا اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا کہ وہ ان لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ یہ بات میں نے تم کو نہیں بتائی تھی اور اس لئے نہیں بتائی تھی کہ مجھے وہ آدمی کچھ ابنارمل سا لگا تھا۔ میں نے سوچا واجدہ سے تصدیق کرکے تمہیں بتاؤں گا تاکہ تمہارے دل میں خواہ مخواہ کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ اب میں نے واجدہ سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ پاگل آدمی ہے اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اسی طرح کی اُلٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔ چلو اب بات صاف ہوگئی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ بدگمان ہونے سے پہلے تصدیق کرلینا چاہئے۔ بتاؤ اگر میں اس وقت واجدہ سے اس معاملے کی تصدیق نہ کرتا تو کیسی تباہی پھیلتی۔''

''ہاں آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے پوچھ لیا۔ ورنہ جانے کیا ہو جاتا۔ آپ ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچتے۔'' واجدہ نے کہا اب اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''میں تو یہ بات سن کر لرز گئی تھی۔'' صابرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صابرہ آپ چائے بنائیں میں ذرا باتھ روم ہوکر آیا۔'' بابر علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ تین منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو صابرہ چائے بنانے کیلئے اُٹھ چکی تھیں اب وہ کیتلی سے چائے اُبال رہی تھی، تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ چائے خاموشی سے پی گئی پھر بابر علی نے کہا۔ ''اچھا بھئی اب میں تو چلتا ہوں، نیند کی آمد آمد ہے۔''

''تو پھر ہم یہاں بیٹھ کر کیا کریں ہم بھی چلتے ہیں۔'' واجدہ نے کہا۔

بابر علی کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ واجدہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ چائے پینے سے پہلے جو بابر علی اُٹھے تھے وہ باتھ روم میں نہیں گئے۔ فیاض حسین کے کمرے میں گئے تھے۔ فیاض حسین سو چکے تھے اور بابر علی اپنی کارروائی مکمل کرکے وہاں سے نکل آئے تھے اب ضروری تھا کہ واجدہ بھی اپنے کمرے میں پہنچ جائے تاکہ انہوں نے جو کمرے میں دام بچھایا تھا اس میں وہ بھی پھنس سکے۔

صبح جب فیاض اور واجدہ کمرے سے نکل آئے تو بابر علی فوراً اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ٹیبل لیمپ کے برابر کتابوں کے درمیان رکھا۔ کتاب جیسا حساس ٹیپ ریکارڈر وہاں سے نکالا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پھر انہوں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کیا اور کیسٹ کو ریورس کر کے ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا۔

واجدہ جب بابر علی کے کمرے سے نکلی تو اس کی کیفیت کشتی کے اس مسافر جیسی تھی جس کی کشتی طوفان میں گھر کر نکل آئی ہو۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے اس نے اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے فیاض حسین کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ واجدہ کو گردن اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

فیاض حسین کو جاگتے دیکھ کر وہ تیزی سے بیڈ کے نزدیک آئی اور تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''خدا کا شکر ہے آج ہم بچ گئے۔''

''کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔'' فیاض نے پوچھا۔

''دلدار بٹ اس کمینے نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا اگر میں اسے پاگل قرار نہ دیتی تو اس نے تو اس بھیانک راز سے پردہ اُٹھا دیا تھا جسے آج تک ہم اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔''

''وہ گدھے کا بچہ بابر کو کہاں سے مل گیا۔ ہم نے تو بابر کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔''

''مجھے نہیں معلوم وہ انہیں کہاں ملا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں۔ لیکن بابر بھائی کی گفتگو کے انداز سے یہ معلوم ہوا کہ اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا ہے، وہ سیّد پور کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ لاہور سے کتنی دور ہے۔''

''ارے یہ تو بہت برا ہوا پھر تم نے بات کو کیسے سنبھالا۔'' فیاض حسین نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''بس اس وقت جانے کیسے میرے دماغ میں یہ بات آ گئی۔ میں نے فوراً اسے ذہنی مریض قرا دیدیا۔ بس اس طرح بات نبھ گئی اور ایک بھیانک حقیقت سے پردہ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔''

''بابر کو تمہاری بات کا یقین آ گیا؟'' فیاض حسین نے سوال کیا۔

''ہاں مجھے محسوس تو یہی ہوا کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی تو صابرہ باجی اندر آ گئی تھیں...... انہیں بابر بھائی نے کچھ نہیں بتایا تھا اس وقت بابر بھائی نے جس طرح قہقہہ لگا کر بات کی اس سے تو یہی انداز ہوتا تھا کہ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا ہے۔'' واجدہ نے بتایا پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''لیکن فیاض اب میرا دل ڈرنے لگا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اب یہ راز کہ نیلم ہماری بیٹی نہیں ہے ظاہر ہو کر رہے گا۔ اور اگر کسی طرح یہ بات ثابت ہو گئی تو میں اپنی بہن کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی۔ شرمندگی ہو گی۔ بہت تباہی پھیلے گی جانے کیا ہو جائے۔''

''ارے کچھ نہیں ہو گا۔ تم فکر مت کرو۔'' فیاض حسین نے یقین سے کہا۔ ''اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے...... آؤ اب سو جاؤ۔''

ٹیپ ریکارڈر پر یہ ساری گفتگو سن کر بابر علی سناٹے میں آ گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سامنے سے گزرتی راشدہ سے کہا۔ ''بیٹا ذرا امی کو بھیجنا۔''

''جی اچھا، ابو۔''

چند منٹ کے بعد صابرہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''آپ نے مجھے بلایا۔''

''ہاں...... میں نے تمہیں بلایا ہے۔ ذرا دروازہ بند کر دو اور میرے پاس آؤ۔'' بابر علی نے کہا۔

''شاید آپ بھول گئے کہ شادی آپ کی نہیں آپ کے بیٹے کی ہوئی ہے۔'' صابرہ بولی۔

''ہاں مجھے معلوم ہے، وقت ضائع مت کرو اور دروازہ بند کر کے اِدھر آؤ۔'' بابر علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ بابر علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ صابرہ کی شوخی ہوا ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے دروازہ بند کیا اور بابر کے نزدیک آ کر بولی۔ ''خیر تو ہے۔''

''خیر کہاں؟'' بابر علی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے چاروں طرف طوفان اُٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ کالی آندھی چل رہی ہے۔ سمندر موجیں مارتا ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔''

''بابر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''تمہاری بہن نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔''

''کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔''

''نیلم واجدہ کی بیٹی نہیں ہے۔''

''لیکن رات کو تو آپ نے کہا تھا کہ......''

''رات کی بات چھوڑ دو۔'' بابر علی نے صابرہ کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یہ ٹیپ سنو۔''

''خدا کا شکر ہے کہ آج ہم بچ گئے۔'' واجدہ کی آواز سنائی دی۔

صابرہ نے اپنے کان پوری توجہ سے ٹیپ کی طرف لگا دیئے۔ جوں جوں واجدہ اور فیاض کی گفتگو آگے بڑھتی جا رہی تھی صابرہ کے ہوش اُڑتے جا رہے تھے۔ وہ گھبرا گھبرا کر بابر علی کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس پراسرار گفتگو کا آخری جملہ سنائی دیا۔ ''ارے کچھ نہیں ہو گا تم فکر مت کرو اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے...... آؤ اب سو جاؤ۔''

جملے کے ختم ہوتے ہی بابر علی نے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں ایک سوگوار سناٹا چھا گیا ایسا لگا جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو۔

موت واقعی ہو گئی تھی یہ اس بھروسے کی موت تھی جو ایک بہن نے دوسری بہن پر کیا تھا۔

صابرہ کو جہاں اپنی سگی بہن کے دھوکا دینے کا دکھ تھا وہاں اسے غصہ بھی تھا۔

''میں اس کمینی کو اپنے گھر میں نہیں رکھوں گی، پتہ نہیں کس ذلیل کی اولاد ہے۔ جب سے ہمارے گھر میں آئی ہے، تباہی پھیلا دی ہے میں اس چڑیل کو طلاق دلوا دوں گی۔''

''صابرہ ...... صابرہ۔'' بابر علی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''ذرا صبر سے کام لو...... اس میں نیلم کا کیا قصور ہے، اسے طلاق دلوا کر کیوں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی ہو۔ سزا دینا ہی ہے تو اپنی بہن کو دو جس نے اتنی بڑی حقیقت کو ہم سے کیوں چھپائے رکھا۔''

''اس کو تو میں ایسی سزا دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔'' صابرہ نے غصے سے کہا۔

''صابرہ تمہیں یاد ہو گا کہ نیلم کی پیدائش پر لاہور سے خط آیا تھا۔ اس خط میں مری میں نیلم کے پیدا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ سب کیا تھا۔'' بابر علی نے صابرہ کو یاد دلایا۔

''وہ ڈرامہ ہی ہو گا۔ پتہ نہیں کس کی لڑکی کو گود لیا ہے۔ اس لڑکی کو اپنی بچی ثابت کرنے کیلئے وہ مری میں رہی۔ ویسے ان لوگوں نے ڈرامہ بڑی کامیابی سے کیا۔ آج تک اس حقیقت کا پتہ نہ چلنے دیا وہ تو بھلا ہو اس آدمی کا جس نے یہ راز فاش کر دیا۔''

''صابرہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' بابر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''وہ کیا۔'' صابرہ بولی۔

''تم ان لوگوں سے لڑو گی نہیں۔'' بابر علی نے کہا۔ ''میں تمہارے غصے سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس غصے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ نیلم کس کی بیٹی ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب وہ ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔''

''میں نیلم کو تو خیر بخش سکتی ہوں لیکن واجدہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گی۔''

''تم کیا کرو گی۔'' بابر علی نے پوچھا۔

''میں اب زندگی بھر اسے نیلم سے نہیں ملنے دوں گی۔ اس نے ہمیں دکھ پہنچایا ہے تو ہم بھی اسے چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ اس نے دھوکا دے کر ہمارے دل کو تڑپایا تو ہم اس سے نیلم کو دور کر کے اسے تڑپائیں گے۔''

بابر علی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے صابرہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی اس کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ واجدہ سے اس مسئلے پر خوب لڑی پہلے تو واجدہ نے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوشش کی لیکن جب صابرہ نے بلند آواز میں ٹیپ سنوا دیا تو دونوں میاں بیوی کی سٹی گم ہو گئی۔ اب دونوں میاں بیوی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بالآخر انہیں اقرار کرتے ہی بنی۔ اس بھیانک حقیقت کا اقرار تو انہیں کرنا ہی پڑا کہ اب اسے چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔ ساتھ میں جو شرمندگی تھی۔ وہ قابل دید تھی۔ دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ نظریں اُٹھتی نہ تھیں۔

شام کو فرقان ماموں آئے تو بابر علی نے پوری روداد سنائی اور وہ ٹیپ کی ہوئی گفتگو بھی سنوا دی۔ ساری تفصیل سن کر ماموں فرقان بولے۔ ''حیرت ہے تمہیں گفتگو ٹیپ کرنے کا خیال کیسے آیا؟''

''ماموں جب میں نے واجدہ سے سیّد پور اور دلدار بٹ کے بارے میں سوالات کئے تو میں نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھی تھیں اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تب میں نے اس کی بات پر یقین کر کے اسے فریب میں مبتلا کر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کمرے میں جا کر فیاض سے اس معاملے میں گفتگو ضرور کرے گی۔ تو میں نے اس کے کمرے میں جا کر ٹیپ ریکارڈر رکھ دیا اور اسے آن کر کے آ گیا۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ آپ نے ساری گفتگو سن ہی لی۔'' بابر علی نے اپنے کارنامے کی تفصیل بتائی۔

''ابھی ایک بات اور چھپائی ہے ان دونوں نے۔'' ماموں فرقان نے ایک اور دھماکا کیا۔

''وہ کیا ماموں؟'' بابر علی نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں اس وقت دادا غفور کے گھر سے آ رہا ہوں۔ انہوں نے اس اثر کے بارے میں اپنے علم کے ذریعے معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ اثر تقریباً چھ ماہ پرانا ہے اور یہ جن سیّد پور سے نیلم کے ساتھ لگا ہے۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ بات بھی دانستہ چھپائی گئی۔'' بابر علی نے کہا۔

''آخر کیوں؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''ظاہر ہے یہ شادی پھر نہ ہوتی جس لڑکی پر جن کا سایہ ہو ایسی لڑکی سے جانتے بوجھتے کون شادی

کرنے کی ہمت کرتا۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''یہ سیّد پور کا راز کیا ہے نیلم آخر وہاں کیوں گئی۔'' بابر علی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

''اس راز سے تو واجدہ ہی پردہ اُٹھا سکتی ہے۔ اسی سے پوچھو۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''میں پوچھوں گی اس سے...... اس طرح پوچھوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔'' صابرہ غصے سے اُٹھی۔

''صابرہ اتنا غصہ مت کرو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' بابر علی نے اسے سمجھایا۔

''اب کون سی میری طبیعت ٹھیک ہے۔ ان لوگوں نے میرے گھر کا سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میرا گھر ایک عذاب میں مبتلا ہے۔'' صابرہ نے بڑے کرب کے عالم میں کہا۔ ''میں جاتی ہوں اسے یہیں بلا کر لاتی ہوں اب جو بھی بات ہو گی سب کے سامنے ہو گی۔ ماموں بھی اس وقت یہاں موجود ہیں۔''

''بہت شدید غصے میں ہے۔'' صابرہ کے جانے کے بعد ماموں فرقان بولے۔

''ماموں ویسے یہ غصے والی بات تو ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جو کبھی کوئی غیر بھی نہ کرتا۔ میرا تو اب اپنوں سے ایمان اُٹھ گیا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں اپنے۔ عذاب میں مبتلا کرنے والے...... ذہنی سکون لوٹنے والے۔ میں صابرہ کے سامنے زیادہ بولا نہیں۔ میں اگر غصہ دکھاتا تو معاملہ آپے سے باہر ہو جاتی لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کو گھر سے کھڑے کھڑے نکال دوں۔'' بابر علی نے کہا۔

''بابر تم سمجھدار آدمی ہو ذرا صبر سے کام لو۔ غصہ کرو گے تو حقائق پوری طرح سامنے نہیں آئیں گے اور اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سامنے پورے حقائق آ جائیں تا کہ نیلم کو اس سے نجات دلوائی جا سکے۔'' ماموں فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''نیلم پر جو سایہ ہے وہ اتنی آسانی سے دور ہونے والا نہیں ہے اس کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔'' ماموں فرقان ابھی بابر علی کو سمجھا رہے تھے کہ دروازے پر زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ واجدہ اور فیاض حسین مجرموں کی طرح گردن جھکائے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور صابرہ بولے جا رہی تھی جو اس کی نوک زبان پر آ رہا تھا۔ وہ بے نقط سنا رہی تھی وہ خاموشی سے سننے پر مجبور تھے۔ ایک تو بیٹی والے تھے اور پر کام ایسے کئے تھے کہ بغیر سنے چارہ نہ تھا۔

جب صابرہ مستقل بولے چلی گئی اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا تب بابر علی نے اسے روکا اور چپ رہنے کی تلقین کی۔ ''صابرہ چپ ہو جاؤ۔''

''میں کیسے چپ ہو جاؤں میرے کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔''

''بھائی صاحب انہیں بولنے دیں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے دیں ہم لوگ واقعی قصوروار ہیں۔ ہم

نے نیلم کے بارے میں حقائق چھپا کر بہت زیادتی کی ہے۔ اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو اسی طرح ردعمل سامنے آتا۔'' فیاض حسین نے بڑے التجا بھرے میں لہجے میں کہا۔

''بھئی فیاض صاحب یہ سب ہوا کیسے؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ماموں میں اب کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ بس ذرا صابرہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔''

''صابرہ بھئی اب تم کچھ نہیں بولوگی۔'' ماموں فرقان نے صابرہ کو تنبیہہ بھرے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان کی ہدایت پر صابرہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ تب فیاض حسین نے کہنا شروع کیا۔ ابتدا اس نے اپنی شادی سے کی۔

واجدہ سے شادی کر کے فیاض حسین بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا، یہ ان کی محبت کی شادی تھی۔ شادی کے بعد فیاض حسین نے سوچا تھا کہ اگر پانچ سال تک بھی ان کے یہاں بچہ نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ فیاض حسین کے برخلاف واجدہ کو بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد ایک گول مٹول پیارے بچے کی ماں بن جائے۔ فیاض حسین کی ماں بھی یہی چاہتی تھی لہٰذا شادی کے ایک سال بعد ہی دونوں ساس، بہو نے ڈاکٹروں کے پاس چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔

معائنے کے دوران جو صورت حال سامنے آئی وہ واجدہ کی زندگی جہنم بنانے کے لئے کافی تھی۔ فیاض حسین نے اس وقت عقلمندی کا ثبوت دیا جو کچھ ڈاکٹروں نے بتایا وہ اس نے اپنی ماں کو نہ بتایا۔ ساتھ ہی اس نے واجدہ کو بھی منع کر دیا کہ وہ بھی ماں سے کوئی تذکرہ نہ کرے، یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ جس دن معائنے کی رپورٹیں ملنے والی تھیں اس دن واجدہ کی ساس کی طبیعت خراب ہوگئی وہ اس کے ساتھ نہ جا سکی۔ تب وہ مجبوراً فیاض حسین کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کلینک پر رپورٹیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے جو روح فرسا خبر سنائی اسے فیاض حسین نے بڑے صبر سے سنا لیکن واجدہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس دن فیاض حسین نے خدا کا بڑا شکر ادا کیا کہ واجدہ کے ساتھ اس کی ماں نہ تھی ورنہ گھر جاتے ہی ماں کا سب سے پہلا مطالبہ یہی ہوتا۔ ''فیاض اس کلموہی کو طلاق دو۔''

اگر طلاق کا مطالبہ نہ بھی ہوتا تو دوسری شادی کا حکم ضرور دیا جاتا۔

فیاض حسین کو ان دونوں باتوں میں کوئی بات منظور نہ تھی۔ وہ واجدہ کو طلاق دینا چاہتا نہ دوسری شادی کا خواہشمند تھا۔ اسے واجدہ ہر قیمت پر عزیز تھی وہ اس کی محبت تھی۔

ماں نے یہ روح فرسا خبر نہ سنی۔ اس سے فیاض کو سہولت ہوگئی۔ فیاض نے واجدہ کو اپنی ماں کے عتاب سے تو بچا لیا لیکن ڈاکٹری معائنے کے بعد واجدہ خود جس آگ میں جلنے لگی اس سے اسے وہ نہ بچا سکا۔

بات کچھ بھی ہوتی لیکن واجدہ گھوم پھر کر بچے پر پہنچ جاتی۔ اب ان کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا

تھا۔ واجدہ کی بے قراری کا وہی عالم تھا۔ ایک رات جب وہ دونوں سونے کے لئے لیٹے تو واجدہ نے کہا۔ ''فیاض ایک بات بتاؤ گے۔''

''ہاں پوچھو۔'' فیاض نے جواب دیا۔

''اپنا چہرہ میری طرف کرلو۔'' واجدہ نے پیار سے کہا۔

''اچھا کوئی بہت خاص بات ہے کیا۔'' فیاض حسین نے کروٹ لے کر اپنا چہرہ واجدہ کی طرف کر لیا۔ ''ہاں.....اب بولو۔''

''تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔'' واجدہ نے ایک عجیب سوال کیا۔

''میری محبت کا حال مجھ سے پوچھتی ہو کیا تم خود نہیں جانتیں۔'' فیاض حسین بولا۔

''میں تمہاری زبانی سننا چاہتی ہوں۔''

''اچھا سنو پھر میری جان تمہارے اندر ہے میں تم سے ہوں۔ تم ہو تو میں ہوں، تم نہ رہیں تو میں بھی نہ رہوں گا۔''

''اور تمہیں بچوں سے کتنی محبت ہے۔'' وہ بولی۔

''میں بچوں کے بغیر ساری زندگی تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔'' فیاض حسین نے بڑے پیار سے کہا۔

''لیکن فیاض میں بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی مجھے ہر قیمت پر بچہ چاہئے۔''

''تم جانتی ہو کہ ڈاکٹر نے تمہارے بارے میں کیا کہا ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں اس نے کہا ہے کہ میں بنجر زمین ہوں، بانجھ ہوں، میری کوکھ سے کوئی بچہ جنم نہیں لے گا۔'' واجدہ نے افسردگی سے کہا۔

''اب تم یہ جانتی ہو تو پھر مجھے بتاؤ بچہ کہاں سے آئے گا۔''

''بچہ!'' واجدہ نے کہا۔ ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائی تھی کہ ان دونوں نے ایک چیخ کی آواز سنی۔ یہ چیخ فیاض حسین کی ماں کے علاوہ کسی کی نہ تھی۔

چیخ کی آواز سن کر دونوں پریشان ہوگئے۔ جس بات کو انہوں نے اتنی رازداری سے سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ شاید وہ بات فیاض حسین کی ماں نے سن لی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بہو کھوکھلا درخت ہے، خشک نہر ہے، بن پانی کا بادل ہے، وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتی، وہ اب کبھی اپنے پوتے کو نہیں کھلا سکتی۔

اس بھیانک حقیقت نے فیاض کی ماں کو شاید ایک جنونی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ تبھی وہ ہذیانی حالت میں تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام لے کر آواز دی تھی۔ ''فیاض۔''

جبکہ روم کا دروازہ مکمل بند نہ تھا، کمرے کی آواز باہر اور باہر کی آواز بآسانی اندر آسکتی تھی۔
اپنی ماں کی چیخ سن کر فیاض تڑپ کر اُٹھا۔ اس نے چپل بھی نہ پہنے۔ ننگے پاؤں باہر ہی بھاگا۔ ا
کی ماں راہداری میں چاروں خانے چت لیٹی تھی اور اس پر بے ہوش طاری تھی۔

فیاض نے اپنی ماں کے چہرے کو اِدھر اُدھر ہلایا لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

''فیاض، جلدی کریں، اماں کو اسپتال لے چلیں۔'' واجدہ نے اپنی ساس کو بے ہوش دیکھ کر کہا۔
تب فیاض نے اپنی ماں کو گود میں اُٹھایا۔ اُٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا، واجدہ نے اپنی سا
سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے کتنی بار اسے آواز دی۔ ''اماں، اماں۔''

لیکن اماں تک بہو کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ اماں کی سانس اُکھڑ رہی تھی۔ اسے رک رک
سانس آرہی تھی۔ ''فیاض جلدی کرو۔'' واجدہ نے بے قراری سے کہا۔ فیاض سے گھبراہٹ میں گا
اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ہی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ واجدہ کا بھی یہی
تھا۔ اس نے بھی کپڑے تبدیل نہ کیے تھے۔ ویسے یہ وقت کپڑوں کا خیال رکھنے کا نہ تھا، اماں کا خ
رکھنے کا تھا۔

فیاض کو اپنی ماں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر اسپتال پہنچ جائے۔
کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ اسے اس بات کا شبہ زیادہ تھا کہ اماں نے کم
میں ہونے والی گفتگو سن لی تھی اور اس گفتگو کو سن کر وہ اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔

اسپتال کا ایک بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر تنویر اس کا دوست تھا۔ اتفاق سے اس وقت وہ ڈیوٹی پر تھا۔ اس
وجہ سے مریضہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کو خاص نگہداشت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

لیکن اب اماں کو کسی نگہداشت کی ضرورت رہی تھی، نہ علاج کی۔ وہ اپنے خالق حقیقی سے
تھیں۔ ان کا انتقال گاڑی میں ہی ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر تنویر نے محض دل کی تسلی کیلئے اس کا معائنہ کیا تھ

ڈاکٹر تنویر نے بعد میں اماں کے انتقال کی وجہ دل کا شدید دورہ بتایا۔

اس راز سے پھر کبھی پردہ نہ اُٹھ سکا کہ اماں نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی، اور اپنی بہو
بے سایہ ہونے کے صدمے نے انہیں دل کے دورے میں مبتلا کر دیا تھا یا انہیں اپنے کمرے
دل کا دورہ پڑا اور وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔ دورہ کیونکہ شدید تھا سنبھل نہ سکیں
چیخ مار کر گر گئیں۔

بہر حال کچھ بھی ہوا ہو، اماں اب اس گھر میں نہ رہی تھیں۔ کوئی بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اس
آنگن پہلے ہی سُونا تھا، اب سارا گھر ہی سُونا ہو گیا تھا۔

واجدہ کو اپنے شجر بے سایہ ہونے کا پہلے ہی کیا کم صدمہ تھا کہ اب اس کے سر سے ہی سایہ اُ

تھا۔ یہ گھر اب اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ اماں تھیں تو وہ ان سے باتیں کر کے اپنا جی بہلا لیا کرتی
تھی۔ اب گھر میں کوئی نہ رہا تھا کس سے باتیں کرتی۔ فیاض مصروف آدمی تھا۔ اس کا ایک فلم ڈسٹری
بیوشن آفس تھا۔ وہ صبح کا نکلا شام کو گھر پلٹتا، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ دفتر سے ہی اسٹوڈیو چلا جاتا۔ وہاں
سے پھر رات گئے واپسی ہوتی۔ اس اثنا میں واجدہ اتنے بڑے گھر میں، کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح
اس کمرے سے اس کمرے میں اور اس کمرے سے صحن میں منڈلاتی رہتی۔ وہ ایک سمجھدار عورت تھی۔
اپنے شوہر کے کام کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لئے وہ اس سے کبھی نہ اُلجھتی۔ وہ جب
بھی گھر آتا اس کا مسکرا کر استقبال کرتی۔

ویسے بھی یہ وہ مرد تھا جس نے اس سوکھی ٹہنی کو گلے کا ہار بنایا ہوا تھا۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا
تھا پھر وہ اپنی تنہائیوں کا رونا رو کر، اسے جلدی گھر آنے پر کیوں مجبور کرتی۔

فیاض کو تو ویسے ہی اس کا بہت خیال تھا۔ اس نے ایک ملازمہ اس کیلئے رکھ دی تھی۔ واجدہ گھر میں
کل وقتی ملازمہ رکھنے کی قائل نہ تھی۔ اسے گھر میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا زیادہ پسند تھا۔ لہٰذا جب تک
اماں زندہ رہیں، اس نے فیاض کے کہنے کے باوجود گھر میں کبھی ملازمہ نہ رکھی۔

فیاض نے اب ملازمہ رکھی تو واجدہ نے سختی سے انکار نہ کیا۔ اس نے سوچا چلو گھر میں ایک سے دو
بھلے کام وام تو ایسا کوئی خاص نہ تھا۔ بس باتیں ہی باتیں تھیں۔

حسنہ اچھے مزاج کی عورت تھی۔ سمجھدار تھی جلد ہی دونوں کا ایک دوسرے میں دل لگ گیا۔ حسنہ،
حسینہ کی بڑی بہن تھی، حسینہ ایک ایکسٹرا گرل تھی۔ وہ ڈانس ڈائریکٹر عزیز کے گروپ میں تھی۔ گروپ
ڈانس کے موقع پر حسینہ کو دو چار شاٹ دینے کے لئے بلا لیا جاتا۔ حسینہ صورت وشکل کی اچھی تھی۔ وہ
اس کوشش میں تھی کہ اب ناچ گانوں سے ہٹ کر کوئی چھوٹا موٹا رول مل جائے۔ اس سلسلے میں وہ
فلمسازوں کے دفتروں کے چکر کاٹتی رہتی تھی۔ ایک دن فیاض حسین سے بھی ٹکرا گئی۔ فیاض نے کوشش
کر کے دو ایک فلموں میں اسے چھوٹے موٹے رول دلوا دیئے۔ وہ اس سلسلے میں اس کی بہت ممنون
تھی اور اکثر اس کے دفتر آتی رہتی تھی۔ ایک دن فیاض نے اس سے کسی ملازمہ کے بارے میں پوچھا
کہ اگر اس کی نظر میں کوئی شریف اور ضرورت مند عورت ہو تو بتائے۔ تب حسینہ نے اپنی بہن حسنہ کا
نام لیا۔ اس کے شوہر نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا وہ اپنی بہن حسینہ کے پاس آگئی تھی۔ حسنہ کا
شوہر اسے برے راستے پر ڈالنا چاہتا تھا جبکہ وہ اس کے لئے راضی نہ تھی۔ تب اس نے دھکے دے کر
اسے گھر سے نکال دیا۔

فیاض نے سوچا، چلو مظلوم عورت ہے، گھر میں پڑی رہے گی۔ واجدہ کا جی بھی بہل جائے گا اور وہ
گھر کا کام کاج بھی سنبھال لے گی۔ یہ سوچ کر اس نے حسنہ کو اپنے دفتر بلوایا۔

عورت اسے سلیقے کی محسوس ہوئی۔ اس نے اسے فوراً اپنے گھر میں ملازمت دے دی۔ حسنہ۔ بہت جلد واجدہ کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔

حسنہ سولہ سال کی تھی، تب اس کی شادی ہوئی۔ اب اس کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اس میں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔ اُس کے بعد سے پھر کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔

حسنہ سیّد پور بیاہی تھی۔ وہ تھوڑا بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے لفظوں کی پہچان تھی جبکہ اس کا شوہر نپ اَن پڑھ تھا۔ ان کے پاس اپنی زمین کوئی نہ تھی۔ وہ دوسروں کے کھیتوں میں کام کر کے روزی حاصہ کرتا تھا۔ حسنہ کے شوہر کو مستقل کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ دو دن کام کرتا تو دو دن آرام، کھیہ تماشے کا بڑا شوقین تھا۔ سیّد پور میں کبھی کوئی چلتا پھرتا سینما آجاتا تو وہ کام کو بھول کر ''منڈوا'' کے چَ لگاتا رہتا۔

حسنہ نے یہ چار سال اس کے ساتھ بڑے عذاب میں گزارے۔ اس نے خود محنت مزدوری کی خود بھوکی پیاسی رہی، فاقے کیے مگر مست رہی۔ کبھی اس نے زبان سے اُف بھی نہ کی۔ مگر جب اس شوہر بالکل پٹری سے اُتر گیا اور اس نے حسنہ کو پیسے کمانے کی مشین بنانا چاہا تو وہ ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

''وزیرے یہ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا۔ ''میں فاقے کرسکتی ہو لیکن اپنی چادر کو نہیں فروخت کرسکتی۔ تُو یہ بات اپنے دماغ سے نکال دے کہ میں تیرے بنائے ہو۔ گندے راستے پر چلوں گی۔''

''میرے راستے پر نہ چلی تو یاد رکھ پھر سارے راستے بند ہو جائیں، البتہ ایک راستہ کھل جائے اور وہ ہے تیرے گھر کا راستہ واپسی کا راستہ۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''ہاں میں واپس چلی جاؤں گی۔'' حسنہ کو بھی غصہ آگیا۔

''پھر میں تجھے کبھی نہ بلاؤں گا۔'' اس نے دھمکی دی۔

''میں کبھی نہ آؤں گی۔'' حسنہ نے دھمکی قبول کرلی۔

پھر حسنہ نے انتظار نہ کیا اسی دن گاڑی میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے تانگے میں بیٹھ دھرم پورے پہنچی۔ دھرم پورے میں اس کی ماں رہتی تھی، ایک چھوٹی بہن تھی حسینہ۔ ایک بھائی بھی لیکن باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر سے منہ موڑ لیا تھا۔ اب وہ کہاں تھا کوئی نہ جانتا تھا، اس ماں دوسرے گھروں میں کام کر کے کچھ کما لیتی تھی۔ حسینہ فلم لائن میں ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ وہ ماں بوجھ نہ تھی۔ اپنا خرچہ خود نکال لیتی تھی۔ حسنہ گھر میں داخل ہوئی تو اس نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ کہ کچھ ہوگیا ہے۔ وہ ماں کو دیکھ کر اس کے گلے لگ گئی اور خوب روئی۔ اتنا روئی کہ اس کی ہچکیا بندھ گئیں۔ ماں نے اسے بمشکل الگ کر کے پانی پلایا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر بولی

''وزیرے نے تجھے نکال دیا ہے۔''

''ماں تُو نے مجھے کہاں بیاہ دیا، اسے تو معلوم ہی نہیں عورت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو عورت کو مزے دار ان سمجھتا ہے۔ چبایا اور تھوک دیا۔ ماں میں مر جاؤں گی مگر اب وزیرے کے گھر نہیں جاؤں گی۔ ان چار سالوں میں اس نے اتنے دُکھ دیئے ہیں کہ تجھے کیا بتاؤں، ماں وہ بالکل نکھٹو ہے، وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہی نہیں، وہ تو اپنی عورت سے کام کرانا چاہتا ہے۔ ماں وہ بہت بُرا شوہر ہے جس پر تھوکا تو جاسکتا ہے اس کے ساتھ رہا نہیں جاسکتا۔'' حسنہ کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرنے لگے۔

''تو تھوک آتی اس پر۔'' ماں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ماں میں اس پر تھوک آئی ہوں۔'' حسنہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ تجھے لینے آیا تُو نہ جائے گی۔'' ماں نے پوچھا۔

''اوّل تو وہ مجھے لینے نہیں آئے گا، میں اس کے مطلب کی عورت نہیں ہوں۔ اگر وہ بھولا بھٹکا آیا تو میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' حسنہ نے بڑے پُر وثوق انداز میں کہا۔

''چاہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہی کیوں نہ ہو جائے۔'' ماں نے پھر پوچھا۔

''اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں اپنی عورت کی غیرت اور عزت جاگ گئی تو پھر میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' حسنہ نے فیصلہ سنایا۔

''یہ عورت بھی اللہ میاں نے کیا چیز بنائی ہے۔'' اس کی ماں نے ہنس کر کہا۔

''اللہ نے تو بہت اچھی چیز بنائی ہے، ماں۔'' حسنہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ان مردوں نے اس کا ناس کر دیا ہے۔ اتنا گرا دیا ہے کہ وہ بلندی پر کھڑی ہونا بھی چاہے تو نہ ہو سکے۔''

اس طرح کی باتیں جب وہ واجدہ سے کرتی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ حسنہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی وہ بس لفظ آشنا تھی لیکن وہ باتیں بہت سمجھداری کی کرتی تھی۔ واجدہ اس سے اس کی باتیں سنتی تو بات کٹ جاتی۔ ایک اچھی خاصی سلیقے مند لڑکی کو کیسا جاہل اور دیہاتی مرد نصیب ہوا تھا۔ اگر کوئی اچھا سمجھدار شوہر ہوتا تو ایسی پیاری بیوی کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ حسنہ، حسینہ سے کہیں خوبصورت تھی اگر وہ فلم لائن میں جانا چاہتی تو شاید اسے جلد کام مل جاتا لیکن اسے اداکاری سے دلچسپی نہ تھی۔ اپنی چھوٹی بہن حسینہ سے بالکل مختلف تھی۔ واجدہ اکثر اس کے بارے میں سوچتی کہ اگر حسنہ تعلیم یافتہ ہوتی اور کسی کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتی تو آج وہ کسی گھر میں ملازمہ کے بجائے ...تی لیکن قسمت بھی آخر کوئی چیز ہے۔ شاید یہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اللہ لڑکیوں کو صورت نہ دے ان ان کے مقدر اچھے کرے۔ اچھا مقدر بُری صورتوں کو بھی اچھا بنا دیتا ہے لیکن اچھی صورتوں سے ...را اچھے نہیں ہوتے۔

حسنہ، واجدہ کے گھر میں آ کر بہت خوش تھی۔ واجدہ اسے ملازمہ نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اسے عزت نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس کی قدر کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے حسنہ کو اس گھر کا تمام حال معلوم ہو گیا واجدہ نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اپنے سارے دکھ بیان کر دیئے۔

جب حسنہ، واجدہ کا دُکھ سنتی تو سوچتی کہ یہ دکھ صرف غریبوں کے پلو سے ہی نہیں بندھے بلکہ یہ ہر اس جگہ مل جاتے ہیں جہاں یہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں بھی دُکھ ہوں گے۔ اللہ بڑا انصاف وا ہے۔ جب وہ کچھ دیتا ہے تو کچھ چھین بھی لیتا ہے۔ اچھی صورت دی تو اس سے خوشحالی چھین لی خوشحالی دی تو اولاد سے محروم کر دیا۔ بے پناہ دولت سے نوازا مگر ایسی بیماری دے دی کہ ڈبل روٹی ایک پیس کے سوا کچھ نہ کھا سکے۔ دولت مند ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ہر غم سے آزاد ہے۔

واجدہ کا دکھ اسے آٹھ آٹھ آنسو رُلاتا۔ حسنہ ایک دردمند دل رکھنے والی عورت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی مالکن کا دکھ کس طرح بٹائے۔ وہ جن پیروں، فقیروں کو جانتی تھی وہاں سے تعو گنڈے لے آئی تھی لیکن تعویذوں گنڈوں سے کبھی اولاد پیدا ہوتی ہے اور ایسی صورت میں جب عورت کسی سوکھی ٹہنی کی طرح ہو۔

جب سے حسنہ اس گھر میں آئی تھی اور واجدہ کے دکھ سے آشنا ہوئی تھی۔ وہ تواتر سے ایک خوا دیکھتی تھی۔ وہ خواب میں دیکھتی کہ ایک بہت خوبصورت باغ ہے۔ چاروں طرف سبزہ ہے، پھول ہی پھول ہیں، پھولوں کے درمیان ایک سولہ سترہ سال کی نہایت حسین لڑکی بیٹھی ہے۔ واجدہ اس لڑ کے قریب جاتی ہے تو وہ لڑکی اس کے پاس آ جاتی ہے۔ تبھی حسنہ کہیں سے نمودار ہوتی ہے اور واجدہ اس لڑکی کے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے اور واجدہ سے کہتی ہے بی بی جی، اس لڑکی کو اپنے گ سے لگا لیں۔ یہ آپ کی بیٹی ہے۔'' یہ سن کر واجدہ بہت خوش ہوتی ہے اور اس حسین جمیل لڑکی کو ''میر بیٹی۔'' کہہ کر گلے سے لگا لیتی ہے۔

یہ خواب حسنہ نے سیکڑوں مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ خواب اسے اسی طرح نظر آتا تھا اس میں کوئی تر اضافہ نہ ہوتا تھا۔

ایک دن صبح حسنہ سو کر اُٹھی تو اس کی طبیعت کچھ بھاری بھاری سی تھی۔ متلی کی سی کیفیت ہو رہی تھی وہ اُٹھ کر باتھ روم گئی تو وہاں اسے قے ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

جب ذرا اس کی طبیعت سنبھلی اور اُبکائیوں سے اس کو نجات ملی تو واجدہ نے حسنہ کو لیڈی ڈاکٹر دکھایا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے امید سے ہونے کی نوید سنائی۔

حسنہ گھر آ کر واجدہ سے لپٹ گئی۔ واجدہ نے پوچھا۔ ''بہت خوش ہو۔''

''ہاں بی بی جی، میں بہت خوش ہوں، مجھے میرے خواب کی تعبیر ملنے والی ہے۔'' حسنہ نے خوش ہو کر کہا۔

''کیا مطلب۔'' واجدہ سمجھ نہ پائی۔

''بی بی جی، میں خواب بہت کم دیکھتی ہوں اور کبھی دیکھتی ہوں تو وہ ہمیشہ سچے نکلتے ہیں۔'' حسنہ بولی۔

''ایسا کیا خواب دیکھ لیا تم نے۔'' واجدہ نے وضاحت چاہی۔

''میں آپ کو بتاؤں۔ اچھا میں نہیں بتاتی۔ آپ بتایئے کہ کیا ہوگا۔ لڑکی یا لڑکا۔'' حسنہ نے پوچھا۔

''لڑکا ہوگا۔'' واجدہ نے اسے خوش کرنے کے لئے ایسے ہی کہہ دیا۔

''نہیں بی بی جی میں آپ کو ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ لڑکی ہوگی، میرے خواب بڑے سچے ہوتے ہیں۔''

''اری حسنہ تُو اللہ والی بنتی جا رہی ہے۔ بڑی پیشگوئی کرنے لگی ہے۔'' واجدہ نے ہنس کر کہا۔

''بی بی جی، آپ کو یاد نہیں۔ میں نے جب بھی وہ خواب دیکھا ہے، آپ کو بتایا ہے، کیا آپ کو میرا وہ خواب یاد نہیں۔'' حسنہ نے کہا۔

''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' واجدہ مسکرا کر بولی۔

''بس پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کی بیٹی آ رہی ہے۔'' حسنہ نے انکشاف کیا۔

''حسنہ تُو جو بات کہہ رہی ہے، اس کا مطلب سمجھتی ہے نا۔'' واجدہ نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، میں جو بات کہہ رہی ہوں، اس کا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔'' حسنہ نے بڑے یقین سے کہا۔

''کیا واقعی، یہ میری بیٹی ہوگی۔'' واجدہ خوشی سے جھوم کر بولی۔

''ہاں، بی بی جی، مجھ سے آپ کا دکھ نہیں دیکھا جاتا میں سوچتی رہتی تھی کہ آپ کے کسی طرح کام آ جاؤں۔ میں سوچتی رہتی تھی اور خواب دیکھتی رہتی۔ آج میری سوچ، میرا خواب حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آنے والا بچہ جو یقیناً لڑکی ہے، آپ کا ہوگا۔ میں اسے پہلے ہی دن سے آپ کی گود میں ڈال دوں گی۔ پھر آپ کو کوئی نہ کہہ سکے گا کہ آپ بانجھ ہیں، میں آپ کو ماں بنا دوں گی۔'' حسنہ نے واجدہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

واجدہ کو بچے کی بڑی خواہش تھی اور جب سے اسے اپنے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ زندگی بھر بچے کی ماں نہ بن سکے گی تب سے بچے کی خواہش اور شدید ہو گئی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کسی چیز سے محرومی اس چیز کے لئے شدت اختیار کر لیتی ہے اسے حاصل کرنے کی تڑپ بڑھ جاتی ہے۔

واجدہ کی محرومی دیکھ کر، فیاض اس سے کسی کا بچہ گود لینے کا مشورہ دیتا لیکن واجدہ یتیم خانے سے بچہ لا کر پالنا نہ چاہتی تھی۔ وہ ایسا بچہ گود لینا چاہتی تھی جو پہلے ہی دن سے اس کی گود میں آ جائے اور پھر اس کے والدین اس بچے سے کوئی غرض نہ رکھیں۔ وہ اس بچے کو اپنا بچہ مشہور کر کے پالنا چاہتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ فیاض کے کہنے کے باوجود اس نے کسی بڑے بچے کو گود لینے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اب یہ موقع خود بخود اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ اس سنہری موقع سے ہر قیمت پر فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔

حسنہ کے سامنے ایک پہاڑ سی زندگی پڑی تھی۔ اسے بچے کی ایسی خواہش نہ تھی اور ان حالات میں کہ غربت اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ نکھٹو شوہر سے واسطہ تھا۔ وہ اولاد کا روگ پال کر کیا کرتی پھر جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی، تب سے اسے پتہ چلا کہ خلوص اور محبت کیا چیز ہے۔ اسے واجدہ بہت پسند تھی اس سے اپنی مالکن کا دُکھ نہ دیکھا جاتا تھا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ وہ اُمید سے ہے، اس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے آنے والے بچے کو واجدہ کی گود میں ڈال دے گی۔

واجدہ نے اس خوشخبری کو فوراً فیاض کو بتایا، فیاض نے اس کی باتیں غور سے سنیں اور پھر بولا واجدہ، بچہ گود لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن بعد میں یہ نہ ہو کہ بچہ بڑا ہو جائے تو وہ ہمارے دَر پر آ کر کھڑی ہو جائے کہ میرا بچہ واپس کرو، ذرا اس کو پکا کر لینا۔ وہ بچہ ہمارے حوالے کر کے بھول جائے۔ ایک تو کبھی اپنا بچہ ہونے کا دعویٰ نہ کرے، دوسرے اس راز کو ہمیشہ راز رکھے۔ اس لئے کہ ہم اسے اپنا بچہ بنا کر پالیں گے۔ بڑے ہو کر کبھی اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ہماری اولاد نہیں ہے تو اس کی شخصیت متاثر ہو گی۔"

"یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں اس سے ساری بات پکی کر لوں گی۔" واجدہ نے کہا۔

دوسرے دن واجدہ نے حسنہ کے سامنے سارے خدشات ظاہر کر دیئے۔ وہ بولی۔ "دیکھ حسنہ آج تُو جوش میں ہے۔ میری محبت میں، یا مجھے دُکھی دیکھ کر تُو نے مجھے اپنا بچہ دینے کی ہامی بھر لی ہے لیکن ایک بات میں تجھے صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ اگر تُو نے ایک مرتبہ بچہ میری خالی گود میں ڈال دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچہ بڑا ہو جائے پھر تُو اسے دیکھے، تیری ممتا جوش مارے اور اس جوش میں تُو ہم سے اس کی واپسی کا مطالبہ کر دے۔ ایک بات تو اچھی طرح کان کھول کر سن لے بچے سے تیرا دعویٰ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ تُو اس راز کو ہمیشہ راز رکھے گی۔ کسی پر ظاہر نہیں کرے گی، حتیٰ کہ بچے پر بھی نہیں۔ بچہ دیکھنے کی تجھے اجازت ہو گی۔ صرف دیکھنے کی، زبان پر تیری ایک لفظ نہ آئے گا۔"

"بی بی جی آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ بچہ آپ نے مجھ سے مانگا نہیں، میں نے آپ کو خود دینے کی پیشکش کی ہے۔ پھر میں آپ سے اسے واپس کیوں مانگوں گی۔ آپ نے میرا مشکل وقت میں ساتھ دیا ہے میں اس گھر میں ایک معمولی ملازمہ کی طرح آئی تھی لیکن آپ نے مجھے ملازمہ کب سمجھا۔ آپ نے مجھے عزت دی، مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھا۔ میں آپ سے اس قدر محبت کرتی ہوں کہ اگر مجھ سے میری جان بھی مانگیں تو اس کے نذر کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لوں گی۔ بچہ تو کوئی چیز نہیں، میں بچہ آپ کے اس طرح حوالے کروں گی کہ اس پر میرا حق بخود بخود ختم ہو جائے گا آپ دیکھتی جایئے۔"

حسنہ کی یہ پیشگوئی کہ اس کے بطن سے لڑکی جنم لے گی۔ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اس طرح وہ خواب تواتر سے دیکھتی تھی، سچ ثابت ہو گیا۔ لڑکی کو واجدہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔
"بی بی جی اس لڑکی کو اپنے گلے سے لگا لیں یہ آپ کی بیٹی ہے۔"

تب واجدہ نے حسنہ سے اس بچی کو لے کر بے اختیار آنکھوں سے لگا لیا۔

"میری بچی۔" کہہ کر واجدہ نے اسے کلیجے سے بھینچ لیا۔ پھر حسنہ نے اپنی پھول سی بچی اس طرح واجدہ کے حوالے کی کہ اس کا حق خود بخود ختم ہو گیا۔ یہاں بھی اس کا کہا سچ ثابت ہو گیا۔

حسنہ نے واجدہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہم لاہور چھوڑ کر کہیں اور چلتے ہیں لیکن جانے سے پہلے ایک ڈرامہ کرنا ہو گا۔

واجدہ نے پوچھا۔ "کیسا ڈرامہ۔"

حسنہ نے کہا۔ "آپ اپنے خاندان میں اُمید سے ہونے کا اعلان کر دیں۔ یہ بات سب میں مشہور کر دیں کہ آپ کو اللہ نے بچے سے نواز دیا ہے اور وہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے کہ آپ بانجھ ہیں۔ آخر تو ڈاکٹر ہی ہوتے ہیں اللہ میاں نہیں ہوتے، اولاد سے نوازنے والا اللہ ہے، ڈاکٹر نہیں۔"

یہ بات سن کر واجدہ خوش ہو گئی، وہ یہی چاہتی تھی۔ بچہ ہر صورت میں اس کا کہلائے کوئی یہ نہ کہے کہ گود لیا ہے۔ حسنہ کی تجویز پر سوچ بچار کے بعد ایک مکمل منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبہ کا ہر طرح سے جائزہ لیا گیا، کہیں اگر کوئی جھول تھا تو اسے دور کیا گیا۔

یہ بات پورے خاندان، رشتے داروں، پاس پڑوس اور محلے میں مشہور کر دی گئی کہ واجدہ کی اللہ نے گود بھر دی ہے۔ یہ خبر واجدہ نے اپنی بہن صابرہ کو بھی کراچی بھجوا دی۔ صابرہ کا فوراً خط آیا اس نے ڈھیروں مبارکبادیں دی تھیں اور دعا کی تھی کہ واجدہ تخلیق کے اس مرحلے سے بخیر و خوبی گزر جائے۔

پھر اعلان ہوا۔ یہ اعلان تقریباً تین ماہ بعد ہوا کہ واجدہ کی خصوصی حالت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اسے صحت افزا مقام پر لے جایا جائے۔ ورنہ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق بچے کی پیدائش میں پیچیدگیاں پڑنے کا امکان تھا۔ اس طرح واجدہ کو مری روانہ کر دیا گیا۔ وہاں ایک ڈاک بنگلے میں اس کی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ کام کاج کیلئے حسنہ موجود تھی۔

چھ ماہ واجدہ مری رہی۔ حسنہ نے وہاں ایک بہت خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ حسنہ نے یہ بات کہ وہ اُمید سے ہے اس نے اپنے گھر والوں سے بھی چھپائی تھی۔ اس کی ماں اور بہن کو بھی معلوم نہ تھا۔ انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ اپنی مالکن کے ساتھ مری گئی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ بات تین افراد کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھی کہ یہ بچی واجدہ کی نہیں حسنہ کی ہے۔ اور جب سب کو یہ معلوم تھا کہ واجدہ نے مری میں ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا ہے تو حسنہ کا حق خود بخود اس بچی پر سے ختم ہو گیا۔ اب اگر وہ

آئندہ یہ دعویٰ بھی کرتی تو کون اس کی بات پر یقین کرتا۔

مری سے واپس آنے کے بعد واجدہ نے صابرہ کو بہت خوبصورت بچی پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ صابرہ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اسے مبارکباد کا خط لکھا اور بچی کی زندگی کے لئے ڈھیروں دعائیں بھیجیں۔ اس طرح یہ راز صابرہ پر بھی آشکار نہ ہوسکا کہ واجدہ نے دراصل بچے کو جنم نہیں دیا بلکہ اس نے بچے کی پیدائش کا محض سوانگ بھرا تھا۔

حسنہ، واجدہ کے ساتھ بچی کی پیدائش کے بعد تقریباً چار سال رہی۔ پھر اس کا شوہر وزیر علی اسے لینے آپہنچا۔ اب وہ سدھر گیا تھا۔ اس نے گناہوں سے توبہ کرلی تھی۔ کام کاج بھی کرنے لگا تھا۔ اس عرصے میں کوئی چکر چلا کر دبئی کا پھیرا بھی مار آیا تھا۔ اب سیّد پور میں اس نے زمین خرید لی اور ایک آٹا پیسنے کی چکی لگالی تھی۔ ان چار سالوں میں اس نے ایک شادی بھی کرلی تھی لیکن اس کی نئی بیوی نے اس کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔

تب اسے حسنہ کی یاد شدت سے آئی اور وہ سیدھا بھاگ کر لاہور پہنچا تھا۔ حسنہ کی ماں کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ اپنی غلطیوں کی رو رو کر معافی مانگی تھی۔ تب حسنہ کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہتی وہ سمن آباد میں رہتی ہے اور اس نے اس کا گھر نہیں دیکھا۔ حسینہ نے دیکھا ہے۔ شام کو وہ آئے تو اس کے ساتھ چلے جانا۔

یہ سن کر وزیرے کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سمن آباد میں کس کے ساتھ رہتی ہے۔ کہیں اس نے شادی تو نہیں کرلی۔ لیکن وہ شادی کیسے کرسکتی ہے اس نے ابھی حسنہ کو طلاق کہاں دی ہے۔ جس شبے نے اس کے سر میں اپنا پھن پھیلایا تھا اس کا اظہار اس نے اپنی ساس کے سامنے کردیا۔

''کیا حسنہ نے شادی کرلی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''وزیرے تُو نے میری پھول سی بیٹی کو بڑے دکھ دیئے ہیں، اب تُو باز آجا۔'' ماں نے تلخی سے کہا۔ ''وہ شادی کیسے کرے گی اسے تو شادی کے نام سے ہی نفرت ہوگئی ہے۔ تُو نے میری بیٹی کو بہت ستایا ہے۔''

یہ سن کر وزیر علی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ یہ اچھا تھا لیکن وہ کس کے ساتھ، کس کے گھر پر رہ رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی اسے کوئی بھی اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا۔ وزیرے کے گندے دماغ میں پھر کیڑے کلبلانے لگے۔ وہ اسی طرح سوچ سکتا تھا۔

اور اسی طرح کی سوچ نے حسنہ کو گھر سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ حسنہ کی ماں نے اسے جلانے کے لئے صاف صاف نہیں بتایا تھا کہ حسنہ کس حیثیت سے وہاں رہتی ہے۔ وہ شام تک بیٹھا ٹوٹی کرسی پر

پہلو بدلتا رہا۔

دن چھپے حسینہ گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ گھر میں وزیرا موجود ہے، بہنوئی کی شکل دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور خاموشی سے اندر کمرے میں چلی گئی۔

اندر کمرے میں ماں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اسے دیکھ کر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''اری حسینہ وزیرا آیا ہے، حسنہ کو لینے، ذرا تُو اسے حسنہ کے گھر پہنچادے۔''

''یہ اب آیا ہے چار سال کے بعد ماں یہ کچھ جلدی نہیں آگیا۔'' حسینہ نے زور سے کہا، تاکہ باہر بیٹھا وزیر علی سن لے۔ اس نے سن لیا لیکن خاموش بیٹھا رہا۔ یہ وقت اس کے بولنے کا نہ تھا۔ سننے کا تھا۔

''تُو ٹھیک کہتی ہے حسینہ یہ کچھ جلدی ہی آگیا ہے۔'' ماں نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال اب آگیا ہے تُو اسے حسنہ تک پہنچادے۔''

''میں نہیں جاؤں گی، اسے وہاں لے کر۔'' حسینہ نے سخت لہجے میں کہا ''یہ خود جائے گا۔''

''حسینہ تو مجھے پتہ بتادے میں خود چلا جاؤں گا۔'' وزیرا اس کی بات سن کر کمرے میں داخل ہوا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''وزیرے تو اب آیا کیوں ہے، چار سال کے بعد اچانک تجھے حسنہ کی کیا ضرورت پڑگئی۔'' حسینہ نے اپنی شعلے برساتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ ''کبھی آکر یہی دیکھ لیتا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مرگئی۔''

''حسینہ میں جانتا ہوں کہ میں قصوروار ہوں میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔'' وزیر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''تیرا، کیا خیال ہے وہ تجھے معاف کردے گی۔''

''ہاں، حسنہ بہت اچھی ہے وہ مجھے ضرور معاف کردے گی۔''

''پھر جا وہاں جاکر دیکھ لے۔'' حسینہ نے کہا اور اسے سمن آباد کا پتہ لکھ کر دے دیا اور زبانی سمجھادیا۔

پتہ لے کر وہ پھر ایک منٹ میں بھی اس گھر میں نہ رکا۔ بس پکڑ کر وہ سمن آباد پہنچا۔ پتہ ڈھونڈنے میں اسے کافی دُشواری پیش آئی۔ بالآخر وہ ٹھکانے پر پہنچ گیا اس نے اطلاعی گھنٹی بجانے کے بجائے گیٹ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ حسنہ باورچی خانے میں تھی، روٹیاں پکا رہی تھی۔ واجدہ ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی، گھر کا گیٹ بجنے پر اس نے حسنہ کو آواز دی۔ ''حسنہ دروازے پر کون ہے۔''

''بی بی جی کوئی فقیر معلوم ہوتا ہے، گھنٹی نہیں بجائی، گیٹ بجا رہا ہے۔''

''اچھا میں دیکھتی ہوں، ان مانگنے والوں نے تو ناک میں دَم کر رکھا ہے اس طرح دروازے

بجاتے ہیں جیسے قرض وصول کرنے آئے ہوں۔''

واجدہ نے جب دروازے پر پہنچ کر گیٹ کھولا تو اسے وہاں فقیر کے بجائے پنک قمیض پہنے ایک آدمی نظر آیا۔ واجدہ کو دیکھ کر وزیرا کچھ جھجکا پھر ہمت کرکے آگے بڑھا۔ ''سلام جی۔''

''وعلیکم السلام۔'' واجدہ نے اس شخص کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے کس سے ملنا ہے۔''

''میں حسنہ کے گھر سے آرہا ہوں، اس کی ماں نے بتایا ہے کہ وہ یہاں رہتی ہے مجھے اس سے ملنا ہے۔''

''حسنہ سے۔'' واجدہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

حسنہ کو رہتے ہوئے اس گھر میں چار سال کا عرصہ ہوگیا تھا لیکن اس سے آج تک کوئی ملنے نہ آیا تھا۔ اس اجنبی کو دیکھ کر واجدہ کو حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے پوچھا۔ ''تم کون ہو حسنہ کے۔''

''میں وزیر علی ہوں جی...... وزیرا، میں اس کا شوہر ہوں۔''

''اوہ۔'' واجدہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''اچھا تم ٹھہرو میں حسنہ کو جا کر بتاتی ہوں۔''

کچن میں داخل ہو کر واجدہ، حسنہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بیلن سے روٹی بڑھانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ واجدہ کو وہ اس وقت بہت اچھی لگی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حسنہ کو شوہر کی آمد کی اطلاع کس طرح دے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس خبر سے اسے خوشی ملے گی یا افسردہ ہو جائے گی۔

دروازے پر واجدہ کو کھڑے دیکھ کر اس نے اپنی نظریں گھمائیں اور بولی۔ ''کون تھا بی بی جی، فقیر ہوگا۔''

''تھا نہیں ہے۔'' واجدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ پیشہ ور فقیر ہے یا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن سوالی ضرور ہے۔''

''سوالی۔'' حسنہ نے روٹی کو توے سے اُتارتے ہوئے کہا۔ ''پھر کچھ دے دیا آپ نے۔''

''مجھ سے اس نے کچھ نہیں مانگا وہ تمہارا سوالی ہے۔''

''میرا سوالی۔''

''ہاں، تمہارا سوالی۔''

''کون ہے وہ۔''

''تمہیں بلا رہا ہے جا کر دروازے پر دیکھ لو۔''

''آپ اسے جانتی ہیں۔''

''میں اسے جانتی تو نہیں لیکن اس نے اپنی پہچان کروا دی ہے۔''

''بی بی جی بتائیں نا۔''

''نہیں میں بتاؤں گی نہیں خود جا کر دروازے پر دیکھو، پھر فیصلہ کرو کہ اسے گھر کے اندر بلانا ہے یا

نہیں۔ اگر گھر کے اندر بلانا ہو تو لے آنا مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

اتنے واضح اشارے کے باوجود حسنہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ اس اشارے کو سمجھتی اس وقت جب اس کے ذہن میں کہیں وزیر علی کا خیال ہوتا۔ وہ اپنے شوہر کو یکسر بھلا بیٹھی تھی اور کیسے نہ بھلاتی۔ اس نے حسنہ کو دیا ہی کیا تھا، ایک عذابناک زندگی۔ چار سال اس نے اس کے ساتھ کس طرح گزارے تھے، وہ چار سال اسے چالیس سال محسوس ہوتے تھے۔ ان دُکھوں کو وہ کب تک کلیجے سے لگائے رکھتی۔ شروع شروع میں تو وہ خاصی پریشان رہی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ سب کچھ بھولنے لگی۔ واجدہ کے رویے نے اسے سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیا اور اب تو اسے واجدہ کے گھر میں رہتے، جنت میں بستے چار سال ہو گئے تھے۔ اب وہ دوزخ بھرے دنوں کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنے در پر آنے والے کسی سوالی کا انتظار نہ تھا پھر وہ اس سوالی کو کیسے پہچانتی۔ چولہے کی آگ کم کرکے حسنہ اُٹھی۔ واجدہ کو دیکھتی ہوئی کچن سے باہر نکلی۔ وہ گیٹ کی طرف چلی، واجدہ نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

حسنہ نے گیٹ کھول کر تھوڑی سی گردن باہر نکالی اور پوچھا۔ ''کون ہے۔''

''میں ہوں حسنہ...... وزیرا۔'' وزیر علی نے جلدی سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چلے جاؤ یہاں سے میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔'' یہ کہہ کر حسنہ نے گیٹ بند کر لیا۔ حسنہ نے گیٹ بند کیا تو وزیر علی کو لگا جیسے اس نے دل کا دروازہ بند کر لیا ہو، وہ یہاں بڑی آس لے کر آیا تھا۔ مایوس ہو کر لوٹنا نہ چاہتا تھا۔ گیٹ بند ہوتے ہی اس نے تڑپ کر آواز دی۔ ''حسنہ بس ایک سنٹ میری بات سن لے۔'' یہ کہہ کر اس نے گیٹ بجایا۔

''میں نے تیری بہت سنی ہے، چار سال رہی ہوں تیرے پاس اب اور سنانے کو کیا رہ گیا ہے۔'' حسنہ نے گیٹ کے اس طرف سے کہا، وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ گلا خشک ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے۔

''حسنہ، میں تجھ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔'' گیٹ کے اس طرف سے وزیر علی نے کہا۔

''جا، میں نے تجھے معاف کیا۔'' حسنہ نے بڑے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اب چلا جا یہاں سے۔''

''نہیں حسنہ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں گیٹ پر دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔ اس وقت اُٹھوں گا جب تیری شکل نظر آئے گی، تیرا دیدار ہوگا۔'' وزیر علی نے بڑی محبت سے کہا۔

''میں ہیر نہیں ہوں، تُو رانجھا نہیں ہے۔'' حسنہ کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔

''میں رانجھا نہ سہی تُو ہیر ضرور ہے۔'' وزیر علی نے پانسہ پھینکا۔

''یہاں کیوں آیا ہے۔'' حسنہ نے غصے سے کہا، پانسہ پلٹ گیا۔

''دروازہ کھول پھر بتاؤں گا۔'' وزیر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

’’حسنہ گیٹ کھول کیوں نہیں دیتی، اسے اندر تو آنے دے۔‘‘ واجدہ کمرے کے دروازے
کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جانے وزیر کے لہجے میں واجدہ کو کیا دکھائی دیا کہ اس۔
حسنہ کو دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔

حسنہ کو پھر گیٹ کھولنا پڑا۔ واجدہ، وزیر علی کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اس نے اسے عزت
بٹھایا۔ حسنہ ڈرائنگ روم میں نہ آئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ واجدہ نے اسے آواز دی

’’حسنہ تم کہاں ہو، اِدھر آؤ۔‘‘

’’بہت غصہ ہے، اسے۔‘‘ وزیر علی نے کہا۔

’’غصہ کیوں نہ ہو، تم نے کام ہی ایسا کیا ہے۔ چار سال تک تم نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ تمہار
بیوی کہاں ہے، زندہ ہے یا مر گئی۔ کیسے مرد ہو تم۔‘‘ واجدہ نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔

’’میں اب اسے لے جانے کے لئے آیا ہوں، اب چار سال پہلے والا وزیر علی نہیں ہوں۔ ا
میرے پاس، بہت کچھ ہے بس ایک حسنہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں نے حسنہ کو بہت دکھ د
ہیں لیکن اب میں اسے اتنے سکھ دوں گا کہ وہ سارے دکھ بھول جائے گی۔ بیگم صاحبہ آپ میری
کریں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ مجھے میری حسنہ واپس دلوا دیں۔‘‘ یہ کہتے کہتے وزیر
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس کے آنسو دیکھ کر واجدہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

’’بھئی میں نے تمہاری حسنہ کو باندھ کر نہیں رکھا ہے، وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو اسے ضر
لے جاؤ۔‘‘ واجدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھہرو میں اسے یہاں بلا کر لاتی ہوں۔‘‘

ڈرائنگ روم سے نکل کر واجدہ کچن میں پہنچی، اس کا خیال تھا کہ حسنہ روٹیاں پکانے بیٹھ گئی ہو
لیکن وہ باورچی خانے میں نہ تھی۔ چولہا اسی طرح دھیمے دھیمے جل رہا تھا۔ واجدہ کچن سے نکل کر ا
کے کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ موجود تھی اور اپنا چہرہ ہاتھ میں چھپائے بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔

واجدہ نے خاموشی سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ بے اختیار چونک اُٹھی۔ اس نے سر اُٹھا
دیکھا، سامنے واجدہ کو پا کر وہ کھڑی ہو گئی اور اس سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تُو کیوں رو رہی ہے۔‘‘ واجدہ نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہو
کہا۔ ’’خوشی کی بات ہے کہ تمہارا مرد تمہیں لینے آیا ہے۔ نہیں، اب وہ پہلے جیسا نہیں ہے، اس
بات کر کے دیکھ لو وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رو رہا ہے۔‘‘

بالآخر وزیر کے آنسو کام آ گئے۔ جس شوہر کو اس نے ہمیشہ چیختے دھاڑتے دیکھا تھا، اب اسی شو
کی آنکھوں میں ندامت کے موتی تھے۔ وہ پگھل گئی، اس نے اس کی آنکھوں کے موتی چن لئے۔
جو اسے ہمیشہ رُلاتا رہتا اور رُلا کر خوش ہوتا تھا، آج اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے قرار ہو

۔ وہ عورت تھی، نرم دل، نازک جذبات والی پسپا ہو گئی۔ اس کا عزم اس کے شوہر کے آنسوؤں
کیا۔ پھر کچھ سہارا واجدہ نے لگایا۔ اگرچہ حسنہ کے اس گھر سے چلے جانے سے واجدہ کو نقصان
اب وہ حسنہ کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کے بغیر رہنا مشکل تھا۔ پھر بھی واجدہ نے اس بات پر اصرار
وہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی جائے، اپنا گھر بسائے۔ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اُٹھائے۔
اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہ عمر تنہا رہنے کی نہ تھی۔ پھر واجدہ نے اس کو یہاں تک سمجھا دیا بلکہ ایک
اسے تسلی دے دی تھی کہ اگر کبھی وزیر کا رویہ ذرا بھی خراب ہو تو وہ فوراً لاہور چلی آئے۔
گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ جو احسان اس نے واجدہ پر کیا تھا، وہ ایسا نہ تھا کہ
بھلایا جا سکے۔

واجدہ کے سمجھانے پر وزیر علی کے ساتھ چلی گئی۔
گھر سے رخصت کرتے ہوئے واجدہ نے حسنہ سے کہا۔ ’’حسنہ اس گھر سے جو لے جانا چاہو
، مجھے خوشی ہو گی۔‘‘

نے مسکرا کر کہا۔ ’’نہیں بی جی مجھے کچھ نہیں چاہئے، آپ نے چار سال تک مجھے اس گھر میں
بہن کی طرح رکھا۔ بس میری لئے یہی کافی ہے۔‘‘

پھر وہ بیڈروم میں گئی۔ اس نے سوئی ہوئی نیلم کو پیار کیا۔ واجدہ نے کہا۔ ’’اسے اُٹھا دوں۔‘‘

’’نہیں بی بی جی سونے دیں۔‘‘ حسنہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

’’حسنہ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔‘‘ واجدہ نے اسے یاد دلایا۔

’’ہاں بی بی جی مجھے یاد ہے۔ جو راز ہے وہ مرتے دَم تک راز رہے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔‘‘ یہ
کر وہ گھر سے رخصت ہو گئی۔

حسنہ نے جو وعدہ کیا تھا اسے نبھا کر دکھایا۔ وہ آخری وقت تک اپنے عہد پر قائم رہی۔ بیس سال
اس نے پلٹ کر نہ دیکھا کہ اس کی بیٹی نیلم کہاں ہے۔ اب وہ پلٹ کر دیکھتی بھی کیوں۔ نیلم سے
کا کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ اِدھر واجدہ نے بھی حسنہ کے بارے میں زیادہ کھوج نہ کی۔ وہ ایسا کیوں
کرتی۔ بس کبھی کبھار حسنہ کی بہن حسینہ سے اس کے بارے میں معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ سیّد پور میں
اپنے شوہر کے ساتھ سکھ بھری زندگی گزار رہی ہے۔ حسنہ کے جانے کے بعد کچھ عرصے تک وہ
کو یاد آئی، پھر وہ اسے بھول گئی۔ کتنا اچھا ہوا کہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی، لاہور سے دور
اگر وہ یہاں رہتی تو نیلم کا راز کھلنے کا خطرہ رہتا۔ اس کے چلے جانے سے واجدہ کو اطمینان ہو گیا
اب نیلم کو کوئی اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔

نیلم کے بعد حسنہ کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ کوئی سات سال تک وزیر علی نے حسنہ سے اولاد

ہونے کا انتظار کیا۔ جب انتظار کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے ایک اور شادی کر لی۔ وزیر علی کو شدید خواہش تھی۔ ان سات سالوں میں اس نے حسنہ کا کافی علاج کروایا تھا۔ حسنہ بالکل ٹھیک کسی ڈاکٹر نے اس میں کوئی خامی نہ بتائی تھی پھر بھی وہ اولاد سے محروم تھی۔ قدرت کے کام میں دخل دے سکتا ہے۔

جب وزیر علی نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو حسنہ نے خوشی سے اجازت دے دی۔ وزیر علی نے ایک کم عمر لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی، وزیر علی ایک لڑکے کا باپ بن گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اس نے اپنے آس پاس کے علاقے میں گھر مٹھائی بانٹی۔

اس خوشی کے موقع پر وہ حسنہ کو نہ بھولا۔ اس نے اپنے بچے کو اس کی ماں کے پہلو سے اُٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا اور بولا۔ ”تیرا بچہ ہے، بتا اس کا کیا نام رکھوں۔“

حسنہ نے اس بچے کو اپنی گود میں لے کر اس کے پھول سے گالوں پر پیار کیا اور بولی۔ ”وزیر، اس کا نام لیاقت رکھ دے۔ لیاقت علی۔“

”چل ٹھیک ہے رکھ دیا، آج سے یہ لیاقت علی ہوگا۔“

لیکن یہ بات لیاقت علی کی ماں سروری کو پسند نہ آئی۔ بچہ اس کا اور نام رکھے سوکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وزیر علی کے اس رویے پر وہ جل بھن کر رہ گئی۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ اب اس گھر میں حسنہ رہے گی یا سروری۔ اس نے اب ہر وقت وزیر علی کے کان بھرنا شروع کئے۔ سروری چھوٹے ذہن کی عورت تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ وزیر علی کے ذہن کو بھی چھوٹا کر دیا۔ حسنہ، سروری کا رویہ دیکھ کر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی کہ وہ اس سے اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسنہ گھر کی ایک کوٹھری تک محدود ہو کر رہ گئی اور سروری گھر کی مالکن بن گئی۔

اب سروری کے کئی بچے ہو چکے تھے۔ اس نے وزیر علی کے دل و دماغ پر اچھی طرح قبضہ جما لیا تھا۔ وہ حسنہ پر اب آخری ضرب لگانا چاہتی تھی کہ اُلٹی اس پر ضرب لگ گئی۔ یہ ضرب بڑی کاری تھی وہ بلبلا کر رہ گئی۔ سروری نے وزیر علی پر اپنا اتنا رنگ جما لیا تھا کہ وہ حسنہ کو بے کار شے سمجھنے لگا۔ سروری کی ترغیب کے مطابق وہ اسے طلاق دینے ہی والا تھا کہ اوپر سے اس کا بلیک وارنٹ آ گیا۔

رات کے وقت گاؤں کے پاگل کتے نے اسے کاٹ لیا۔ صبح کو اسپتال لے جانے سے پہلے ہی وہ منہ سے جھاگ ڈالتا، زندگی سے منہ موڑ گیا۔

وزیر علی کی موت کے بعد سروری نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ گھر پر اس کا پہلے ہی قبضہ تھا۔ حسنہ اس گھر کی کوٹھری میں کوڑھ کی مریض کی طرح محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کے ساتھ سروری نے اس

کے مال پر بھی قبضہ کر لیا۔ حسنہ کا اب اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ اب کہاں جاتی۔ ایک ماں اور چھوٹی بہن حسینہ تھی۔ ماں کا کب کا انتقال ہو چکا تھا۔ حسینہ کو نشے نے زندگی درگور کر دیا تھا۔ وہ داتا دربار پر پڑی رہتی تھی۔

حسنہ اب سیّد پور سے نکلنا نہ چاہتی تھی۔ اس گاؤں میں وہ بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے یہاں رہ کر جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے کیا تھا۔ اس گاؤں کی ایک ایک گلی سے اسے محبت تھی۔ وہ اب گاؤں چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے گاؤں والوں کو درمیان میں ڈالا تب گاؤں والوں نے سروری سے وہ مکان حسنہ کو دلا دیا جس میں وہ رہتی تھی بس اس نے اتنی ہی خواہش کی تھی۔

پھر سروری سیّد پور میں نہ رہی۔ اس نے زمینیں اور آٹے کی چکی فروخت کر دی اور میکے چلی گئی۔ وہاں اس نے دو سال بعد ہی دوسری شادی کر لی۔

حسنہ سیّد پور میں تنہا رہ گئی۔ حسنہ ملنسار عورت تھی۔ اس لئے گاؤں کے سارے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ حسنہ نے اپنا دل لگانے کے لئے گھر کے اندر چھوٹی سی دکان کھول لی۔ یہ چھوٹی سی دکان اس کی گزر بسر کے لئے کافی تھی۔

اس دکان پر جب کوئی تین چار سال کی بچی آتی تو اس کی نگاہوں میں اپنی بیٹی نیلم کی تصویر آ جاتی۔ جب لاہور سے آئی تھی تو وہ اتنی ہی چھوڑ کر آئی تھی۔ نیلم کی یاد آتی تو وہ کھوسی جاتی۔ اب تو نیلم جوان ہو گئی۔ کیا پتہ اب تک اس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ کئی بار وہ سوچتی کہ لاہور چلے اور اپنی بیٹی کا دیدار کر کے واپس آ جائے لیکن وہ ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی۔ اسے اپنا وعدہ یاد آ جاتا۔ اس راز کو راز ہی رہنا تھا۔ کیا پتہ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ کر قابو میں نہ رہ سکے۔

اس طرح سوچتے ہوئے وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ لاہور سے آئے اب اسے بیس سال ہو گئے لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔ واجدہ کے ساتھ بتائے ہوئے چار سال ہر دم اس کی نگاہوں میں بسے رہتے تھے۔ حسنہ اب بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دن بھر دکان پر بیٹھی کھانستی رہتی، رات ہوتی تو یہ کھانسی بجائے دبنے کے اُبھر آتی۔ کھانسی کے مارے اس کا بُرا حال ہو جاتا۔ اس کے پھیپھڑے دن بدن چھلنی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ دکان پر بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ چلنا پھرنا بھی دوبھر تھا۔ وہ خون تھوکنے لگی تھی۔ اسے اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں، جب زندگی موت کے گلے لگ جائے گی۔

مرنے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بیٹی نیلم کو دیکھنا چاہتی تھی۔ نیلم میں جیسے اس کی جان اٹکی ہوئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نیلم سیّد پور آئے کیسے۔ حسنہ میں اب اتنی جان نہ تھی کہ وہ اتنا لمبا سفر کر کے لاہور

پہنچتی۔ وہ تو بس اب آخری سفر کی تیاریوں میں تھی۔ حسنہ نے اپنے پڑوس کے ایک لڑکے سے کے نام ایک خط لکھوایا۔ دلدار بٹ ان دنوں سیّد پور آیا ہوا تھا۔ سیّد پور میں اس کی کافی زمینیں تھ کی دیکھ بھال اس کے چھوٹے بھائی عاشق کے ذمے تھی۔ وہ خود بھی گاہے گاہے گاؤں آتا رہتا دلدار بٹ، فیاض حسین کا پڑوسی تھا۔ وہ کل لاہور واپس جانے والا تھا۔ حسنہ کو اس کی واپسی کا علم اس نے اس لڑکے کے ہاتھ وہ خط اسے بھجوا دیا کہ بحفاظت اور یقینی طور پر واجدہ کو مل جائے گا۔

دلدار بٹ نے اس بند لفافے کو حیرت سے دیکھا، جس پر فیاض حسین کا نام لکھا ہوا تھا۔ اا اس وقت تو خط یہ کہہ کر اپنے بیگ میں ڈال لیا کہ ٹھیک ہے وہ اس خط کو فیاض کو دیدے گا لیکن بع اس کا تجسس جاگا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سیّد پور کی ٹی بی کے مرض میں مبتلا، ایک بیوہ کا لاہور کے بڑے فلم تقسیم کار سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

اس نے راستے میں بیگ سے وہ بند لفافہ نکال لیا۔ اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ لفافہ آ چپکایا گیا تھا۔ اسے کھولنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ دلدار بٹ نے ذرا سے اشارے پر وہ لفافہ کھو خط پڑھ کر اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جو بات اب تک کسی کو معلوم نہ تھی اس را دلدار بٹ واقف ہوگیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ نیلم، فیاض کی بیٹی نہیں ہے بلکہ سیّد پور کی ایک کی بیٹی ہے۔ جس نے بڑے جذباتی انداز میں نیلم کو دیکھنے کی گزارش کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر دلدا کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ دلدار بٹ اچھے اطوار کا آدمی نہ تھا، وہ ایک بُرا پڑو چھوٹی چھوٹی باتوں پر گلی کے لوگوں سے جھگڑے مول لینے کا عادی تھا۔ اس نے فیاض حسین کئی بار اُلجھنے کی کوشش کی تھی۔ فیاض حسین اس کی کمینی فطرت سے واقف تھا، اس لئے ہر با دے گیا تھا۔

دلدار نے اس خط کو فیاض حسین کے حوالے کردیا۔ اس نے اپنی زبان سے یہ نہ کہا کہ وہ حقیقت سے واقف ہوگیا ہے لیکن اپنے رویے اور طنز بھری مسکراہٹ سے اس نے بہت کچھ ظاہر کر

فیاض حسین نے جب وہ خط واجدہ کو دیا تو وہ اسے پڑھ کر پریشان ہوگئی۔

"اب کیا ہوگا حسنہ نے تو ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔" واجدہ بولی۔

"ایک کام ہوسکتا ہے، اس خط کو پھاڑ دیا جائے اور ہم یہ بھول جائیں کہ کوئی خط ملا تھا۔"

"نہیں فیاض یہ بہت مشکل ہے۔ اس خط کو پھاڑ کر میں زندگی بھر ضمیر کی خلش میں مبتلا رہو یہ حسنہ کی آخری خواہش ہے۔ اس نے ہم سے زندگی میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ اپنے جگر کے ٹکڑے دے کر جیسے بھول گئی۔ اب بیس سال بعد اس نے اپنی بیٹی کو پہلی اور آخری بار دیکھنے کی خواہش ہے تو ہمیں اس کیلئے کچھ کرنا ہوگا۔ مرنے سے پہلے اس کی یہ آخری خواہش پوری کرنا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم سیّد پور چلتے ہیں۔" فیاض حسین نے کہا۔

یہ لوگ نیلم کو لے کر دوسرے دن ہی سیّد پور پہنچ گئے۔ یہ لوگ گاڑی میں آئے تھے لیکن گاؤں کی گلیاں چھوٹی تھیں کہ گاڑی کا اندر جانا مشکل تھا۔ لہٰذا انہیں گاڑی گاؤں کے باہر ہی چھوڑنا پڑی۔ فیاض حسین نے ڈرائیور کو گاڑی میں ہی چھوڑ دیا کیونکہ گاڑی دیکھ کر گاؤں کے بچے اس کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے۔ خطرہ تھا کہ کہیں کوئی بچہ پتھر وتھر نہ مار دے۔

گاؤں کے ایک لڑکے سے فیاض نے حسنہ کے بارے میں پوچھا۔ یہ کوئی شہر نہ تھا کہ جہاں پڑوسی بھی پڑوسی سے واقف نہیں ہوتا، حسنہ کا نام سن کر وہ بچہ فوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔ فیاض حسین، واجدہ اور نیلم اس بچے کی قیادت میں اس کے پیچھے چلنے لگے۔

گاؤں کی چھوٹی اور پتلی گلیاں، گلیوں میں بہتی گندی نالیاں، نالیوں سے اُٹھتی بدبوئیں، نیلم نے فوراً اپنی ناک پر دوپٹہ رکھ لیا اور گلیوں میں پڑے گوبر سے خود کو بچاتی، بڑے محتاط انداز میں چلنے لگی۔

چلتے چلتے اچانک نیلم کی نظر سامنے پڑی، تو وہ ٹھٹھک گئی۔ اس وقت وہ اپنے والدین سے آگے تھی۔ نیلم کو رُکتے اور جھجکتے دیکھ کر واجدہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"امی، وہ۔" نیلم نے اپنی آنکھ سے اشارہ کیا۔ "وہ کیا ہے؟"

واجدہ نے سامنے دیکھا تو اس کے جسم میں ایک دَم جھرجھری سی آگئی۔ اس نے فیاض حسین سے کہا۔ "وہ، دیکھتے ہو۔"

فیاض اسی کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ وہ گلی کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا اس کا رنگ ایک دَم سیاہ تھا۔ وہ بلا تھا لیکن اس کی جسامت بلے جیسی نہ تھی کسی کتے جیسی تھی۔

"کیا بلا ہے یہ۔" فیاض حسین نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بلا ہے کہ کتا۔"

نیلم اس بلے سے خوفزدہ ہو کر اپنے باپ کے پیچھے ہوگئی تھی۔ کالے بلے نے اسے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ جب نیلم، فیاض کے پیچھے ہوگئی، اسے نظر نہ آئی تو وہ کھڑا ہوگیا۔

اب یہ لوگ اس کالے بلے کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اس دیہاتی بچے نے نیلم کو اس کالے بلے سے ڈرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ کالے بلے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "باجی آپ ڈریں مت یہ کالا بلا کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ آپ آرام سے نکل جائیں۔"

لیکن کالے بلے کو اس دیہاتی لڑکے کا درمیان میں آنا پسند نہ آیا وہ اچھل کر اس کے کندھے پر چڑھ آیا۔ لڑکا اس کا بوجھ برداشت نہ کرسکا، وہ فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں نیلم آگے نکل چکی تھی۔ دیہاتی لڑکا بھی زمین سے اُٹھ کر بھاگا، جبکہ وہ کالا بلا اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اگلے دونوں پاؤں چاٹنے لگا۔ اس کی نظریں اب بھی نیلم پر تھیں۔

وہ اس کی پشت پر لہراتے ہوئے گھنے بالوں کو دیکھ رہا تھا۔ نیلم کے بال بہت خوبصورت تھے۔ ریشم جیسے اور ایک دم لمبے۔ اس کے بال گھٹنوں سے بھی نیچے آتے تھے اور بہت گھنے تھے۔

کالا بلا نیلم کی خوبصورت زلفوں، متناسب جسم اور دلکش چال کو دور تک دیکھتا رہا۔

سیّد پور کے جن کی نیلم سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ اس حسین لڑکی کو دیکھتے ہی اس کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا، اس پر عاشق ہو گیا تھا، اس کے دامِ الفت میں جکڑ گیا تھا۔

اب وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔

دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ دیہاتی لڑکا ایک گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک کچا گھ تھا۔ اس گھر کے دَر و دیوار سے کسمپرسی جھلک رہی تھی۔ لڑکے نے ٹوٹے دروازے کے گھر میں داخل ہو کر انہیں پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

گھر میں سب سے پہلے واجدہ داخل ہوئی۔ اس کے بعد فیاض حسین پھر نیلم۔ واجدہ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سامنے چار پائی پر ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھا۔ حسنہ کو اس حال میں دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا۔ کیسی حسین عورت تھی، حسنہ اور اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔ جیسے قبر کا مردہ۔ وہ کالی کھوسٹ ہو گئی تھی۔ ہڈیوں سے کھال چمٹ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ چار پائی پر ایک میلے چیکٹ تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف تھیں جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

واجدہ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک دَم حسنہ کے چہرے پر رنگ بکھر گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، اس نے فوراً اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھا نہ گیا۔

حسنہ کو اس حالت میں دیکھ کر اسے شدید صدمہ پہنچا۔ واجدہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کی چار پائی کے نزدیک جا کر بولی۔ ''ہائے حسنہ، تجھے یہ کیا ہو گیا۔''

''کچھ نہیں بی بی جی، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔'' حسنہ نے بمشکل کہا۔

''دیکھ حسنہ تُو نے خط میں لکھا تھا کہ میں مر رہی ہوں، مرنے سے پہلے مجھے میری بیٹی سے ملوا دو، میری آخری خواہش ہے، تو حسنہ تیری آخری خواہش کے احترام میں ہم لوگ اتنی دور آ گئے ہیں او ساتھ میں تیری بیٹی کو لے آئے ہیں۔ لے مل لے اس سے۔'' واجدہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ پھر وہ نیا کی طرف مڑی اور بولی۔ ''نیلم یہ تمہاری آیا نہیں سگی ماں ہے۔''

''سگی ماں۔'' نیلم کی آنکھوں میں حیرت کے پردے لہرا گئے۔

''ہاں، ہم نے تمہیں راستے میں بتایا کہ حسنہ تمہاری آیا تھی اسے تم سے بہت محبت تھی۔ اب مر۔ وقت اس نے تمہیں یاد کیا ہے۔ ہم نے تمہیں غلط بتایا تھا اس عورت کی آنکھوں میں دیکھو نیلم، اس آنکھوں سے ممتا اُمڈ رہی ہے۔ ممتا کی اس پیاسی کو ''ماں'' کہہ کر اس سے لپٹ جاؤ۔ اسے اپنا ہونے

کا سانس دلا دو شاید اس کی موت آسان ہو جائے۔''

''آؤ بیٹی میرے نزدیک آؤ۔ یہاں چار پائی پر بیٹھ جاؤ تمہاری ماں نے تمہیں غلط بتایا ہے۔ پہلی بات صحیح تھی، میں تمہاری ماں نہیں تمہاری آیا ہوں۔ میں نے تمہیں چار سال تک اپنی گود میں کھلایا ہے تم میری نظروں میں بسی ہوئی ہو۔ یوں سمجھو تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ میری جان ہو۔ تمہیں دیکھنے کے لئے میں تڑپ رہی تھی۔ اب تمہیں دیکھ لیا ہے، آسانی سے اور پورے اطمینان سے مر سکوں گی۔'' یہ کہہ کر حسنہ نے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سوکھے ہاتھ کا لمس پا کر نیلم کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ حسنہ نے نیلم کا گورا اور نرم ملائم ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا، اسے دھیرے سے پیار کر لیا، نیلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

پھر ایک دَم سے حسنہ کے جسم میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ تب واجدہ نے نیلم کو چار پائی سے اُٹھا دیا اور اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''حسنہ روتی کیوں ہے۔ نیلم کو جی بھر کر دیکھ لے، یا ایسا کر تُو ہمارے ساتھ چل۔ ہم تجھے اسپتال میں داخل کروا دیں گے تُو اچھی ہو جائے گی۔ پھر زندگی بھر میرے پاس، اپنی نیلم کے پاس رہنا۔''

''نہیں بی بی جی۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میں گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوں۔ آپ نے ہمیشہ مجھے محبت دی ہے۔ آپ نیلم کو میرے پاس لے آئیں۔ یہی احسان مجھ پر بہت بڑا ہے۔ میری آنکھیں سیراب ہو گئیں، میری بے چین روح کو قرار آ گیا ہے۔'' حسنہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

نیلم کی عجیب حالت تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ حسنہ اس کی سگی ماں ہے یا محض آیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اسے دیکھ کر اسے گھن آ رہی تھی۔ وہ اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے جلد از جلد دور ہونا چاہتی تھی۔

نیلم نے فیاض حسین کی طرف اُکتاہٹ بھری نظروں سے دیکھا۔ ''ابو واپس کب چلیں گے۔''

''چلتے ہیں بیٹا۔'' فیاض حسین نے اسے تسلی دی، پھر وہ حسنہ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں حسنہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ تم ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتیں، چلتیں تو اچھا تھا۔''

''نہیں صاحب جی، آپ کا بہت شکریہ۔ اب میں کہاں جاؤں گی۔ چل چلاؤ کا وقت ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' حسنہ نے کہا۔

''آپ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔'' نیلم پہلی بار حسنہ سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں، بیٹا! میں اکیلی رہتی ہوں۔ جب ساتھ والا ہی نہ رہا تو کسی اور کو کیا ضرورت ہے کہ وہ میرے

ساتھ رہے۔ بیٹا تم پڑھتی ہو۔'' حسنہ نے نیلم کے خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''جی میں پڑھتی ہوں۔'' نیلم بولی۔

''بیٹا کیا تمہیں، میں یاد ہوں۔'' حسنہ نے محبت سے پوچھا۔

''نہیں مجھے آپ یاد نہیں ہیں۔'' نیلم نے سادگی سے کہا۔

''حسنہ اسے کیا یاد ہوگا، یہ چار سال کی تو تھی۔ تمہیں لاہور سے آئے ہوئے اب بیس سال ہوگ اسے کہاں یاد ہوگا۔'' واجدہ نے وضاحت کی۔

''لیکن بی بی جی، میں نیلم کو کبھی نہیں بھولی۔ ساتھ ہی میں اس عہد کو بھی نہیں بھولی جو میں نے آ کے ساتھ بسر کیا تھا۔ میں نے آج تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ابھی آپ نے نیلم کو حقیقت سے آ کرنے کی کوشش کی تو میں نے آپ کو جھٹلا دیا لیکن اس وقت جانے کیوں میرا جی چاہ رہا ہے کہ میر کہوں اور سچ کا ردعمل دیکھوں۔ اس وقت میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ ممتا اُمڈی آ رہی ہے۔ میرا بے اخ جی چاہ رہا ہے کہ نیلم مجھے ایک مرتبہ ''میری امی'' کہہ کر پکارے۔'' حسنہ نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔

''نیلم اپنی ماں کی خواہش پوری کرو۔'' واجدہ نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

''امی یہ کیا تماشا ہے۔'' نیلم پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔

''بیٹی، حسنہ تمہاری سگی ماں ہے۔ اسے ماں کہو، اس کے گلے لگ جاؤ۔'' فیاض حسین نے نیل دوبارہ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

نیلم نے اپنی جان چھڑانے کے لئے جلدی سے حسنہ کو ''میری امی'' کہا اور منہ بناتی ہوئی اس گلے لگی اور پھر فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ ''بس ابو۔''

''بس بیٹی۔'' فیاض حسین کے بجائے حسنہ نے جواب دیا۔ ''اللہ تجھے خوش رکھے۔''

لیکن نیلم کی خوشی کے دن اب پورے ہو چکے تھے اور یہ بات حسنہ کو معلوم تھی نہ واجدہ کو۔ اگر حسنہ یا واجدہ میں سے کسی کو آگے آنے والے واقعات کا اندازہ ہوتا تو شاید حسنہ اسے سیّد پور کبھی نہ بلاتی ا نہ ہی واجدہ، نیلم کو سیّد پور لاتی۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے اس پر حرف بہ حرف عمل ہوتا ہے۔ مقدر کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد گاؤں کا ایک دس بارہ سالہ لڑکا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چینی مٹی کا بڑا پیالہ تھا۔ اس میں دودھ بھرا ہوا تھا۔

''حسنہ چاچی دودھ پی لو۔'' اس لڑکے نے کہا۔

''چھٹے دودھ کا پیالہ اِدھر گھڑونجی پر رکھ دے۔'' حسنہ نے چھٹے کو ہدایت کی۔

چھٹے نے دودھ سے بھرا پیالہ گھڑے کے برابر رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

لڑکے کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ کالا بلا گھر میں داخل ہوا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے یک نظر نیلم کو دیکھا اور پھر چھلانگ لگا کر گھڑونجی پر چڑھ گیا۔

بلے کو گھڑونجی پر چھلانگ لگاتے ہوئے فیاض نے دیکھا تو وہ اسے مارنے کیلئے دوڑا اسے خدشہ تھا کہ کہیں بلا دودھ نہ پی جائے۔ کالے بلے نے فیاض کی ذرہ بھر بھی پروانہ کی۔ اس نے بڑے اطمینان سے گھڑونجی پر چڑھ کر پیالے میں منہ ڈال دیا اور اپنی سرخ سرخ زبان سے لپ لپ دودھ پینے لگا۔

فیاض کو یہ دیکھ کر بڑا غصہ آیا، اس نے قریب جا کر اس کے لات جمانا چاہی لیکن حسنہ ایک دم چیخ پڑی۔ ''نہیں صاحب جی! اسے مت مارنا۔''

''حسنہ اس نے دودھ کا ستیاناس کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں صاحب جی، یہ دودھ اسی کا ہے۔''

''یہ دودھ اسی کا ہے، لیکن وہ لڑکا تو یہ دودھ تمہارے لئے لایا تھا۔ اصل میں تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو، اس لئے تمہارا یہ حال ہوگیا ہے۔'' فیاض حسین نے قدرے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں ابھی تک اس کالے بلے پر تھیں۔

''یہ بلا کس قدر خوفناک ہے، یہ وہی معلوم ہوتا ہے جو ابھی ہمیں گلی میں ملا تھا۔'' واجدہ نے کالے بلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو بڑی بے نیازی سے دودھ پی رہا تھا۔

''بی بی جی، یہ بلا نہیں ہے۔'' حسنہ نے کہا۔

''پھر کیا ہے۔'' واجدہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

اتنے میں کالے بلے نے پیر مار کر پیالہ نیچے پھینک دیا۔ پیالہ زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گیا۔ حسنہ نے چونک کر کالے بلے کی طرف دیکھا۔ وہ گھڑونجی پر چڑھا ہوا حسنہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حسنہ کو تنبیہہ کر رہا ہو۔ وہ ایک مرتبہ ہلکے سے غرایا، پھر اس نے ''میاؤں'' کی آواز نکالی۔ یہ میاؤں کی آواز بھی بڑا لرزا دینے والی تھی۔

حسنہ ایک دَم سہم گئی۔ وہ کالا بلا نیلم کو دیکھتا ہوا، چھلانگ مار کر دروازے میں غائب ہوگیا۔

''ہاں حسنہ یہ بلا نہیں تو پھر کیا ہے۔'' واجدہ نے حسنہ سے پھر پوچھا۔

''نہیں بی بی جی میں کچھ نہیں بتا سکتی، وہ غصے ہو کر گیا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ وہ جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ نہیں تھا۔'' حسنہ نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ اپنا دودھ پینے آیا تھا پی کر چلا گیا۔''

واجدہ اور فیاض حسین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ حسنہ کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے اس کی بات کو دماغ کا خلل سمجھ کر زیادہ بحث نہ کی۔

سیّد پور زیادہ بڑا گاؤں نہ تھا۔ اس گاؤں میں آنے والا مہمان کسی سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہ لوگ

تو یہاں کار میں آئے تھے۔ کار گاؤں کے باہر کھڑی تھی۔ جلد ہی عاشق بٹ کو ان مہمانوں کے بار میں علم ہو گیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ نہ صرف لاہور سے آئے ہیں بلکہ سمن آباد سے آئے ہیں اور دلدار بٹ کے پڑوسی ہیں تو بھاگا بھاگا حسنہ کے گھر آیا، اور انہیں ضد کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ دوپہر کا کھانا اس نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ کھلایا۔

ابھی یہ لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ انہیں حسنہ کی موت کی اطلاع ملی۔

واجدہ اور فیاض کو اس اطلاع پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ حیرت تو انہیں اس بات پر تھی کہ حسنہ ا حالت میں اب تک زندہ کیسے تھی؟ واجدہ نے دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے نیلم کو حسنہ سے ملوا دیا اگر نیلم کو دیکھے بغیر مر جاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ کم از کم واجدہ زندگی بھر ضمیر کی آگ میں جلتی رہتی۔

کھانا چھوڑ کر یہ لوگ حسنہ کے گھر آئے۔ واجدہ نے نیلم کو عاشق کی بیوی اور بیٹی کے پاس چھوڑ نیلم نے خود بھی اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے کی ضد نہ کی۔ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ حسنہ اس کی سگی ما ہے۔ نیلم کے دل میں ذرا بھی ماں کی محبت نے جوش نہیں مارا تھا۔ شاید ایسا فلموں میں ہی ہوتا ہے اپنے خون کو دیکھ کر دل میں محبت کا سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ یہاں تو نیلم کو یہ بھی معلوم تھا کہ حسنہ اس کی اصل ماں ہے پھر بھی نیلم نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ اصل میں پہلے ہی دن سے واجدہ کی گ میں چلی گئی تھی۔ اس نے واجدہ کو ہی اپنی ماں کے روپ میں دیکھا تھا۔ واجدہ اور حسنہ میں زمی آسمان کا فرق تھا اگر نیلم سے کہا جاتا کہ تم اپنی سگی ماں کے ساتھ رہنا پسند کرو گی یا منہ بولی ماں کے ساتھ تو وہ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتی کہ اپنی منہ بولی ماں کے ساتھ۔ ایک خوبصورت شہر کا ایک خوبصورت گھر چھوڑ کر اس چھوٹے سے دیہات کے ایک کچے گھر میں رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی اس لب گور، ماں کے ساتھ رہنے کے بجائے وہ منہ بولی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی۔

واجدہ اور فیاض، حسنہ کے گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے سامنے چارپائی پر حسنہ کا لاشہ دیکھ اس کے اوپر ایک میلی سی چادر پڑی تھی اور دو بوڑھی عورتیں ننگی زمین پر چارپائی کے نزدیک بیٹھی تھیں حسنہ مر گئی تھی اسے رونے والا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ کیسی کسمپرسی کی موت مری تھی، کچھ دیر پہلے تک وہ زن تھی۔ واجدہ اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے رہی تھی۔ اس نے بہت ساری پرانی یادیں تازہ کی تھیں او اب وہ خود یاد بن گئی تھی۔ واجدہ کے لئے وہ ایک حسین یاد سے کم نہ تھی۔ اس نے اس پر بہت ب احسان کیا تھا۔ وہ اسے اپنے جگر کا ٹکڑا تحفے میں دے گئی تھی۔ یہ ایک انمول تحفہ تھا۔

فیاض حسین نے اس کی تجہیز و تکفین میں اُٹھنے والے تمام اخراجات کو اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے علاوہ اس نے حسنہ کی پختہ قبر بنانے کے لئے بھی رقم ادا کر دی۔

پھر واجدہ نے حسنہ کے چہرے سے چادر سرکا کر آخری بار اس کا چہرہ دیکھا۔ حسنہ کا چہرہ بڑا

سکون تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑی مطمئن ہو کر اس دنیا سے گئی ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر واجدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

تب فیاض حسین نے دھیرے سے واجدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے حسنہ کے گھر سے نکال لایا۔

جب وہ واپس عاشق بٹ کے گھر پہنچے اور انہوں نے نیلم کو ساتھ لے کر سیّد پور سے جانے کا قصد کیا تو انہوں نے نیلم کے بارے میں بڑی عجیب خبر سنی۔

جب واجدہ نے یہ خبر سنی تو فوراً اس نے اپنا دل تھام لیا۔ ''ہائے نہیں۔''

''ارے، یہ کیسے ہوا؟'' فیاض حسین بھی پریشان ہو گیا۔

واجدہ اور فیاض جب حسنہ کے گھر سے واپس آئے تو عاشق بٹ اپنے گھر سے گھبرایا ہوا نکل رہا تھا، وہ نیلم کے بارے میں انہیں بتانے جا رہا تھا، انہیں سامنے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ''نیلم بے ہوش ہو گئی ہے۔''

یہ سن کر واجدہ پر بجلی سی گری۔ فیاض پریشان ہو گیا۔ دونوں گھر کے اندر کی طرف بھاگے۔

نیلم ایک کمرے میں، چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی، عاشق بٹ کی بیوی اور بیٹی اس کے نزدیک پریشان کھڑی تھیں۔

''ہائے میری بیٹی کو کیا ہوا؟'' واجدہ نے تڑپ کر پوچھا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ''نیلم میری بچی کیا ہوا؟''

نیلم کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے واجدہ کی پکار کو نہ سنا، وہ کیسے سنتی، وہ بے ہوش تھی۔

''بہن پریشان نہ ہوں۔'' عاشق بٹ کی بیوی بولی۔ ''ابھی اسے ہوش آ جائے گا، یہ ڈر گئی ہے۔''

''ڈر گئی ہے؟'' فیاض حسین نے پوچھا۔ ''لیکن کس چیز سے؟''

''وہ جی کالے بلے سے۔'' اس مرتبہ عاشق بٹ کی بیٹی بولی۔

''کالا بلا یہاں کہاں آ گیا۔'' واجدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''بس جی ہم دونوں چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔'' عاشق بٹ کی بیٹی نے بتایا۔ ''میں نیلم کو گاؤں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ کالا بلا اچانک چارپائی کے نیچے سے برآمد ہوا اور اچھل کر نیلم کی گود میں آ بیٹھا۔ اس کالے بلے کو اپنی گود میں دیکھ کر نیلم نے ایک زوردار چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہو گئی۔''

''میں کمرے سے باہر تھی۔'' عاشق بٹ کی بیوی بولی۔ ''چیخ کی آواز سن کر بھاگی ہوئی اندر آئی، اس وقت تک نیلم بے ہوش ہو چکی تھی۔ کالا بلا اس کی گود سے نکل کر چھلانگ لگا رہا تھا اور یہ عائشہ (اس نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کیا) اس کالے بلے کو شش شش، کر کے بھگا رہی تھی۔ کالے بلے نے

تیزی سے چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔"

"عجیب لڑکی ہے۔" فیاض حسین نے کہا۔ "بلا گود میں آ بیٹھا تو ڈر کر بے ہوش ہو گئی۔ بھلا بلیوں سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔"

"فیاض اس کو ہوش میں لانے کیلئے کچھ کریں، میرا دل تو بیٹھا جا رہا ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے

"ذرا اس کو ہوا کرو اور پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارو، ابھی ہوش میں آ جائے گی۔" عاشق بٹ بولا

عاشق بٹ کی بیٹی عائشہ فوراً ہاتھ کا پنکھا لے کر جھلنے لگی۔ عاشق بٹ کی بیوی ایک کٹورے میں ٹھ پانی لے آئی۔ واجدہ نے اس کے ہاتھ سے کٹورا لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ مگر نیلم آنکھیں نہ کھولیں۔

"سنیں یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں۔" واجدہ، عاشق بٹ سے مخاطب ہوئیں۔

"یہ چھوٹا سا گاؤں ہے، یہاں ڈاکٹر کہاں البتہ ایک کمپاؤنڈر ضرور ہے جو یہاں ڈاکٹر بنا ہے۔ آپ کہیں تو اسے بلوا دوں۔" عاشق بٹ نے جواب دیا۔

"کیوں فیاض۔" واجدہ نے فیاض حسین سے اجازت چاہی۔

"ہاں بلوا لو، کمپاؤنڈر ہے تو کچھ نہ کچھ تو ضرور جانتا ہوگا۔"

"ہاں جی، ویسے تو بڑا تجربہ کار ہے، پورا گاؤں اسی سے علاج کراتا ہے۔"

"پھر اسے بلوا دیں۔" فیاض حسین نے کہا۔

"اچھا جی۔" یہ کہہ کر عاشق بٹ نے پاس کھڑے ایک بچے کو حکم دیا۔ "اوئے جا، بوٹے نوں لا، اس سے کہنا چوہدری جی نے بلایا ہے۔"

یہ سن کر بچہ فوراً کمرے سے تیر کی طرح نکل گیا۔

"ذرا اس کے تلوے سہلاؤ۔" فیاض حسین نے واجدہ سے کہا۔

واجدہ یہ سن کر نیلم کے سرہانے سے اُٹھنے لگی تو عائشہ نے اسے روک دیا۔ "خالہ آپ وہیں بیٹھ میں سہلائے دیتی ہوں۔"

پھر وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ سے اس کے تلوے رگڑنے لگی واجدہ، نیلم کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ پھر اس کی بھنوؤں کو آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں دبانے لگی۔ عاشق بٹ کی بیوی گاہے گاہے اس کے چہرے پر چھینٹے مار رہی تھی۔ فیاض حسین ا عاشق بٹ خاموش کھڑے تھے۔

کوئی ترکیب کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ نیلم ابھی تک بے ہوش تھی۔ فیاض حسین بار بار اپنی گھڑی د رہا تھا۔ اس بچے کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر بوٹا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"کیا ڈاکٹر کا گھر دور ہے۔" فیاض نے پوچھا۔

"نہیں جی قریب ہی ہے، پتہ نہیں وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا، میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"چلیں آپ کے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔"

"آ جائیں۔" عاشق بٹ نے کہا اور وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے اپنی دُم زور سے کچی زمین پر ماری اور پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک کرسی کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے سے کرسی اُلٹ گئی۔ کرسی کے گرنے کی آواز سے سب چونک پڑے پھر اس کرسی کے نیچے سے کالے بلے کو برآمد ہوتے دیکھ کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کالے بلے نے چارپائی پر بے ہوش پڑی نیلم کو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا۔ میاؤں کی ڈراؤنی آواز نکالی اور وہیں سے چھلانگ لگائی۔

یہ چھلانگ اس نے چارپائی پر لگائی تھی۔ واجدہ فوراً اُٹھ کر بھاگی۔ عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی بھی ہائے اللہ، اوئی اللہ کرتی ہوئی کمرے سے بھاگیں۔

واجدہ کالے بلے کو چارپائی پر چھلانگ لگاتے دیکھ کر گھبرا کر اُٹھ تو گئی، دروازے کی طرف بھاگی بھی لیکن پھر اسے اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی، اس نے ہمت کی اور دروازے پر رک گئی جبکہ عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی کمرے سے کب کی نکل چکی تھیں۔

واجدہ نے پلٹ کر دیکھا اس نے جو دیکھا وہ اسے لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ کالا بلا اپنی سرخ اور لمبی زبان سے نیلم کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔

واجدہ نے اپنے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

تب واجدہ نے کوئی چیز تلاش کرنے کیلئے ادھر اُدھر دیکھا مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے وہ پھینک کر مار سکتی۔ پھر اسے اپنے سینڈل کا خیال آیا۔ اس نے فوراً اپنے پاؤں سے سینڈل اُتار لیا اور کھینچ کر کالے بلے کو مارا۔ سینڈل کالے بلے کی پیٹھ پر لگا۔ سینڈل کھا کر وہ غصے سے غرا کر پلٹا اور اس نے واجدہ پر جست لگانے کیلئے اپنی دونوں ٹانگیں جھکائیں۔

واجدہ پر لرزا طاری ہو گیا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے بھاگی۔ واجدہ کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کالا بلا اطمینان سے واپس پلٹا اور پھر نیلم کا نرم ملائم گورا ہاتھ اپنی سرخ زبان سے چاٹنے لگا۔

واجدہ کمرے سے باہر نکلی تو اسے وہ تینوں نظر آئے۔ فیاض، عاشق اور ڈاکٹر بوٹا کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے عائشہ اور عاشق بٹ کی بیوی تھی۔

"کیا ہوا واجدہ۔" فیاض حسین نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ کم بخت کالا بلا۔'' واجدہ کی آواز میں لرزش تھی۔ ''وہ اندر ہے نیلم کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔''

''ارے۔'' فیاض حسین یہ سن کر بجلی کی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کالا بلا نیلم کا ہاتھ بڑے اطمینان سے چاٹ رہا ہے۔

فیاض حسین نے آگے بڑھ کر اس کے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھا کر بلے نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

البتہ فیاض حسین کے چھکے چھوٹ گئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی فولاد کے تختے کو ٹھوکر مار دی ہو۔ جوتے پہنے ہونے کے باوجود ضرب اس کے انگوٹھے پر لگی، وہ بلبلا کر رہ گیا۔

اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس کالے بلے کا جسم نرم ملائم نہ تھا بلکہ فولاد کی طرح سخت تھا۔

جب وہ کالا بلا ٹھوکر کھا کر بھی پیچھے نہ ہٹا تو عاشق بٹ ایک لاٹھی لے آیا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کی کمر پر لاٹھی ماری۔ عاشق بٹ ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ یہ وار اتنا زوردار اور بھرپور تھا کہ کوئی عام بلا ہوتا تو وہیں دَم توڑ دیتا۔

لیکن وہ عام بلا نہ تھا وہ کالا بلا تھا۔ اس کی کمر پر لاٹھی پڑی تو وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ کالے بلے کی کمر کو کچھ نہ ہوا۔ اس کی کمر سے ''ٹن'' کی آواز آئی جیسے بلے کے بدن پر نہ پڑی، لوہے کی پٹری پر پڑی ہو۔

''چوہدری جی بلم لاؤ۔'' ڈاکٹر بوٹا نے کہا۔

عاشق بٹ جلدی سے باہر نکلا اور چند سینکڈوں میں ہی واپس آ گیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا تیز دھار کا بلم تھا۔

عاشق بٹ نے بڑے غصے سے اس کالے بلے کے پیٹ میں بلم مالا۔ خیال تھا کہ تیز دھار کا بلم اس کے پیٹ کے اندر آر پار ہو جائے گا لیکن فیاض نے دیکھا کہ بلے کو کچھ نہ ہوا، اس مرتبہ ٹن کی آواز بھی نہ آئی۔ بلم بلے کے آر پار بھی ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے روئی میں آر پار ہو جائے۔

عاشق بٹ نے کئی مرتبہ اس کے جسم میں بلم مارا لیکن ہر مرتبہ بلم کالے بلے کے جسم کے آر پار ہو گیا لیکن اسے کوئی تکلیف پہنچی نہ خون نکلا، نہ اس کے کوئی زخم آیا۔ وہ بڑے اطمینان سے نیلم کا ہاتھ چاٹتا رہا۔

اب عاشق کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ بلم اس نے گھبرا کر نیچے پھینک دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

عاشق بٹ کے کمرے سے نکلتے ہی کالے بلے نے اپنی گردن اُٹھائی۔ فیاض حسین کی طرف لال انگارہ آنکھوں سے دیکھا اور چھلانگ مار کر چارپائی سے زمین پر آیا۔ پھر تیزی سے فیاض حسین کی ٹانگوں سے ٹکراتا، کمرے سے نکل گیا۔ فیاض حسین نے محسوس کیا جیسے کوئی سخت چیز اس کی ٹانگوں کو رگڑتی ہوئی گزر گئی ہو۔ فیاض کالے بلے کے جانے کے بعد تیزی سے نیلم کی طرف بڑھا۔ اس نے

یلھا کہ نیلم کی ہتھیلی ایک دَم سرخ ہو رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے اب خون جھلک آئے گا۔

پھر اچانک نیلم نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں اور بے قراری سے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ہاں، بیٹا میں اِدھر ہوں، تمہارے پاس۔'' فیاض حسین نے چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابو۔'' نیلم جلدی سے اُٹھ کر فیاض حسین سے لپٹ گئی اور گھبرا کر بولی۔ ''یہاں سے جلدی ل چلیں۔''

''ہاں بیٹے فوراً چلتے ہیں، ہم تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔'' فیاض حسین نے اس ے خوبصورت بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ نیلم کا جسم لرز رہا تھا۔ ہوں نے اسے اور اپنے نزدیک کر لیا اور تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا ڈرو مت، میں تمہارے پاس ں اور ہاں ان سے ملو یہ اس گاؤں کے ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر بوٹا۔''

''بیٹی آپ بے ہوش کیسے ہو گئی تھیں۔'' ڈاکٹر بوٹا نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''ابو وہ بلا کہاں ہے۔'' نیلم نے ڈاکٹر کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

''وہ چلا گیا۔'' فیاض حسین نے دروازے کی طرف دیکھا ان کی آواز میں خوف تھا۔

تب اچانک نیلم کی نظر ہتھیلی پر پڑی وہ ایک دَم سرخ ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی جلن بھی ہو رہی تھی۔ نیلم ے اپنی ہتھیلی فیاض حسین کے سامنے کر کے پوچھا۔ ''ابو یہ کیا ہے؟''

پہلے فیاض نے سوچا کہ اسے سچ سچ بتا دے کہ تمہاری ہتھیلی کو کالے بلے نے چاٹا ہے لیکن پھر انہوں ے سوچا اس طرح اس کے دل میں کہیں دہشت نہ بیٹھ جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ارادہ بدل دیا اور ے۔ ''پتہ نہیں بیٹا یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی مرہم وغیرہ لگائے دیتے ہیں۔''

پھر فیاض حسین، ڈاکٹر بوٹا سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ کے پاس کوئی ٹیوب وغیرہ ہے۔''

''جی ہاں ہے میں ابھی پٹی کئے دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر بوٹا نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

ہاتھ کی مرہم پٹی کر کے ڈاکٹر بوٹا نے نیلم کے ایک انجکشن لگانا چاہا لیکن فیاض حسین نے منع کر دیا۔ وہ اب اچھی طرح ہوش میں آ چکی تھی، اس لئے اسے اب کسی انجکشن کی ضرورت نہ تھی۔

ڈاکٹر بوٹا طاقت کی کچھ گولیاں وغیرہ دے کر رخصت ہو گیا۔

اب شام ہونے کو آ رہی تھی۔ فیاض حسین سورج غروب ہونے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا تا کہ اندھیرا ہونے تک وہ مین روڈ پر پہنچ جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے فوراً ہی وہاں سے نکلنے کی تیاری کی۔ عاشق بٹ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ رکے نہیں۔

خاص طور پر نیلم کسی طور وہاں رکنے کے لئے تیار نہ تھی وہ بار بار یہی کہے جا رہی تھی۔

''ابو چلیں نا، یہاں سے نکلیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

تب وہ لوگ حسنہ کا جنازہ اُٹھنے سے پہلے ہی سیّد پور سے روانہ ہو گئے۔

عاشق بٹ انہیں گاؤں کے باہر کار تک چھوڑنے آیا۔ ڈرائیور انہیں دور سے آتے دیکھ کر گا سے باہر آ گیا۔ نیلم کے ہاتھ میں پٹی بندھی دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا نیلم بی بی۔'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ایسے ہی چوٹ لگ گئی۔'' فیاض حسین نے جواب دیا۔ ''چلو جلدی کرو، اندھیرا ہو سے پہلے پہلے ہی مین روڈ پکڑ لو۔''

''جی بہت بہتر صاحب جی۔'' اس نے بڑے ادب سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

نیلم اور واجدہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور کے ساتھ فیاض حسین بیٹھ گیا، گاڑی اسٹا ہوئی۔ فیاض نے عاشق بٹ کو خدا حافظ کہا اور تیزی سے شیشہ چڑھا لیا۔

گاڑی کچے راستے سے گزر رہی تھی۔ آگے آموں کا باغ تھا۔ باغ کے کنارے سے گاڑی گزر ایک درخت پر بیٹھے ہوئے کالے بلے نے بڑی پھرتی سے چھلانگ لگائی اور گاڑی کی چھت پر طرح جم کر بیٹھ گیا جیسے اسے چھت پر کیلوں سے جڑ دیا گیا ہو۔

کالے بلے کے چھت پر کودنے کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ وہ کودا ہی اتنی آہستگی سے تھا۔ کودتے وقت بالکل پھول سا ہو گیا تھا حالانکہ اس کا وزن کسی گدھے سے کم نہ تھا۔

فیاض اور واجدہ کے دل پر بڑا بوجھ سا تھا۔ سیّد پور آ کر ان کا بڑا دل خراب ہوا تھا انہیں توقع کہ حسنہ کو وہ اس خستہ حالت میں دیکھیں گے۔ پھر وہ ان کی موجودگی میں ہی چل بسے گی۔ اِدھر کا بلے نے دہشت پھیلا دی تھی۔

پہلے تو اس کے بارے میں حسنہ کا یہ کہنا کہ وہ محض ایک بلا نہیں ہے کچھ اور ہے۔ اس کے بعد بے ہوش ہونا، اس کی ہتھیلی چاٹنا اور اس پر کوئی وار کارگر نہ ہونا، یہ سب باتیں تھیں کہ ذہن چکرا کر تھا۔ بہرحال یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ کالا بلا نہ تھا کچھ اور تھا۔

وہ کیا تھا یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ چھت پر جما ہوا بیٹھا تھا اور گاڑی برق رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر خا چھائی ہوئی تھی۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ کے بارے میں بار بار سوچ رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہاتھ پر یہ زخم سا طرح بنا۔ یہ اسے معلوم تھا کہ وہ کالے بلے کے اچانک گود میں چڑھ آنے کی وجہ سے خوف مر ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر بلا آ رہا تھا۔ بلے سے پہلی ملاقات کا گویا اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔ وہ گلی کے درمیان بیٹھا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اا

ل لال آنکھوں میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گئی تھی۔ پھر حسنہ، آپا سے اس کی سگی ں بن گئی تھی۔ نیلم کا ذہن ابھی تک اسے اپنی سگی ماں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہ ں تھی۔ اب سگے سوتیلے کا کوئی جھگڑا نہ رہا تھا لیکن اب بھی اس کا ذہن ''نہیں نہیں'' کی گردان کر رہا ا۔ وہ بار بار نظریں اُٹھا کر واجدہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ یقین کر لینا چاہتی ہو کہ اس کی سگی ں کا انتقال نہیں ہوا، وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہی ہے۔ وہ واجدہ کے علاوہ ماں کے روپ ں کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

فیاض حسین ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کالا بلا اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ حسنہ کے ہے ہوئے الفاظ اور نیلم کی ہتھیلی چاٹتا ہوا وہ کالا بلا بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ فیاض کا ے ٹھوکر مارنا، عاشق بٹ کا لاٹھی سے مارنا اور پھر اس کا جسم بلم سے چھیدنا اور بلم کا اس کے جسم سے ار پار ہونا، اسے سب یاد تھا۔ کیسا خوفناک منظر تھا وہ۔

واجدہ کو حسنہ کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ حسنہ اس کی محسن تھی۔ اس نے اس کے لئے بہت بڑا ایثار یا تھا، وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں میں حسنہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کیسی حسین عورت یسی چڑیل جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹی بی کوئی ایسا مرض تو نہیں جس کا علاج نہ ہو سکے۔ اگر اسے پہلے ے حسنہ کی بیماری کا پتہ چل جاتا تو وہ سیّد پور آ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتی۔ لاہور میں وہ اس کا علاج کرواتی اور پھر وہ اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ حسنہ کو ٹی بی یوں ہی نہیں ہو گئی تھی۔ تنہائی نے زہر ہلاہل کا کام کیا تھا۔ تنہائی اس کے پھیپھڑوں کو چاٹ گئی تھی۔ حسنہ کو یاد ر کے واجدہ کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔

ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی کہ وہ لاہور خیریت سے پہنچ جائے۔ راستے میں گاڑی خراب نہ ہو، اگرچہ گاڑی نئی تھی، پھر بھی کوئی پرابلم کھڑی ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

کوئی آدھی رات کے بعد وہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔

گھر کے گیٹ پر گاڑی رکتے ہی کالے بلے نے گاڑی کی چھت سے درخت پر چھلانگ لگائی اور وہ ان لوگوں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے خود داخل ہو گیا۔ واجدہ کو پھولوں، پودوں اور درختوں کا بہت شوق تھا۔ یہ آم کا درخت تھا جس کا تنا گیٹ کے اندر تھا۔ وہ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ اس کی شاخیں آدھی سڑک پر تھیں اور آدھی گھر کے اندر۔ لہٰذا کالے بلے کو اس آم کے درخت سے گھر میں جانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

گاڑی سے اُتر کر ڈرائیور نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ فیاض حسین جاتے ہوئے گھر پر اپنے دفتر کے پہراسی ولی محمد کو چھوڑ گیا تھا تا کہ گھر کی حفاظت رہے، وہ اس وقت لمبی تان کر سو رہا تھا۔ کئی لمبی گھنٹیاں

دینے پر اچانک اس کی آنکھ کھلی وہ گہری نیند میں تھا۔ پہلے تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کیسی۔ جب اسے احساس ہوا کہ یہ گھنٹی کی آواز ہے، دروازے پر کوئی موجود ہے تو وہ گھبرا کر اُٹھ کر بھاگا۔

گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے آواز دے کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ہاں ولی محمد گیٹ کھولو، ہم لوگ ہیں۔'' فیاض حسین نے جواب دیا۔

فیاض حسین کی آواز پہچان کر ولی محمد نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

گھر میں داخل ہو کر نیلم نے سکون کا سانس لیا۔ وہ کمرے میں جا کر دھم سے اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں بیڈ پر پھیلا لئے اور آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لینے لگی۔

تب اچانک اسے احساس ہوا جیسے اس کے سرہانے کوئی ہے۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں او ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا کمرے میں کوئی نہ تھا۔

ابھی وہ دوبارہ آنکھیں بند کرنے والی تھی کہ اچانک کمرے میں لائٹ بجھ گئی۔ اسے خیال آیا کہ بجلی چلی گئی ہے لیکن اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور راہداری میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بجلی موجود ہے پھر اس کے کمرے کی لائٹ آف کیسے ہو گئی۔

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اس نے بجلی کا بٹن دیکھا وہ آن تھا۔ اس نے دوبارہ اسے آن آف کیا لیکن ٹیوب نہ جلی۔ اس نے سوچا ٹیوب میں کوئی خرابی ہو گئی ہے، یہ سوچ کر اس نے اپنے بیڈ کے سرہانے رکھا ٹیبل لیمپ جلانا چاہا تو ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا ایک دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرا گھپ ہو گیا۔ ایک لمحے کو کانپ کر رہ گئی، دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے جلدی سے ٹیبل لیمپ کا بلب روشن کر دیا اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلا تو اس کے ساتھ ہی کمرے کی ٹیوب لائٹ جل اُٹھی۔

ٹیوب لائٹ کے نیچے شوکیس کے اوپر ایک بڑی سے گڑیا رکھی تھی۔ یہ نیلم کے بچپن کی یادگار تھی۔ اسے گڑیوں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو دیکھ کر فیاض حسین نے ایک قیمتی جاپانی گڑیا اسے لا کر دی تھی۔ یہ گڑیا ایک نوزائیدہ بچے کے برابر تھی۔ اس کے اندر ایک کیسٹ لگا ہوا تھا۔ وہ چند جملے بھی بولتی تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے سے اس کا ٹیپ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ و روغن بھی اُڑ گیا لیکن سونے جاگنے کی عادت ختم نہ ہوئی تھی۔ لٹانے سے اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور اسے اُٹھانے سے آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ نیلم کو اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لہٰذا وہ اسے ہمیشہ کھڑا کر کے رکھتی تھی تا کہ اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اس گڑیا کے ساتھ خیر اب تو بچپن جیسی وارفتگی نہ رہی تھی لیکن اب بھی کبھی وہ اسے اپنے ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھ لیتی تھی۔

اس وقت بھی شوکیس پر کھڑی گڑیا پر اس کی نظر پڑی تو جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اُٹھا کر لے، وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

ابھی وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی کہ اس کے قدم جم کر رہ گئے۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور زور سے چیخی کہ پورے گھر میں اس کی چیخ گونج گئی۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر گری اور اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

چیخ سن کر فیاض اور واجدہ اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔ کمرے میں آ کر دیکھا تو نیلم کو بیڈ پر گٹھری بنا ہوا پایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا۔'' فیاض حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''نیلم میری بیٹی، میری جان، تجھے کیا ہوا۔'' واجدہ نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔

''نہیں امی نہیں۔'' وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ ''امی وہ شوکیس...... گڑیا...... وہ ڈھانچہ۔''

نیلم بے ربط انداز میں بولی، واجدہ اور فیاض کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''گڑیا، ڈھانچہ۔'' واجدہ نے سوالیہ انداز میں دھرایا۔ ''نیلم تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے۔''

''ہاں امی گڑیا کی جگہ ایک ڈھانچہ رکھا ہے۔''

''کہاں ہے بیٹی ڈھانچہ، تمہاری گڑیا اپنی جگہ شوکیس پر موجود ہے۔'' واجدہ نے اسے بتایا۔

یہ سن کر نیلم نے اپنے چاند چہرے سے ہاتھ کا بادل ہٹایا اور ڈرتے ڈرتے گڑیا کو دیکھا، واقعی اب وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے خوفزدہ ہوا جائے۔ اس کی جاپانی گڑیا اس کی بچپن کی ساتھی اپنی انہی بڑی بڑی آنکھوں سے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تو نے کیا دیکھا تھا بیٹی۔''

''امی ابھی ابھی جب میں اپنی گڑیا کو اُٹھانے کیلئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی تو امی میں آپ کو کیا بتاؤں کہ کیسا خوفناک ڈھانچہ میں نے دیکھا تھا۔ امی کسی مردے کی سوکھی کھوپڑی کی طرح اس کا چہرہ تھا، آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھے تھے، سر پر بال تھے اور بالوں کی چوٹیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور جسم کسی دیمک زدہ لکڑی کی طرح تھا۔ اس کے جسم پر بے شمار سوراخ تھے۔ لمبے لمبے سوکھے ہاتھ پاؤں، کھلا ہوا منہ اور ان سے جھانکتے دانت۔ امی اس کا سائز میری گڑیا جتنا تھا۔ پتہ نہیں وہ بیٹھا تھا یا کھڑا تھا۔'' نیلم اس ڈھانچے کے بارے میں بتاتے بتاتے کانپنے لگی۔

''اری چل بے وقوف، کیا بے پر کی ہانک رہی ہے۔''

واجدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس ڈھانچے کے بارے میں سن کر خود اند لرز گئی تھی۔

''امی، آپ کو یقین نہیں آ رہا۔'' نیلم نے روہانسی ہو کر کہا۔

''ارے چل ایسے ہی تیرا وہم ہو گا۔ یہاں کہاں ڈھانچہ، ہوتا تو کہاں غائب ہو جاتا۔''

''امی خدا کی قسم، میں نے ڈھانچہ دیکھا ہے۔'' نیلم نے واجدہ کو یقین دلانے کیلئے قسم کھائی۔

''اچھا اب قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، آرام سے سو جاؤ۔''

''امی آپ کو معلوم ہے جب میں کمرے میں آ کر لیٹی تو کیا ہوا۔''

''ہاں، کیا ہوا؟'' اس مرتبہ فیاض حسین نے پوچھا۔

''ابو خود بخود کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔'' نیلم نے فیاض کو بتایا۔

''خود بخود۔'' فیاض حسین نے سوال کیا۔

''جی ابو خود بخود اور کمرے کا دروازہ ایک تیز ہوا کے جھونکے سے بند ہو گیا اور جب میں آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو لائٹ خود بخود جل گئی۔ یہ سب کیا ہے، کیا ہو رہا ہے۔'' نیلم نے اُ ہوئے لہجے میں کہا۔

اس سوال کا کسی کے پاس جواب نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ واجدہ اور فیاض تو پہلے ہی اُ ہوئے تھے۔ ان کے دماغ ماؤف تھے سیّد پور جا کر انہوں نے بڑی غلطی کی تھی۔

اس رات نیلم تنہا اپنے کمرے میں نہ سو سکی۔ وہ بہت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ واجدہ کو اس کے ساتھ کے بیڈ پر سونا پڑا۔ وہ واجدہ سے لپٹ کر سو گئی۔

سیّد پور سے واپس آنے کے بعد نیلم کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ وہ گھبرائی گھبرائی رہتی تھی۔ سر میں درد مستقل رہنے لگا تھا۔ بھوک کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی سرخ رنگت پھیکی پڑنے لگی تھ فیاض حسین نے نیلم کو لاہور کے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا، لیکن کوئی نیلم کے مرض کو نہ سمجھ سکا۔ س نے اسے ''کوئی بیماری نہیں'' کا سرٹیفکیٹ دیدیا لیکن وہ تھی کہ دن بدن گھلتی جا رہی تھی۔ اس کا نفس علاج بھی کرایا گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ سر کا درد کم ہوا نہ بھوک کھلی، سرخ رنگت بدستور زرد ہوتی رہی۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔

وہ جو سیّد پور سے ساتھ آیا تھا وہ اسی گھر میں مقیم تھا وہ کسی کو نظر نہ آتا تھا لیکن اس نے سب کو ا نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ نیلم خاص طور پر اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ اسے دیکھے بغیر اسے چین نہ آ تھا۔ وہ اس کی رگوں میں اندھیرا بن کر اُتر رہا تھا۔ نیلم بیمار ہو رہی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کم کی بیمار ہے۔

ایک دن کیا ہوا۔

شام کو نیلم نے اپنے ٹیلر کے پاس کپڑے دینے جانا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے جب اس نے نے ڈھونڈے تو ایک جوتا غائب تھا۔ اس نے سرخ جوتے کی تلاش میں پورا کمرہ چھان مارا لیکن وہ اس نے سوچا کہ پیلے سینڈل پہن لے۔ ان کپڑوں سے وہ بھی میچ کر رہے تھے۔ پیلے سینڈل کھول کر دیکھا تو وہاں بھی وہی تماشا تھا۔ اس ڈبے سے بھی ایک سینڈل غائب تھا۔ یا اللہ یہ وں جوتوں کا ایک ایک پیر کہاں گیا۔ اس نے اپنے کمرے کے علاوہ پورا گھر چھان مارا لیکن تے کہیں نہ ملے۔

نیلم کو اس قدر پریشان دیکھ کر واجدہ نے اس سے پوچھا: ''کیا ہوا بیٹی۔''

''امی ڈبوں سے میرے جوتے غائب ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں جوتوں کا ایک ایک غائب ہے۔ نہ لال والا جوتا ہے جو میں نے ابھی انار کلی سے لیا تھا اور نہ پیلا والا سینڈل ہے جو آپ لا کر لائی تھیں۔'' نیلم نے واجدہ کو بتایا۔

واجدہ نے اس کے گمشدہ جوتوں کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملنے تھے نہ ملے۔

واجدہ نے کہا۔ ''نیلم چھوڑ کچھ اور پہن لے۔''

نیلم کے پاس جوتوں کی کیا کمی تھی۔ وہ کچھ بھی پہن سکتی تھی لیکن مسئلہ میچنگ کا تھا کوئی اور جوتا پہننے اسے ڈریس تبدیل کرنا پڑتا، اسے استری کرنا پڑتی اور اس وقت وہ استری کے موڈ میں نہ تھی۔

اس کی مشکل کو واجدہ نے آسان کیا۔ اس کے کپڑوں پر استری کر دی۔ نیلم ڈریس تبدیل کمرے سے نکلی، گاڑی گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ وہ چابی گھماتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر درخت کے تنے پر پڑی وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

اس کے دونوں گمشدہ جوتے، درخت کی سوکھی ٹہنیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ گمشدہ جوتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ یہ جوتے درخت تک کیسے پہنچے اور سوکھی ٹہنیوں پر ٹکے ہوئے کیسے تھے۔ جوتے اونچائی پر رکھے ہوئے تھے۔ اتنی اونچائی پر کہ انہیں ہاتھ بڑھا کر نہیں اتارا جا سکتا تھا۔

ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ان جوتوں کو کیسے اُتارے اس کی نظر پتوں پر پڑی۔ دو بڑے پتوں کے پیچھے اسے کوئی جھانکتا نظر آیا۔ وہ کوئی کالا سا نیگرو ٹائپ مرد تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اب نیلم سے یہاں نہ رکا گیا۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ گھر کے اندر بھاگ گئی۔

اندر میں اسے واجدہ مل گئی، نیلم کی اُڑی ہوئی رنگت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

''کیا ہوا ابھی تم گئی نہیں۔''

''امی باہر پتوں میں کوئی مرد چھپا ہوا ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ مجھے دکھاؤ۔'' واجدہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور امی میرے جوتے مل گئے۔ وہ آم کے درخت کی سوکھی ٹہنیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' نے چلتے چلتے بتایا۔

واجدہ نے باہر آکر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں اچھی طرح دیکھ لیا البتہ نیلم جوتے جوں کے توں سوکھی ٹہنیوں پر رکھے ہوئے تھے۔

''کہاں ہے کوئی مرد۔''

''امی ان پتوں کے پیچھے تھا اور مجھے بڑا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔''

''اچھا جاؤ اندر سے کوئی ڈنڈا وغیرہ لاؤ۔'' واجدہ نے درخت کے تنے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا امی۔'' یہ کہہ کر نیلم گھر میں داخل ہوئی۔

اسٹور میں چند مچھر دانی کے ڈنڈے پڑے ہوئے تھے جب وہ اسٹور میں داخل ہوئی اور اس۔ لائٹ جلانے کے لئے بٹن پر ہاتھ رکھا تو کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی نے نیلم کا ہاتھ کیا پکڑا گویا اس پر قیامت گزر گئی۔

اسٹور میں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا تھا، اس وقت تو خیر مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اندھیرا گ ہو گیا تھا۔ نیلم نے اندھیرا دور کرنے کے لئے بلب روشن کرنا چاہا۔ بٹن اسٹور میں داخل ہوتے ہی دا جانب تھا۔ نیلم نے اندازے سے بٹن پر ہاتھ رکھا اور ابھی اس نے بٹن آن کرنے کے لئے ہاتھ کا د ڈالا ہی تھا کہ اس کا خوبصورت نرم نازک اور گورا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ وہ لائٹ نہ جلا سکی۔

اس کے ہاتھ پر کسی نے نرمی سے گرفت کی تھی یہ گرفت غیر مہذبانہ نہ تھی۔ کسی نے بہت آہستہ سے اس کے ہاتھ کو پکڑا تھا، بہت پیار سے چھوا تھا۔

''امی۔'' وہ بُری طرح چیخی اور پھر باہر کی طرف بھاگی۔ واجدہ ابھی باہر ہی تھی۔ وہ نیلم کا انتظ کر رہی تھی کہ وہ ڈنڈا لائے تو وہ اس کے جوتوں کو اُتارے۔ نیلم کو بغیر ڈنڈے اور بدحواس ہو کر ا طرف آتا دیکھ کر واجدہ پریشان ہو گئی۔

''کیا ہوا نیلم۔'' اس نے پوچھا۔

''امی اسٹور میں کوئی ہے، میں نے لائٹ جلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کسی نے میرا ہاتھ لیا۔'' نیلم نے لمبے لمبے سانس لے کر جلدی جلدی بتایا۔

''اری، تُو تو بہت ہی ڈرنے لگی ہے، آ میرے ساتھ۔'' واجدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف چلی۔ واجدہ نے محسوس کیا کہ نیلم کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا تھا۔

اسٹور کے اندر پہنچ کر واجدہ نے لائٹ جلائی وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اس کا ہاتھ پکڑتی۔

''کیا ہے یہاں؟'' واجدہ نے نیلم سے پوچھا۔

اس بات کا وہ کیا جواب دیتی، اس نے کچھ دیکھا ہوتا تو جواب دیتی۔ اس نے محض محسوس کیا تھا اور اس وقت بھی وہ ایک بات محسوس کر رہی تھی اس نے واجدہ کا بازو پکڑ کر ایک گہرا سانس لیا۔

''امی، آپ کو خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔'' نیلم نے ایک اور گہرا سانس لیتے ہوئے واجدہ سے پوچھا۔

''ہاں کوئی خوشبو آ تو رہی ہے۔'' واجدہ نے لمبا سانس لیا۔

''کیسی خوشبو ہے یہ۔'' نیلم نے سوال کیا۔

''یہ تو گلاب کے پھولوں جیسی معلوم ہوتی ہے۔'' واجدہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''اسٹور میں یہ خوشبو کہاں سے آ گئی۔''

''امی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' نیلم، واجدہ کے بازو سے لپٹ گئی۔

''پگلی اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے کوئی خوشبو سے بھی ڈرتا ہے۔''

''امی، یہاں کچھ دیر پہلے ضرور کوئی تھا۔'' نیلم کی آواز میں لرزش تھی۔

''اری کوئی نہیں تھا، وہ محض تیرا وہم تھا تجھے تو باہر بھی کوئی آدمی نظر آیا تھا۔ پتہ نہیں تجھے کیا ہو گیا، تجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ نظر آتا رہتا ہے۔''

''امی، میں سچ کہہ رہی ہوں اس کے ہاتھ کا لمس اب تک مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ وہ کوئی بہت گرم ہاتھ تھا، بخار زدہ۔'' نیلم نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈنڈا نکالا۔ وہ خوشبو ابھی تک آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا اسٹور میں منوں گلاب رکھے ہوں۔

ڈنڈا نکال کر واجدہ باہر آئی، پھر وہ گھر کے بڑے دروازے سے باہر نکلی۔ نیلم اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

درخت کے تنے پر اب وہ جوتے نہ تھے، وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ شاید ہوا کے جھونکے سے نیچے آ گرے تھے۔ نیلم نے اپنے دونوں جوتے اُٹھائے۔ انہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھا وہ صحیح سلامت تھے۔

نیلم اس دن ٹیلر کے پاس نہ جا سکی۔ وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اس کا باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ وہ ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھ گئی۔ ٹیلی ویژن سے کوئی موسیقی کا پروگرام آ رہا تھا۔

واجدہ کچن میں تھی وہ رات کے کھانے میں مصروف تھی۔ حسنہ کے جانے کے بعد اس نے کوئی باقاعدہ ملازمہ نہ رکھی تھی۔ جھاڑو، پونچھے اور کپڑے دھونے کے لئے ایک ماسی رکھی ہوئی تھی۔ جو صبح

کام کر کے چلی جاتی تھی۔ فیاض حسین نے بارہا کہا تھا کہ کھانے پکانے کیلئے بھی کوئی ملازمہ رکھ لو ہی کچن میں گھسی رہتی ہو لیکن واجدہ اس کے لئے راضی نہ ہوئی۔ وہ خود ہی کھانا پکانا چاہتی تھی۔ وقت بھی وہ کھانے کے انتظامات میں مصروف تھی۔

ٹیلی ویژن دیکھتے دیکھتے اچانک نیلم کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس ڈرتے ڈرتے ٹیلی ویژن اسکرین سے نظریں ہٹا کر دائیں بائیں دیکھا کوئی نہ تھا۔

وہ پھر ٹیلی ویژن دیکھنے لگی۔ لیکن اس کا سکون لٹ چکا تھا۔ وہ بے چین ہو گئی تھی۔ پھر اسے اچا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے چہرے کے نزدیک لمبا سانس لیا ہو۔

وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھا۔ آ پاس کوئی نہ تھا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔

اب اس سے کمرے میں نہ رکا گیا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹیلی ویژن آف کیا تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ واجدہ اس وقت کہاں ہوگی۔ وہ سیدھی باورچی خانے پہنچی۔ واجدہ وہاں موجود تھی، وہ سبزی کاٹ رہی تھی۔

''لائیے امی میں کاٹ دوں سبزی۔'' نیلم نے واجدہ کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

''اچھا'' واجدہ نے ہنس کر نیلم کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہیں سبزی کاٹنے سے کب دلچسپی ہو گئی۔''

''ابھی سے۔'' نیلم نے سرسری سا جواب دیا۔

''تم نے ٹیلی ویژن کیوں بند کر دیا، اتنا اچھا گانا آ رہا تھا۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''آپ سن رہی تھیں کیا۔ ٹیلی ویژن کھول دوں۔'' نیلم نے کہا۔

''نہیں تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے ٹیلی ویژن کیوں بند کیا جبکہ تم موسیقی کے پروگراموں پر جان د ہو اور اس وقت تو تمہارا پسندیدہ فنکار اسکرین پر تھا۔''

''سچ بتا دوں۔'' نیلم نے واجدہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں بتاؤ۔'' واجدہ نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے کمرے میں ڈر لگ رہا تھا۔'' نیلم، واجدہ کے نزدیک ہو کر بولی۔

''نیلم اب تم بڑی ہو گئی ہو۔'' واجدہ نے ہنس کر کہا۔

''ہاں، امی میں جانتی ہوں کہ بڑی ہو گئی ہوں، بچی نہیں رہی ہوں لیکن میں کیا کروں مجھے ڈر لگ ہے اور جب سے ہم سیّد پور گئے ہیں تب سے خوفزدہ کر دینے والے واقعات کا سلسلہ شروع ہے۔ ام یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

''کہیں کچھ نہیں ہو رہا۔'' واجدہ نے بے نیازی سے کہا۔ ''آؤ چلو ٹی وی لاؤنج چلتے ہیں میں وہیں بیٹھ کر سبزی کاٹ لوں گی۔ پروگرام بھی دیکھ لوں گی۔''

''ٹھیک ہے چلیں۔'' نیلم، واجدہ کے پیچھے پیچھے ہولی۔

ٹی وی لاؤنج میں آ کر نیلم نے صوفے پر پڑا ریموٹ کنٹرول اُٹھایا اور ٹی وی کھول دیا۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین فوراً روشن ہو گئی اور ایک روشن روشن چہرہ چھوٹی اسکرین پر نمودار ہو گیا۔

واجدہ اپنی سبزی کے ساتھ نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔ نیلم صوفے پر براجمان ہو گئی وہ کچھ دیر پہلے اسی جگہ بیٹھی تھی جب اسے یہ احساس ہوا تھا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ پھر کسی نے اس کے بہت نزدیک لمبا سا سانس لیا تھا۔ نیلم نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا اسے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ اب کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس بھی ختم ہو گیا تھا۔ واجدہ بھی سامنے بیٹھی تھی پھر بھی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

جب سے وہ سیّد پور سے آئی تھی۔ اس کے دل کا سکون لٹ گیا تھا۔ ہر وقت اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ بعض وقت یہ درد اس قدر شدت اختیار کر لیتا کہ نیلم تڑپ تڑپ جاتی۔ وہ دوپٹے سے اپنا سر کس کر باندھ لیتی۔ پھر بھی اُٹھتی ہوئی ٹیسوں میں افاقہ نہ ہوتا۔ واجدہ گھنٹوں اس کا سر دباتی لیکن درد جوں کا توں رہتا۔ جب نیلم کے سر میں شدت کا درد اُٹھتا تو اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو جاتیں۔ وہ آنکھیں کھولتی تو اسے آنکھوں کو دیکھ کر ڈر لگتا۔ درد کا یہ دورہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک چلتا پھر اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور وہ سو جاتی۔ سو کر اُٹھتی تو اس کی طبیعت سنبھل چکی ہوتی۔ درد کی شدت تو کم ہو جاتی لیکن درد بالکل ختم نہ ہوتا ہلکا درد مستقل رہتا۔

فیاض حسین نے شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو نہ چھوڑا تھا۔ سب نے نیلم کا بغور معائنہ کیا تھا۔ سر کے متعدد ایکسرے بھی لئے گئے تھے لیکن کسی ڈاکٹر کو درد کی وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ نیلم کا دوائیں کھا کھا کر برا حال ہو گیا تھا۔ تھک ہار کر اس نے علاج چھوڑ دیا۔

اب سیّد پور سے آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ سر درد کے ساتھ اس کی بھوک بھی مٹتی جا رہی تھی۔ نیلم خوش خوراک لڑکی تھی۔ کھانے کی شوقین بھی تھی لیکن اب اسے کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ واجدہ نے کھانا سامنے رکھ دیا تو کھا لیا ورنہ کوئی پروا نہ کی۔ ناشتہ کیا کیا نہ کیا۔ رات کا کھانا بھی تقریباً چھوٹ گیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹا تو اس کی صحت پر بھی اثر پڑا سرخ سفید رنگت زرد ہونے لگی، مرجھانے لگی۔

ایک طرف نیلم کی دماغی اور جسمانی حالت بگڑتی جا رہی تھی تو دوسری طرف گھر میں عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے تھے۔ کبھی ڈھانچہ نظر آ گیا تو کبھی جوتے غائب ہو کر درخت پر جا ٹنگے اسٹور میں کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو کبھی گلاب کی خوشبو پھیل گئی۔

یہ خوف اب اس کے ساتھ مستقل چمٹ گیا تھا کہ ہر لمحہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ نیلم اب روم جاتی تو اندر سے دروازہ بند نہ کرتی۔ خوف کی وجہ سے وہ دروازہ بند کر ہی نہیں سکتی تھی۔ رات کو نے اپنے کمرے میں سونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ واجدہ کے ساتھ سوتی تھی۔ فیاض الگ سونے لگا رات کو سوتے سوتے چیخ کر اُٹھ جاتی۔ بھیانک خوابوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

اب ایک واقعہ اور پیش آنے لگا تھا۔ رات نیلم اپنے کمرے میں نہ سوتی تھی لیکن صبح اُٹھ کر جب اپنے کمرے میں جاتی تو اسے تکیے پر ایک تازہ گلاب رکھا ہوا ملتا۔

جب پہلے دن اسے اپنے تکیے پر گلاب کا ایک بے حد خوبصورت اور تر و تازہ پھول رکھا ہوا نظر آ وہ بے اختیار اس پھول کی طرف بڑھی۔ اس نے پھول کو اُٹھا کر سونگھا، بڑی مسحور کن خوشبو تھی، اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں گلاب کا پھول نہ ہو کوئی بچھو ہو، اس احساس کے سا اس نے گلاب کا پھول بستر پر پھینک دیا اور اپنے کمرے سے نکل گئی۔

پھر اس نے گلاب کے پھول کے بارے میں واجدہ سے پوچھا۔ ''امی آپ نے رکھا ہے وہ گلا کا پھول۔''

''کون سا بیٹی؟'' واجدہ نے پلٹ کر سوال کیا۔

''میرے کمرے میں تکیے پر۔'' نیلم نے بتایا۔

''میں نے تو کوئی پھول نہیں رکھا، آج تو میں باہر گارڈن میں بھی نہیں گئی۔ پھول کہاں سے رکھتی''

''امی پھر کس نے رکھا ہے وہ گلاب کا پھول؟'' نیلم پریشان ہونے لگی۔

''اپنے ابو سے پوچھ لو، شاید انہوں نے رکھا ہو۔'' واجدہ نے کہا۔

فیاض حسین شیو بنا رہا تھا کہ نیلم اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نیلم کو صبح صبح اپنے کمرے آتے دیکھ کر فیاض حسین مسکرایا اور بولا۔ ''ارے بھئی نیلم پری آج صبح صبح کیسے دیدار کرا دیا۔''

''ابو آپ کے تحفے کا شکریہ۔'' نیلم نے اندھیرے کا تیر چھوڑا۔

''کس تحفے کی بات کر رہی ہو نیلم۔'' فیاض حسین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اس گلاب کے پھول کی جو آپ نے میرے کمرے میں، بیڈ کے تکیے پر رکھا۔'' نیلم نے بڑ یقین سے کہا۔

''لیکن نیلم میں نے تو کوئی پھول تمہارے تکیے پر نہیں رکھا۔'' فیاض حسین بولا۔

''ابو پھر وہ میرے تکیے پر کس نے رکھا، امی بھی منع کر رہی ہیں۔'' نیلم نے فکرمندی سے کہا۔

''ذرا وہ پھول لا کر دکھاؤ مجھے۔'' فیاض حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی ابھی لائی۔'' کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن اپنے کمرے میں جانے کی اب اس میں ہمت

تھی اس نے واجدہ کو کچن سے اپنے ساتھ لیا، کمرے میں آئی۔ وہ گلاب کا پھول جوں کا توں بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔

''ارے، یہ تو زرد گلاب ہے۔'' واجدہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ پھول اُٹھا لیا۔ ''ہمارے گارڈن میں تو زرد گلاب کا کوئی پودا نہیں۔''

''پھر یہ کہاں سے آ گیا۔'' نیلم نے فکرمند ہو کر پوچھا۔ ''چلیں ابو کو دکھائیں۔''

وہ گلاب کا پھول کس نے تکیے پر رکھا، کہاں سے آیا، یہ کوئی نہ بتا سکا۔

لیکن اب یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔ صبح ہی صبح گلاب کا ایک تازہ پھول نیلم کے تکیے پر رکھا ہوتا۔ ہر وقت یہ پھول اس قدر تازہ ہوتا کہ اس پر شبنم کے قطرے صاف چمکتے نظر آتے۔ خوشبو بھی گلاب کے عام پھول کے مقابلے میں تیز اور مسحور کن ہوتی۔ یہ گلاب کے پھول مختلف رنگوں میں ہوتے۔ کبھی کالا گلاب ہوتا تو کبھی گہرا سرخ یہ سارے گلاب کے پھول اس گھر کے گارڈن کے نہ تھے۔ اتنے بڑے اور خوبصورت گلاب ان کے گارڈن میں کہاں کھلتے تھے۔

جب کئی دن تکیے پر گلاب کا پھول ملتا رہا اور سب یہ معلوم کرنے میں ناکام ہو گئے کہ یہ پھول کہاں سے آتا ہے، کون رکھ جاتا ہے، تو ایک دن فیاض حسین نے نیلم کے کمرے کو مقفل کر دیا۔

پھر رات کو بھی اس نے کئی مرتبہ اُٹھ کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ بدستور بند پایا لیکن صبح کو جب اس نے کمرے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تکیے پر ایک کالا گلاب موجود تھا۔ اس گلاب پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے، اس قدر تازہ تھا وہ کہ اس کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

نیلم کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی، فیاض حسین نے اسے چیک کیا وہ اندر سے بدستور بند تھی۔ ابھی وہ کالے گلاب کو دیکھ کر حیران اور پریشان ہی ہو رہا تھا کہ واجدہ کمرے میں آ گئی۔ اس نے تکیے پر پھول رکھا دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''دروازہ بند ہونے کے باوجود؟'' واجدہ نے فیاض کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں دروازہ مقفل ہونے کے باوجود یہ گلاب کا پھول یہاں موجود ہے، عقل دنگ ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ گلاب کا پھول کہاں سے آیا۔'' فیاض حیران ہو رہا تھا۔

''فیاض یہ مجھے کسی انسان کا کام نہیں معلوم دیتا۔'' واجدہ پریشان ہو کر بولی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اب ایک آخری بات اور رہ گئی ہے۔'' فیاض نے کہا۔

''وہ کیا ہے۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''کمرے کی ہر طرح نگرانی کر کے دیکھ لی ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کمرے میں ایک رات

گزار کر دیکھ لوں۔ کسی پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاؤں اور صبح تک بیٹھا رہا ہوں۔ پھر دیکھوں کا یہ پھول کہاں سے آتا ہے، کون رکھتا ہے۔'' فیاض حسین نے جواب دیا۔

''ہائے، نہیں فیاض۔'' واجدہ اپنا دل پکڑ کر بولی۔ ''میں تمہیں تنہا کمرے میں نہیں رہنے دوں گی۔

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔'' فیاض نے بے نیازی سے کہا۔

''نہ فیاض ایسا سوچنا بھی نہیں۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کمرے میں اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔''

''اچھا، ایسا کرو دونوں رہیں گے۔'' فیاض حسین نے مسکرا کر کہا۔

''نا بابا میرے بس کا نہیں ہے، خدانخواستہ کچھ نظر آ گیا تو میرا تو ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ فیاض ا کیوں نہیں کرتے کہ اس کمرے میں ایک رات کسی اور کو سلا دو۔''

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔'' فیاض حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کس کو سلاؤں، کون سو کی ہمت کرے گا۔''

''جسے بھی سلاؤ اسے بتانا کچھ نہیں۔ بغیر کچھ بتائے سونے کو کہہ دینا۔'' واجدہ نے ترکیب بتائی۔

''کس سے کہوں سونے کو۔'' فیاض حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اپنے دفتر کے چپراسی ولی محمد سے کیوں نہیں کہہ دیتے۔'' واجدہ نے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے اس سے کہوں گا تو وہ کوئی سوال بھی نہیں کرے گا۔ خاموشی سے آ کر سو جائے گا۔

اور ہوا بھی یہی۔ شام کو جب دفتر بند کرنے کا وقت ہوا تو فیاض نے ولی محمد سے کہا۔ ''ولی محمد تم ا بیوی کو بتا کر میرے گھر آ جاؤ، رات کو تم نے وہیں رہنا ہے۔''

ولی محمد بہت سیدھا آدمی تھا اس نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ ''کیوں صاحب جی۔'' بلکہ سعادتمن مندی سے بولا۔ ''بہت بہتر صاحب جی۔''

''آٹھ بجے تک پہنچ جانا کھانا گھر پر ہی کھا لینا۔'' فیاض حسین نے ہدایت کی۔

ولی محمد ٹھیک آٹھ بجے فیاض حسین کے گھر پہنچ گیا۔ واجدہ نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر ولی م نے پوچھا۔ ''صاحب جی کہاں سونا ہے۔''

تب واجدہ نے اسے نیلم کا کمرہ دکھایا۔ ایک تکیہ دیا۔ ولی محمد بیڈ کے برابر نیچے قالین پر لیٹ گیا۔

''ولی محمد ایک بات بتاؤ تمہیں اکیلے کمرے میں سونے سے ڈر تو نہیں لگتا۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''نہیں بیگم صاحب ڈر کس بات کا۔'' ولی محمد نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں تو اس گھر میں اکی سویا ہوں جب آپ لوگ سیدپور گئے ہوئے تھے۔ آج تو اس گھر میں آپ لوگ بھی موجود ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے مجھے یہ بات یاد ہی نہیں رہی۔ اچھا تم سو جاؤ۔'' یہ کہہ کر واجدہ کمرے سے نکل آئی۔

''فیاض، یہ ولی محمد تو آرام سے سو جائے گا۔'' واجدہ نے فیاض کے کمرے میں آ کر کہا۔ ''پھر ہمیں

یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ پھول کس نے رکھا۔''

''پھر کیا کرنا چاہئے۔''

''اسے اصل حالات سے آگاہ کر دیں، اگر وہ خوفزدہ ہو جائے تو تم بھی اس کے ساتھ سو جانا اور اگر وہ سارے واقعات سن کر خوفزدہ نہ ہو تو اس سے کہنا کہ رات کو سوئے نہیں۔ پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جائے اور رات بھر کمرے کی نگرانی کرے۔''

فیاض حسین نے واجدہ کی ہدایت کے مطابق ولی محمد کو گلاب کے پھول کی کہانی سنا دی۔ یہ ساری کہانی سن کر ولی محمد کو ذرا بھی ڈر نہ لگا بلکہ اس کے اندر خوف کے بجائے تجسس جاگا، وہ بولا ''صاحب جی آپ فکر ہی نہ کریں، میں رات بھر بیٹھ کر کمرے کی نگرانی کروں گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کمرے میں کون پھول رکھ کر جاتا ہے۔ میں اس کو ایسی پھینٹی لگاؤں گا کہ پھر زندگی بھر کے لئے پھول رکھنا چھوڑ دے گا۔''

فیاض حسین نے کمرے کی ٹیوب لائٹ جلا دی اور اسے رات بھر جلتی رہنے کی ہدایت دے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

ولی محمد نے فیاض حسین سے یہ کہنے کو تو کہہ دیا کہ وہ رات بھر جاگ کر نگرانی کرے گا لیکن وہ نیند کا بڑا کچا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کھانا بھی کچھ ضرورت سے زیادہ کھا لیا تو کھانے کا نشہ بڑھنے لگا۔ کچھ دیر تو وہ نیند سے لڑتا رہا۔ کبھی اُٹھا کبھی لیٹا اور کبھی بیٹھا اور کبھی ٹہلا۔ آخر کب تک پھر نیند نے بلی بن کر ایک چوزے کی طرح دبوچ لیا۔ وہ قالین پر پڑ کر گہری نیند سو گیا۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا تھا لہٰذا اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ فیاض کمرے میں آ کر اسے سوتا ہوا پکڑ لے گا۔

کوئی تین بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے خود کو اجنبی جگہ پایا۔

کھردری چارپائی کی جگہ وہ قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنے مالک کے گھر آیا ہوا ہے۔ اسے کمرے کی نگرانی کے لئے سلایا گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ جاگ کر رات گزارنے کے بجائے آرام سے پڑ کر سو گیا تھا۔ اتنی دیر میں تو کوئی پھول رکھ کر بھی چلا گیا ہوگا۔ ولی محمد نے پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا۔

بیڈ خالی تھا شکر تھا ابھی تک کسی نے شرارت نہیں کی تھی۔

پھر ولی محمد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ کے نزدیک آیا اس نے سوچا کہ نیچے قالین پر لیٹنے کے بجائے بیڈ پر کیوں نہ لیٹ جائے۔ ایسا نرم ملائم بستر روز روز کہاں نصیب ہوتا ہے۔ ابھی وہ بیڈ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اس کا منہ پھر گیا۔ وہ اپنے گال سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا مگر کمرے میں تھپڑ

مارنے والا کہیں نظر نہ آیا۔

پھر اچانک اس کی نظر بیڈ پر پڑی اسے دیکھ کر ولی محمد کی چیخ نکل گئی۔

وہ کوئی انتہائی بدشکل آدمی تھا جو بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے اور سر پر جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے جن سے سرخ سرخ خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں چمڑے کا دستانہ پہنے ہوئے تھا، انگلیوں کی جگہ نوکیلی کیلیں نکلی ہوئی تھیں۔

ولی محمد اس بدہیئت آدمی کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ وہ چیختا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھولی اور گیلری میں بھاگا۔

پہلی ہی چیخ پر فیاض حسین کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کر باہر آیا۔ ولی محمد اسے دیکھ کر تیزی سے اس سے چمٹ گیا۔

فیاض حسین نے بمشکل اسے اپنے سے الگ کیا اور بولا۔ "کیا ہوا ولی محمد؟"

"صاحب جی وہ......وہ......" ولی محمد کی سانس چڑھی ہوئی تھی، اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"کیا، وہ وہ۔" فیاض نے نرمی سے پوچھا۔

"صاحب جی کمرے میں کوئی ہے۔" ولی محمد بمشکل بولا۔

"کمرے میں کون ہے، آؤ میرے ساتھ۔"

"نہیں صاحب جی میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔ وہ، وہ بڑی ڈراؤنی شکل کا آدمی ہے۔"

آوازیں سن کر واجدہ کی بھی آنکھ کھل گئی، وہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی اور دونوں کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر بولی۔ "کیا ہوا؟"

"کمرے سے چیختا ہوا نکلا ہے۔ میں اس سے یہی پوچھ رہا ہوں، یہ بتا رہا ہے کہ کوئی ڈراؤنی شکل کا آدمی کمرے میں موجود ہے۔"

"ہائے میرے اللہ۔" واجدہ خوفزدہ ہوگئی۔

"میں دیکھتا ہوں جا کر کون ہے کمرے میں۔" یہ کہہ کر فیاض حسین تیزی سے آگے بڑھا۔ واجدہ اور ولی محمد اسے ٹوکتے ہی رہ گئے۔

"ولی محمد، صاحب کے پیچھے جاؤ۔" واجدہ نے ولی محمد کو ہدایت کی۔

"بیگم صاحبہ میں۔" ولی محمد کی سٹی گم ہوگئی۔

"ہاں جلدی جاؤ، بھاگو۔" واجدہ نے ذرا غصے سے کہا۔

ابھی وہ ہلا بھی نہ تھا کہ فیاض فوراً واپس آگیا۔

"وہاں تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

یہ سن کر ولی محمد کو کچھ اطمینان ہوا وہ جلدی سے کمرے کی طرف بڑھا پھر اس نے کمرے میں ڈرتے ڈرتے قدم رکھا۔ اب واقعی وہاں کوئی نہ تھا۔

ولی محمد نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی تفصیل اس نے فیاض حسین کو بتائی۔

"مجھے لگتا ہے ولی محمد تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔" فیاض حسین نے اظہار خیال کیا۔

"نہیں صاحب جی وہ خواب ہرگز نہیں تھا میں نے جو کچھ دیکھا ہے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"پھر وہ کہاں گیا؟" فیاض حسین نے پوچھا۔

"صاحب جی کسی نے میرے تھپڑ بھی مارا تھا۔" ولی محمد نے انکشاف کیا۔

"تھپڑ۔" فیاض حسین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی صاحب جی، یہاں اس طرف۔" ولی محمد نے داہنا گال فیاض حسین کی طرف کیا۔

فیاض حسین نے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے دائیں گال پر انگلیوں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ اب اسے یقین آگیا کہ ولی محمد نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت میں دیکھا ہے۔

ولی محمد بڑی مشکل میں تھا۔ اسے اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہاں آکر ایسے خوفناک واقعات سے دوچار ہونا پڑے گا تو وہ ہرگز کمرے میں سونے کی ہامی نہ بھرتا۔

صبح نزدیک تھی۔ فیاض حسین نے صبح ہونے تک نیلم کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ولی محمد اب اس کمرے میں اکیلا جانے کو بالکل تیار نہ تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ فیاض بھی اس کے ساتھ ہوگا تو وہ کمرے میں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ بیڈ ابھی تک خالی پڑا تھا، تکیے پر کوئی پھول نہ تھا۔

فیاض حسین نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ کھڑکی پہلے ہی بند تھی۔ کمرے میں لیمپ روشن تھی۔ فیاض حسین نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اسٹول اُٹھایا اور اسے ایک کونے میں رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ولی محمد اس کے نزدیک ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

ولی محمد نیند کا کچا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں نیند کہاں، دہشت کی وجہ سے کبھی وہ اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتا اور کبھی پھٹی پھٹی نظروں سے بیڈ کو دیکھنے لگتا۔ فیاض حسین ٹانگ پر ٹانگ رکھے، اسٹول پر بیٹھا تھا اس کی نظریں مسلسل تکیے پر تھیں۔

صبح تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ کوئی اندر آیا نہ تکیے پر پھول رکھا۔

سات بجے کے قریب واجدہ نے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا۔ فیاض حسین اُٹھا، اس نے جلدی سے دروازہ کھولا، دروازہ کھولتے ہی اسے واجدہ کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے نیلم تھی۔

اس کے چہرے پر بھی اطمینان نہ تھا۔
"واجدہ خیریت تو ہے۔" فیاض حسین نے دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔
"پہلے تم بتاؤ۔" واجدہ یہ کہہ کر اندر آئی اس نے سب سے پہلے تکیے پر نظر ڈالی۔
"اِدھر تو خیریت ہے تمہارے سامنے تکیہ ہے دیکھ لو پھول نہیں ہے۔" فیاض حسین نے کہا۔
"لیکن ہمارے کمرے میں خیریت نہیں ہے، وہاں سائیڈ ٹیبل پر جدھر نیلم سو رہی تھی ایک کا رنگ کا تر و تازہ گلاب موجود ہے۔"
"ارے۔" فیاض حسین حیران ہو کر کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں واقعی سائیڈ ٹیبل پر ایک ک پھول موجود تھا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔
"کچھ دیکھا تم لوگوں نے۔" فیاض حسین نے پوچھا۔
"میں تو سو رہی تھی، مجھے نہیں معلوم۔" واجدہ نے کہا۔
"اور تم نیلم۔" فیاض حسین نے نیلم سے پوچھا۔
"ابو میں بھی سو رہی تھی میں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔" نیلم نے جواب دیا۔
"ہم وہاں اس کا انتظار کرتے رہے اور وہ یہاں آ کر اپنا کام دکھا گیا۔"
"ابو کون ہے وہ؟"
"کیا معلوم بیٹا کون ہے وہ۔"
"ابو یہ پھول کس قدر خوبصورت ہے۔" نیلم یہ کہہ کر کالے گلاب کی طرف بڑھی۔
"نا، نا۔" فیاض حسین نے اسے تنبیہہ کی۔ "اس پھول کو ہاتھ مت لگانا۔"
"لیکن کیوں ابو؟"
"نیلم تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں، اس میں بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" واجدہ نے ڈ
"جی اچھا امی۔" نیلم نے سعادت مندی سے کہا۔
وہ کالا گلاب شام تک وہاں رکھا رہا۔
حالات اب اتنے سنگین ہو گئے تھے کہ کسی عامل کو بلائے بغیر چارہ نہ تھا۔ فیاض حسین نے جاننے والوں سے تذکرہ کر رکھا تھا۔ آج وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ شام کو گھر میں کسی عامل ساتھ ہی گھسے گا۔
لگن سچی ہو تو پھر حالات بھی خود بخود ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ دفتر پہنچا تو "صادق فلم منیجر نے فیاض کو ایک عامل کا پتہ بتایا۔ یہ عامل کاروباری آدمی نہ تھا بلکہ بہت کم لوگ جانتے ت عامل بھی ہے۔ وہ ایک پریس میں ملازم تھے اور شاہ نور اسٹوڈیوز کے عقب میں جو آبادی تھی وہا

ہائش تھی، نام تھا ان کا فتح محمد۔
شام کو گھر پہنچنے سے پہلے فیاض حسین نے واجدہ کو فون کر دیا تھا اسے بتا دیا تھا کہ وہ شام کو ایک ل فتح محمد کے ساتھ گھر آئے گا۔ لہٰذا نیلم کا کہیں باہر جانے کا پروگرام ہو تو اسے جانے نہ دینا۔
واجدہ اب بڑی بے چینی سے عامل کا انتظار کر رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی نیلم اپنے کمرے میں موجود ل، واجدہ بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھیں کہ گھنٹی بجی۔
واجدہ اُٹھنے لگی تو نیلم نے اسے روک دیا۔ "ٹھہریں امی میں جاتی ہوں گیٹ کھولنے۔"
"نہیں بیٹی تم مت جاؤ، فیاض کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی ہوں گے۔" یہ کہہ کر واجدہ اُٹھ گئی۔
اس نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو فیاض کے ساتھ ایک دُبلے پتلے آدمی کو پایا۔ پچاس سال کا ایک الا سا آدمی تھا۔ بالکل ایک عام سا آدمی اسے دیکھ کر واجدہ بڑی حیران ہوئی۔ یہ فیاض، عامل کے م س آدمی کو پکڑ لائے ہیں۔ اس نے سوچا پھر وہ فوراً ہی دروازے سے پلٹ آئی۔ فیاض حسین فتح محمد کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ فتح محمد نے صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں اوپر کر لیں۔ وہ بے تکلفی سے الی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "گھر میں کوئی چھوٹا آئینہ ہو گا۔"
"ہاں ہو گا۔" فیاض حسین نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
پھر فیاض حسین نے ایک چھوٹا سا آئینہ فتح محمد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ فتح محمد نے آئینے کا اسٹینڈ ھا کیا اور اسے اس زاویے سے میز پر رکھا کہ اسے اپنی شکل آئینے میں دکھائی دیتی رہے۔
اب فتح محمد کی نظر آئینے پر تھی اور وہ انگلیوں پر کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔
اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔
دروازہ کھلنے کی آواز پر فیاض حسین چونکا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں واجدہ کھڑی ھی۔ واجدہ نے کچھ بولنا چاہا تو فیاض حسین نے اسے انگلی کے اشارے سے بولنے سے منع کر دیا۔ فتح بہت توجہ سے کچھ پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔
فیاض حسین نہیں چاہتا تھا کہ واجدہ کی آواز سے فتح محمد کی توجہ ہٹ جائے۔ وہ خود اُٹھ کر دروازے لی گیا اور واجدہ کو اشارے سے باہر نکال لے گیا۔
پھر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے واجدہ سے پوچھا۔ "ہاں، کیا ہوا؟"
"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ عامل صاحب کتنی دیر یہاں رہیں گے۔" واجدہ نے کہا۔
"مجھے معلوم نہیں۔" فیاض حسین نے کہا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"میرا مطلب ہے کہ اگر کھانا وغیرہ کھا کر جائیں گے تو کھانے کا انتظام کروں۔"
"میرا خیال ہے کہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر بھی جاتے ہوئے ان سے اصرار کر لیں گے۔"

فیاض حسین نے خیال ظاہر کیا۔ ''ویسے ایک آدمی کے کھانے کا کیا انتظام۔ گھر میں اتنا کھانا تو ہو
ہے کہ ایک دو آدمی زائد کھا سکیں۔''

''اگر وہ کھاتے تو ذرا اہتمام کر لیتی۔ ایک دو سالن اور پکا لیتی۔'' واجدہ نے ملائمت سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اہتمام کر لو۔ وہ کھائیں گے تو کھالیں گے ان کا وظیفہ ختم ہو جائے گا تو میں بات کر لوں گا۔'' فیاض حسین نے کہا۔

فتح محمد کا وظیفہ جلدی ختم نہ ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک چلا۔ فتح محمد انگلیوں پر کچھ پڑھتا رہا اور اس آنکھیں آئینے پر جمی رہیں۔

وظیفہ پڑھتے پڑھتے اچانک فتح محمد نے فیاض حسین کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی لا کو کہا۔ فیاض حسین جلدی سے اُٹھ کر ایک گلاس پانی لے آیا اور اس نے گلاس آئینے کے برابر رکھ د فتح محمد نے وظیفہ ختم کر کے جھک کر آئینے پر تین پھونکیں ماریں پھر آئینہ دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے اس آئینے میں کچھ دیکھا ہو، اس کے بعد اس نے گلاس اُٹھایا اور غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی لیا۔

''لڑکی کہاں ہے؟'' فتح محمد نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''گھر میں اندر۔'' فیاض حسین نے بتایا۔

''اس کے سر کا ایک بال چاہیے۔'' فتح محمد نے کہا۔

''میں لے کر آتا ہوں۔'' فیاض حسین اُٹھتا ہوا بولا۔ ''لڑکی کو تو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں لڑکی کو لانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کے سر کا ایک بال چاہیے۔'' فتح محمد نے کہا۔

فیاض حسین کو نیلم کے سر کا بال لانے میں چند سیکنڈ لگے۔ وہ بال لا کر اس نے فتح محمد کے سا کر دیا۔ ''لیجیے۔''

فتح محمد نے فیاض کے ہاتھ سے نیلم کے سر کا بال لے لیا۔ پہلے اس نے اسے روشنی کی طرف کر دیکھا پھر بال کا ایک سرا اس نے اپنی اُنگلی میں لپیٹ لیا۔

پھر اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اب وہ پڑھتا جاتا تھا اور بال کو اُنگلی پر لپیٹتا جاتا تھا۔ یہاں تک سارا بال اس کی اُنگلی پر لپٹ گیا پھر اس نے انگوٹھے سے بال کے سرے کو دبا لیا تا کہ وہ کُھل نہ سکے۔

فیاض حسین اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اچانک فتح محمد کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر ہوئی تھیں۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا جیسے اسے زمین میں کسی بلی کی طرح گاڑ دیا گیا ہو۔

پھر وہ چلا۔ اس کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔

وہ کسی ایسی معمول کی طرح قدم اُٹھا رہا تھا جس پر مسمریزم کر دیا گیا ہو۔

فیاض حسین خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ فتح محمد نے بند دروازے کو کھولا اور باہر نکل گیا

اض کا خیال تھا کہ اس کا رخ گھر سے باہر کی طرف ہو گا لیکن ایسا نہ ہوا وہ گھر کے اندر جا رہا تھا۔ فیاض ں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

تح محمد، نیلم کے کمرے میں گیا نہ ان کے بیڈروم میں، نہ وہ ٹی وی لاؤنج میں گیا۔ اس کا رخ اسٹور ل طرف تھا۔ فتح محمد نے میکانکی انداز میں اسٹور کا دروازہ کھولا اور اس میں داخل ہو گیا۔

فیاض حسین جب تک دروازے کے نزدیک پہنچا اس وقت تک دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔

اچانک اندر سے ''میاؤں'' کی خوفناک آواز آئی پھر ایسا محسوس ہوا جیسے دو شخص آپس میں گتھم گتھا گئے ہیں۔ اندر سے چیزوں کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ دیر مزید اندر سے آوازیں آتی ہیں پھر ایک دَم سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسٹور کا دروازہ کھلا۔ فتح محمد اسٹور سے برآمد ہوا۔ فیاض حسین ان کی شکل یکھتے ہی کانپ گیا۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا ا یسی ہی سنجیدگی طاری تھی، جیسی اسٹور میں داخل ہوتے وقت تھی۔ اس کے سفید کپڑوں پر جگہ جگہ ن کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔

''پانی.....'' فتح محمد نے بڑی بے چینی سے کہا۔

فیاض حسین فوراً ایک گلاس پانی لے آیا۔ فتح محمد اتنی دیر میں ڈرائنگ روم میں پہنچ چکا تھا۔ فیاض ین نے اس کو پانی لے جا کر دیا۔ فتح محمد نے بڑی بے تابی سے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ی تیزی سے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر فیاض کی طرف گلاس بڑھاتا ہوا بولا۔ ''اور۔''

فیاض حسین اس مرتبہ جگ بھر کر لے آیا اس نے ایک گلاس پانی اسے اور پیش کیا۔

تح محمد نے پانی غٹ غٹ پی لیا اور گلاس فیاض کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''اور، میرا حلق خشک رہا ہے۔ پیٹ میں آگ لگی ہے۔''

اس طرح فتح محمد نے چار گلاس پانی کے پیئے۔ تب کہیں جا کر اس کے حواس بحال ہوئے۔

''یہ کیا ہوا؟'' فیاض حسین نے اس کے کپڑوں پر پڑے ہوئے سرخ دھبوں کے بارے ں پوچھا۔

''یہ خون کے دھبے ہیں۔'' فتح محمد نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

''آپ کو چوٹ لگی ہے۔'' فیاض حسین نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں، وہ مجھے چوٹ دے گیا ہے۔ وہ بہت زبردست ہے۔'' فتح محمد نے گول مول جواب دیا۔

''س کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' فیاض حسین نے پوچھا۔

''میرا مشورہ مانیں گے؟'' فتح محمد نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''جی فرمائیں۔'' فیاض حسین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''آپ اپنی لڑکی کی جتنا جلد ممکن ہو سکے شادی کر دیں۔'' فتح محمد نے ہدایت کی۔

''ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔'' فیاض حسین نے بتایا۔

''کیا آپ کو اپنی لڑکی کی زندگی عزیز نہیں۔'' فتح محمد نے تنبیہ کی۔

''وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔'' فیاض حسین نے گھبرا کر کہا۔ ''اس سے زیادہ عزیز کون ہوگا۔''

''پھر میں جو کہہ رہا ہوں وہ کریں۔ شادی بھی اس کی کہیں دور ہونا چاہئے۔ اس پر زبردس ہے۔ وہ دن بدن اسے اپنے گھیرے میں لیتا جا رہا ہے۔'' فتح محمد نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

''آپ کچھ کریں نا۔ جو کہیں گے حاضر کر دوں گا۔'' فیاض حسین بولا۔

''پیسوں سے یہ اثر دور نہ ہوگا۔ اس کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اتنی محنت میری بساط باہر ہے۔'' فتح محمد نے بے مایوسانہ انداز میں گردن ہلائی۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔''

''ارے، ارے۔'' فیاض حسین نے چونک کر کہا۔ ''آپ بیٹھیں تو، کھانا کھا کر جائیے گا۔''

''نہیں کھانا میں نہ کھاؤں گا۔'' فتح محمد نے کھڑے ہوتے ہوئے وثوق سے کہا۔

''کوئی نذر و نیاز۔'' فیاض حسین نے پوچھا۔

''میں کوئی پیر نہیں ہوں، فقیر آدمی ہوں۔'' فتح محمد نے بڑی انکساری سے کہا۔

''آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی کوئی فیس وغیرہ۔'' فیاض حسین نے گھما کر پھر سوال ک

''نہیں، فیاض صاحب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔'' فتح محمد ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا ہوا بولا۔ '' نے جو ہدایت کی ہے اس پر فوراً عمل کریں۔ ورنہ آپ کی لڑکی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

یہ کہہ کر فتح محمد ایک لمحہ نہ رکا۔ وہ کچھ خوفزدہ سا محسوس ہو رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از اس گھر سے نکل جائے۔

فتح محمد کو وہ گیٹ تک چھوڑ کر آیا۔ فیاض حسین بہت پریشان تھا، نیلم کے بارے میں فتح محمد جو گیا تھا وہ اذیت میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ اس کے علاوہ فتح محمد کی جو دُرگت یہاں بنی تھی اور اس کپڑوں پر خون کے چھینٹے جو پڑ گئے تھے۔ یہ سب فیاض حسین کو حیران اور پریشان کرنے کے کافی تھے۔

فیاض حسین نے دروازے میں قدم رکھا تو واجدہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ بولی۔ ''کیا عامل صاح چلے گئے۔''

''ہاں چلے گئے۔'' فیاض حسین نے جواب دیا۔

''کیا وہ اسٹور میں بھی گئے تھے۔'' واجدہ نے سوال کیا۔

''ہاں، گئے تھے۔''

''اسٹور میں وہ کیوں گئے تھے۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیوں گئے تھے۔ بس بیٹھے بیٹھے خود بخود اُٹھ کر اسٹور میں داخل ہو گئے پھر جب وہ اندر سے باہر آئے تو ان کے ہوش اُڑے ہوئے تھے اور لباس پر خون کے دھبے تھے۔''

''خون کے دھبے۔'' واجدہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ ''کیا وہ زخمی ہو گئے تھے۔''

''نہیں ان کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا۔'' فیاض حسین نے وضاحت کی۔

''کیا بتایا انہوں نے۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''کوئی صاف بات نہیں کی۔ بس اتنا بتایا کہ نیلم پر زبردست اثر ہے اس کی جلد از جلد شادی نہ کی تو ی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔'' فیاض حسین نے فکرمندی سے کہا۔

''اثر ہے تو اسے دور کریں، انہیں یہاں کس لئے بلایا تھا۔'' واجدہ وارفتگی سے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ معاملہ ان کے بس سے باہر ہے۔ وہ یہاں سے ڈرے ڈرے سہمے سہمے سے ئے ہیں۔''

''فیاض پھر کیا ہوگا؟'' واجدہ پریشان ہو گئی۔

''آؤ پہلے ذرا اسٹور میں جا کر دیکھتے ہیں، بعد میں پھر کچھ اور سوچیں گے۔''

''نہیں بھئی، میں وہاں نہیں جاؤں گی، جانے وہاں کیا ہو۔'' واجدہ نے سہم کر کہا۔

''اچھا ٹھہرو، میں الماری سے ریوالور نکال کر لاتا ہوں۔'' فیاض حسین یہ کہہ کر الماری کی طرف گیا۔ اس نے الماری سے اپنا ریوالور نکالا، اسے چیک کیا وہ لوڈ تھا۔

''تم یہیں بیٹھو، میں اکیلا دیکھ کر آتا ہوں۔'' فیاض حسین اسٹور کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

ریوالور کی وجہ سے کچھ واجدہ کی ہمت بندھ گئی۔ وہ اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے چل دی۔

فیاض حسین نے ہینڈل گھما کر پہلے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ پھر سیدھے ہاتھ میں ریوالور تان کر، ے میں زور سے لات ماری، دروازہ زور سے دیوار کے ساتھ لگا، ایک دھماکا سا ہوا۔

دروازہ کھلتے دیکھ کر واجدہ کا دل حلق میں آ گیا۔ وہ جلدی سے فیاض حسین کے پیچھے چھپ گئی۔

ر میں کچھ نہ تھا۔ فیاض حسین نے اندر جا کر اسٹور کی لائٹ جلائی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھی۔ اس نے اپنے پیر سے ٹین کی پیٹی میں ٹھوکر ماری لیکن وہاں سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔

ب ہمت کر کے واجدہ بھی اندر آ گئی تھی وہ غور سے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ فرش صاف تھا۔

''یہاں تو کچھ نہیں ہے۔'' واجدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن میں نے خود کسی بلے کی غراہٹ سنی تھی اور پھر چیزوں کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ جیسے دو

شخص آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ہوں۔ یہ کیفیت بس تھوڑی دیر رہی تھی اس کے بعد سناٹا چھا گیا
پھر فتح محمد ہلدی کی طرح ہو کر یہاں سے نکلے تھے۔ لباس پر خون کے چھینٹے بھی تھے۔'' فیاض ح
نے بتایا۔

''اگر یہاں لڑائی ہوئی ہوتی تو چیزیں اِدھر اُدھر پھیلی ملتیں، یہاں تو سب چیزیں اپنے ٹھکانو
رکھی ہیں۔ پھر یہاں خون کے قطرے بھی نہیں دکھائی دیتے۔'' واجدہ نے کہا۔

''امی، کس کا خون؟'' اچانک نیلم نے آکر پوچھا۔

اسٹور کے دروازے پر اچانک ہی نیلم نمودار ہو گئی تھی۔ اسے دروازے پر دیکھ کر دونوں گھبرا گ
فیاض حسین کی نیلم کی طرف پشت تھی اس لئے وہ اس کے ہاتھ میں ریوالور نہ دیکھ سکی۔ فیاض حسین
موقع غنیمت جان کر، ریوالور فوراً ٹوٹی میز کی دراز میں ڈال دیا۔

پھر فیاض اس کی طرف مسکراتا ہوا پلٹا تھا اور اس نے اسے مطمئن کرنے کیلئے ایسے ہی ایک چ
بلی کی کہانی سنا دی تھی۔ اس بلی کی جو ایک موٹا سا چوہا منہ میں دبا کر اسٹور میں داخل ہو گئی تھی۔ اور
وہ اسے نکالنے کے لئے اسٹور میں داخل ہوئے تھے۔

نیلم بھی اس بلی اور زخمی چوہے کی تلاش میں ان کی مدد کرنے لگی۔ اس نے اسٹور کے سا
کونے کھدرے دیکھ ڈالے مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔

نیلم کو دوسری طرف متوجہ دیکھ کر فیاض حسین نے دراز سے ریوالور نکالا اور واپس اپنے کم
میں آ گیا۔

سر دست نیلم کی فوری شادی کا مسئلہ تھا۔ فتح محمد نے تو تنبیہہ کی ہی تھی۔ فتح محمد کے علاوہ ایک ڈ
نے بھی فوری شادی کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نیلم شادی کے بعد نارمل ہو جائے گی۔ ا
صورت میں نیلم کی شادی کرنا تھی لیکن اتنی جلدی شادی کیسے ممکن تھی۔ انہوں نے تو اس کی ط
دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ نیلم فائنل ایئر میں تھی۔ دو ماہ بعد اس کے امتحان ہونے والے تھے۔ ا
کے بعد فوراً اس کی شادی ہو جانا چاہئے تھی لیکن اس قدر جلد کوئی قابل قدر رشتہ ملنا کہاں آسان تھا

دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے۔ کئی لڑکے زیر بحث آئے لیکن سب سے اچھا لڑکا صابرہ کا
اکبر کو ان دونوں میاں بیوی نے اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ نیلم بھی اکبر سے اچھی طرح واقف تھی
ایک دو مرتبہ کراچی رہ آئی تھی۔ اکبر بھی لاہور کا چکر لگا گیا تھا۔ اکبر، نیلم سے شادی کرنے کا
خواہشمند تھا۔ پسند نیلم بھی کرتی تھی۔ صابرہ نے دبے لفظوں میں واجدہ سے نیلم کا رشتہ مانگا تھا
لیکن واجدہ نے آج تک اس رشتے کے سلسلے میں کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خاندا
ایک سے ایک لڑکا موجود تھا۔ لڑکی ابھی زیر تعلیم تھی، بے حد حسین تھی۔ دولت مند باپ کی اکلوتی

ر اس کیلئے کسی خاص رشتے پر غور کرنے کی ابھی کیا ضرورت تھی۔ لہٰذا اکبر کا رشتہ، دوسرے
شتوں کی طرح ابھی ''زیرِ غور'' تھا اور اب وہ دونوں اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے اس رشتے کو منع
ں کیا تھا۔

ان حالات میں یہی رشتہ سب سے موزوں تھا۔ ان دونوں نے آپس میں تو یہ رشتہ طے کر لیا تھا
ب نیلم سے اس رشتے کے بارے میں رائے لینا تھی۔

نیلم بہت سیدھی اور فرمانبردار قسم کی لڑکی تھی۔ واجدہ نے جب اس سے اکبر کے بارے میں
چھا۔ ''اکبر کیسا لڑکا ہے۔''

تو نیلم نے سوال کا مطلب سمجھے بغیر مسکرا کر کہہ دیا۔ ''بہت اچھا۔''

''تیرے ابو، اس سے تیری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' واجدہ نے صاف صاف بات کی۔

''مجھے ابو کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔'' نیلم نے ہنس کر کہا۔

''شکر ہے خدا کا۔'' واجدہ نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ''تُو نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ تُو
حان سے فارغ ہو جا، اس کے فوراً بعد تیری شادی ہو جائے گی۔''

''ارے امی، اتنی جلدی، میں تو واقعی آپ پر بوجھ معلوم ہوتی ہوں۔'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں، میری جان تُو ایسی لڑکی ہے جس کا کوئی بوجھ نہیں، تُو پھول کی طرح ہلکی ہے۔'' واجدہ نے
ے اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اس کے سوا کوئی
ارہ نہیں سب یہی کہتے ہیں کہ نیلم کی جس قدر جلدی ہو سکے شادی کر دو۔''

''ارے امی، لوگوں کی کیا بات کرتی ہیں ان کا تو کام ہی مشورے دینا ہے پھر شادی ان کے
ے ہر مرض کا علاج ہے۔ شادی نہ ہو گئی کسی حکیم کا مجرب نسخہ ہو گئی۔ کسی وید کی بوٹی ہو گئی، کسی عامل کا
عویذ ہو گئی۔ اندھیرے کا جگنو ہو گئی، کھل جا سم سم ہو گئی۔ اِدھر لڑکی کو چھینک آئی اِدھر رشتے دار پکار
ٹھے ہائے اس کی شادی کر دو۔ اس کی چھینکیں بند ہو جائیں گی۔ کسی لڑکی کے سر میں درد ہوا فوراً پاس
وس کے لوگ مفت مشورہ دینے آ گئے بہن اس کی شادی کرو، اس کا سر کا درد جاتا رہے گا۔'' نیلم
نے ہنس کر کہا۔

''چل زیادہ باتیں نہ بنا۔'' واجدہ نے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔ ''شادی واقعی سو دکھوں کا
ایک مداوا ہے۔''

''امی، میرا خیال ہے کہ جس کو کوئی غم نہ ہو، وہ شادی کر لے، اللہ نے چاہا تو کبھی اس کے پاس
ٹی نہ آئے گی۔'' نیلم ہنس کر بولی۔

''اچھا، میری دادی، اب تو چپ ہو جا، میں نے مان لیا کہ جب سو بے وقوف مرے تھے تو تُو پیدا

ہوئی تھی۔"

"امی، سو بے وقوف نہیں، عقل مند کہیے۔" نیلم نے ہنستے ہوئے کہا۔

نیلم کو ہنستا ہوا دیکھ کر واجدہ اسے بغور دیکھنے لگی۔ اس نے ایک عرصے کے بعد اپنی بیٹی کے چہرے پر ہنسی دیکھی تھی۔ واجدہ نے اس کی پیشانی چوم کر گلے سے لگایا، پھر دل ہی دل میں نیلم کے بخت اچھے ہونے کی ڈھیروں دعائیں کر ڈالیں۔

لیکن اس کے بخت اچھے نہ ہوئے۔ اس کی تقدیر نہ بدلی۔ قسمت اچھی نہ ہوئی۔

چار ماہ بعد نیلم کی اکبر سے شادی ہو گئی۔

یہ تھے وہ حالات اور واقعات جن سے فیاض، واجدہ اور نیلم گزر رہے تھے۔ فیاض نے اب کوئی بات نہ چھپائی تھی بلکہ ہر بات تفصیل سے بتا دی تھی۔

سب لوگ ان واقعات کو بڑی توجہ، حیرت اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب فیاض نے اپنی داستان ختم کی تو محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک کسی نے کسی سے بات نہ کی۔ ہر شخص اپنی جگہ ششدر رہ گیا تھا۔

فرقان ماموں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں اس قدر سناٹا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی، اچانک یہ ٹک ٹک بند ہو گئی۔ گھڑی کا پنڈولم ساکت ہو گیا۔ یوں جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔

سردی میں یکایک اضافہ ہو گیا تھا ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا، اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔

سارے واقعات سن کر صابرہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر واجدہ بھی چپ نہ رہ سکی۔ وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔

واجدہ کے رونے کی آواز سن کر صابرہ نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹایا اور اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے جھٹکے سے صاف کیا اور واجدہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں رو رہی ہو؟"

"صابرہ، مجھے معاف کر دو۔" واجدہ نے اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"تمہیں، معاف کر دوں۔" صابرہ نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے ہمیں ہوا بھی نہ لگنے دی۔"

"صابرہ، تمہیں اگر ہم بتا بھی دیتے تو اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا۔ تمہیں ایسی باتوں پر یقین کب ہے۔" واجدہ نے کہا۔

"ہاں، جن، بھوتوں کو میں بالکل نہیں مانتی، مجھے واقعی اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اپنی

ونے کے ناتے تمہارا فرض تھا کہ ایک ایک بات ہمیں صاف صاف بتا دیتیں۔ تم نے ہم سے وہ راز ھی چھپائے رکھا کہ نیلم تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ چلو جن بھوتوں کے بارے میں تم مجھے بتا دیتیں تو بقول ہارے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اگر مجھے شادی سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ نیلم مانگے کا اُجالا ہے تو یں اپنے بیٹے کی ہرگز شادی نہ کرتی۔ خاندان کی کیا لڑکیاں مر گئی ہیں جو میں ایک ملازم کی لڑکی کو بہو نا کر اپنے خاندان کو خواہ مخواہ بٹہ لگا لیتی۔ تم نے بہت بُرا کیا ہے واجدہ میرے ساتھ، میں تمہیں کبھی نہ شوں گی۔" یہ کہہ کر صابرہ غصے سے اُٹھنے لگی۔

ماموں فرقان جوان دونوں کی باتوں کو بڑے صبر سے سن رہے تھے خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔ وہ جانتے تھے کہ واجدہ نے نیلم کے بارے میں دھوکے میں رکھ کر ان لوگوں پر بڑا ظلم کیا تھا، لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے صرف معاف کرنا سیکھا تھا۔ بگڑی ہوئی بات کو بنانا سیکھا تھا۔

"صابرہ، بیٹھو۔" ماموں فرقان نے نرمی سے کہا۔

"نہیں، ماموں، اب میں نہیں بیٹھوں گی، مجھے نیند آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں واقعی نیند آ رہی ہے۔" ماموں نے ہنس کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تمہاری نیند کوسوں دور بھاگ گئی ہوگی۔"

"ویسے، ان لوگوں نے کام تو ایسے ہی کیے ہیں۔" صابرہ نے غصے سے کہا۔

"صابرہ، میں ایک بات جانتا ہوں کہ اگر تم واجدہ کی جگہ ہوتیں تو تم بھی یہی کرتیں۔"

"نا، ماموں یہ نہ کہیں۔" صابرہ نے خفگی سے کہا۔ "میں ہرگز ایسا نہ کرتی، اوّل تو میں کسی اور کی لی کو گود لیتی ہی نہیں اگر لیتی تو دنیا والوں کو یا کم از کم لڑکی کے سسرال والوں کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتی۔ ماموں یہ تو صریحاً دھوکا ہے۔"

"صابرہ ایسا نہ کہو، اب تو ساری باتیں تمہاری سامنے آ گئی ہیں، یہ لوگ اپنی اس حرکت پر نادم بھی ہیں۔ تم سے واجدہ نے معافی بھی مانگ لی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں معاف کر دینا چاہیے۔"

"آپ نہیں جانتے ماموں کہ میرے، دل میں کیسی آگ لگی ہے۔ اس نے میری سگی بہن ہوتے ہوئے سوتیلی بہن کا سا سلوک کیا ہے میرے ساتھ، اب میں بھی اسے سوتیلی بن کر دکھاؤں گی۔" یہ کہہ کر صابرہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"جاؤ، بابر اسے سمجھاؤ۔" ماموں فرقان نے صابرہ کے کمرے سے چلے جانے کے بعد کہا۔

"ماموں، اس وقت وہ بہت غصے میں ہے۔ کچھ نہیں سمجھے گی۔ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔" بابر علی نے ماموں فرقان کو بتایا۔

"بابر صاحب، کیا ہو جائے گا۔" فیاض حسین نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگ نیلم کو طلاق دلوادیں گے۔" فیاض حسین کا لہجہ عجیب تھا۔ "ٹھیک ہے آپ دلوادیں طلاق۔ایسی ذلت سے تو بیٹی کا باپ کے گھر بیٹھ جانا زیادہ بہتر ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو، فیاض۔" ماموں فرقان نے مداخلت کی۔

"اب ماموں دیکھیں نا۔ہم نے ساری بات صاف صاف بتادی، اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ لی۔پھر بھی ان لوگوں کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔اب وہ سوتیلی بہن بن کر دکھانے کی دھمکی دے کر گئی ہیں۔ جانے یہ لوگ میری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔میری بیٹی بہت معصوم اور سیدھی ہے۔قصور ہمارا ہے۔اسے ہمارے قصور کی سزا کیوں ملے۔"

"ارے کچھ نہیں ہوگا۔میں صابرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ دل کی بہت اچھی ہے۔بس ذرا غصے میں آگئی ہے۔ایک دو دن میں ٹھیک ہوجائے گی۔اب آپ لوگ اپنے غصے پر قابو رکھیں کسی کا کچھ نہ بگڑے گا، نیلم مفت میں ماری جائے گی۔وہ پہلے ہی عذاب میں مبتلا ہے۔" ماموں فرقان نے ملائمت سے کہا۔

پھر ماموں فرقان نے فیاض اور بابر دونوں کو اچھی طرح سمجھایا۔صابرہ اور واجدہ کو بھی اونچ نیچ سمجھائی۔اب کافی وقت ہوگیا تھا۔سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ ماموں فرقان نے اپنے گھر جانے کی اجازت لی۔بابر علی انہیں گھر تک چھوڑنے گیا۔

ماموں فرقان کے جانے کے بعد صابرہ، اکبر کو اپنے کمرے میں لے گئی اور اس کو ایک ایک بات کہہ سنائی۔اکبر بہت توجہ سے اپنی ماں کی بات سنتا رہا۔نیلم کون تھی اور وہ کن مرحلوں سے گزری تھی اور یہ لوگ اکبر سے نیلم کی شادی کرنے پر اچانک کس طرح راضی ہوگئے تھے۔

صابرہ نے اپنے بیٹے کو یہ ساری داستان اس انداز سے سنائی تھی کہ وہ نیلم کو ایک وبال سمجھنے لگے اور گھبرا کر اسے چھوڑنے کا تہیہ کرلے لیکن ساری داستان سن کر اکبر نے ایک گہرا سانس لیا اور بس۔

جب اکبر کے دل میں آگ نہ بھڑکی تو صابرہ کو بہت غصہ آیا اس کے دل میں آگ بھڑکی ہوئی تھی اور وہ ہر قیمت پر واجدہ سے انتقام لینا چاہتی تھی اب تو اسے نیلم سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔وہ کسی ملازمہ کی بیٹی کو بہو سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

"ہاں، اکبر اب کیا کریں۔" صابرہ نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے امی؟" اکبر نے بات کو سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھا۔

"کل یہ لوگ نیلم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" صابرہ نے بتایا۔

"تو لے جانے دیں، میں جا کر لے آؤں گا۔" اکبر نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں لے جانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن میں چاہ رہی تھی کہ لے جارہے ہیں تو بس لے جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اکبر کی سمجھ میں واقعی کچھ نہ آیا۔

"ہمیشہ کے لئے لے جائیں۔" صابرہ نے دوٹوک انداز میں بات کی۔

"نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" اکبر گھبرا گیا۔

"تب نیلم کو طلاق دینا ہوگی۔" صابرہ کے دل کی بات بالآخر زبان پر آگئی۔

"اس کا قصور کیا ہے؟" اکبر نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اس کے والدین نے ہم سے جھوٹ بولا۔" صابرہ نے جرم بتایا۔

"وہ والدین نے بولا، نیلم نے تو نہیں۔" اکبر نے جرح کی۔

"نیلم ایک ملازمہ کی بیٹی ہے، میں اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔" صابرہ نے دوسرا جرم بتایا۔

"امی، کچھ بھی ہو، میں نیلم کو طلاق نہیں دوں گا۔" اکبر نے جرأت مندی سے فیصلہ سنایا۔

"ارے بے وقوف تجھے پتہ نہیں کہ اس پر جن کا سایہ ہے۔" صابرہ نے اسے خوفزدہ کرنا چاہا۔

"امی آپ جن بھوتوں کی کب سے قائل ہوگئیں۔" اکبر نے ہنس کر کہا۔

"اکبر مجھ سے بحث نہ کر۔" صابرہ کو غصہ آگیا۔

"امی، پھر آپ بھی مجھے کسی کام کے لئے مجبور نہ کریں۔" اکبر نے مستحکم انداز میں کہا۔

اکبر، صابرہ کا بہت لاڈلا بیٹا تھا کیوں نہ ہوتا، وہ اکلوتا بیٹا تھا۔صابرہ کو پکی اُمید تھی کہ وہ اس کی ہدایت پر آنکھ بند کرکے عمل کرے گا اور صبح ہوتے ہی نیلم کو طلاق دیدے گا اور یہ ممکن تھا کہ وہ ماں کی محبت میں نیلم کو چھوڑ بیٹھتا۔وہ تو بھلا ہو، فرقان ماموں کا انہوں نے اس گھر میں بادِ سموم چلتی دیکھ لی تھی۔اس لئے انہوں نے جانے سے پہلے اکبر کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسے مضبوط کردیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر نیلم کو نہیں چھوڑے گا۔

ساری باتیں سن کر اکبر نے کہا تھا۔"ماموں، اس جن کا کیا ہوگا جو اس پر آتا ہے۔"

"اس جن کی فکر نہ کرو، اس جن کو میں بھگاؤں گا۔" ماموں نے یقین دلایا۔

"اگر آپ نے جن سے نجات دلادی تو پھر میں کبھی نیلم کو نہ چھوڑوں گا۔" اکبر نے کہا۔

جب اکبر، نیلم کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا تو صابرہ نے اسے غصے میں اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہا۔"دفع ہوجا، یہاں سے۔"

اکبر خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل آیا۔اکبر کے چلے جانے کے بعد صابرہ تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔

اکبر نے صبح اُٹھ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ گاڑی لے کر گھر سے نکل گیا۔ وہ ماموں فرقا کے گھر عزیز آباد پہنچا۔ ماموں فرقان دکان پر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ گھر کی گھنٹی بجی۔

ماموں فرقان نے منہ دھوتے ہوئے آواز لگائی۔ ''دیکھو بیٹا کون ہے دروازے پر۔''

شمسہ باورچی خانے میں تھی۔ وہ اپنے ابو کی آواز سن کر دروازے کی طرف لپکی، دروازہ کھوا سامنے اکبر کھڑا تھا۔

''آیئے، آیئے اکبر میاں۔'' شمسہ عمر میں اس سے دو سال چھوٹی تھی لیکن رشتے میں اس کی پھوپ ہوتی تھی لہٰذا وہ رشتے کی مناسبت سے اسے چھوٹا ہی سمجھ کر برتاؤ کرتی۔

''سلام پھوپھی جان۔'' اکبر اسے جان بوجھ کر بڑا بنانے کی کوشش کرتا۔

''جیتے رہو۔'' شمسہ بجائے شرمانے کے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیتی۔

''کون ہے بھئی شمسہ۔'' ماموں فرقان نے اندر سے پوچھا۔

''ابو، اکبر آئے ہیں۔'' شمسہ نے بتایا۔

''چلو اکبر اچھے وقت پر آیا ہے، ابھی میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں، میں ناشتہ ہی کرنے آیا ہوں۔'' اکبر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا، امی نے گھر سے نکال دیا۔'' شمسہ نے چھیڑا۔

''ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' اکبر نے پھیکے لہجے میں کہا۔

ناشتے کے بعد اکبر نے ماموں فرقان کو رات کی ساری روداد سنائی، ماموں فرقان یہ سن پریشان ہو گئے۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ماموں فرقان نے جلدی سے اُٹھ کر ریسیور اُٹھایا اور بڑی ملائمت سے کہا۔ ''ہیلو۔''

اس ''ہیلو'' کے جواب میں اِدھر سے جو کہا گیا اسے سن کر ماموں فرقان نے اکبر کو فکر مندی سے دیکھا

''ماموں کس کا فون ہے؟'' ماموں فرقان کو اپنی طرف فکر مندی سے دیکھنے پر اکبر نے پوچھا۔

''تمہارے ابو ہیں فون پر۔'' ماموں فرقان نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' اکبر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''صابرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں فوراً گھر بلایا ہے۔ گاڑی تمہارے پاس ہے، صابرہ اسپتال لے جانا ہے۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

اسپتال کا نام سن کر اکبر کو سردی میں پسینہ آ گیا۔ ''کیا ہوا امی کو، لایئے ذرا، مجھے فون دیجئے۔''

ماموں فرقان نے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں ریسیور تھما دیا۔

''جی ابو! کیا ہوا امی کو۔'' اکبر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بیٹے، آپ فوراً گھر آئیں۔ فون پر وقت ضائع نہ کریں۔'' بابر نے نرمی سے کہا۔

''اچھا ابو، میں فوراً یہاں سے نکل رہا ہوں۔'' اکبر نے کھڑے ہوتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہوا۔ ''ماموں میں چل رہا ہوں۔''

''ہاں ٹھیک ہے تم جاؤ، اسپتال پہنچ کر جو بھی صورتحال ہو، دکان پر مجھے بتا دینا۔''

''ٹھیک ہے ماموں۔'' اکبر نے گھر سے نکل کر عجلت میں گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈک پر آ گیا۔

اکبر کے انکار سے صابرہ بہت دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ صدمہ تو اسے اس بات کا بھی کم نہ تھا کہ نیلم ایک ملازمہ کی اولاد تھی اور واجدہ نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس صدمے کے ساتھ ہی اکبر نے نیلم کو طلاق دینے سے انکار کر کے صابرہ کو ایک اور عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

صابرہ یہ کاری ضرب برداشت نہ کر سکی۔ وہ رات بھر روتی رہی۔ صبح کچھ دیر کو اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر اُٹھی تو اُٹھا نہ گیا۔ وہ شاید ڈپریشن کا شکار تھی۔

اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں فوری طور پر اسے ڈرپ لگائی گئی۔ طاقتور انجکشن اور ادویات دی گئیں۔ شام تک اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔

فیاض اور واجدہ، دو بجے کی فلائٹ سے نیلم کو لے جانے والے تھے لیکن صابرہ کے اسپتال پہنچ جانے کی وجہ سے فیاض نے سیٹیں کینسل کرا دیں۔ دونوں نے اسپتال جانا چاہا لیکن بابر جانتا تھا کہ اگر وہ دونوں اسپتال پہنچے تو صابرہ انہیں دیکھ کر غصے میں آ جائے گی۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی تنبیہہ کر رکھی تھی کہ مریضہ کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ بابر علی نے دونوں کو نرمی سے سمجھا دیا کہ وہ اسپتال نہ جائیں۔ ڈاکٹروں نے مریضہ سے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔

دوپہر کو ماموں فرقان اسپتال پہنچ گئے۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر صابرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ماموں فرقان کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کا چہرہ دیکھ کر لوگوں کے دل میں پھول کھل جاتے تھے۔ ان کے اندر ایسی مقناطیسی کشش موجود تھی۔ جو بھی انہیں دیکھتا، اس کا دل ان کی طرف کھنچتا۔ ماموں فرقان کے احترام میں صابرہ نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

''صابرہ لیٹی رہو، اُٹھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' ماموں فرقان نے ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی کیا پریشانی ہے تمہیں؟''

''مجھے تو کوئی پریشانی نہیں۔'' صابرہ نے مسکرا کر کہا۔

''پھر غصہ ہو گا۔'' ماموں فرقان بولے۔

"نہیں غصہ بھی نہیں۔" صابرہ نے اپنے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ یہاں اسپتال میں کس خوشی میں تشریف لائی ہیں۔" ماموں فرقان نے ہنس کر پوچ

"میں خود تو نہیں آئی، یہ لوگ لائے ہیں۔" صابرہ نے بابر اور اکبر کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر ہم لوگ اسپتال نہ لاتے تو یہ اب تک چل بسی ہوتیں۔" بابر نے مذاق میں کہا۔

"ہاں آپ تو یہی دعا کریں گے۔" صابرہ نے بابر کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

ماموں فرقان نے لڑائی کے آثار دیکھے تو فوراً درمیان میں آ گئے۔ "اچھا بھئی لڑائی نہیں ہو گ اسپتال ہے۔ اسے گھر سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اچھا بابر یہ بتاؤ نیلم کا کیا ہوا؟"

"نیلم گھر میں ہے، وہ لوگ آج نہیں گئے۔ صابرہ کی وجہ سے رک گئے ہو سکتا ہے کل جائیں" بابر نے بتایا۔

"صابرہ کے بارے میں ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے۔" ماموں فرقان نے بابر سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شام تک یہاں سے نکال دی جائیں گی۔" بابر نے پھر شوخی دکھائی۔

"دیکھیں ماموں انہیں سمجھائیں۔" صابرہ نے خفگی سے کہا۔

"بابر تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم اپنی عاقبت خراب کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔"

"اچھا ماموں آپ بھی، کیوں نہیں آخر ماموں کس کے ہیں۔" صابرہ نے اس مرتبہ ماموں فرق کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ "اس بات کا احساس کر لیں کہ میں اسپتال میں ہوں۔"

ماموں فرقان کچھ دیر اور بیٹھے، خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ پھر وہ اجازت لے کر چلے گئے۔ شا ڈاکٹر نے صابرہ کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی مسئلے پر زیادہ سوچ ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

صابرہ کو خاصی نقاہت ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کی مریضہ محسوس ہونے لگی تھی۔ آنے سے پہلے ہی صابرہ نے بابر کو ہدایت کر دی تھی کہ واجدہ اور فیاض میرے سامنے نہ آئیں۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی غصہ آنے لگتا ہے۔

بابر عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ ایک طرف بیوی تھی۔ دوسری طرف بیٹے کے سسرال وا تھے۔ سسرال سے پہلے وہ اس کی سالی تھی، دہرا رشتہ تھا۔ وہ کس طرح ان سے کہتا کہ صابرہ کے کمر میں نہ جائیں۔ وہ آپ لوگوں کی شکلیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ اسپتال تک تو بات نبھ گئی تھی۔ وہ تو ڈاکٹروں کی آڑ لے لی گئی تھی۔ ملاقاتی ممنوع قرار دیئے گئے تھے لیکن اب جبکہ وہ گھر پر آ گئی تھ انہیں ملنے سے کیسے روکا جاتا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فیاض اور واجدہ کو صاف صا بتا دیا جائے۔

تب بابر کافی دیر تک انہیں بتانے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرتا رہا لیکن وہ کتنے ہی میٹھے الفاظ امونڈ لیتا، کیسا ہی رس بھرا لہجہ اختیار کر لیتا۔ لفظوں کے ہیر پھیر اور لہجے کی تبدیلی سے مفہوم تو نہیں دل سکتا تھا۔

جب واجدہ نے صابرہ کے گھر آنے کے بعد اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی تو بابر، واجدہ ازی سے ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ان کے پیچھے پیچھے فیاض تھا۔

"واجدہ ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی۔" بابر نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں بابر بھائی آپ کہیں میں کیوں برا مانوں گی بھلا۔" واجدہ نے اسے یقین دلایا۔

"تم صابرہ کے کمرے میں مت جاؤ۔ وہ اس وقت پاگل ہو رہی ہے اسے نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے اور نہ سنائی دے رہا ہے اور جب آدمی کو کچھ دکھائی نہ دے، سنائی نہ دے تو ایسے آدمی کے سامنے جانے سے کیا فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہاری سگی بہن ہے، تمہارا دل اس کے لئے تڑپتا ہو گا۔ تم اسے دیکھنا چاہتی ہو گی لیکن واجدہ ایسی عیادت کا کیا فائدہ جو مریضہ کو تسلی دینے کے بجائے نقصان پہنچا دے۔ صابرہ کو اس بات سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ اب وہ تمہارا، فیاض کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔"

بابر نے دل پر پتھر رکھ کر یہ سب کہا۔

یہ سب سن کر فیاض کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ وہ چور سا ہو گیا۔

واجدہ یہ سب سن کر بے اختیار رو پڑی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے نیلم کے بارے میں حقائق نہ بتلا کر غلطی کی تھی، جرم کیا تھا لیکن اس نے اپنے اس جرم کی صابرہ سے معافی مانگ لی تھی پھر تو اسے معاف کر دینا چاہئے تھا۔

تب فیاض حسین ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے صوفے کے نزدیک پہنچ کر واجدہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "واجدہ۔"

واجدہ نے اپنا سر اٹھایا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی۔ "جی۔"

"واجدہ، اپنے آنسو پونچھ لو، اٹھو یہاں سے چلیں۔ ابھی وقت ہے۔ ایئر پورٹ چلتے ہیں۔ رات کی فلائٹ سے لاہور نکل جائیں گے۔ چلو جلدی کرو، تیاری کرو یہاں کافی عزت افزائی ہو گئی۔" یہ کہہ کر فیاض کمرے سے نکل گیا۔ بابر اسے روکنا چاہتا تھا لیکن روک نہ سکا۔

واجدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے بابر کو دیکھا اور بڑے درد سے بولی۔ "فیاض ٹھیک کہہ رہے ہیں، بابر بھائی، ہمیں اب اس گھر میں نہیں رکنا چاہئے۔"

بابر گونگا ہو گیا وہ نہ تو یہ کہہ سکا کہ ٹھیک ہے چلے جاؤ نہ یہ کہہ سکا کہ مت جاؤ۔

واجدہ اپنے آنسو پونچھتی اُٹھی اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

اکبر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس اذیت ناک صورت کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ وہ نیلم کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ نیلم اس کے خوابوں کی شہزادی تھی۔ اس نے نیلم کے خواب دیکھے تھے اور یہ اتفاق تھا کہ وہ حاصل ہو گئی تھی۔ اب اپنے خوابوں کی شہزادی کو کیسے چھوڑ دیتا۔

اکبر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے لٹتے ہوئے کارواں کے نظارے میں محو تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کسی نے اسے کا نام لے کر آواز دی ہو۔

وہ یک دم چونک پڑا چونک کر اس نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا، دروازے پر نیلم کھڑی تھی۔

''آؤ نیلم میرے خوابوں کی شہزادی میرے نزدیک آؤ۔'' اکبر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''امی ابو جا رہے ہیں۔'' نیلم نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''مجھ سے انہوں نے تیاری کر کہا ہے۔''

''کہاں جا رہے ہیں؟'' اکبر نے چونک کر پوچھا۔

''لاہور اور کہاں؟'' نیلم نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

''اس وقت۔'' اکبر حیران ہوا۔

''ابو بہت غصے میں ہیں، اب وہ یہاں سے فوراً چلے جانا چاہتے ہیں ویسے جانا تو ہے ہی کل آج چلے گئے۔''

''اچھا۔'' اکبر نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور کیا کر سکتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ نیلم کو پلک جھپکائے بنا ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اس کے اس طرح دیکھنے سے نیلم گھبرا گئی۔ ''اس طرح کیوں گھور رہے ہیں مجھے؟''

''نیلم، تم جانتی ہو، نہیں تم کہاں جانتی ہو گی۔ نیلم یہ دنیا والے تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں لیکن نیلم میں نے قسم کھا لی ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے میں تمہیں کھونے نہ دوں گا۔ میں نے تمہیں بڑی آرزوؤں سے حاصل کیا ہے۔'' اکبر جذباتی ہو گیا۔

''اکبر میں خود بھی یہی چاہتی ہوں میں تمہاری ہوں، تمہاری رہنا چاہتی ہوں۔'' نیلم نے بے اختیار کہا۔

جب نیلم، اکبر کی ہونے کا عہد کر رہی تھی تو اسی وقت کہیں سے ''میاؤں'' کی خوفناک آواز آئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا ہو۔ گلا گھونٹنے کا احساس بس چند لمحوں کے لئے تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ گلے کے پاس لے کر ''اوہ۔'' کر کے رہ گئی۔

''کیا ہوا نیلم؟'' اکبر نے اس کی اُڑی ہوئی رنگت دیکھ لی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' نیلم نے اپنی کیفیت چھپا لی۔ ''گلے میں کچھ خراش سی محسوس ہوئی۔''

''ابھی میاؤں کی آواز بھی آئی تھی۔'' اکبر نے فکرمند ہو کر کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔

''میں نے نہیں سنی۔'' نیلم نے یہاں بھی جھوٹ بولا۔

اکبر نے بیڈ کے نیچے اِدھر اُدھر کالے بلے کو تلاش کیا لیکن وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔

''کیا امی کو تم لوگوں کے جانے کا معلوم ہے۔'' اکبر نے پوچھا۔

''نہیں۔'' نیلم نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا میں جا کر بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر صابرہ کے کمرے میں پہنچا۔ صابرہ بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔

''امی، خالہ، خالو ابھی جا رہے ہیں۔'' اکبر نے فکرمندی سے کہا۔

''تو میں کیا کروں، جانے دو۔'' صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔

''امی آپ ان سے بات کر لیں نا۔'' اکبر نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔

''بات کرنا تو دور کی بات ہے میں تو ان لوگوں کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' صابرہ بولی۔

''آخر کب تک۔'' اکبر نے پوچھا۔

''ساری زندگی۔'' صابرہ نے بڑے یقین سے کہا۔ ''کیا تو مجھ سے واقف نہیں۔''

اکبر اپنی ماں کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ کیا صابرہ کی ضد سے گھر کا ہر فرد واقف تھا۔ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتی صحیح یا غلط، اس پر زندگی بھر کاربند رہتی۔ اب اس نے اپنی سگی بہن اور بہنوئی کی شکل نہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو دنیا کا کوئی آدمی اسے اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

اکبر خاموشی سے سر جھکائے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس موضوع پر اپنے باپ سے بات کرے وہ بابر کو سارے گھر میں تلاش کرتا رہا۔ بالآخر ڈرائنگ روم میں پہنچا، بابر ابھی تک وہیں بیٹھا تھا وہ صوفے پر نیم دراز تھا اور سوچوں میں گم تھا۔

دروازے پر آہٹ سن کر اس نے سر اُٹھایا۔ اکبر کو دروازے پر پا کر اس نے سر کے اشارے سے نزدیک بلایا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔

''ابو۔'' اکبر کی آواز میں لرزش تھی۔

''میں جانتا ہوں اکبر تم یہاں کیوں آئے ہو، کیا کہنے آئے ہو جو ہوتا ہے ہونے دو۔''

''ابو، وہ لوگ جا رہے ہیں۔ اپنے ساتھ نیلم کو بھی لے جا رہے ہیں۔'' اکبر نے فکرمندی سے کہا۔

''تو جانے دو، نیلم ان کی بیٹی ہے وہ اپنی بیٹی کو لے جا رہے ہیں۔'' بابر نے لاپروائی سے کہا۔

”لیکن ابو اس طرح۔“ اکبر کے لہجے میں افسوس تھا۔

”اور کس طرح جائیں اس گھر میں ان کی جو عزت افزائی ہوئی ہے اس کے نتیجے میں وہ اگر نہیں جائیں گے تو اور کس طرح جائیں گے۔“ بابر نے غصے سے کہا۔

ابھی یہ لوگ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ماموں فرقان کا فون آ گیا۔

بابر نے ان کی بات سننے سے پہلے گھر کی صورتحال بتائی۔ ماموں فرقان یہ سب سن کر پر ہو گئے بولے۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ صابرہ کو کیا ہو گیا ہے اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔“

”ماموں میں کیا کر سکتا ہوں، آپ صابرہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اچھا، بابر تم یوں کرو کہ ان لوگوں کو روکو میں آ رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آ جاؤں وہ گھر جائیں نہیں۔ نیلم کو ہر قیمت پر روکنا ہے۔ اسے ان کے ساتھ نہیں جانے دینا۔“

”کیوں ماموں۔“ بابر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہ میں آ کر بتاتا ہوں۔ مختصراً اتنا سن لو کہ دادا غفور نہیں چاہتے کہ نیلم کراچی چھوڑے، ا کراچی سے چلی گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آ سکے گی۔“ ماموں فرقان نے انکشاف کیا۔ ”تفصیل آ کر بتاتا ہوں۔ تم انہیں میرے گلشن پہنچنے تک روکے رکھو۔“

”اچھا ٹھیک ہے، ماموں آپ آئیں میں انہیں اس وقت تک کے لئے روکتا ہوں۔“

ٹیلی فون بند کر کے بابر نے اکبر کی طرف اور سنجیدگی سے بولا۔ ”بیٹے، واجدہ کو بلاؤ۔“

اکبر چاہتا تھا کہ وہ باپ سے ماموں فرقان کے فون کے بارے میں معلوم کر کے کہ انہوں کہا ہے لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ خاموشی سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واجدہ کے ساتھ کمرے میں واپس آ گیا۔ واجدہ کے ہاتھ پر ساڑھی لٹکی تھی شاید وہ اسے تہہ کرتے کرتے اکبر کے ساتھ آ گئی تھی۔

”جی بابر بھائی۔“ واجدہ اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بابر نے دیکھا کہ وا آنکھوں میں اب بھی آنسو تیر رہے تھے۔

”بیٹھو واجدہ۔“ بابر نے اپنے نزدیک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”نہیں، بابر بھائی اب بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اپنے کپڑے سمیٹ رہی ہوں۔“

”واجدہ، ماموں فرقان کا فون آیا تھا وہ ابھی آنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے گھر سے نہ جائیں۔ وہ کچھ نیلم کے بارے میں بھی کہہ رہے تھے۔ تفصیل وہ خود آ کر بتائیں گے مناسب سمجھو تو آدھا گھنٹہ رک جاؤ اتنی دیر میں وہ یہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔“

ماموں فرقان کا نام سن کر واجدہ نرم پڑ گئی۔ اس نے کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے پلٹی اور کمرے سے نکل گئی۔

بابر کے کہنے کے مطابق ماموں فرقان آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے واجدہ فیاض سے ڈرائنگ روم بند کر کے بات کی۔ بابر علی ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

وہ دونوں ایک منٹ بھی اس گھر میں رکنے کو تیار نہ تھے جبکہ ماموں فرقان چاہتے تھے کہ وہ رات کی فلائٹ سے لاہور نہ جائیں۔ انہیں لاہور ایئر پورٹ پر دقت ہوگی۔ ماموں فرقان کے سمجھانے سے وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ رات کی فلائٹ سے واپس نہیں جائیں گے۔ صبح دن کی فلائٹ سے چلے جائیں گے لیکن اب یہاں نہیں رکیں گے، رات کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔

ماموں فرقان پھر اَڑ گئے۔ انہوں نے اپنے پرخلوص رویے سے انہیں اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ بالکل اس گھر میں نہ رہیں لیکن ہوٹل بھی نہ جائیں وہ رات کو ان کے گھر رہیں پھر انہوں نے نیلم کے بارے میں بھی بات کی لیکن تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا کہا کہ پہلے میرے ساتھ گھر چلو وہاں بات ہوگی۔

ماموں فرقان نے ایسا پتہ پھینک دیا تھا جس کا کوئی توڑ نہ تھا۔ نیلم میں واجدہ اور فیاض کی جان تھی۔ نیلم کے بارے میں انہوں نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں۔

ماموں فرقان تینوں کو اپنے ساتھ لے کر عزیز آباد پہنچ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا گھر ان لوگوں کو نظر میں چھوٹا دکھائی دے گا لیکن ان کا دل چھوٹا نہ تھا۔ وہ بڑے دل کے مالک تھے۔ ان کا دل دریا اور دماغ سمندر تھا۔ ان کی شخصیت شجر سایہ دار کی سی تھی۔ فیاض حسین اپنے شہر کا ایک بڑا آدمی تھا لیکن اس میں تکبر نہ تھا یہی حال واجدہ کا تھا۔ واجدہ تو فیاض حسین سے اس معاملے میں دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ اپنے چھوٹے لوگوں کی عزت کرنا خوب جانتی تھی اس کی اسی عادت نے تو اسے نیلم دلوائی تھی۔ اس نے کبھی ملازمہ نہ سمجھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حسنہ، اس کے حسن سلوک پر مرمٹی تھی اور اپنے جگر کا ٹکڑا اس کے حوالے کر کے چلی گئی تھی۔ کسی نے سچ کہا کہ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے لیکن لفظوں کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا۔

عزیز آباد پہنچ کر واجدہ اور فیاض نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ماموں فرقان کے ایک سو بیس گز کے مکان کی دونوں میاں بیوی نے کچھ اس طرح تعریف کی کہ انہیں اپنا مکان محل معلوم ہونے لگا۔

شمسہ نے نیلم کو دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ نیلم بھی اس طرح شمسہ کے گلے لگی جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔

ممانی ریحانہ نے بھی واجدہ کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے ان کی آمد کی منتظر تھیں۔ گھر میں ایک

ہنسی خوشی کا ماحول تھا۔ واجدہ کو اس ماحول میں بڑا سکون ملا۔ جب سے وہ کراچی آئی تھیں جیسے
لگی رہی تھی۔ اس کے دماغ کی رگیں کھنچ رہی تھیں۔ اب جا کر اس کے تنے ہوئے اعصاب کو
کا احساس ہوا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سب لوگ ایک کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ رات گئے تک خوش
چلتی رہیں۔

دوسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے واجدہ اور فیاض لاہور چلے گئے۔ نیلم کو انہیں مجبوراً چھوڑ
دادا غفور کی یہی ہدایت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نیلم اگر یہاں سے چلی گئی تو سخت نقصان میں ر
وہاں سیّد پور کا جن اسے کہیں کا نہ رکھے گا۔ دادا غفور چاہتے تھے کہ اس جن سے نجات کے
ٹھوس عمل کیا جائے۔ اس عمل کے لئے نیلم کا نظروں کے سامنے رہنا ضروری تھا۔

اکبر اور بابر، ان دونوں کو ایئر پورٹ چھوڑ آئے تھے۔ جاتے ہوئے واجدہ نے نیلم کو ماموں
کے قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ماموں فرقان، نیلم کو شمسہ کی طرح سمجھنا میں اسے محض آپ
سہارے چھوڑے جا رہی ہوں۔''

''ہاں، واجدہ تم اطمینان سے جاؤ، نیلم کی فکر مت کرو، یہ مجھے شمسہ سے بھی زیادہ عزیز رہے
ماموں فرقان نے یہ الفاظ رسماً نہیں کہے تھے بلکہ انہوں نے جو کہا تھا اسے اپنے دل پر لکھ لیا تھا۔

جب یہ لوگ گلشن سے نکلے تو صابرہ کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس نے یہی قیاس کر لیا تھا کہ
اور فیاض، نیلم کو لے کر لاہور جا چکے ہیں، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ ایئر پورٹ نہیں ماموں
کے گھر چلے گئے ہیں اور یہ کہ نیلم اپنے والدین کے ساتھ لاہور نہیں گئی ہے۔ ماموں فرقان
یہاں ہے۔

اور یہ بات اسے اس وقت معلوم ہوئی جب ماموں فرقان شام کو نیلم کے ساتھ گلشن پہنچے۔

واجدہ اور فیاض ساڑھے بارہ بجے کے قریب ایئر پورٹ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد
بجے کے قریب ان لوگوں نے کھانا کھایا پھر سہ پہر کو ماموں فرقان نیلم کو لے کر دادا غفور کے گھر
روڈ پہنچے۔ دادا غفور کی یہی ہدایت تھی کہ وہ نیلم کو دیکھنا چاہتے تھے۔

برنس روڈ جاتے ہوئے ماموں فرقان، نیلم کو بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بس یہی کہا تھا
غفور ان کے دور کے رشتے داروں میں سے ہیں۔ وہ بہت دن سے بلا رہے تھے ہم نے سوچا
ان کے گھر چلا جائے۔ تم بھی ہو سوچا کہ تمہیں بھی ساتھ لے چلیں۔ تم نے وہ علاقہ نہیں دیکھا
تمہاری سیر ہو جائے گی۔

ماموں فرقان ٹیکسی میں آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے ممانی ریحانہ اور شمسہ تھیں۔ نیلم ان د

درمیان میں تھی۔ ماموں فرقان نے نیلم کو درمیان میں قصداً بٹھایا تھا۔

ٹیکسی تیزی سے برنس روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماموں فرقان، نیلم کو گزرنے والی سڑکوں اور
وں کے نام بتاتے جا رہے تھے۔

صدر سے نکلنے کے بعد اچانک نیلم کا رنگ بدلا اس نے گھبرا کر ماموں فرقان کے کندھے پر ہاتھ
ا اور بولی۔ ''ماموں آپ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں؟''

''بیٹا ہم نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم دادا غفور کے یہاں جا رہے ہیں۔''

''نہیں ماموں، میں کہیں نہیں جاؤں گی مجھے آپ یہیں اُتار دیں۔'' نیلم نے عجیب سے لہجے
کہا۔

ماموں فرقان اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی
وں میں دیکھتے ہوئے کچھ پڑھنا شروع کیا۔

''روکو ٹیکسی میں کہیں جاؤں گی؟'' نیلم نے اچانک دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ممانی ریحانہ نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماموں فرقان کا اسے درمیان میں بٹھانا کام آ گیا۔ اس
کا پورا امکان تھا کہ وہ اگر کنارے پر بیٹھی ہوتی تو اب تک کب کا ٹیکسی کا دروازہ کھول چکی ہوتی۔

نیلم کی بات سن کر ٹیکسی والے نے فرقان ماموں کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو۔ کیا
لہ ہے۔

ٹیکسی مت روکنا۔ یہ بات ماموں فرقان نے ٹیکسی والے کو اشارے سے سمجھائی۔

ماموں فرقان کچھ پڑھ رہے تھے اس لئے زبان سے کچھ بولنا نہیں چاہتے تھے۔

''نیلم پریشان مت ہو بیٹے۔'' ممانی ریحانہ نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

نیلم نے اپنا سر فوراً ممانی کے کندھے سے اُٹھا لیا اور ایک مرتبہ پھر ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لئے
ہاتھ بڑھایا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے گھر واپس لے چلیں۔'' نیلم نے ماموں فرقان سے التجا کی۔

ماموں فرقان نے اشارے سے نیلم کو قریب آنے کو کہا جیسے وہ اسے آہستگی سے کچھ بتانا چاہتے
نیلم ان کا اشارہ پا کر جب آگے کی طرف جھکی تو ماموں فرقان نے اس کے چہرے پر زور سے
ک ماری۔

نیلم نے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر وہ بڑے اطمینان سے سیٹ سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ جو اس کا
بدل گیا تھا اور بار بار ٹیکسی سے اُترنے کی کوشش کر رہی تھی ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اور
رلی طرح خاموش ہو گئی۔

برنس روڈ کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ماموں فرقان نے بائیں جانب ٹیکسی مڑوائی اور پھر تھ
اندر جا کر اسے روکنے کو کہا۔ ٹیکسی سے اُتر کر ماموں فرقان نے کرایہ ادا کیا اور پھر وہ لوگ بلڈ
سڑھیاں چڑھنے لگے۔

داداغفور کے گھر والوں نے نیلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیلم نے ان لوگوں کو دیکھ کر بظاہر خوشی کا ا
لیکن اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

ماموں فرقان نے داداغفور کے کمرے میں جا کر نیلم کی آمد اور اس کی کیفیت کے بارے م
اور بولے۔ ''داداغفور، نیلم کو جلد دیکھ لیجئے کہیں اس کی حالت نہ بگڑ جائے۔''

''ارے فرقان تم فکر نہ کرو۔ وہ اب آگئی ہے یہ گھر کسی قلعے کی طرح ہے بالکل محفوظ۔ اس گ
کوئی غیر انسانی مخلوق پَر بھی نہیں مار سکتی۔'' داداغفور نے بے نیازی سے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

''جانتے ہو تو پھر پریشان کیوں ہوتے ہو۔''

''پریشان اس لئے ہوں کہ اس کی ماں اسے میرے سپرد کر کے گئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ ا
وعافیت اس کے گھر پہنچادوں۔''

''اچھا بھئی، لاؤ بلاؤ اسے۔'' داداغفور نے کہا۔

ماموں فرقان فوراً اُٹھے۔ اندر کمرے میں آئے، نیلم داداغفور کے پوتے پوتیوں کے سات
بولنے میں مصروف تھی۔ ماموں فرقان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ سہم گئی۔ ماموں فرقان نے اس کی کیا
محسوس کر لیا لیکن اس کا اظہار نہ کیا۔ خوش ہو کر بولے۔ ''ہاں بھئی گپیں شروع ہو گئیں۔ تم لڑکیوا
یہ ایک اچھی بات ہوتی ہے بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل جاتی ہو۔ آؤ نیلم، داداغفور کو سلا
وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔''

''مجھے ماموں۔'' نیلم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔''

نیلم کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور خوش ہو کر بولے
نیلم بیٹے آؤ۔ اِدھر آجاؤ، میرے پاس۔''

''آداب دادا۔'' نیلم نے آنکھیں جھکائے آداب کیا۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' داداغفور نے دُعا دی۔

نیلم سکڑ سمٹ کر داداغفور کے پاس چوکی پر بیٹھ گئی۔ داداغفور گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے
انہوں نے آگے جھک کر نیلم کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''کیسی ہو، بیٹی؟''

''جی ٹھیک ہوں، دادا۔''

داداغفور نے اپنی کالی واسکٹ کی جیب میں سے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف
ھاتے ہوئے بولے۔ ''لو بیٹے یہ رکھ لو۔''

''ارے دادا، اس کی کیا ضرورت تھی۔'' نیلم نے دھیرے سے کہا۔

''نیلم تکلف نہ کرو، فوراً نوٹ پکڑ لو تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں منہ دکھائی کے سو روپے مل رہے
ں۔ ذرا اپنی ممانی ریحانہ سے پوچھنا وہ آج تک روتی ہے کہ اسے داداغفور نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو
ئی روپے ٹکائے تھے۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

داداغفور مسکرا دیئے مگر بولے کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے تکیے کے نیچے سے تسبیح نکالی اور وہ اندر سے
ی کو آواز دینے ہی والے تھے کہ ماموں فرقان بولے۔ ''دادا پانی لاؤں کیا۔''

''ہاں، ایک گلاس پانی چاہئے۔'' داداغفور نے کہا۔

ماموں فرقان پانی لینے اندر چلے گئے۔ جب پانی لے کر آئے تو دادا تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو چکے تھے۔
ہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی اپنے نزدیک رکھنے کو کہا۔ ماموں فرقان نے گلاس چوکی پر رکھ دیا۔
تسبیح مکمل کرنے کے بعد داداغفور نے گلاس اُٹھا کر پھونکیں ماریں اور نیلم کی طرف بڑھاتے
ہوئے بولے۔ ''لو نیلم یہ پانی پی لو۔''

پانی کے گلاس کو نیلم نے غور سے دیکھا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے ذرا جھجکی۔ ''دادا مجھے پیاس
ہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا، جتنا پی سکتی ہو پی لو۔''

''نیلم یہ پانی فوراً پی لو تمہارے سر میں ہر وقت درد رہتا ہے نا ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''اچھا ماموں۔'' نیلم نے داداغفور کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

گلاس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر اسے گھورنے لگی۔

''پانی میں کچھ پڑا ہوا ہے کیا نیلم۔'' داداغفور نے پوچھا۔

''یہی دیکھ رہی ہوں۔'' نیلم نے گلاس کو بدستور گھورتے ہوئے کہا۔

''لاؤ مجھے دکھاؤ، میں دیکھوں۔'' ماموں فرقان نے ہاتھ بڑھایا۔

یلم نے گلاس ماموں فرقان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے ذرا اوپر روشنی میں کر کے دیکھا۔
انی بالکل صاف تھا۔ اس میں کوئی تنکا وغیرہ نہ تھا۔

''نیلم پانی بالکل صاف ہے، پی لو۔'' ماموں فرقان نے گلاس نیلم کی طرف بڑھایا۔

یلم نے گلاس پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کر کے بغور دیکھنے لگی۔

''بیٹے وہم نہ کرو، پانی پی لو۔'' اس مرتبہ داداغفور بولے۔

لیکن نیلم نے پانی نہ پیا۔ وہ بدستور اسے گھورتی رہی۔

ماموں فرقان نے دادا غفور کی آنکھوں میں دیکھا۔ دادا غفور کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"نیلم پانی پی لو جلدی کرو۔" ماموں فرقان نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا۔

"اسے تو خود کیوں نہیں پی لیتا، مجھے بے وقوف سمجھتا ہے۔" اچانک نیلم کا لب و لہجہ بدل گیا۔ اس نے مردانہ آواز میں کہا اور اس پانی کو ماموں فرقان کے منہ پر پھینک دیا۔

پورے گلاس کا پانی ماموں فرقان کے چہرے اور لباس پر پڑا تو وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

ماموں فرقان کی گھبراہٹ سے نیلم بڑی محظوظ ہوئی اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور مذاق اُڑاتے ہوئے بولی۔ "بس فرقان ایک گلاس پانی سے ڈر گئے؟ اب ہم جا رہے ہیں۔"

نیلم جو ہونق بن گئی تھی اپنی اصلی حالت پر آ گئی، اب نہ آنکھیں پھٹی رہیں اور نہ رنگ لال انگارہ رہا...... نہ مردانہ آواز رہی۔

اسے ہوش آیا تو سب سے پہلے اس نے اپنا دوپٹہ درست کیا جو شانے سے ڈھلک چکا تھا۔ دوپٹہ درست کر کے اس نے ماموں فرقان کی طرف دیکھا اسے وہ بھیگے ہوئے نظر آئے، نیلم نے حیرت سے انہیں دیکھا اور نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہوا ماموں؟"

"بیٹی تمہیں نہیں معلوم؟" ماموں فرقان نے ہنس کر دادا غفور کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

"مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی؟" نیلم نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"سر کیوں پکڑ رہی ہو؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ماموں میرے سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔" نیلم نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

تب ہی دادا غفور نے ماموں فرقان کو اشارہ کیا کہ وہ گلاس میں اور پانی لے آئیں۔ ماموں فرقا نے شیشے کا خالی گلاس اُٹھایا اور اندر سے دوبارہ پانی لے آئے۔ دادا غفور نے اس پر کچھ پڑھ کر پھو اور گلاس نیلم کی طرف بڑھا دیا۔

"لو بیٹا پانی پی لو تمہارے سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

نیلم نے فوراً گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جلدی سے پانی پی گئی۔ پانی پی کر اسے کچھ سکو محسوس ہوا۔ چہرے پر جو مردنی پھیل گئی تھی وہ کم ہوئی۔ ذرا بشاشت آئی پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولی "دادا جی میں اندر جاؤں۔"

"ہاں ٹھیک ہے بیٹا تم اندر جاؤ۔" دادا غفور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نیلم نے بڑی فرمانبرداری سے ذرا آگے ہو کر ان کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ دادا غفور نے اس

شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "بیٹا فکر نہ کرنا تمہیں بہت جلد اس موذی سے نجات مل جائے گی۔"

"کس موذی سے دادا؟" نیلم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس موذی سے بیٹا جو خود کو سیّد پور کا بتاتا ہے۔ اس کا نام ابھی نہیں معلوم، وہ بھی کر لیں گے۔ حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم بہت ہیں اسے سمجھنے کیلئے۔" دادا غفور نے بڑے ین سے کہا۔

"اچھا دادا شکریہ۔" نیلم کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، بہرحال وہ مدد کرنے کو کہہ رہے تھے لہٰذا ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا سو اس نے کر دیا۔

پھر وہ دادا غفور کو "خدا حافظ" کہہ کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں خواتین بیٹھی تھیں۔

"فرقان اس لڑکی کیلئے کچھ کرو اس نے اس پر خاصا قبضہ جما لیا ہے۔" دادا غفور نے نیلم کے جانے ے بعد کہا۔

"آپ بتائیں کیا کروں؟" ماموں فرقان خود پریشان تھے۔

"ایک رات قبرستان میں گزار لو گے؟" دادا غفور نے پوچھا۔

"گزار لوں گا۔" ماموں فرقان نے اس طرح کہا جیسے یہ ان کے لئے معمولی بات ہو۔

"ڈرو گے تو نہیں؟" دادا غفور ہنسے۔

"دادا غفور میں بچہ تھوڑی ہوں۔" ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

"جانتا ہوں۔" دادا غفور نے ہنس کر کہا۔ "بھائی قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے تم نے تو وہاں پوری رات گزارنا ہے۔ میں یہ کام خود کرتا لیکن بڑھاپے نے اب اس قابل نہیں رکھا ہے کہ اتنا لمبا عمل کر سکوں۔"

"دادا غفور آپ فکر نہ کریں۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "میں بھی اگرچہ جوان نہیں لیکن ایک رات رور گزار لوں گا قبرستان میں۔"

پھر دادا غفور نے ماموں فرقان کو بتایا کہ قبرستان میں بیٹھ کر کیا پڑھنا ہے۔ کس طرح عمل کرنا ہے ہاں کس قسم کی صورتحال پیش آ سکتی ہے، ایسی صورتوں میں کیا کرنا ہوگا۔

ماموں فرقان نے تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جو چیزیں وہاں پڑھنا تھیں انہیں ایک کاغذ پر وٹ کر لیا اس کے بعد دادا غفور سے اجازت لے کر ان کے کمرے سے نکل آئے۔

دادا غفور اپنے کمرے سے مشکل سے نکلتے تھے۔ گھر میں کوئی بھی آتا جاتا وہ ان سے ملنے ان کے رے میں جاتا پھر وہ اسے اپنے کمرے سے ہی رخصت کر دیتے تھے لیکن اس دن جانے کیا ہوا کہ یلم جب گھر سے جانے لگی تو دادا غفور اسے سیڑھیوں تک چھوڑنے آئے اور بار بار پریشان نہ ہونے

کی تلقین کرتے رہے۔

''نیلم تم بہت خوش قسمت ہو کہ دادا غفور تمہیں گھر کے باہر تک چھوڑنے آئے۔'' ماموں فرقان۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ بات تو ہے دادا غفور بھلا کہاں اپنے کمرے سے نکلتے ہیں، چاہے کوئی آئے کو جائے۔'' ریحانہ ممانی نے تائید کی۔

نیچے اُتر کر سڑک پر آئے تو فوراً ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔

ماموں فرقان نے پہلے اپنے گھر والوں کو عزیز آباد چھوڑا پھر اسی ٹیکسی میں نیلم کو اس کے گھر گلشن پہنچایا جب وہ گلشن پہنچی تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

گیٹ صابرہ نے کھولا، سامنے ماموں فرقان اور نیلم کو پایا تو وہ کچھ حیران ہوئیں، اُن کے خیال کے مطابق واجدہ اور فیاض لاہور جا چکے تھے اور ان کے ساتھ نیلم بھی چلی گئی تھی۔ نیلم کو ماموں فرقان کے ساتھ گھر کے دروازے پر دیکھا تو حیران ہونا لازمی امر تھا۔

نیلم کو دیکھ کر وہ دروازے پر رکی نہیں۔ اس نے ماموں فرقان کو جلدی سے سلام کیا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

ماموں فرقان۔ صابرہ کے تعاقب میں اس کے کمرے تک پہنچ گئے۔ نیلم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماموں فرقان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی خاموش رہی۔

''صابرہ تمہیں طبیعت کیسی ہے؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ماموں میں ٹھیک ہوں۔'' صابرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ نیلم لاہور کیوں نہیں گئی؟''

''گئی تھی۔'' ماموں فرقان نے صابرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''گئی تھی تو پھر واپس کیوں آ گئی؟''

''اسے اپنی ساس یاد آ رہی تھی اس لئے ایئرپورٹ سے واپس آ گئی۔'' ماموں فرقان نے یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی صابرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''ماموں سچ بتائیں نا۔'' صابرہ نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں اپنا منہ بگاڑ لیا۔

''اچھا ذرا میں مغرب کی نماز پڑھ لوں پھر آ کر سچ بتاتا ہوں۔ تم جب تک اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لو۔'' یہ کہہ کر ماموں کمرے سے نکل گئے۔

قریبی مسجد میں ماموں فرقان نے نماز پڑھی۔ گھر واپس آئے تو بابر اور اکبر بھی شوروم سے واپس آ چکے تھے۔

راشدہ، نیلم کے کمرے میں بیٹھی اس سے محو گفتگو تھی، اسے نیلم کے لاہور نہ جانے کی بڑی خوشی تھی

وہ اس سے ماموں فرقان اور دادا غفور کے گھروں کا احوال سن رہی تھی۔

اکبر باتھ روم میں منہ دھونے میں مصروف تھا۔ بابر کپڑے تبدیل کر کے ایک کرسی پر بیٹھا چائے کا منتظر تھا۔ صابرہ اپنے کمرے میں تھی اور ابھی مصلے سے اُٹھی تھی۔

ماموں فرقان نے سب سے پہلے بابر علی سے علیک سلیک کی۔ دادا غفور کے گھر جو بیتی تھی وہ سنائی پھر وہ اُٹھ کر صابرہ کے پاس چلے گئے۔ صابرہ کے کمرے میں راشدہ بھی موجود تھی۔ وہ چائے کے خالی کپ اُٹھانے آئی تھی۔ ماموں فرقان، بابر علی کے ساتھ چائے پی چکے تھے۔ راشدہ کمرے سے باہر چلی گئی تو ماموں فرقان نے دادا غفور کے گھر کی روداد بیان کی۔ اسے یہ بتایا کہ وہاں کیا ہوا، دادا غفور نے نیلم کو لاہور جانے سے کیوں روکا۔ ماموں فرقان نے صابرہ کو یہ بھی بتایا کہ فیاض اور واجدہ رات کو ان کے گھر رہے اور دوسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے لاہور گئے۔ صابرہ بڑے صبر سے ماموں فرقان کی زبانی تمام کہانی سنتی رہی۔ ماموں فرقان نے ساری داستان سنا کر صابرہ سے کہا۔

''نیلم کے والدین تو خیر واپس لاہور چلے ہی گئے اب شاید وہ کبھی واپس نہ آئیں۔''

''تو نہ آئیں، جائیں بھاڑ میں، میں کون سی ان کیلئے مری جا رہی ہوں۔'' صابرہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ تم ان کے لئے مری نہیں، کوئٹہ جاؤ گی۔'' ماموں فرقان نے اس کے غصے والی توجہ نہ دی بات کو ہنسی میں اُڑانے کی کوشش کی۔

''اوہو ماموں۔'' صابرہ نے زچ ہو کر کہا۔ ''آپ تو حد کرتے ہیں۔''

''میری بات دراصل ادھوری رہ گئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ فیاض اور واجدہ تو اب چلے ہی گئے دونوں صورتیں تمہیں اب نظر نہیں آئیں گی۔ اب ایک صورت گھر میں رہ گئی ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم نیلم کو معاف کر دو؟''

''معاف کرنے کو میں اسے کیا کہہ رہی ہوں، اسے کیا کہہ سکتی ہوں۔'' صابرہ نے بڑی لاتعلقی سے کہا۔

''اس سے محبت نہیں کر سکتیں تو نفرت بھی نہ کرو، وہ بہت معصوم اور سیدھی سادی سی لڑکی ہے، وہ پہلے ہی عذاب میں مبتلا ہے اگر اس گھر سے اسے نفرت ملی تو وہ کہیں کی نہ رہے گی، پاگل ہو جائے گی۔''

''ارے ماموں وہ کوئی عذاب وذاب میں مبتلا نہیں ہے، یہ سب ڈھونگ رچا رکھا ہے اس نے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ اس پر جن کا سایہ نہیں ہے وہ ڈرامہ کر رہی ہے؟'' ماموں فرقان نے حیرت سے کہا۔

''میں تو یہی سمجھتی ہوں۔'' صابرہ نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

''صابرہ تم بہت بے وقوف ہو، تم کچھ نہیں سمجھتیں، تمہیں اس وقت سمجھ آئے گی جب وقت تمہ ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔'' ماموں فرقان نے کسی قدر غصے سے کہا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

پھر ماموں فرقان نے صابرہ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو صابرہ، ماموں فرقان کو اس طرح ناراض ہو کر کمرے سے کبھی نہ دیتی۔ انہیں روک لیتی لیکن اس وقت اسے نیلم کی طرفداری بالکل پسند نہ آئی۔ ماموں فرقان کی نیلم کی تعریف اور حمایت میں کلمات سن کر اس کا ذہن سلگ اُٹھا تھا، ذہن تلخ ہو گیا تھا۔ اعصا اینٹھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے ماموں فرقان کو جانے دیا۔

وہ کچھ دیر بیڈ پر بیٹھی رہی پھر وہ تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھڑکیاں بھی بند تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ آج سردی خاصی تھی، شام ہوتے ا ہواؤں کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ صابرہ نے اپنا نرم ملائم کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

اس کی نظریں چھت کو گھور رہی تھیں اور اس کا دماغ نیلم میں اُلجھا ہوا تھا اور اس نے بیٹھے گھر میں ایک عذاب پال لیا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی اتنی دور شادی کرنے کی۔ کراچی میں لڑک کیا کمی تھی۔ دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں، یہاں کی لڑکی ہوتی تو دیکھی بھالی ہوتی طرح کا فریب تو نہ کھاتی۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے چہرے پر تھپڑ کی طرح پڑا۔

اس کے سرہانے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا تھا۔ اتنی تیز ہوا آ رہی تھی کہ اس پر پڑا ہوا اُڑ رہا تھا۔ یہ کھڑکی باہر باغ کی طرف کھلتی تھی۔

صابرہ کان سن کرنے والی ہوا سے بچنے کے لئے تیزی سے اُٹھی، اس نے جلدی سے کھڑ بند کیا اور اسے بولٹ کر دیا۔

کھڑکی بند کر کے اس نے ہیٹر آن کر دیا وہ ہیٹر کا استعمال کبھی کبھی کرتی تھی لیکن اس وقت اس طرح سردی محسوس ہوئی تھی کہ وہ ہیٹر آن کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ چند ہی سیکنڈوں میں ہ شعلوں کی طرح چمکنے لگے۔ صابرہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیئے، کچھ دیر وہ کھڑی رہی، ہاتھوں کو گرمی محسوس ہوئی تھی لیکن جسم میں سردی تیر کی طرح گھس رہی تھی۔

وہ فوراً بیڈ پر آ گئی...... اس نے جلدی سے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ابھی وہ اچھی طرح ا گرد لپیٹ نہ پائی تھی کہ برف جما دینے والا ایک تیز جھونکا اس کے سر کو لگا۔

کھڑکی کا پٹ پھر کھل گیا تھا...... اور اس سے اتنی تیز ہوا اندر آ رہی تھی کہ پردہ بھی خاصا ا

تھا۔ صابرہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ کھڑکی کو اس نے اچھی طرح بند کر کے بولٹ کیا تھا لیکن وہ اس طرح کھل گئی تھی جیسے بولٹ ہی نہ تھی۔

صابرہ نے جلدی سے اُٹھ کر پھر کھڑکی اچھی طرح بند کی اور چٹخنی چڑھا دی۔ لیکن ابھی کھڑکی بند کر کے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ کھڑکی پھر کھل گئی اور اس میں سے یخ بستہ ہوائیں اندر آنے لگیں۔

اب کچھ صابرہ کو خوف محسوس ہوا، یہ کیا ہو رہا تھا۔ کھڑکی چٹخنی چڑھائے جانے کے باوجود کیونکر کھل رہی تھی...... اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہ تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

اب صابرہ نے کھڑکی بند نہ کی۔ وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس نے کمبل میں اپنا منہ بھی چھپا لیا...... کھڑکی سے ہوا اتنی تیزی سے آ رہی تھی کہ صابرہ کو کمبل کے اوپر اپنے سر پر لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ......اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑنے لگی تھی۔

اس کالے بلے نے جو کھڑکی کے نیچے بیٹھا تھا، کھڑکی پر چھلانگ لگائی اور جالی دار گرل کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے نکل کر فرش پر چھلانگ لگائی اور بیڈ کے نیچے چلا گیا۔

تبھی ایک زوردار دھماکا سا ہوا...... کھڑکی اپنے آپ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گئی تھی۔

کھڑکی کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے صابرہ کا دل لرز اُٹھا۔ اس نے ہمت کر کے کمبل سے اپنا منہ نکالا اور کھڑکی کی طرف دیکھا...... اب کھڑکی اس طرح بند تھی جیسے کبھی کھلی ہی نہ ہو۔

صابرہ نے اُٹھ کر اسے ایک مرتبہ پھر بولٹ کرنا چاہا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی کہ کھڑکی کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔

اب اسے اپنی صحیح الدماغی پر شک ہونے لگا۔ کھڑکی کا چٹخنی بند ہونے کے باوجود بار بار کھلنا اور پھر کھلی کھڑکی کا بند ہو جانا اور چٹخنی بند ہو جانا...... اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ کوئی بھیانک خواب۔

وہ اپنے دماغ کو جھٹک کر پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

لیٹے لیٹے اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے برابر کوئی لیٹا ہے۔ صابرہ نے فوراً اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ اسے اس احمقانہ خیال پر ندامت ہوئی۔ وہ پھر آرام سے لیٹ گئی۔ اس مرتبہ اس نے اپنا منہ کمبل سے نہ ڈھکا۔ کمبل صرف گردن تک لے لیا۔

پھر اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے برابر کوئی لیٹا ہے۔ اب اس احساس میں یہ اضافہ ہوا کہ برابر لیٹنے والا کوئی کفن پوش ہے۔ جیسے کفن پوش لاش۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بیڈ پر چاروں طرف دیکھا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اس نے کمرے کے چاروں کونوں پر نظر ڈالی۔ کمرے میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

وہ اپنے وہم پر اندر ہی اندر مسکرائی۔ اس نے لاحول پڑھی اور پھر کمبل اوڑھ لیا۔

کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہی، وہ احساس پھر جاگ اُٹھا۔ جیسے کوئی کفن اوڑھے اس کے برابر لیٹا

اب اسے ''کھڑ کھڑ'' کی آواز بھی سنائی دی۔ جیسے کسی نے کروٹ لی ہو۔ یہ کھڑ کھڑاہٹ بالکل کور لٹھے جیسی تھی۔ اس کے برابر جو کوئی بھی تھا۔ وہ کفن پوش ضرور تھا لیکن مُردہ نہ تھا۔

اس احساس نے اس کے جسم پر لرزا طاری کر دیا۔ وہ کمبل پھینک کر اُٹھنے لگی لیکن اس سے اُٹھا ن ...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کفن پوش شخص اس کے اوپر سوار ہو گیا ہو...... اس کا گلا دبا رہا صابرہ نے چیخنا چاہا لیکن اس کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

وہ ایسی سخت سردی میں پسینے پسینے ہو گئی تھی۔ دل بڑے زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ج سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔

یہ احساس کہ کوئی کفن پوش شخص اس کے اوپر سوار ہو کر گلا دبا رہا ہے، بس چند لمحوں رہا۔

لیکن یہ چند لمحے اس پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ وہ ایک ہولناک تجربے سے گزر گئی۔ اس کی سا بہادری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازہ کھول کر کمر سے نکل گئی۔

اس تیزی میں وہ اپنے چپل پہننا بھی بھول گئی تھی۔

کمرے سے باہر نکلی تو اسے راشدہ مل گئی۔ راشدہ نے اپنی ماں کے ہوش اُڑے ہوئے دیکھے اس کے اپنے ہوش اُڑ گئے۔ وہ گھبرا کر بولی۔ ''امی، امی کیا ہوا؟''

''تیرے ابو کہاں ہیں؟'' صابرہ نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔

''ٹی وی لاؤنج میں ہیں؟'' راشدہ نے بتایا پھر اس کی نظر ماں کے پیروں پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ صابرہ کے پیر میں چپل نہ تھی۔ صابرہ ان عورتوں میں سے تھی جو فرش پر ننگے پاؤں رک کسی گناہ سے کم نہیں سمجھتیں۔

''امی آپ کے چپل کہاں ہیں؟'' راشدہ نے پوچھا۔

''وہ کمرے میں ہیں، میں ذرا تیرے ابو سے بات کر لوں۔'' صابرہ نے بتایا۔

''میں آپ کے چپل لے آؤں؟'' راشدہ نے پوچھا۔

''نہ، نہ تم میرے کمرے میں نہ جانا۔'' صابرہ یہ کہتی ہوئی لاؤنج کی طرف چلی گئی۔

راشدہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ صابرہ پر ایسی کیا افتاد پڑی کہ وہ چپل پہنے بغیر کمرے سے نکل آ اور اب اسے بھی کمرے میں جانے سے منع کر گئی تھی۔

راشدہ کو ویسے ہی خاصا ڈر لگتا تھا اور جب سے شادی ہوئی تھی تب سے تو ڈرانے والے واقعات

ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا تھا...... وہ خواہش کے باوجود کمرے میں نہ گئی...... اس نے نیلم کے کمرے کا رخ کیا۔

صابرہ لاؤنج میں پہنچی تو بابر کو اطمینان سے صوفے پر لیٹے ٹی وی دیکھتے ہوئے پایا۔

صابرہ نے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ بابر علی کو اس کی اس حرکت پر غصہ آ گیا۔ ٹی وی بند کرنے سے پہلے اسے اخلاقاً اس سے پوچھنا چاہئے تھا۔

''صابرہ یہ کیا بے ہودگی......!'' بابر نے غصے سے کہا مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر پایا۔

صابرہ جب ٹیلی ویژن بند کر کے اس کی طرف پلٹی تو بابر اپنا غصہ بھول گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''صابرہ تمہیں کیا ہوا؟'' بابر علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

صابرہ خاموشی سے اس کے برابر بیٹھ گئی...... بابر علی کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں لرزش ہے۔

''صابرہ تم کانپ رہی ہو؟'' بابر نے گھبرا کر کہا۔

''بابر، میں اس وقت بہت پریشان ہوں...... کیا ماموں فرقان چلے گئے۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''ہاں، وہ تو چلے گئے...... اکبر انہیں چھوڑنے گیا ہے۔'' بابر علی نے کہا۔ ''لیکن تم پریشان کیوں ہو؟''

تب صابرہ نے کمرے میں اس کے ساتھ جو گزری تھی، ایک ایک بات تفصیل سے بتا دی۔

بابر علی نے ساری داستان سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''یہ سب تم کہہ رہی ہو۔ تم تو ایسی باتوں کی قائل ہی نہیں، تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، وہم ہوا ہے۔''

خیر بابر علی اس کی تسلی کے لئے اس کے ساتھ کمرے میں گیا جو کچھ صابرہ نے بتایا تھا اسے سن کر وہ خود بھی خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن بیوی کے سامنے بہادری کا خول چڑھائے وہ دروازہ کھول کر ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کچھ نہ تھا...... ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔

صابرہ نے کمرے میں آ کر اپنے چپل پہنے۔ کمرے میں اِدھر اُدھر غور سے دیکھا۔ پھر اس نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کو دیکھا۔ وہ جوں کی توں بند تھی اور چٹخنی بھی چڑھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کھڑکی کبھی کھلی ہی نہ ہو۔

پھر اکبر کے آنے پر اس نے ساری روداد سنائی۔ ساری کہانی سن کر، اس نے بھی وہی بات کہی۔

''ارے امی آپ کو وہم ہوا ہوگا۔''

صابرہ نے گھر کے جس فرد سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ اس نے جواب میں یہی کہا۔ ''آپ کو وہم

ہوا ہے۔''

جیسے جیسے گھر کے افراد ''آپ کو وہم ہوا ہے۔'' کہتے جاتے ویسے ویسے صابرہ کو یقین ہو کہ کمرے میں اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا، اس میں بڑی صداقت تھی۔ بند کھڑکی کا کھلنا اور کھلی کھڑکی کا خود بخود بند ہو جانا۔ پھر اس کفن پوش ہیولے کا سینے پر چڑھ بیٹھنا اور گلا گھ وہ کورے لٹھے کی کھڑ کھڑاہٹ...... کیا یہ سب وہم تھا۔

اس کا جی چاہا کہ ماموں فرقان کو فون کر کے یہ سب بتائے مگر ماموں فرقان تو اس کے کمر غصہ ہو کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی تو یہ سب عذاب نازل ہوا تھا۔ وہ باوجود خوا انہیں فون نہ کر سکی۔

اکبر، ماموں فرقان کو گھر چھوڑ کر واپسی میں ایک مووی لے آیا تھا۔ کھانا کھا کر سب لوگ لاؤنج میں جمع ہو گئے تھے۔ اکبر اس مووی کو لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

صابرہ نے کوئی گھنٹہ بھر تو اس فلم کو دیکھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، اسے تھکن ہو سونے کے لئے اُٹھ گئی۔ اُٹھتے ہوئے اس نے چاہا کہ نیلم یا راشدہ اس کے ساتھ آ جائے.... دونوں فلم میں اس طرح مگن تھیں کہ صابرہ کو انہیں اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

جب سے ماموں فرقان نے منع کیا تھا کہ اکبر، نیلم کے پاس نہ جائے۔ تب سے وہ نیل پاس سُلانے لگی تھی۔ راشدہ کا جی چاہتا تو وہ بھی ان دونوں کے درمیان گھس کر لیٹ جاتی۔ چوڑا تھا۔ وہ تینوں باآسانی بیڈ پر آ جاتی تھیں۔

صابرہ جب اُٹھنے لگی تو بابر نے کہا۔ ''سونے جا رہی ہو؟''

''ہاں، طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔'' صابرہ نے نقاہت سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم آرام کرو...... وہ رات والا کیپسول کھا لینا اور نیند کی گولی بھی لے لینا۔''

''اچھا......'' یہ کہہ کر صابرہ ٹی وی لاؤنج سے نکل آئی۔ صابرہ نے کچن سے ایک گلاس پا اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا، پھر اس کی دراز سے اپنی دوائیں کیپسول اور نیند کی گولی کھائی۔ دراز بند کر کے اس نے سوچا لائٹ بند کر دے اور سو جائے۔ بند کرنے کے لئے اُٹھی۔ ایک دم اس کے ذہن میں کورے لٹھے کی کھڑ کھڑاہٹ آ گئی۔ لائٹ بند کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

بیڈ پر لیٹ کر اس نے کمبل اچھی طرح اوڑھا اور اسے جو کچھ یاد تھا پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے نے اپنے سینے پر پھونک ماری اور کمبل میں منہ ڈھک لیا۔ وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی۔ پھر جا کی گولی نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ چند منٹوں میں ہی گہری نیند سو گئی۔

وہ کالا بلا پورے اطمینان سے پیر پھیلائے لیٹا ہوا تھا اور اپنی دُم کو بار بار قالین پر مار رہا تھا۔

صابرہ جانے کتنی دیر سوئی ہوگی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ شدت کی پیاس لگی تھی، اس نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور گلاس کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

کمبل ہٹاتے ہی اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ پھر اس نے غور کیا تو ٹی وی لاؤنج سے مکالموں کی آواز آ رہی تھی۔ فلم چل رہی تھی، اس کا مطلب ہے کہ لائٹ گئی نہیں، شاید بابر کمرے میں آیا ہوگا، یہ دیکھنے کہ وہ سوئی کہ نہیں اور کیونکہ صابرہ کمرے کی لائٹ بجھا کر سونے کی عادی تھی، اس لئے وہ لائٹ بند کر کے چلا گیا ہوگا۔ صابرہ نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا لیکن اب دروازہ بھی بند تھا۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بھی بند کر کے چلا گیا ہوگا تاکہ فلم کی آوازوں سے اس کی نیند خراب نہ ہو۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔

اس نے اندھیرے میں اندازے سے سائیڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیاں گلاس سے ٹکرائیں۔ اس نے فوراً گلاس اُٹھا لیا اور تھوڑا سا سر اونچا کر کے غٹ غٹ کر کے پانی پی لیا۔

ابھی اس نے پانی کے دو گھونٹ ہی لئے ہوں گے کہ اس کی عجیب حالت ہو گئی...... گلاس میں پانی نہ تھا۔ کوئی بھاری چیز تھی...... اس کا ذائقہ بھی نمکین سا تھا اور اس میں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔

صابرہ تڑپ کر اُٹھی۔ گلاس ہاتھ میں لئے لئے وہ سوئچ بورڈ کی طرف آئی۔ اس نے جلدی سے لائٹ آن کی۔ کمرہ روشن ہوا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ گلاس میں پانی نہ تھا۔

گلاس میں خون تھا۔ گاڑھے گاڑھے خون سے آدھا گلاس بھرا ہوا تھا۔ دو گھونٹ وہ پی چکی تھی۔

اس احساس کے آتے ہی اس نے پانی کی جگہ خون پیا ہے۔ اسے ابکائی شروع ہو گئی۔ وہ گلاس میز پر رکھ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔ اسے ایک بڑی قے ہوئی۔ اس کے منہ سے خون فوارے کی طرح نکلا تھا۔

اس سے اتنا خون دیکھا نہ گیا۔ وہ وہیں چکرا کر گر گئی۔ کالا بلا بدستور بیڈ کے نیچے گھسا آرام سے لیٹا تھا اور زور زور سے اپنی دم کو قالین پر مار رہا تھا۔

فلم ختم ہونے کے بعد جب راشدہ اور نیلم کمرے میں سونے کے لئے آئیں تو انہوں نے بیڈ خالی دیکھا۔ البتہ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

''امی۔'' راشدہ نے آواز لگائی اور وہ باتھ روم کی طرف بڑھی۔

جب وہ دروازے پر پہنچی تو اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

''ہائے امی۔'' یہ کہہ کر راشدہ دوڑی۔ صابرہ باتھ روم کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔

''نیلم جلدی سے ابو کو بلاؤ۔'' راشدہ نے نیلم سے کہا۔

نیلم فوراً تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

راشدہ نے فرش پر بیٹھ کر صابرہ کے جسم کو ہلایا جلایا۔ صابرہ کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ کی آنکھیں بند تھیں۔

چند لمحوں میں بابر اور اکبر بھی کمرے میں آ گئے۔ دونوں نے مل کر صابرہ کو باتھ روم کے فرش اٹھایا اور بیڈ پر ڈالا۔ پھر بابر نے اسے زور زور سے ہلا کر آوازیں دیں۔ ''صابرہ صابرہ۔''

''امی، امی۔'' ادھر راشدہ بھی تڑپ تڑپ کر آوازیں دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھ کر دیکھا تو اپنوں کو اپنے گرد پایا۔ وہ سب پریشان چہرے لئے اسے تک رہے تھے۔

''کیا ہوا صابرہ۔'' بابر نے تشویش سے پوچھا۔

''امی، آپ باتھ روم میں بیہوش پڑی تھیں۔'' راشدہ نے بتایا۔

باتھ روم کا نام سن کر صابرہ کو خون کی قے یاد آئی۔ یہ یاد آیا کہ اس نے پانی کی جگہ خون لیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی اس کا جی پھر متلانے لگا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

''نہیں لیٹی رہو۔'' بابر علی نے اسے لیٹے رہنے کی تلقین کی۔

''امی آپ کو کیا ہوا تھا، چکرا گئے تھے کیا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''میں دوا کھا کر آرام سے سوگئی تھی۔ پھر جانے کتنی دیر بعد میری اچانک آنکھ کھلی مجھے بہ پیاس لگی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا حالانکہ میں نے لائٹ کھلی چھوڑ دی تھی۔ پھر میں اندھیرے میں گلاس ٹٹولا اور اسے اٹھا کر پانی پی لیا۔ پانی کے ابھی میں نے دو گھونٹ ہی پیئے کہ مجھے عجیب سا ذائقہ محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ گلاس میں پانی نہ خون تھا۔ میرا جی متلایا۔ میں باتھ روم میں بھاگی۔ وہاں میرے منہ سے خون اس طرح نکلا کسی فوارے سے نکلتا ہے۔ خون دیکھ کر پھر مجھے ہوش نہ رہا۔'' صابرہ پر جو گزری تھی وہ اس آہستہ آہستہ کہہ سنائی۔

بابر نے فوراً گلاس کی طرف دیکھا جو سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں خون نام کی کوئی چیز نہ تھی صاف شفاف پانی تھا۔

پھر وہ بغیر کچھ کہے باتھ روم میں گیا۔ اس نے واش بیسن اور اس کے آس پاس بغور دیکھا۔ فرش معائنہ بھی کیا۔ وہاں بھی اسے ایک قطرہ خون کا نظر نہ آیا۔

تب وہ اطمینان سے واپس آیا اور بولا۔ ''صابرہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ تو گلاس میں خو

اور نہ ہی باتھ روم میں خون کا کوئی قطرہ موجود ہے۔''

صابرہ نے فوراً پلٹ کر گلاس کی طرف دیکھا۔ واقعی اس میں خون نہ تھا۔ اس میں آدھا گلاس پانی موجود تھا۔ پھر اٹھ کر باتھ روم گئی۔ وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کو بھی بغور دیکھا مگر کہیں ن کا ایک چھینٹا بھی نظر نہ آیا۔ وہ ذہنی اذیت کا شکار ہوگئی۔ بیڈ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' صابرہ نے گویا خود کلامی کی۔ ''وہ سب میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔''

''صابرہ تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔'' بابر نے رائے ظاہر کی۔

''نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔'' صابرہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''پھر تم وہم کا شکار ہوئی ہو۔'' بابر علی نے کہا۔ ''یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔''

وہ اس بات کا کیا جواب دیتی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بس سوال ہی سوال تھے۔

بابر اور اکبر کے جانے کے بعد راشدہ اور نیلم اپنے اپنے کمبلوں میں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئیں۔ صابرہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ منے دیوار گیر گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ نیلم اور راشدہ کمبلوں میں منہ چھپائے سو رہی تھیں۔

پانی کی جگہ خون پینے کا احساس اُس کے ذہن سے مٹائے نہیں مٹ رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر ک اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ وہ بار بار کروٹیں لے رہی تھی اور اپنے دل کو مختلف تاویلیں دے کر ہلا رہی تھی، لیکن اس کا دل اس خون کو وہم کا کرشمہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ خون کا وہ ذائقہ تک اس کی ان پر تھا۔

چتے سوچتے اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔

اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے کمرے کی لائٹ بجھا دی ہو، کمرے میں گہری تاریکی پھیل گئی۔ اسے ں لگا جیسے وہ کسی گہری قبر میں ہے۔ تنہا ہے۔ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے دائیں یں ٹٹول کر دیکھتی ہے لیکن وہاں کسی کو نہیں پاتی۔ نہ اس کے برابر نیلم ہے اور نہ راشدہ۔

اچانک اس کے چہرے کے قریب کوئی زور سے سانس لیتا ہے اور بڑے پراسرار انداز میں کہتا ہے۔

''تم مر جاؤ گی۔''

صابرہ پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم اکڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا چاہتی ہے ہیں ہلا پاتی۔ وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

وہ پراسرار آواز مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

ی گہرے گہرے سانس لے کر کہہ رہا تھا۔

''تم مر جاؤ گی۔''

"تم مرجاؤ گی۔"

"تم مرجاؤ گی۔"

"تم مرجاؤ گی۔" کی گردان ابھی جاری تھی اور صابرہ اپنے جکڑے ہوئے جسم کو حرکت د۔ سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ بڑے زور سے چیخی۔

اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سن کر راشدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے صابرہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"امی، امی۔"

"ہاں کیا ہے؟" صابرہ نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

"امی آپ چیخ رہی تھیں، کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھیں۔"

"راشدہ، مجھے ذرا پانی دے۔" صابرہ نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ خشک ہو رہا

راشدہ نے اٹھ کر صابرہ کو پانی دیا۔ صابرہ نے پانی کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی لیا۔ وہ پسینے ہو رہی تھی۔ قبر کی تاریکی اور اس کی آواز یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے۔ صابرہ پھٹی پھٹی نظروں سے راشدہ کو دیکھ رہی تھی۔ شور کی آواز سن کر نیلم کی بھی آنکھ کھل گئی تھی لیکن خاموش لیٹی تھی۔

"امی، آپ مجھے اس طرح نہ دیکھیں، مجھے ڈر لگنے لگے گا۔" راشدہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

صابرہ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اسے وہ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز اسے اپنے دماغ کے کسی گوشے میں سنائی دے رہی تھی۔

وہی پراسرار آواز "تم مرجاؤ گی۔"

"راشدہ کیا تجھے کوئی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

راشدہ نے غور سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی آواز سنائی نہ دی۔

"نہیں، امی مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ نیلم کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دے رہی۔ راشدہ نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" نیلم نے سادگی سے کہا۔

"امی کیا ابو کو بلاؤں۔" راشدہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" صابرہ نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کے کان کسی نہ سنائی دینے والی آواز پر لگے ہوئے

صابرہ کو وہ آواز برابر سنائی دے رہی تھی بلکہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کوئی تنبیہ کر رہا تھا۔

"تم مرجاؤ گی۔"

بابر راشدہ کے بلاوے پر آنکھیں ملتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "ہاں، صابرہ مجھ

ہے۔"

بابر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، وہ صدا آنی بند ہوگئی۔ اب اس کے دماغ میں دور تک سناٹے کا تھا۔

صابرہ نے بابر کو خواب میں جو دیکھا تھا اور سنا تھا اس کی تفصیل بتائی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔" صابرہ کی ساری بات سن کر بابر بولا۔

"نہیں، بابر وہ خواب نہیں تھا وہ آواز تو مجھے جاگنے کے بعد بھی سنائی دیتی رہی تھی۔ وہ آواز بارے کمرے میں داخل ہوتے ہی بند ہوئی ہے۔ میں اس کو خواب کیسے سمجھ لوں، وہم کیسے لوں۔"

"صابرہ کیا تمہیں ڈر محسوس ہو رہا ہے؟" بابر نے پوچھا۔

"نہیں، میں خوفزدہ نہیں ہوں۔"

"پھر آرام سے سو جاؤ، صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔" یہ کہہ کر بابر کمرے سے نکل گیا۔

بابر کا یوں کمرے سے چلے جانا، صابرہ کو اچھا نہ لگا۔ وہ اگرچہ خوفزدہ نہ تھی لیکن وہ چاہ رہی تھی کہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھتا۔ اس سے اس کی حالت کے بارے میں سوالات کرتا۔ خیر کوئی بات اس نے سوچا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر کو سوتے سے اٹھا دیا جائے تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے اس میں درد ہو جاتا ہے۔

بابر کے جانے کے بعد راشدہ اور نیلم نے بھی اپنے اپنے کمبل سنبھال لئے اور اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

صابرہ ان دونوں کے درمیان بیڈ کی بیک سے تکیے لگا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت خاصی سردی ہو رہی تھی۔

صابرہ نے گھڑی پر نظر کی۔ چار بج رہے تھے۔

گھڑی سے نظر ہٹائی تو کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ ایک دم بہت گہرا اندھیرا ہو گیا۔

کسی نے صابرہ کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا لے چلا۔ صابرہ اس کے ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جانے کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد صابرہ کو زمین پر دھکا دے دیا گیا۔ پھر اسے جکڑ لیا گیا۔ اب وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی اور اسے اپنی پشت پر آگ جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"صابرہ۔" پھر کوئی مخاطب ہوا۔ "تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے نا۔ لیکن اب تمہیں ہمارے ہونے کا یقین آ جائے گا، آج کے بعد سے تم ہماری بے عزتی نہیں کر سکو گی۔"

اس کی آواز بند ہوئی تو آگ کی تپش اسے اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ اسے "چڑ چڑ" کی آوازیں آنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بال جلائے جا رہے ہوں۔

پھر ایک دم روشنی ہوگئی۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اب نہ تاریکی تھی نہ آگ کی تپش تھی، نہ کوئی اسے جکڑے ہوئے تھا۔

یہ خواب نہ تھا وہ ابھی سوئی نہ تھی۔ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا اور اس کے ساتھ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ آگ کی تپش بالوں کا جلنا، وہ تنبیہ اس کے بعد تاریکی چھٹی تو وہ ویسے ہی بستر پر بیٹھی تھی۔

یہ سب کیا تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ تھرا اٹھی۔ ''نہیں۔''

وہ جلدی سے اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے آئی۔ وہاں وہ بھیانک حقیقت پوری طرح اس پر آشکا ہوئی۔ پیچھے سے اس کے سارے بال جل چکے تھے۔ صابرہ کے بال بہت اچھے تھے۔ گھنے بھی تھا لمبے بھی۔ اسے اپنے بال بہت عزیز تھے وہ ان کی بڑی حفاظت کرتی تھی۔ اب انہی بالوں کا ایسا حش ہوا کہ وہ تھرا اٹھی تھی۔

دماغ کے کسی گوشے میں اب بھی وہ آواز گونج رہی تھی۔ ''صابرہ، تمہیں ہمارے ہونے کا یقین نہیں ہے نا، لیکن اب تمہیں ہمارے ہونے کا یقین آجائے گا۔ آج کے بعد سے تم ہماری بے عز نہیں کرسکو گی۔''

وہ خوفناک کالا بلا بیڈ کے نیچے اطمینان سے بیٹھا اپنی بھاری دم کو بار بار قالین پر مار رہا تھا۔ پھ ایک دم کھڑا ہوگا اس نے کھڑے ہوکر ایک بھرپور انگڑائی لی اور بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔

صابرہ آئینے کے سامنے کھڑی بار بار اپنی گردن موڑ موڑ کر جھلسے ہوئے بالوں کا ماتم کر رہی تھ اس کے خوبصورت بالوں کا نہ صرف ستیاناس ہوگیا تھا بلکہ بال اس طرح جھلسائے گئے تھے کہ اس سر کی پشت پر کھال تک دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ اپنے جلے ہوئے بالوں کو دیکھتی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر جاتے تھے۔

ایک مرتبہ جو اس نے اپنی آنسو بھری آنکھوں کو صاف کر کے آئینہ دیکھا تو اپنی پشت پر ایک انتہ بھیانک چہرے کو پایا۔ وہ چہرہ اس سے دو فٹ بلند تھا۔

وہ عجیب چہرہ تھا، آدھا شیر کا تھا اور آدھا انسان کا۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے بال۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ صابرہ کی گردن کی طرف بڑھائے اور اپنا بھیانک منہ کھولا۔

صابرہ بڑے دل گردے کی مالک تھی۔ پورے خاندان میں نڈر مشہور تھی۔ عورتیں اس کی جرا اور بہادری کی مثالیں دیتی تھیں آج وہی صابرہ خوف کی علامت بنی ہوئی تھی۔ اس کے اعصا جواب دے چکے تھے۔ اسے اس طرح گھیرا اور ستایا گیا تھا کہ وہ توبہ مانگ رہی تھی۔

اس بھیانک چہرے کو وہ مزید برداشت نہ کرسکی۔ اس سے پہلے کہ وہ آدھا شیر آدھا انسان اسے پکڑتا وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔

صبح کے سناٹے میں اس کی چیخ پورے گھر میں گونج گئی۔

راشدہ اور نیلم گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ بابر اور اکبر بھی اپنے کمروں سے آگئے۔

سارے لوگ صابرہ کو بیہوش اور اس کے بالوں کو جھلسا ہوا دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

صابرہ کے بیہوش ہوتے ہی کالا بلا اپنی اصلی حالت میں آگیا اور بڑے شاہانہ انداز سے چلتا ہوا بیڈ کے نیچے داخل ہوگیا۔ پھر اس نے چاروں پیر پھیلا لئے اور بڑی آسودگی سے اپنے اگلے دونوں پاؤں چاٹنے لگا۔ جیسے پیروں میں شہد لگا ہو۔

صابرہ کوئی آدھے گھنٹے کی کوششوں سے ہوش میں آئی لیکن اس کے ہوش میں آنا نہ آنا برابر ہی تھا۔ وہ ہوش میں آکر خاموشی سے خلا میں گھورتی رہتی۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری تھی۔

وقفے وقفے سے اس کے ہونٹوں سے بس ایک ہی بات نکل رہی تھی۔

''ہاں، میں تمہیں مانتی ہوں، تم ہو، تمہارے ہونے کا اقرار کرتی ہوں بس اب مجھے معاف کردو۔''

گھر والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، کس کے ہونے کا اقرار کر رہی ہے، کس سے معافی مانگ رہی ہے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے بال کس طرح جھلس گئے تھے پھر اس نے ایسی دہشت ناک چیخ کیا دیکھ کر ماری تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد اس نے کچھ نہ بتایا تھا۔ بس وہ خلا میں گھورتی یا پھر کسی کے ہونے کا اقرار کرتی رہی تھی۔

اس کی ہذیانی کیفیت کو دیکھ کر بابر اور اکبر کو اسے اسپتال لے جانا پڑا۔

جب ڈاکٹر معائنے کیلئے آیا تو صابرہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور ہنس کر بولی۔ ''تم ڈاکٹر ہو۔''

''جی ہاں، میں ڈاکٹر ہوں۔'' ڈاکٹر نے بڑے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

''ارے تم کیا خاک ڈاکٹر ہو، تمہیں جنوں کے بارے میں تو کچھ پتہ نہیں ہے۔'' صابرہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''جنوں کے بارے۔'' ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پہلے آپ بتائیں آپ کیا جانتی ہیں۔''

''میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ میں ان کے ہونے کا اقرار کرتی ہوں، میں ان کو مانتی ہوں۔ اے لڑکے کیا تم جنوں کو مانتے ہو، دیکھو جھوٹ مت بولنا۔''

''نہیں، میں جھوٹ کیوں بولوں گا، آپ کی طرح میں بھی جنوں پر یقین رکھتا ہوں۔''

''تم بہت اچھے ہو، ڈاکٹر۔'' صابرہ نے خوش ہو کر کہا۔

''اب آپ اجازت دیں تو آپ کا معائنہ کرلیں۔''

''ہاں کیوں نہیں، لو میں لیٹ جاتی ہوں۔ تم اچھی طرح میرا معائنہ کرو۔'' یہ کہہ کر صابرہ بیا لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے آلہ ابھی کانوں سے لگایا ہی تھا کہ صابرہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اے ڈاکٹر، کیا تم نے کبھی جن دیکھے ہیں۔''

''نہیں، میں نے جن نہیں دیکھے۔ بس ان کے بارے میں پڑھا اور سنا ہے۔'' ڈاکٹر نے سنجی سے کہا۔

''پھر تمہیں ان کے بارے میں کیسے یقین آئے گا۔'' صابرہ نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''کسی چیز کو جاننے کیلئے اس کا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے دلیل دی۔

''لیکن ڈاکٹر بغیر دیکھے یقین بھی تو نہیں آتا۔'' صابرہ نے ہنس کر پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جن دیکھے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں، میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں بہت کچھ جانتی ہوں میں ان کے ہونے کا اقرار کر ہوں۔ میں انہیں مانتی ہوں۔'' صابرہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ صابرہ سے اس کی حالت کے بارے میں بہت سوالات کئے لیکن اس نے سارے سوالات کا ایک ہی جواب دیا۔

''ہاں، میں ان کے ہونے کا اقرار کرتی ہوں، میں انہیں مانتی ہوں۔''

ڈاکٹر کیلئے یہ کیس منفرد نوعیت کا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے صابرہ کو مسکن دوائیں د کر سلا دیا اور اس کیس کو شہر کے ایک بڑے ماہر نفسیات کے حوالے کر دیا۔

لیکن وہ ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتی رہی۔

''ڈاکٹر کبھی تم نے جن دیکھے ہیں۔ نہیں دیکھے میں نے دیکھے ہیں۔''

''کیسے ہوتے ہیں جن ذرا بتائیں تو۔'' وہ پوچھتا۔

''جن دیکھنا ہے تو میرے جلے ہوئے، جھلسے ہوئے بالوں کو دیکھ لو اور عبرت پکڑو۔ اگر تم نے ا کے ہونے کا اقرار نہ کیا تو یاد رکھو بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔'' صابرہ بہت افسردہ ہو کر کہتی۔ بس وہ ا طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتی رہی۔ ڈاکٹر کے ہر سوال کے جواب میں وہ جن کا تذکرہ کرتی رہی بل ایک ہی بات دہراتی رہی۔

بالآخر ڈاکٹر تھک ہار گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بابر نے اپنی بیوی کے

بارے میں جو باتیں بتائی تھیں وہ ڈاکٹر کے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بیٹھے بٹھائے خود بخود اس کے بال جھلس گئے۔

آج کے زمانے میں بھلا جن کہاں۔ اور یہ جن ہوتی کیا بلا ہے۔ وہ ان عورتوں کو خوب جانتا تھا۔ وہ ایسے ایسے جن خود تخلیق کر لیا کرتی ہیں کہ لوگوں کے ہوش اڑ جائیں۔ اب تک جو واقعات اس کے علم میں آئے تھے اس سے اس نے ساس بہو کے درمیان چپقلش کا اندازہ کیا تھا۔ یہ ایک اذیت پسندی کا کیس تھا۔ یہ بال صابرہ نے خود ہی جلا لئے تھے اور اب ''جن جن'' کہہ کر سب کو ڈرا رہی تھی۔

بہرحال کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مریضہ کی تحلیل نفسی بہت ضروری تھی اور تحلیل نفسی کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھی۔ اس کے پاس تو سو سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔

''ہاں، میں نے جن دیکھے ہیں، میں ان پر یقین رکھتی ہوں۔''

فی الحال ڈاکٹر نے اسے کچھ دوائیں لکھ دیں۔ یہ سب دوائیں ذہنی سکون کے لئے تھیں دو دن بعد آنے کا کہہ کر اور چند ہدایات دے کر ڈاکٹر چلا گیا۔

دوائیں کھا کر صابرہ دوپہر تک پرسکون انداز میں سوتی رہی پھر اس کی آنکھ کھلی تو سامنے بابر کو پایا۔ دائیں جانب گردن گھمائی تو ماموں فرقان کو دیکھا بائیں جانب اکبر تھا۔

ماموں فرقان کو دیکھ کر صابرہ نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صابرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر وہ سسک سسک کر رو پڑی۔

صابرہ کو روتے دیکھ کر ماموں فرقان کا دل کٹ گیا۔ لیکن وہ پتھر بنے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ وہ رو لے تا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ یہ ندامت کے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ یہ پشیمانی تھی جو آنکھوں کے رستے نکل رہی تھی۔

ماموں فرقان نے اس کے جھلسے ہوئے بالوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا یہ حشر ہونے پر انہیں دل ہی دل میں افسوس تھا جب وہ کافی رو لی تو ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''صابرہ فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ماموں آپ مجھے معاف کر دیں۔'' صابرہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

''تم مجھ سے کس بات کی معافی مانگ رہی ہو، تم نے مجھے تو کچھ نہیں کہا۔'' ماموں فرقان مسکرا کر بولے۔

''ماموں میں غلطی پر تھی۔ میں اگر آپ کا کہا مان لیتی تو آج میرا یہ حشر نہ ہوتا۔'' صابرہ نے کہا۔

''اب تمہیں یقین آ گیا۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں، ماموں۔" صابرہ نے بڑا اور ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ "میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے، کچھ بھگت لیا ہے اب میں کسی بات کا انکار نہیں کرسکتی۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"تم نے ایک ہی دن میں توبہ مانگ لی، پریشان ہوگئیں، ذرا اس معصوم بچی کا خیال کرو جو چھ ماہ اس طرح کے حالات سے دوچار ہے اور تم اسے محض "ڈرامہ" سمجھتی رہی ہو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ہاں، ماموں میں غلطی پر تھی۔ اسی بات کی میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔"

"کیا تم نے نیلم کو معاف کردیا۔" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے صدق دل سے اسے معاف کردیا مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ فیاض کی بیٹی یا کسی ملازمہ کی مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اب اس گھر کی بہو ہے۔ ہماری عزت ہے۔"

"واہ رے، انقلاب زمانہ۔" بابر علی نے ہنس کر کہا۔

"شکریہ امی۔" اکبر کے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ صابرہ نے اکبر کو قریب کر کے اسکا سر اپنے سر سے لگالیا۔ "میرا بیٹا۔"

"میرا مظلوم بیٹا کہو۔" بابر علی نے پھر ٹکڑا لگایا۔

"ہاں یہ بات تو صحیح ہے واقعی اکبر بڑا مظلوم ہے بیچارہ۔ شادی کر کے بھی کچھ ہاتھ نہ آیا لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ صبر سے کام لے رہا ہے۔ آخر صابرہ کا بیٹا ہے نا۔ بالآخر فتح اس کے قدم چومے گی۔" ماموں فرقان نے اکبر کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ماموں، آپ جیسا کہتے جارہے ہیں، کرتا جارہا ہوں، میں آپ کا بڑا فرمانبردار ہوں۔" اکبر بولا۔

"میں جانتا ہوں، اکبر صاحب۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

"نیلم اور راشدہ کہاں ہیں۔" صابرہ نے پوچھا۔

"گھر پر۔" اکبر نے کہا۔

"ہائے انہیں گھر پر اکیلا چھوڑ دیا۔" صابرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"نہیں، وہ اکیلی نہیں ہیں ان کے ساتھ شمسہ ہے، تمہاری ممانی ہیں۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"ممانی آئی ہیں، وہ تو گھر سے کبھی کبھی نکلتی ہیں۔ آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لائے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا صورت حال ہے، وہ تو آنے کو کہہ رہی تھی لیکن میں نے خود ہی انہیں گھر پر چھوڑ دیا اور اکبر کو ساتھ لے کر یہاں آگیا۔" ماموں فرقان نے وضاحت کی۔

"امی، آپ اسپتال میں کب تک رہیں گی۔ گھر چلیں نا۔" اکبر نے کہا۔

"چلو۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ایسے ہی چلو، پہلے ڈاکٹر سے پوچھ لیں۔ شام تک یہاں رہو۔ شام کو ڈاکٹر سے بات کریں گے۔" بابر نے کہا۔

شام کو ڈاکٹر نے دیکھا تو صابرہ کو بہت اچھا پایا۔ جب وہ اسپتال لائی گئی تھی تو اس پر ایک ہذیانی کیفیت طاری تھا۔ اب وہ پورے ہوش میں آچکی تھی۔ پرسکون ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے چند دوائیں اور چند ہدایات دے کر اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔

صابرہ گھر پہنچی تو سب سے پہلے اس نے نیلم کو گلے لگالیا۔ "میری بچی میری بیٹی۔" کہہ کر اس کی پیشانی اور رخساروں کو چوما۔

صابرہ کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر نیلم بھی اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ تو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی سسک سسک کر رو پڑی جیسے وقتِ رخصت ہو۔

ماموں فرقان، ممانی ریحانہ اور شمسہ کو یہ منظر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

"اے بھئی، یہ رونا دھونا ہی چلتا رہے گا یا چائے وائے بھی چلے گی۔" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

"ماموں، چائے آپ کو ابھی ملتی ہے۔" راشدہ نے کہا۔

"ہاں، بھئی جلدی پلاؤ چائے تاکہ ہم لوگ چلیں۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"ماموں آپ جائیں گے نہیں، اتنے دنوں کے بعد تو ممانی آئی ہیں، میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔" صابرہ نے کہا۔

"بھئی، کھانے وانے کے چکر میں، بہت دیر ہو جائے گی، پھر سواری ملنی مشکل ہو جاتی ہے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"آپ رکشہ ٹیکسی کی فکر نہ کریں، اکبر آپ کو چھوڑ کر آئے گا۔" صابرہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ٹیکسی والا بھی یہیں موجود ہے۔" اس مرتبہ شمسہ چہک کر بولی۔

اس کی اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نیلم اور اکبر کی شادی کے بعد یہ پہلا قہقہہ تھا جو اس گھر میں گونجا تھا۔

اس گھر سے خوشیاں روٹھ گئی تھیں ہر طرف خوف، غصے اور اداسی کا راج تھا۔ نفرتیں اگ رہی تھیں، خوف پھل پھول رہا تھا گھر کے مکیں ایک دوسرے کے چہروں سے بیزار ہو گئے تھے۔

اس گھر میں آج خوشی کا پہلا قہقہہ گونجا تو سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا اور خدا کا شکریہ ادا کیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب اکبر، ماموں فرقان اور ان کے گھر والوں کو عزیز آباد چھوڑنے جارہا تھا تو اس نے راستے میں ماموں فرقان سے پوچھا۔ "ماموں آپ قبرستان کب جائیں گے۔"

''بیٹے، مرنے کے بعد جاؤں گا۔'' ماموں فرقان نہایت سنجیدگی اور معصومیت سے بولے۔

''اللہ نہ کرے ابو، آپ کیسی بات کرتے ہیں۔'' شمسہ جو پیچھے بیٹھی تھی تڑپ کر بولی۔

''ماموں میرا مطلب تھا کہ آپ اس عمل کے لئے کب قبرستان جائیں گے۔'' اکبر نے شرم
ہو کر کہا۔

''ہاں تو یوں بولو۔'' ماموں فرقان ہنس کر بولے۔ ''اس عمل کے لئے چودھویں رات کا ہونا
ضروری ہے میرا خیال ہے کہ آج چاند کی دس گیارہ تاریخ ہے، کیوں ریحانہ؟'' انہوں نے اپنی
سے تصدیق چاہی۔

''جی آج دس تاریخ ہے۔'' ممانی ریحانہ نے جواب دیا۔ ''دیکھا اکبر، عورتیں تاریخ کے معا
میں کتنی تیز ہوتی ہیں انہیں دن یاد نہیں رہتے لیکن یہ تاریخ کو کبھی نہیں بھولتیں۔'' ماموں فرقان
چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''کون کہتا ہے، ہمیں دن یاد نہیں رہتے۔ آپ کے ساتھ گزارے ہوئے مجھے اچھے برے
اچھی طرح یاد ہیں۔'' ممانی ریحانہ نے بات سے بات پیدا کی۔

''واہ ممانی واہ، آپ نے کیا لاجواب بات کی، دل خوش کر دیا۔'' اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

''بھائی چمچے، یہ یاد رکھو کہ قبرستان جا کر عمل میں نے کرنا ہے، تمہاری ممانی نے نہیں۔'' ماموں
فرقان نے تنبیہہ کی۔

''اور اس کے لئے تمہیں اپنے ماموں کے پاؤں دبانے ہوں گے، گھر چل کر۔'' ممانی ریحا
نے ہنس کر کہا۔

''پاؤں دبا دے گا تو کیا ہو جائے گا، جنت کمائے گا، میں آخر اس کا دادا ہوں۔'' ماموں
فرقان بولے۔

بس اسی طرح ہنسی خوشی باتیں کرتے عزیز آباد آ گیا۔ اکبر کچھ دیر ماموں فرقان کے گھر بیٹھا
واپس آ گیا۔

رات کو اکبر نے لاہور فون کیا۔ فیاض اور واجدہ کو اس نے ساری روداد سنائی۔ واجدہ کو صابرہ
بال جلنے کا جہاں افسوس ہوا وہاں اس بات کی خوشی ہوئی کہ اس نے نیلم کو معاف کر دیا تھا۔

فون پر نیلم نے بھی بات کی پھر اکبر نے اصرار کر کے صابرہ اور واجدہ کی بات کرا دی۔ دونو
بہنوں نے فون پر بات کم کی، روتی زیادہ رہیں۔

صابرہ کو اپنے بال جلنے کا بے حد صدمہ تھا وہ بال جلے بھی عجیب طرح سے تھے۔ اس کی پور
جل گئی تھی اور سر کے پیچھے ایک چھوٹا چاند بن گیا۔ کھال دکھائی دینے لگی تھی۔

صابرہ نے اس سلسلے میں کئی ماہر ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ آئندہ اس جگہ
بال نہیں نکلیں گے۔ یہ سن کر وہ اور پریشان ہو جاتی تھی۔

پریشان اس وقت ماموں فرقان کے گھر والے بھی تھے۔ جس کام کا فرقان ماموں نے بیڑا اُٹھایا
تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ چاندنی رات میں آدھی رات کو قبرستان جا کر عمل کرنا بڑی جان جوکھوں کا
کام تھا۔ ممانی ریحانہ ڈری ڈری تھیں۔ انہوں نے دبی زبان سے اس عمل کی مخالفت کی تھی۔ وہ جانتی
تھیں کہ ماموں فرقان دھن کے پکے ہیں انہیں دنیا کی کوئی طاقت قبرستان میں عمل کرنے سے نہیں
روک سکے گی۔ اس لئے ممانی ریحانہ نے پرزور مخالفت نہیں کی۔ وہ اتنا ضرور چاہتی تھیں کہ ماموں
فرقان اکیلے قبرستان نہ جائیں۔ اکبر یا بابر ساتھ جائے۔

''سنیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ بابر کو اپنے ساتھ قبرستان لے جائیں۔'' ممانی ریحانہ
نے کہا۔

''وہ کیوں۔'' ماموں فرقان نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک سے دو بھلے۔'' ممانی ریحانہ نے سادگی سے کہا۔

''مجھے قبرستان سے ڈر تھوڑے ہی لگتا ہے۔'' ماموں فرقان بولے۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ ایک نڈر آدمی ہیں، پھر بھی کیا حرج ہے اگر آپ کے ساتھ کوئی
چلا جائے۔''

''میں پھر یکسوئی سے اپنا کام نہ کر پاؤں گا، میرا دھیان بٹ جائے گا۔''

''کیا ضروری ہے کہ جانے والا آپ کے پاس بیٹھے، وہ کچھ فاصلے سے بھی بیٹھ سکتا ہے۔'' ممانی
ریحانہ نے رائے دی۔

''پھر اس کی حفاظت کا ذمہ دار کون ہو گا۔'' ماموں فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور آپ کی حفاظت کا کون ذمہ دار ہو گا۔'' ممانی ریحانہ خاموش نہ رہ سکیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہو گا میں اپنی حفاظت آپ کر لوں گا، میں وہاں حصار کھینچ کر بیٹھوں گا۔'' ماموں
فرقان نے انہیں سمجھایا۔

ممانی ریحانہ حصار کا ذکر سن کر کسی حد تک مطمئن ہو گئیں پھر وہ ایک بیوی تھیں ان کا شوہر قبرستان
میں جا کر ایک خطرناک عمل کرنے والا تھا ان کی پریشانی فطری تھی۔

پھر چودھویں کی وہ رات بھی آ گئی جس کا ماموں فرقان کو انتظار تھا۔

اس رات ماموں فرقان نے عشاء کی نماز اپنے کمرے میں پڑھی۔ نماز کے بعد وہ کافی دیر تک
وظیفہ پڑھتے رہے۔ کھانا انہوں نے آج مغرب کے وقت کھا لیا تھا۔

وہ کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک پڑھتے پڑھاتے رہے پھر خاموشی سے اپنے کمرے سے بر
ہوئے انہوں نے ممانی ریحانہ کو آنکھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ قبرستان جا رہے ہیں۔ اب فجر
وقت لوٹیں گے، وہ دروازے کی کنڈی لگالیں۔

شمسہ اور ممانی ریحانہ انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ممانی ریحانہ نے ان کی حفاظت کے
کچھ پڑھ کر ان کی طرف پھونک ماری اور خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

ماموں فرقان پیدل ہی قبرستان کی طرف چل دیئے۔ ان کے گھر سے قبرستان زیادہ دور نہ تھا کو
آدھا میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اس قبرستان کے کونے پر ایک مسجد تھی مسجد کے بعد ہی سنسان را
شروع ہو جاتا تھا۔

چاند اپنے شباب پر تھا وہ سامنے ایک سنہری تھال کی طرح ٹنگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھنڈی او
زرد روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جاڑوں کی چاندنی بڑی دلفریب ہوتی ہے لیکن قبرستان کے
اس سناٹے میں یہ چاندنی بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔ کچے راستے کے دونوں طرف اُگی ہوئی گھ
جھاڑیاں پر ہیبت منظر پیش کر رہی تھیں۔

ماموں فرقان کے ہاتھ میں تسبیح تھی وہ مسلسل پڑھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے قبرستان مید
بڑھے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک دو کتے ملے تھے انہوں نے دور سے بھونکنے کی کوشش کی تھ
لیکن پھر نزدیک آ کر وہ یکدم خاموش ہو گئے تھے اور کان دبا کر جھاڑیوں میں گھس گئے تھے۔ قبرو
سلسلہ شروع ہو چکا تھا بارہ بجنے والے تھے یہ سردیوں کی روشن رات تھی اچھی خاصی سردی تھی۔ ماموا
فرقان نے شلوار قمیض کے اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا قبرستان میں آ کر سردی کا احساس زیادہ ہی بڑھ گ
تھا۔ انہوں نے کوٹ کے بٹن بند کر لئے اور جیب سے دستانے نکال کر پہن لئے پھر انہوں
کندھے سے کمبل اتار کر بائیں ہاتھ پر لیا اور بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔

تبھی چلتے چلتے ٹھوکر لگی ان کا سیدھا پاؤں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا تھا اور وہ چیز آگے لڑھکتی چلی
گئی تھی۔

ماموں فرقان نے اس لڑھکنے والی چیز پر نظر کی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک گئے۔
تبھی کسی نے بڑے غصے میں کہا۔ ''اندھے دیکھ کر چل۔'' یہ آواز اس کھوپڑی سے آئی تھی جوان
کے پاؤں کی ٹھوکر سے لڑھک کر ایک طرف ہو گئی تھی۔

''حضرت آپ راستے میں کیوں پڑے ہیں؟'' ماموں فرقان نے بغیر خوف میں مبتلا ہوئے اس
کھوپڑی سے مخاطب ہوئے۔

''تو جانتا نہیں کہ یہ کیا ہے؟'' ادھر سے آواز آئی۔

''ہاں جانتا ہوں، یہ قبرستان ہے۔'' ماموں فرقان نے پورے اطمینان سے کہا۔

''یہ ہمارا علاقہ ہے، ہماری مرضی ہم کہیں بھی گھومیں۔'' ادھر سے سخت لہجے میں کہا گیا۔

''پتہ نہیں کب کے مرے ہوئے ہیں، ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔ ایک دیمک زدہ کھوپڑی بچی
ہے لیکن اکڑ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ حضرت آپ کا قیام کس طرف ہے میں آپ کے سر اقدس کو آپ
کی قیام گاہ تک چھوڑ دوں۔'' ماموں نے ہنس کر کہا۔

''جا چلا جا، اپنا کام کر، زیادہ نستعلیق بننے کی کوشش نہ کر ورنہ پچھتائے گا۔''

ماموں فرقان نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ پڑھ کر کھوپڑی کی طرف پھونکا، ایک شعلہ سا اٹھا اور
وہاں کچھ نہ رہا۔

تھوڑی دور جا کر ماموں فرقان نے ایک مناسب جگہ تلاش کی۔ وہاں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے
ہوئے تھے۔ انہیں وہاں سے اُٹھا کر ادھر ادھر پھینکا۔ جگہ صاف ہو گئی تو انہوں نے کوٹ کی جیب سے
ایک چاقو نکالا وہ کوئی سات آٹھ انچ لمبے پھل کا رامپوری چاقو تھا۔ یہ چاقو ماموں فرقان کے پاس
بہت عرصے سے تھا۔ یہ انہوں نے علی گڑھ کی نمائش سے خریدا تھا۔

چاقو کھول کر اس کی نوک سے زمین پر حصار کھینچا۔ حصار کھینچتے ہوئے وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان
کے کانوں میں کہیں دور سے گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آوازوں پر انہوں نے
کوئی خاص توجہ نہ دی وہ اپنے کام میں منہمک رہے۔ حصار کھینچنے کے بعد انہوں نے چاقو زمین میں
گاڑ دیا۔

پھر انہوں نے کمبل کھولا اسے اپنے کندھوں پر ڈال دیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

اکڑوں بیٹھتے ہی اُنہیں یوں لگا جیسے وہ کسی برف پوش پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ گئے ہوں۔ انتہائی
سردی تھی ان کے دانت بجنے لگے، جسم میں کپکپی دوڑ گئی، اچانک ہی ہواؤں کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔
ماموں فرقان نے بائیں ہاتھ سے چاقو کے دستے کو تھام لیا اور بلند آواز سے کچھ پڑھنے لگے۔

یہ سردی کا احساس زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جاتے سردی کا احساس کم ہوتا
گیا پھر اتنا کم ہوا کہ انہیں گرمی سی محسوس ہونے لگی۔

اب انہوں نے چاقو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور نظریں اس پر گاڑ دیں۔

گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سامنے ہی کسی نے آگ بھڑکا دی
ہو۔ ان کی نظریں چاقو پر تھیں لیکن انہیں اپنے سامنے آگ کے شعلے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہو
رہے تھے۔ ماموں فرقان نے اپنی توجہ ہٹانے کیلئے ایک مرتبہ پھر زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔
نظریں بدستور چاقو پر تھیں۔

اب آگ ان کے چاروں طرف پھیلتی جارہی تھی انہیں ہر طرف تپش محسوس ہو رہی تھی۔

شعلوں کا رقص ان کے چاروں طرف جاری تھا۔ یہ شعلے ان کے نزدیک سے نزدیک تر ہو رہے تھے، ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا اس قدر تپش بڑھ گئی تھی۔

پھر وہ خطرناک لمحہ آیا۔

ان کے گرد شعلوں کا ناچ جاری تھا۔ یہ شیطانی آگ انہیں زندہ جلانے پر تلی ہوئی تھی۔

لیکن پھر وہ خطرناک لمحہ ان کے سر سے گزر گیا یہ جہنمی آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی جیسے جیسے آگ کے شعلے ان کے نزدیک تر ہوتے گئے، ان کی تپش سرد ہوتی گئی یہاں تک کہ ان کے گرد ہونیوالا شعلو ناچ بالکل سرد پڑ گیا۔ ان کے چاروں طرف بھڑکی ہوئی آگ اس طرح ٹھنڈی پڑ گئی جیسے اس پر برس پڑا ہو۔

ماموں فرقان نے سکون کا سانس لیا۔ یہ شعلوں کا ناچ اتنا بھیانک اور خوف میں مبتلا کر دینے تھا کہ اگر ماموں فرقان ذرا بھی کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے اور آگ سے بچنے کیلئے بھاگ کھڑے ہ تو اس وقت وہ قبرستان میں راکھ بنے پڑے ہوتے۔ ڈھونڈنے والوں کو ان کی ہڈیاں بھی نہ ملتیں قدر خطرناک آگ تھی وہ۔

ماموں فرقان ابھی تک اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ سرد زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ انہوں نے کمبل کو کندھوں سے اتار کر کمرے کے گرد لپیٹ لیا اسے اپنے نیچے دبا لیا اور ٹانگوں پھیلا لیا۔

تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ بڑے اطمینان سے کچھ پڑھ کر ایک ایک دانہ ہاتھ سے چھوڑ جاتے تھے۔

ایک گھنٹے تک کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ قبرستان پر موت کا سناٹا طاری رہا۔ کبھی کبھی دور سے گیدڑ اور کتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔

کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب ماموں فرقان کے کانوں میں کچھ آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ کچھ انسانوں کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں تھیں۔ پھر انہیں سامنے سے روشنی دکھ دی۔ کوئی شخص اپنے ہاتھ میں پیٹرومکس اُٹھائے آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ انہوں نے نظر اُٹھا سامنے کوئی تیس چالیس آدمی نظر آئے وہ سب سفید کپڑوں میں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سب سب کفن پہنے ہیں ان کے کندھوں پر ایک جنازہ تھا پھر ان لوگوں نے ماموں فرقان کے نزد ہی اس جنازے کو رکھ دیا۔

اور وہ سارے لوگ جنازے کے چاروں طرف اکٹھا ہو گئے۔ پیٹرومکس زمین پر رکھ دیا گیا

الی روشنی ان کفن پوشوں کے درمیان سے گزرتی ماموں فرقان تک پہنچ رہی تھی۔

ماموں فرقان کا ہاتھ تسبیح دانوں سے کھیل رہا تھا اور ان کی نظریں سامنے تھیں۔ انہوں نے دیکھا ان میں سے کئی لوگ قبر کھودنے میں لگے ہوئے ہیں۔ قبر بہت تیزی سے کھودی جارہی تھی۔ قبر کی ری کے بعد جنازے کو قبر میں اتار دیا گیا۔

جنازے کو قبر میں اتارے جانے کے ساتھ ہی ایک شور اُٹھا۔ یہ بین کرنے کی آوازیں تھیں۔ یوں رہا تھا جیسے بہت سی عورتیں ایک ساتھ رو رہی ہوں۔ رونے کی آوازوں سے معلوم ہوا کہ وہ کفن مردنہ تھے، ساری عورتیں تھیں۔

یہ رونے کی آوازیں اس قدر تیز تھیں کہ پاس پڑوس کی آبادی تک پہنچ رہی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے قبرستان کا گورکن بھی ان آوازوں کو سن کر یہاں تک پہنچ جائے۔

فعتہً رونے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ پیٹرومکس بھی بجھا دیا گیا۔ اب ان کفن پوشوں نے چلنا شروع ا۔ ماموں فرقان نے دیکھا کہ وہ انہیں کی طرف آرہے تھے۔ اب انہوں نے زور زور سے بولنا ع کر دیا تھا۔ وہ کیا بول رہے تھے، یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہر حال اب ساری آوازیں مردانہ تھیں۔ وہ سارے کفن پوش لوگ ماموں فرقان سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ تیس چالیس کفن اس طرح آگے پیچھے بیٹھے اور کھڑے ہو گئے جیسا اپنا گروپ فوٹو بنوا رہے ہوں۔

ان کفن پوشوں کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھے۔

اب ماموں فرقان نے اپنی نظریں ان کفن پوشوں سے ہٹالیں اور اپنے چمکتے چاقو پر گاڑ دیں۔ وہ د میں مصروف تھے۔

"یہ سامنے کون بیٹھا ہے۔" اچانک ان کے پیچھے سے آواز آئی اور یہ آواز بھی ان کے مرحوم والد کی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ اپنا فرقان ہے، اسے نہیں پہچانتے۔" یہ ان کی مرحومہ والدہ کی آواز تھی۔ یہ آواز بھی ان عقب سے آئی تھی۔

ایک ایسا نفسیاتی حربہ تھا کہ اگر وہ ان آوازوں کے فریب میں آکر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو سارا ل بگڑ جاتا۔ ماموں فرقان خاموشی سے چاقو پر نظریں گاڑے، اپنا کام کرتے رہے۔

"فرقان، ارے او، فرقان۔" ان کی والدہ کی آواز آرہی تھی، بالکل ان کی ماں کا سا لہجہ تھا۔

"ارے تو بولتا کیوں نہیں، کیا تو اپنی ماں کو نہیں پہچانتا۔"

"اس سے پوچھ کہ یہ قبرستان میں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔" اس مرتبہ والد کی آواز آئی۔

"ہاں، ایسی سخت سردی میں تو یہاں کیا کر رہا ہے۔" والدہ نے براہ راست سوال کیا۔

''یہ جو کچھ بھی کر رہا ہے سخت بے وقوفی کر رہا ہے، اسے اپنے انجام کا نہیں پتہ۔'' والد
تنبیہ کی۔

''کیوں، کیوں!'' والدہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا ہونے والا ہے، اس کے ساتھ۔''

ماموں فرقان نے اچانک ہاتھ بڑھا کر چاقو اپنے گرفت میں لے لیا پھر ایک جھٹکے سے اس چاقو کو زمین سے نکال لیا کچھ پڑھ کر چاقو کی نوک پر تین بار پھونکیں ماریں۔ پھر اس کی نوک زمین پر ضرب کا نشان بنایا اور اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے زور سے زمین میں گاڑ دیا۔

زمین میں چاقو کے دھنستے ہی چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر یہ چیخیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں۔ اب وہاں نہ کفن پوش رہے نہ کوئی قبر تھی، نہ پیٹرو کی روشنی۔ دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور سناٹے کا راج تھا۔

آدھے گھنٹے تک پھر سکون رہا، ماموں فرقان اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہے۔

ڈھائی بجے کے قریب انہوں نے چھم چھم کی آواز سنی یہ آواز دور سے آ رہی تھی۔ جیسے کسی عور نے اپنے پیروں میں گھنگھرو باندھ رکھے ہوں اور وہ کمر لچکاتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔

گھنگھرو آواز کے ساتھ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی پھر یہ دونوں آوازیں نزدیک آ گئیں۔

ماموں فرقان نے نظریں اُٹھائیں تو انہوں نے ایک عورت کو سامنے پایا۔ اس عورت ساتھ ایک کالا کتا تھا۔ اس کی سرخ زبان ایک فٹ باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کی جسامت کسی گد سے کم نہ تھی۔

اس کتے کے گلے میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ زنجیر کا ایک سرا اس عورت کے ہاتھ میں تھا اس سے آزاد ہونے کیلئے زور لگا رہا تھا۔ لیکن اس عورت نے اس کی زنجیر مضبوطی سے تھام رکھی تھی خونخوار کتا کسی شیر کی طرح غرا رہا تھا۔ وہ بار بار ماموں فرقان کی طرف جھپٹتا تھا لیکن ہر مرتبہ وہ عور اس کتے کو پیچھے کھینچ لے جاتی تھی۔ جب وہ دو چار قدم پیچھے ہٹتی تو چھن چھن گھنگھرو بج اٹھتے۔

اگر اس خونخوار کتے کی کسی طرح زنجیر اس عورت کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو وہ سیدھا ما فرقان پر چھلانگ لگاتا اور انہیں دو تین منٹ میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔

اتنے طاقتور کتے کو اس نازک عورت نے کس طرح قابو کیا ہوا تھا، اس بات پر حیرت تھی کچھ دی کھیل جاری رہا۔ وہ کتا غراتا ہوا ماموں فرقان کی طرف لپکتا پھر وہ عورت اسے پیچھے کھینچ لے جاتی۔

کتے کی غراہٹ اور گھنگھروؤں کی چھم چھم، چاندنی رات اور قبرستان کا سناٹا سب مل کر ایک خوفنا منظر پیش کر رہے تھے۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر کوئی معمولی دل گردے کا آدمی ہوتا تو حصار کے ا بیٹھا بیٹھا خوف سے دَم توڑ دیتا۔

ماموں فرقان کے جسم میں بھی ایک دو مرتبہ خوف کی لہر آئی تھی لیکن انہوں نے پورے اطمینان سے اسے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھے اور گرد و پیش میں جو ہو رہا تھا اس سے بھی بے خبر نہ تھے۔

اب اس عورت نے اپنے کتے کے ساتھ ماموں فرقان کا طواف شروع کر دیا تھا۔ کتے کی غراہٹ اور گھنگھروؤں کی چھم چھم اب انہیں اپنے چاروں طرف سنائی دے رہی تھی وہ دونوں ماموں فرقان کے اتنے نزدیک سے گزر رہے تھے کہ وظیفہ جاری رکھنے میں دقت پیش آ رہی تھی اور شاید یہی اس عورت کا مقصد تھا کہ کسی طرح وظیفے میں خلل پڑ جائے۔

خیر وہ عورت ماموں فرقان کے وظیفے میں تو خلل نہ ڈال سکی البتہ خود غائب ہو گئی۔ ماموں فرقان نے اچانک ہاتھ بڑھا کر چاقو اپنی گرفت میں لے لیا پھر ایک جھٹکے سے اس چمکتے چاقو کو زمین سے نکال لیا۔ کچھ پڑھ کر اس چاقو کی نوک پر تین مرتبہ پھونکیں ماریں، پھر اس نوک سے زمین پر ضرب کا نشان بنایا اور اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے چاقو کو بہت زور سے زمین میں گاڑ دیا۔

چاقو کے زمین میں دھنسنے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے اس چاقو کا پھل اس عورت کے سینے میں اتر گیا۔ اچانک چیخ بلند ہوئی۔ عورت کے ہاتھ سے اس کتے کی زنجیر چھوٹ گئی اور وہ کتا چھلانگیں مارتا ان کے درمیان غائب ہو گیا۔ اب وہاں عورت بھی نہ تھی۔

پھر کافی دیر سکون رہا۔ ماموں فرقان نے اطمینان کا سانس لیا اب چار بج رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ اب کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہوگا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامنے دو لحیم شحیم آدمیوں کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈراؤنی صورتوں والے آدمی تھے ان کے ہاتھ میں پھاوڑا اور کدال تھیں اور وہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی کی قبر کھودنے کے منتظر ہوں۔

''یہ جو بیٹھا ہے، اس کی قبر کھودنی ہے؟'' ان میں سے ایک ماموں فرقان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''ہاں، اسی کی کھودنی ہے۔'' دوسرے نے تائید کی۔

''میرا خیال ہے کہ چھ فٹ لمبی قبر اس کے لئے ٹھیک رہے گی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار فٹ کا ہوگا۔'' ایک نے اپنا اندازہ پیش کیا۔

''اگر یہ ساڑھے چار فٹ کا ہے تو چھ فٹ کی قبر کھودنے کی کیا ضرورت ہے، ساڑھے چار فٹ کی ٹھیک رہے گی ذرا اس کو دبا کر رکھیں گے۔''

''ہاں، اس کو دبا کر ہی رکھنا چاہئے، اس نے لوگوں کو کافی پریشان کر رکھا ہے۔''

''یہ کیا کسی کو پریشان کرے گا، ابھی خود ہی پریشان ہو جائے گا۔'' ایک نے کہا۔

''وہ کیسے۔'' دوسرا بولا۔

''وہ ایسے کہ ہم ابھی یہاں اس کی قبر کھود دیں گے اور اسے اُٹھا کر اس میں ڈال دیں گے۔ ا
گھر والے اسے ڈھونڈتے ہی رہیں گے کہ کہاں گیا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آؤ پھر اپنا کام شروع کریں۔ وقت کم ہے صبح ہونے والی ہے، اس کام کو د
اُجالے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

پھر ان دونوں دیو قامت آدمیوں نے پھاوڑا اور کدال اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے اور زمین
شروع کردی۔ وہ بہت تیزی سے مٹی کھود رہے تھے۔

یہ خوفناک باتیں سن کر ماموں فرقان کو ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ وہ اپنے کام میں پوری دلجمعی سے
رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ ان دونوں کی مکالمہ بازی پر دل
میں مسکراتے رہے۔

ان دونوں کا ڈرامہ جاری تھا۔ وہ بڑی تیزی سے قبر کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔

قبر کھودتے کھودتے وہ رک جاتے، ماموں فرقان کی طرف اپنی لال لال بھیانک آنکھوں
گھورتے اور پھر کھدائی میں مصروف ہو جاتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں بچہ فکر نہ کر ابھی تیرا کا
کرتے ہیں۔

ماموں فرقان کچھ دیر تک اس ڈرامے کو برداشت کرتے رہے لیکن آخر کب تک؟

انہوں نے پھر وہی عمل دہرایا۔ جیسے ہی چاقو زمین سے نکال کر زمین میں گاڑا تو اس کے سا
وہ دونوں خبیث صورت گورکن ہوا ہو گئے اب نہ وہاں کھدی ہوئی قبر رہی نہ پھاوڑا اور کدال۔

فجر کی اذان ہونے والی تھی۔

انہوں نے اپنے وظیفے کا ننانوے فیصد حصہ مکمل کر لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے بس اب فجر
پڑھ کر وظیفے کا ایک فیصد حصہ مکمل کرنا باقی تھا۔

ہاتھی نکل گیا تھا، دُم باقی رہ گئی تھی۔ قبرستان کی یہ بھیانک رات بخیر و خوبی گزر گئی تھی۔ اب
خطرے کی بات نہ تھی۔

انہوں نے چاقو کو زمین سے نکال لیا اور کمبل پھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی کمر تختہ بن گ
ٹانگیں اکڑ گئی تھیں، پوری رات اس قدر سردی میں آلتی پالتی مار کر بیٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ا
نشست کے ساتھ قبرستان کی بلاؤں کا مقابلہ، ہڈیوں میں اُتر جانے والے خوف سے نبرد آزما
مستقل عمل کئے جانا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔

ماموں فرقان نے اس جان جوکھوں کے کام کو مکمل کر لیا تھا۔ یہ ساری تکلیف انہوں نے

معصوم لڑکی کیلئے اُٹھائی تھی جس کا زمانہ دُشمن ہو گیا تھا۔ زمانے سے بڑا دشمن تو وہ جن تھا جو اس پر
عاشق ہو گیا تھا اور اس لڑکی کو دن بدن تباہی کے دہانے کی طرف لئے جا رہا تھا۔

ماموں فرقان نے کھڑے ہو کر اپنی ٹانگوں اور کمر کو سیدھا کیا اور پھر چاقو کو ریوالور کی طرح تانے
تیز تیز چلنے لگے۔

وہ خیریت سے قبرستان کی حدود سے نکل آئے۔ قبرستان سے نکلنے کے بعد انہوں نے چاقو بند
کر کے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور تسبیح بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لے لی۔

مسجد سامنے تھی۔ مسجد کی حدود میں قدم رکھا تو مؤذن نے اللہ کے بڑے ہونے کا اعلان کیا۔
ماموں فرقان پہلے مسجد کے بیت الخلاء میں گئے وہاں سے نکلے تو وضو کرنے بیٹھ گئے۔ وضو کرنے کی
جگہ پر اندھیرا تھا۔ ایک کمزور سا بلب کافی دور جل رہا تھا۔

ماموں فرقان نے وضو کے لئے نلکا کھولا تو اس میں سے پانی نہ نکلا۔ محلے کا ایک لڑکا ماموں
فرقان کو دیکھ رہا تھا، وہ فوراً ہی لوٹے میں پانی لئے ان کی طرف دوڑا اور بہت ادب سے بولا۔
''ماموں ٹنکی میں پانی نہیں ہے، میں اِدھر بالٹی میں رکھا ہوا پانی لوٹے میں بھر لایا ہوں، آئیے میں
آپ کو وضو کرا دوں۔''

''ارے رضوان تم ہو، شکریہ بیٹا، لاؤ لوٹا مجھے دے دو میں خود کر لیتا ہوں وضو۔'' ماموں فرقان
نے کہا۔

''نہیں ماموں میں کراؤں گا آپ کو وضو۔'' رضوان نے بڑی محبت سے کہا۔

ماموں فرقان نے اس کی محبت کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ رضوان ان کے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگا
وہ اس طرح کھڑا ہوا کہ رہی سہی روشنی بھی رک گئی۔

پھر ماموں فرقان کو روشنی کا کیا کرنا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی وضو کیا اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا
رومال سے اپنا منہ سکھاتے ہوئے صف پر کھڑے ہو گئے۔

نماز پڑھ کر، وہ اپنا وظیفہ مکمل کرنے بیٹھ گئے۔

جب وہ مسجد سے باہر آئے تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ وہ اپنا وظیفہ مکمل ہونے پر بہت خوش تھے، وہ
تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر سب سے پہلے دادا غفور کو ٹیلی فون کر کے ان کو یہ مژدۂ جانفزاء
سنائیں۔ اس کے بعد گلشن فون کر کے بابر کو بھی یہ خوشخبری سنائیں کہ اب نیلم کو بہت جلد اس عذاب
سے نجات مل جائے گی۔

ماموں فرقان گھر پہنچے تو پہلی ہی دستک پر گھر کا دروازہ کھل گیا۔ ممانی ریحانہ، ماموں کو دیکھ کر خوش

ہوئیں۔انہوں نے آنکھیں بند کر کے تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''کام ہوگیا؟'' ممانی ریحانہ نے پوچھا۔

''ہاں جی۔'' ماموں فرقان خوش ہو کر بولے۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔'' ممانی ریحانہ رات کی روداد سننے کے لئے بے چین تھیں۔

''بیگم کچھ نہ پوچھو کہ رات کیسے گزری، اگر تم میرے ساتھ ہوتیں تو پہلے ہی حملے میں بے ہو جاتیں۔

''کیا ہوا آخر، کچھ سناؤ تو۔'' ممانی ریحانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ابھی سناؤں گا پہلے ذرا دادا غفور سے بات کرلوں۔''

''دادا غفور سے بعد میں بات کرنا، پہلے اکبر سے بات کرلو، وہ بہت بے چین ہو رہا ہے، اس کا تک دو مرتبہ فون آچکا ہے۔''

''اچھا۔'' ماموں فرقان نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میں پہلے دادا غفور سے بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ دادا غفور کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

ماموں فرقان، دادا غفور کو فون کر رہے تھے تو اِدھر اکبر، ماموں فرقان کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہا تھا نیلم اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ اکبر کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے کیوں دیکھ رہی ہو، ایسے نہ دیکھا کرو مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اکبر نے نمبر گھماتے ہوئے کر کہا۔

بس اتنی دیر میں نیلم کی رنگت بدل گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ تیور چڑھ گئیں۔اس کی آواز بدل گئی۔ وہ مردانہ آواز میں بولی۔''اکبر، یہ تُو کیا کر رہا ہے۔''

اس روپ میں اکبر نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے خو ہو کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بڑی آہستگی سے بولا۔''وہ جی، میں ماموں فرقان سے بات چاہ رہا تھا۔''

''ماموں فرقان کے بچے۔'' نیلم نے بڑے غصے سے کہا۔''اس سے بعد میں بات کرنا، ہم سے کر۔''

''جی، جی آپ فرمائیں۔'' اکبر گھگھیا کر بولا۔

''تُو کیا سمجھتا ہے، تیرا ماموں فرقان ہمارا کچھ بگاڑ لے گا۔ وہ بے وقوف ہے وہ ہمارا کچھ نہیں سکتا۔ اس نے خواہ مخواہ قبرستان میں اپنی رات کالی کی۔ وہ ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ البتہ اب ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اسے ایسی سزا دیں گے کہ وہ زندگی

ار رکھے گا۔ اب ہم جا رہے ہیں اسے ہمارا پیغام پہنچا دینا۔'' نیلم نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔

جب اس نے سر اُٹھایا تو وہ نارمل ہو چکی تھی۔ اکبر اسے ہکا بکا دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم میں خوف کی وجہ سے لرزہ طاری تھا۔

نیلم نے اکبر کو اس قدر حیران و پریشان دیکھا تو وہ خود بھی پریشان ہوگئی، گھبرا کر بولی۔''کیا ہوا آپ کو، اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔ آپ ماموں کو ٹیلیفون کر رہے تھے۔ ٹیلیفون کرتے کرتے یہ آپ کو کیا ہوگیا۔''

''نہیں، مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ ماموں کا نمبر انگیج ہے، ابھی دوبارہ کرتا ہوں۔'' اکبر نے بڑی معصومیت سے کہا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اسے کچھ نہیں ہوا، تمہیں ضرور کچھ ہوگیا تھا۔ چند لمحوں میں تمہاری رنگت بدل گئی، صورت کچھ سے کچھ ہوگئی تھی، آواز بدل گئی تھی۔

اکبر نے پھر ماموں فرقان کا نمبر ملایا۔ اس اثنا میں وہ دادا غفور سے بات کر چکے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ اکبر کا فون ہے۔ لہٰذا انہوں نے ریسیور اُٹھاتے ہی ہیلو نہیں کہا بلکہ یوں بولے۔''جی، اکبر صاحب۔''

اکبر اپنا نام سن کر حیران رہ گیا، وہ بولا۔''ماموں آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرا فون ہے۔''

''بس ایک اندھیرے میں تیر چلایا تھا، یوں سمجھو کہ تکا لگ گیا۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

''ماموں خیریت تو رہی۔ کام ہوگیا۔'' اکبر اصل مقصد پر آیا۔

''ہاں، بالکل کام ہوگیا، میں نے ابھی دادا غفور سے بھی بات کرلی ہے، آئندہ کیا کرنا ہے، یہ سمجھ لیا ہے، مجھے اس وقت نیند آرہی ہے۔ ایک گھنٹے سو لوں، پھر دکان کا ایک چکر لگا کر تمہارے گھر آتا ہوں۔ نیلم تو ٹھیک ہے۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''جی نیلم ٹھیک ہے، اس وقت میرے سامنے ہی بیٹھی ہے۔'' اکبر نے بتایا۔

''اکبر تم کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہو، تمہاری آواز سے ایسا محسوس ہو رہا ہے، کیا میرا اندازہ غلط ہے۔''

''نہیں ماموں، آپ ٹھیک ہیں، آپ کا اندازہ صحیح ہے۔''

''بیٹا، اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، انشاء اللہ اچھے دن آنے والے ہیں۔'' ماموں فرقان نے اسے تسلی دی۔

''ماموں، ابھی ابھی وہ دھمکی دے کر گیا ہے۔'' اکبر نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون؟'' ماموں فرقان نے پوچھا پھر وہ فوراً ہی سمجھ گئے۔''اچھا، وہ...... کیا وہ ظاہر ہوا تھا۔''

''جی ماموں۔'' اکبر نے بتایا پھر بولا۔''ماموں، آپ ایک منٹ ہولڈ کریں۔''

"اچھا۔" ماموں فرقان نے کہا پھر انہوں نے سنا کہ اکبر نیلم سے کہہ رہا تھا۔ "نیلم تم امی کے
چلو میں ماموں سے بات کر کے آتا ہوں اور دیکھو ذرا دروازہ بند کر جانا۔"

پھر ماموں فرقان نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ بولے۔ "اکبر خیریت تو ہے۔"

"ماموں ابھی کچھ دیر پہلے میں آپ کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نیلم کی اچانک آواز بدل
وہ مردانہ آواز میں بولنے لگی۔"

پھر نیلم نے جو کچھ کہا تھا وہ من وعن اکبر نے ماموں فرقان کے گوش گزار کر دیا۔

"تو اس کو پتہ چل گیا کہ میں رات قبرستان میں تھا۔" ماموں فرقان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہ صرف اسے پتہ چل گیا بلکہ اس نے نہ بھولنے والی سزا دینے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔"

"میں دیکھ لوں گا اسے تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی دوپہر تک پہنچتا ہوں تمہاری طرف۔"

"جی بہتر، ماموں، آپ آیئے۔" اکبر نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ماموں فرقان نے دوپہر کو گلشن جانا تھا لیکن وہ وہاں نہ جا سکے، اس کے بجائے اسپتال پہنچ گئے۔

وہ پوری رات کے جاگے ہوئے تھے پھر بیٹھے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم کا انگ انگ دکھ
تھا، شدید تھکن تھی، شدید نیند تھی، انہوں نے جلدی جلدی اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور اپنے کمرے میں جا
لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ سونے سے پہلے انہوں نے ممانی ریحانہ کو تاکید کی کہ وہ اُنہیں دو گھنٹے کے بع
اُٹھا دیں، کہیں وہ شام تک سوتے ہی نہ رہ جائیں۔

دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب ممانی ریحانہ نے اُنہیں اُٹھانے کے لئے ان کے چہرے سے لحاف
ہٹایا تو وہ کانپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

یہ ماموں فرقان کا چہرہ ہی نہ تھا۔

ان ان کے پورے جسم پر جگہ جگہ سفید داغ پڑے ہوئے تھے۔

ممانی ریحانہ نے اُنہیں گھبرا کر جھنجھوڑ دیا۔ "ارے اُٹھئے۔"

ماموں فرقان نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ ممانی کا پریشان چہرہ دیکھ کر بولے۔ "کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا، اپنے چہرہ کو دیکھئے، یہ آپ کو کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر بولیں۔

ممانی ریحانہ نے اُنہیں آئینہ لا کر دیا۔ اتنی دیر میں وہ اپنا چہرہ ٹٹول چکے تھے۔ آئینہ جو دیکھا تو ا
پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ ان کے چہرے کو کیا ہوا، یہ تو سفید سفید برص کے سے داغ تھے۔

پھر یہ داغ ان کے چہرے پر ہی نہ تھے بلکہ ہاتھ پیروں پر بھی تھے۔

اور یہ صرف محض سفید داغ ہی نہ تھے بلکہ یہ بڑے بڑے زخم سے تھے جن میں پیپ بھری ہوئی تھی۔

ماموں فرقان فوراً اُٹھ کر اسپتال پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر نے انہیں اسپتال میں داخل کر لیا کیونکہ وہ دا

ہت تیزی سے پھیل رہے تھے، آہستہ آہستہ پورا جسم ان داغوں کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔

ان داغوں میں سخت خارش ہو رہی تھی، وہ جیسے ہی کسی داغ کو کھجاتے فوراً مواد پھٹ پڑتا اور جہاں
جہاں مواد لگتا، وہاں ایک نیا داغ پیدا ہو جاتا۔

اکبر اور بابر کو جیسے ہی ماموں فرقان کے اسپتال میں داخل ہونے کا معلوم ہوا وہ فوراً بھاگے بھاگے
اسپتال پہنچے۔ ممانی ریحانہ نے جو کچھ بتایا تھا اس سے کہیں زیادہ ماموں فرقان کی حالت خراب تھی۔

اور جوں جوں علاج ہو رہا تھا، ان کی حالت مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر اس کو خطرناک قسم کی الرجی سمجھ کر اس کا علاج کر رہے تھے۔

لیکن وہ الرجی نہ تھی۔

وہ داغ جن میں مواد بھرا تھا، اب جسم کے چپے چپے پر پھیل گئے تھے۔

پیٹ، کمر، بازو، ٹانگیں حتیٰ کہ سر میں بھی۔ کوئی جسم کا ایسا حصہ نہ بچا تھا جہاں مواد سے بھرے یہ زخم
موجود نہ تھے۔ ان زخموں میں شدید قسم کی خارش تھی۔ ماموں فرقان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

ڈاکٹروں کے دماغ چکرائے ہوئے تھے، ساری دوائیں اُلٹا اثر دکھا رہی تھیں۔

ماموں فرقان کا ایک بیٹا تھا، عرفان۔ وہ حیدرآباد میں رہتا تھا۔ وہاں کے ایک بینک کا منیجر تھا۔ وہ
مہینے کی ہر آخری جمعرات کو کراچی آتا تھا، شادی شدہ تھا۔ اس کے تین بچے تھے دو لڑکے اور لڑکی۔

ماموں فرقان کا بس ایک ہی لڑکا تھا دوسری بیٹی تھی شمسہ جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عرفان
اور شمسہ کے درمیان آٹھ سال کا فرق تھا۔

عرفان اس جمعرات کو گھر آیا تو گھر آ کر اسے معلوم ہوا کہ ابا جی اسپتال میں داخل ہیں۔ ممانی
ریحانہ نے اپنے بیٹے کو سارے حالات سے روشناس کیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے ابا
جی نے کل کی رات قبرستان میں گزاری تھی۔

عرفان کے پاس گاڑی موجود تھی۔ وہ فوراً اسپتال پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اسے شدید بدبو کا
بھبکا آیا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ کمرے میں بابر اور اکبر بھی موجود
تھے لیکن ان کی ناکوں پر رومال نہ تھے۔ بدبو بہرحال انہیں بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ برداشت
کر رہے تھے۔ عرفان کو اندازہ نہ تھا کہ یہ کیسی بدبو ہے جب اسے اندازہ ہوا کہ یہ بدبو ماموں فرقان
کے جسم پر پڑے ہوئے زخموں سے آ رہی ہے تو اس نے ناک سے رومال ہٹا لیا۔

ماموں فرقان کی حالت ایک دن میں انتہائی خراب ہو گئی تھی۔ سارے ٹیسٹ لئے جا چکے تھے لیکن
بیماری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ داغ کیسے تھے، کیوں پڑ رہے تھے، کیوں پھیل رہے تھے۔

ماموں فرقان چند گھنٹوں میں شدید نوعیت کے کوڑھ کے مریض نظر آنے لگے تھے۔

وہ بڑے حوصلے والے آدمی تھے۔ وہ بڑے حوصلے سے کام لے رہے تھے۔ عرفان اسپتال کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے اس کا مسکرا کر استقبال کیا۔ ''آؤ بیٹے۔''

''ابا جی، یہ سب کیا ہے؟''

''پتہ نہیں بیٹا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم ایک کام کرو۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''جی ابا جی، فرمائیں۔''

''تم گاڑی لائے ہو۔''

''جی ہاں ہے میرے پاس۔''

''ماموں آپ بتائیں کیا کام ہے، میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔'' بابر نے فوراً کہا۔

''نہیں، عرفان اپنی گاڑی میں چلا جائے گا۔''

''کہاں بھیجنا ہے، بتائیں آپ۔''

''بیٹا تم نے داداغفور کا گھر تو دیکھا ہے۔''

''جی ابا جی دیکھا ہے۔''

''تم ایسا کرو، اکبر کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور داداغفور کے گھر چلے جاؤ، ان سے کہنا کہ میں نے اسپتال بلایا ہے۔ میرے بارے میں ساری تفصیل بتا دینا۔''

''جی، بہتر ابا جی، میں اکبر کو لے کر چلا جاتا ہوں۔'' عرفان نے سعادت مندی سے کہا۔

پھر وہ دونوں تیزی سے اسپتال کے کمرے سے نکل گئے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے ان کے ساتھ داداغفور بھی تھے۔

داداغفور، ماموں فرقان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ممانی ریحانہ نے اگرچہ دوپہر کو انہیں ٹیلیفون پر ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ ماموں فرقان کی حالت کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ ایسی بری حالت ہو جائے گی۔

انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر رسمی طور پر دو چار باتیں کیں، پھر سب لوگوں سے کمرہ خالی کرنے کو کہا۔

داداغفور کا حکم سن کر بابر، اکبر اور عرفان کمرے سے باہر چلے آئے۔

''ہاں، فرقان اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے، یہ سب کیسے ہوا۔ صبح تو تم بہت خوش تھے۔''

''داداغفور میں کیا بتاؤں، مجھے کچھ نہیں معلوم یہ سب کیا ہے۔ ریحانہ نے مجھے اُٹھایا تو میرے جسم پر داغ پیدا ہو چکے تھے۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔'' داداغفور نے پوچھا۔

''ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ وہ اسے اب تک شدید قسم کی الرجی سمجھ رہے تھے لیکن اب وہ بھی مایوس ہو چکے ہیں۔''

''مجھے ذرا قبرستان کا حال تفصیل سے سناؤ۔'' داداغفور نے کہا۔

ماموں فرقان نے قبرستان میں جو بیتی تھی وہ جلدی جلدی تمام جزئیات کے ساتھ کہہ سنائی۔ پھر انہوں نے مسجد جانے اور وضو کرنے کا ذکر کیا تو داداغفور کو جیسے ڈنک سا لگا۔

''اوہ، میرے اللہ۔'' داداغفور نے انتہائی فکرمند ہو کر کہا۔ ''تمہیں وضو کرانے والا لڑکا کون تھا؟''

''وہ رضوان تھا، داداغفور، میرے گھر کے نزدیک ہی رہتا ہے۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''تمہارا خیال ہے کہ وہ رضوان ہی تھا، تمہارا پڑوسی؟'' داداغفور نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، بالکل۔'' ماموں فرقان نے وثوق سے کہا۔ ''بہت اچھا لڑکا ہے، بڑا سعادت مند۔''

''اب میری سمجھ میں ساری بات آ گئی ہے۔'' داداغفور سوچتے ہوئے بولے۔

''وہ کیا دادا۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''فرقان تم سے بڑی بھول ہو گئی ہے۔'' داداغفور نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''داداغفور، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔'' ماموں فرقان پریشان ہو کر بولے۔

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ......'' ابھی داداغفور کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ نیلم غصے میں بھری کمرے میں داخل ہوئی۔

نیلم عجیب انداز سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس کا چہرہ لوہے کی طرح تپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ نفرت سے سکڑے ہوئے تھے وہ کچھ اس طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ چند لمحوں کے لئے داداغفور کی آنکھیں جھک گئی تھیں، اس کے گلے میں دوپٹہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سردی کے باوجود بدن پر سوئیٹر نہ تھا۔ پیروں میں چپل یا سینڈل نہ تھے۔

وہ اس حالت میں گھر سے اسپتال پہنچ گئی تھی۔

''غفورے تُو اسے کیا بتانا چاہ رہا تھا، اب میرے سامنے بتا، میں بھی تو سنوں۔'' نیلم نے مردانہ آواز میں کہا۔ لہجے میں شدید غصہ ٹپک رہا تھا۔

''وہ ہماری آپس کی بات تھی۔'' داداغفور نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آپ بتائیے، آپ کا کیسے آنا ہوا اس وقت یہاں اسپتال میں۔''

''تم لوگ جو کھیل کھیل رہے ہو اس کا انجام دیکھ لیا اور یہ ابھی کچھ نہیں ہے۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے، تم نے سیّد پور کے جن سے ٹکر لی ہے۔ اب دیکھو بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس فرقان کا

تو میں وہ حشر کروں گا کہ زندگی بھر یاد کرے گا اور بڈھے چھوڑوں گا میں تجھے بھی نہیں۔ ،
تیرے اشاروں پر ناچ رہا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' نیلم غصے میں بولے چلی جارہی تھ
بات کی ایک حد ہوتی ہے، میں نے تم دونوں کو بہت طرح دینے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ
زبانی تنبیہوں سے سنبھل جاؤ گے۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ گے لیکن تم لوگوں نے شاید
پانی کا بلبلہ سمجھ لیا ہے، تم لوگ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔ تم لوگوں نے
کہ میں تم لوگوں کے بس کا نہیں ہوں۔ میں تم لوگوں کے قابو میں آنے والی چیز نہیں ہوں۔
راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔''

''میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جواب دیں گے۔'' دادا غفور نے اس کی خوفناک دھم
نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کہو۔'' نیلم کے لہجے میں وہی کرختگی تھی۔

''چلیں ہم لوگ تو آپ کے پیچھے پڑے ہیں، اس لئے آپ ہمیں نقصان پہنچانے کے در
لیکن اس لڑکی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ اس حالت میں آپ اسے کھینچے پھر رہے ہیں۔''

''ہم اس پر عاشق ہیں، اسے ہم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔'' واضح اور دوٹوک جواب ملا۔

''آپ کے ارادے کیا ہیں۔'' پوچھا گیا۔

''تُو ہمارے ارادے کیا پوچھتا ہے، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ تُو اپنا ارادہ بتا۔''

''ہمارے ارادے تو آپ کے سامنے ہیں، وہ تو فرقان سے ذرا سی چوک ہوگئی ورنہ اُڑ گ
آپ۔'' دادا غفور نے نیلم کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑے سکون سے کہا۔

''مر گئے ہمیں اُڑانے والے۔'' نیلم نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا اور دادا غفور کو گھور کر دیکھا۔

''وظیفہ مکمل ہونے کو تھا۔ بس فرقان سے ذرا بد احتیاطی ہوگئی۔ وہ عمل کے مکمل ہونے کی خوش
آپ کو پہچان نہ سکا۔ اس نے اپنا پڑوس کا لڑکا سمجھ کر وضو کر لیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کیسے پانی سے
کر رہا ہے۔'' دادا غفور نے بتایا۔

''اس لئے بار بار سمجھا رہا ہوں کہ ہم سے ٹکر مت لو۔'' نیلم نے خشک لہجے میں کہا۔

''ٹکر تو ہم نے آپ سے لے لی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جیت کس کی ہوتی ہے۔ ان چھو
موٹے حربوں سے ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔'' دادا غفور نے نیلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ک

''مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ باز آنے والوں میں سے نہیں ہو، خیر کوئی بات نہیں۔ اب نتائج کے
ذمہ دار ہو گے۔ میں چلتا ہوں۔''

یہ کہہ کر نیلم مڑی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

دادا غفور اس کے پیچھے دروازے تک آئے انہوں نے دروازے سے نکل کر دیکھا نیلم کا لمبی راہداری میں دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ دروازے سے باہر نکلتے ہی غائب ہوگئی تھی۔

دادا غفور دروازہ بند کر کے واپس پلٹے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جواب میں ماموں فرقان نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

دادا غفور، ماموں فرقان کے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''دیکھ لی تم نے اس کی چالاکی، تمہیں اس نے ایسی جگہ گرفت میں لیا کہ تم خوشی کے نشے میں اسے پہچان بھی نہ سکے اور وہ بڑے اطمینان سے گندے پانی سے وضو کرا کے چلتا بنا۔ ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ گیا۔''

''مجھ سے واقعی بھول ہوگئی، اگر میں ذرا سا غور کر لیتا تو اسے پہچاننا کوئی مشکل کام نہ تھا۔'' ماموں فرقان نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''خیر افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو ہو گیا سو ہوگیا۔ میں ان کی دھمکیوں سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ کیا تم ہو؟'' دادا غفور نے مسکرا کر پوچھا۔

''دادا غفور آپ جانتے ہیں کہ میں نے تو ڈرنا سیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی دُھن کا پکا ہوں۔ بس ذرا ٹھیک ہو جاؤں پھر کرتا ہوں اس کے خلاف کارروائی۔''

''فرقان تم ایسا کرو کہ اسپتال چھوڑ دو۔'' دادا غفور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیوں دادا؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''دنیا کا کوئی ڈاکٹر تمہارا علاج نہیں کر سکتا ہے، تمہارا مرض ایسا ہے کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہو سکتی۔ تمہیں روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔'' دادا غفور نے ماموں فرقان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

پھر دادا غفور کمرے سے باہر نکلے، باہر سے بابر، اکبر اور عرفان کو بلا کر لائے وہ لوگ لان میں بیٹھے ہوئے گپ لگا رہے تھے۔ دادا غفور کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہوگئے۔

جب وہ لوگ قریب آگئے تو دادا غفور نے بابر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بابر وہ آئی تھی۔''

''کون ماموں؟'' بابر کی تیوری پر بل پڑ گیا۔

''نیلم اور کون۔'' دادا غفور نے کہا۔

''یہاں اسپتال میں، کہاں ہے وہ، کس کے ساتھ آئی تھی۔''

''وہ بالکل تنہا تھی، اس حالت میں کہ نہ اس کے گلے میں دوپٹہ تھا اور نہ پاؤں میں چپل۔'' دادا غفور نے بتایا۔ ''اور آئی نہیں لائی گئی تھی۔''

''کون لایا تھا اسے؟'' اس مرتبہ اکبر نے پوچھا۔

"وہ جو خود کو سیّد پور کا کہتا ہے اور اپنے آپ کو زبردست گردانتا ہے۔" دادا غفور نے کمر۔ داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اکبر نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا اسے نیلم کہیں نظر نہ آئی، اس نے پوچھا۔ "دادا کہاں ہے۔"

"جو لایا تھا، وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔" دادا غفور نے بتایا۔

"وہ ہم لوگوں کو بہت دھمکیاں دے کر گیا ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

پھر دادا غفور نے بابر، اکبر اور عرفان کو نیلم کے آنے کی پوری روداد سنا دی۔ سارے کے سا سناٹے میں آ گئے۔

"عرفان!" دادا غفور نے کچھ دیر کے بعد سناٹا توڑا۔

"جی، دادا۔" عرفان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

"تمہارے باپ کو اسپتال سے شفٹ کرنا ہے۔" دادا غفور بولے۔

"کہاں دادا؟" عرفان نے پوچھا۔

"میرے گھر۔" دادا غفور نے بتایا۔

"جی ٹھیک ہے۔"

"لیکن کیوں دادا، ماموں فرقان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ انہیں گھر لے جایا جائے۔ ا ڈاکٹروں کے سامنے رہنا بہت ضروری ہے۔" بابر نے مداخلت کی۔

"یہ کیس ڈاکٹروں کے بس کا نہیں ہے، بابر۔" دادا غفور نے بڑے وثوق سے کہا۔

"پھر کس کے بس کا ہے۔" بابر نے پوچھا۔

"یہ میرے بس کا ہے، اسے میں ٹھیک کروں گا، یہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے دادا جیسی آپ کی مرضی۔ اکبر اور عرفان تم دونوں ماموں کو دادا کے گھر چھوڑ آؤ۔" ا نے کہا۔

ماموں فرقان کو دادا غفور کے یہاں چھوڑ کر جب اکبر اپنے گھر لوٹا تو رات اپنی زُلف کھول چ تھی۔ اس نے گیٹ پر گاڑی روک کر مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھولنے کی آواز آئی پھر کسی نے گیٹ کھول دیا۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اکبر نے دیکھا کہ نیلم سامنے کھڑی ہے وہ کالی شال اوڑھے ہوئے تھی اس کالی شال میں اس کا سفید چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اکبر اس کے چہرے کے حُسن میں کھو کر رہ گیا۔ ا گاڑی اندر لانا بھی بھول گیا۔

تب نیلم نے حیرت سے کہا۔ "کیا ہوا گاڑی اندر لائیے نا۔"

"اوہ۔" جیسے ہوش میں آ گیا پھر تھوڑی سی گاڑی اندر لا کر اس نے نیلم کے پاس روکی۔ نیلم گیٹ ند کرنے کے انتظار میں کھڑی تھی لیکن گاڑی ابھی پوری اندر نہ آئی تھی۔ وہ گیٹ بند نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہوا، یہاں کیوں رک گئے، گاڑی آگے بڑھائیے نا۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"گاڑی تو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔" اکبر نے عجیب انداز میں کہا۔

"کہاں آگے بڑھی ہے، گاڑی تو گیٹ میں اٹکی ہوئی ہے۔" نیلم نے مسکرا کر کہا۔

تب اکبر نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔ نیلم نے گیٹ بند کیا وہ واپس آئی تو اکبر اس کا منتظر تھا۔

"نیلم تم دو گھنٹے پہلے کیا گھر سے نکلی تھیں۔" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں تو، آپ گھر سے نکلنے کی بات کر رہے ہیں، میں تو اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔" نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں نکلیں؟" اکبر نے پھر پوچھا۔

"اکبر آپ کو کیا ہو گیا ہے، کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" نیلم نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اس کے لہجے کی سچائی بتا رہی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔

اکبر نے پھر کچھ نہ کہا، خاموشی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے فرداً فرداً راشدہ اور صابرہ سے پوچھا۔ انہوں نے بھی نہ صرف نیلم کے باہر جانے کی تردید کی بلکہ حیرت کا اظہار کیا۔

اکبر چکرا کر رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب نیلم گھر سے نکلی ہی نہیں تو پھر اسپتال پہنچنے والی نیلم کون تھی۔

یہی کیا، اب تک ہونے والی باتوں میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں آ جاتی۔

گھر میں پیش انے والے واقعات عقل سے بالاتر تھے کوئی بات عقل میں نہیں آ رہی تھی۔

دادا غفور، ماموں فرقان کو اسپتال سے نکال کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ لوگ مریضوں کو گھر سے اسپتال پہنچاتے ہیں لیکن وہ مریض کو اسپتال سے گھر لے گئے تھے۔

گھر لے جا کر انہوں نے ماموں فرقان کو اپنے کمرے میں رکھا۔ ماموں فرقان کے جسم سے اتنی بدبو آ رہی تھی کہ پاس کھڑا ہونا مشکل تھا۔ خود فرقان ماموں اپنے جسم کی بدبو سے سخت پریشان تھے لیکن دادا غفور نے اس بدبو کی ذرہ بھر پروانہ کی۔ وہ بڑے آرام سے ان کے پاس بیٹھے تھے۔

انہوں نے کہیں سے نیم کے پتے منگوائے تھے، نیم کے پتے آ گئے تو انہوں نے ان پتوں کو پانی میں اُبلوایا پھر اس اُبلے ہوئے پانی کو چھان کر ایک جگ میں بھروالیا۔

اب یہ شیشے کا جگ ان کے سامنے رکھا تھا اور وہ اپنی چوکی پر جسے ایک ہزار دانوں والی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ایک گھنٹے تک وہ بڑے انہماک سے پڑھتے رہے۔ پڑھنے کے دوران وہ گاہے نظر اُٹھا کر ماموں فرقان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ دونوں کی نظریں ملتیں تو دادا غفور مسکرا اُٹھتے مسکراتے دیکھ کر ماموں فرقان کو زبردستی مسکرانا پڑتا۔ وہ اپنے جسم سے اُٹھتی بدبو سے سخت ہو رہے تھے۔

دادا غفور نے تسبیح پھیرنے کے بعد پانی سے بھرا جگ اپنے سامنے رکھا، پھر اس پھونکیں ماریں۔

اس پڑھے ہوئے پانی سے انہوں نے آدھا گلاس بھرا اور ماموں فرقان کی طرف بڑھاتے بولے۔ ”لو فرقان، یہ پانی پی لو۔“

ماموں فرقان کے ہاتھ پر کئی داغ پڑے ہوئے تھے، ان سے پانی رس رہا تھا۔ ماموں فرقان پہلے گلاس لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا پھر کچھ سوچ کر رک گئے اور بولے۔ ”دادا گلاس ہو جائے گا۔ آپ مجھے خود ہی پلا دیں۔“

”لاؤ میں خود ہی پلا دیتا ہوں، ذرا اپنی گردن اونچی کرلو۔“ دادا غفور نے بڑی محبت سے کہا۔

ماموں فرقان نے اپنی گردن اُٹھا کر وہ آدھا گلاس پڑھا ہوا پانی غٹا غٹ پی لیا۔

پانی پی کر اُنہیں بڑا سکون ملا۔ ان داغوں میں جو شدید قسم کی خارش ہو رہی تھی، وہ فوراً بند ہو گئی۔

پھر دادا غفور نے ان کے نہانے کے لئے پانی گرم کروایا۔ اس گرم پانی میں انہوں نے جگ سے ایک گلاس پانی نکال کر اس میں ملا دیا اور فرقان ماموں کو ہدایت کی۔ ”جاؤ، فرقان نہاؤ۔“

دادا غفور نے اپنے کپڑے غسل خانے میں لٹکا دیئے، دونوں کے جسم تقریباً ایک جیسے تھے۔

ماموں فرقان اس گرم پانی سے خوب اچھی طرح نہائے۔ دادا غفور نے صابن لگانے سے منع کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے جسم پر صابن نہ لگایا۔

نہاتے ہی ان کے جسم میں تازگی سی آگئی۔ انہوں نے اپنے جسم کو ایک تولیہ سے بہت احتیاط سے خشک کیا اور دادا غفور کے کپڑے پہن کر باہر آگئے۔ انہوں نے اپنے کپڑوں کو وہیں چھوڑ دیا۔

دادا غفور نے غسل خانے میں جا کر ماموں فرقان کے کپڑوں کو زمین پر رکھا اور دیا سلائی دکھائی۔ کپڑے خشک تھے لیکن پھر بھی ان کپڑوں نے آگ نہ پکڑی۔ تھوڑے جلتے، پھر بجھ جاتے۔ آگ کی جگہ دھواں رہ جاتا۔ کوشش کے باوجود ان کپڑوں نے آگ نہ پکڑی محض سلگ سلگ کر رہ گئے تو دادا غفور نے اندر سے مٹی کا تیل منگوا کر ان کپڑوں پر چھڑک دیا اور پھر دیا سلائی دکھا دی۔

ماموں فرقان کے کپڑے جل اُٹھے۔ دادا غفور نے ان کپڑوں کو ایک ڈنڈے کی نوک سے

پاٹ کر انہیں اچھی طرح جلا دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں جلے ہوئے کپڑوں کی راکھ رہ گئی۔

دادا غفور نے ان جلے ہوئے کپڑوں کی راکھ کو سمیٹا اور پھر ایک پلاسٹک کی تھیلی میں بھر لیا اور ماموں فرقان سے یہ کہہ کر میں ابھی آتا ہوں باہر نکل گئے۔

جلے ہوئے کپڑوں کی راکھ کی تھیلی انہوں نے گندے نالے میں پھینکی اور پھر وہ اپنے فلیٹ میں واپس آگئے۔

دادا غفور کمرے میں آئے تو انہوں نے ماموں فرقان کو بیڈ پر بیٹھا ہوا پایا۔ ماموں فرقان کے جسم میں ٹھنڈک پڑ گئی تھی اور رستے ہوئے زخم ایک دَم خشک ہو گئے تھے۔ اب ان زخموں سے بدبو نہیں آرہی تھی۔ ماموں فرقان کے چہرے پر تازگی تھی۔

”ہاں، بھئی فرقان اب بولو کیا حال ہیں؟“ دادا غفور نے خوش مزاجی سے کہا۔

”دادا غفور آپ نے تو کمال کر دیا۔ مجھ کوڑھی کو دو گھنٹوں میں اچھا کر دیا۔“

”اچھا۔“ دادا غفور خوش ہو کر بولے۔ ”بس تم وقفے وقفے سے جگ کا پانی پیتے رہو، تمہارے جسم پر جو یہ داغ نظر آرہے ہیں وہ جاتے رہیں گے۔“

”دادا آپ نے کیا پڑھا ہے مجھے بتائیں؟“ ماموں فرقان نے پوچھا۔

”ہاں بتا دوں گا، پہلے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ، پھر بتا دوں گا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ ٹال رہے ہیں مجھے بتانا نہیں چاہتے۔“ ماموں فرقان نے کہا۔

”ارے نہیں، فرقان، ایسی کیا بات ہے، تم سے بھلا کیا چھپاؤں گا۔“ دادا غفور بولے۔

”پھر بتائیں نا۔“ ماموں فرقان نے ضد کی۔

”ارے بھئی اتنے بے صبرے نہ بنو، تمہارے یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

پھر ماموں فرقان نے زیادہ ضد نہ کی۔ انہیں معلوم تھا کہ دادا غفور نے بتانے کا وعدہ کرلیا ہے تو ضرور بتا دیں گے۔ ان پر خواہ مخواہ دباؤ ڈالنا، اصرار کرنا بے سود تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو بابر کا فون آگیا۔ دادا غفور نے علیک سلیک کر کے ریسیور ماموں فرقان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ماموں فرقان نے ساری روداد بابر کو سنائی۔ ان کی صحت یابی سے بابر بہت خوش ہوا پھر فرداً فرداً سب نے بات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اکبر، صابرہ اور راشدہ کو اپنے بارے میں از سر نو بتانا پڑا۔ گلشن سے رابطہ منقطع ہوا تو عزیز آباد سے فون آگیا۔

عرفان بہت پریشان تھا۔ وہ مسلسل فون ملانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مسلسل انگیج مل رہا تھا، اب وہ آخری بار ملا رہا تھا کہ ایک دَم لائن مل گئی۔

گھر پر سب پریشان تھے اگرچہ دادا غفور نے عرفان سے کہہ دیا تھا کہ وہ اطمینان سے فرقان کر چلا جائے اور وہ اطمینان سے گھر چلا بھی گیا تھا لیکن گھر پر ممانی ریحانہ کو قرار نہ آیا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح اپنے شوہر کی خیریت معلوم ہو جائے کیونکہ جس تیزی سے مرض بڑ تھا وہ انتہائی باعث تشویش تھا۔

بہر حال جب ممانی ریحانہ کی ماموں فرقان سے بات ہوگئی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ دو گھنٹے اندر ہی ان کی کایا پلٹ گئی ہے۔ زخموں سے پانی رِسنا بند ہو گیا ہے، جسم کی بدبو ختم ہو گئی ہے تو ا نے سکون کا سانس لیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

رات بھر ماموں فرقان سکون سے سوئے لیکن دادا غفور شاید ساری رات جاگتے رہے ان کی آنکھ کھلتی وہ دادا غفور کو سامنے چوکی پر بیٹھا پاتے۔ وہ کچھ پڑھ رہے ہوتے۔

جانے دادا غفور کب سوئے۔ وہ رات بھر پڑھ پڑھ کر ماموں فرقان کے جسم پر مارتے رہے۔

صبح کو ماموں فرقان اُٹھے تو بہت ہشاش بشاش تھے۔ اب ان کے جسم پر پڑے داغو دُھندلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ اسی تیزی سے جس تیزی اُبھرے تھے۔

صبح ناشتے کے بعد، ماموں فرقان نے جانا چاہا لیکن دادا غفور نے منع کر دیا، وہ بولے۔ '' جانے کی ایسی کیا جلدی ہے۔ دکان تو تمہارے جائے بغیر بھی کھل جائے گی پھر تمہارے سیلز مین بھی تمہارے بھروسے کے ہیں، اگر جانے کی بہت جلدی ہے تو شام تک چلے جانا۔''

ماموں فرقان، دادا غفور کی ہدایت پر رک گئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ذرا سی غفلت پھر پلٹ آئے۔

سہ پہر کو دادا غفور نے ایک تعویذ ان کے گلے میں لٹکایا۔ ایک گنڈا بازو پر باندھا اور آدھا پڑھا ہوا پانی اُنہیں پلایا پھر بولے۔ ''فرقان اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ میں نے تمہیں کر دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب یہ مرض پلٹ کر نہیں آئے گا۔ ہاں تین دن تک پڑھا ہوا پانی پیتے رہنا۔''

شام تک ان کے جسم کے داغ بہت حد تک غائب ہو گئے۔ بس اب کہیں کہیں ہلکے نشان گئے تھے۔ عرفان، ماموں فرقان کو لینے آیا تو وہ اپنے باپ کی حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ کہاں ا جسم سے بدبو پھوٹ رہی تھی، زخم رِس رہے تھے اور اب ایک ہی رات میں سب کچھ بدل گیا زخم رہے تھے اور نہ بدبو۔ عرفان، ماموں فرقان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

ماموں فرقان اور عرفان ابھی اپنے گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک روح فرسا خبر سننے کو ملی۔

گھر پہنچ کر ماموں فرقان ابھی اپنے گھر والوں کو اپنے بارے میں بتا ہی رہے تھے کہ بیل بجی۔

بیل کی آواز سن کر شمسہ اُٹھنے لگی تو ماموں فرقان نے اسے روک دیا اور عرفان سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیٹے آپ دیکھیں دروازے پر کون ہے؟''

عرفان فوراً ہی اُٹھ گیا۔ اس نے جا کر گیٹ کھولا تو ایک پریشان شخص کو اپنے سامنے پایا۔

''جی فرمائیے۔'' عرفان نے پوچھا۔

''ماموں فرقان گھر پر ہیں جی۔''

''ہاں، ہیں، آپ کا نام۔''

''میرا نام اشفاق ہے۔ میں دکان سے آیا ہوں، ذرا ماموں فرقان کو جلدی بلا دیجئے۔'' اس پریشان شخص نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''اچھا آپ ٹھہریں میں ابھی اُنہیں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عرفان کمرے میں واپس آیا۔

''کون ہے بیٹا؟''

''ابو، کوئی اشفاق ہے کہہ رہا ہے دکان سے آیا ہے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہا ہے۔''

''اشفاق آیا ہے، یہ اس وقت یہاں کیسے آ گیا۔ اللہ رحم کرے۔'' ماموں فرقان اُٹھتے ہوئے بولے۔

''عرفان ذرا تم بھی اپنے ابو کے ساتھ جاؤ۔ دیکھو کیا معاملہ ہے۔ یہ اشفاق کیوں آیا ہے۔'' ممانی ریحانہ نے ماموں فرقان کے کمرے سے نکلنے کے بعد کہا۔

عرفان فوراً اُٹھ کر بھاگا۔

اشفاق، ماموں فرقان کی دکان کا سیلز مین تھا۔ وہ اس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ وہی گھر سے صبح چابیاں لے جا کر دکان کھولتا تھا اور رات کو گھر پہنچاتا تھا۔ ماموں فرقان مشکل سے چار پانچ گھنٹے دکان پر بیٹھتے تھے۔

ماموں فرقان کو دروازے پر دیکھ کر اشفاق کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ وہ بولنا چاہے تو بولا نہ جائے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ماموں فرقان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

عرفان کو پانی لانے کا اشارہ کیا۔

پانی پینے کے بعد اس میں کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ تب ماموں فرقان نے کہا۔ ''ہاں، اب بتاؤ کیا معاملہ ہے، تم اتنے پریشان کیوں ہو۔''

"ماموں، بہت بُرا ہوا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا ہوا۔" ماموں فرقان نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

"ماموں، دکان میں آگ لگ گئی۔"

"آگ لگ گئی۔" ماموں فرقان کے ذہن میں سناٹا اُترنے لگا۔ "مگر کیسے؟"

"بس جی بیٹھے بیٹھے، میں ایک خاتون کو کپڑا دکھا رہا تھا کہ اچانک تھان میں آگ لگ گئی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" اس مرتبہ عرفان بولا۔

"بس جی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے ریشم کے تھان پر ایک شعلہ ضرور گرتے دیکھا تھا اس کے فوراً ہی آگ بھڑک اُٹھی اور آگ اتنی شدید تھی کہ ہم دکان سے ایک تھان بھی نہیں نکال سکے" اشفاق نے بڑے مردہ لہجے میں کہا۔

"پوری دکان جل گئی۔" عرفان نے پوچھا۔

"ہاں جی، پوری دکان جل کر خاک ہوگئی ہے۔"

"تو وہ اپنا کام کرگیا۔" ماموں فرقان نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے نیلم آگئی تھی۔ اس کی غصیلی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "تم لوگوں نے مجھے پانی کا بلبلہ سمجھ لیا ہے کہ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گی۔ میں بہت زبردست جن ہوں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔

"وہ میری دکان میں شعلہ پھینک گیا، تباہی پھیلا گیا، مجھے برباد کرگیا۔" ماموں فرقان آپ ہی آپ بولے چلے جارہے تھے۔ ان کے لہجے میں بڑی اُداسی تھی، بڑی افسردگی تھی۔

ماموں فرقان کی دکان کیا جلی گویا ان کے دل کی دنیا اُجڑ گئی۔ وہ لاکھوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ بینک میں تھوڑی بہت نقدی تھی یا وہ زیورات تھے جو انہوں نے شمسہ کے لئے بنوا کر رکھے تھے۔ اوران کے پاس کچھ نہ تھا، جو تھا وہ اتنا نہ تھا کہ دکان کو پھر سے بھر لیتے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

عرفان نے حوصلہ دیا۔ "ابو جی، آپ فکر نہ کریں، میں بینک سے قرض دلوا دوں گا۔"

بابر نے سنا تو وہ ماموں فرقان کے گھر آیا اس نے تسلی دی۔ "ماموں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو کتنے پیسے چاہئیں مجھے بتائیں۔"

بس یہ اللہ کا کرم تھا کہ وہ جس کے پاس جاتے جو بھی اس حادثے کے بارے میں سنتا فوراً ان کی مدد کے لئے تیار ہو جاتا۔ جن کپڑوں کی ملوں سے ان کا لین دین تھا ان کے مالکوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پریشان نہ ہونے کی تلقین کی اور کپڑا لے جانے کی پیشکش کی۔

پھر بازار والوں نے بھی حوصلہ بڑھایا۔ دکان داروں نے مل کر انہیں ایک موٹی رقم فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ اتنی ڈھیر ساری ہمدردیاں پا کر ماموں فرقان کا حوصلہ دوچند ہوگیا، وہ دکان جلنے کا غم بھول گئے۔

ایک ماہ کے اندر اندر انہوں نے دکان میں نیا رنگ و روغن کرا لیا۔ دکان پہلے سے بھی کہیں خوبصورت نظر آنے لگی۔ کپڑا بھی خوب بھرا ہوا تھا۔

دکان کے افتتاح سے پہلے دادا غفور خود دکان پر آئے اور انہوں نے دو تین گھنٹے بیٹھ کر کچھ پڑھا تھا اور دکان میں چاروں طرف کیلیں جڑ دیں تھی اب یہ دکان ہر طرح کی تخریب کاری سے محفوظ ہوگئی تھی۔

ماموں فرقان کو جو اس نے نقصان پہنچایا تھا، ایک ماہ میں اس کی تلافی ہوگئی تھی۔ دادا غفور نے ماموں فرقان کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا ورنہ اس نے برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

ماموں فرقان پر بس نہ چلنے یا ہونے والے نقصان کو برداشت کر لینے کے بعد اس نے ماموں کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کی ساری توجہ نیلم پر تھی۔

ایک دن نیلم سہ پہر کو سو کر اُٹھی تو اس نے اپنی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے ایک لمبی اور موٹی موم بتی کو روشن دیکھا۔ موم بتی سرخ رنگ کی تھی، اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ اس کے کمرے میں موم بتی کون روشن کر گیا۔

پہلے تو اس نے اُٹھ کر موم بتی کو پھونک مار کر بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی پھونکوں سے نہ بجھی۔ وہ جیسے جیسے پھونک مارتی، موم بتی کی لو ویسے ویسے اور بھڑک اُٹھتی۔ پھر وہ جلتی موم بتی کو چھوڑ کر راشدہ کے پاس پہنچی۔ اسے اپنے ساتھ کمرے میں بلا کر لائی۔

"کیا ہوا، کچھ بتاؤ تو۔" راستے میں راشدہ نے پوچھا۔

"کمرے میں چل کر تم خود دیکھ لو۔" نیلم نے سنجیدگی سے کہا۔

جب راشدہ نے نیلم کے کمرے میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر جلتی موم بتی پر پڑی۔

"ارے، یہ موم بتی یہاں کس نے جلائی۔" راشدہ نے سوال کیا۔

"یہی دکھانے میں تمہیں یہاں لائی تھی۔" نیلم نے کہا۔ "میں سمجھ رہی تھی کہ شاید موم بتی تم نے جلائی ہو۔"

"نہیں، مجھے نہیں معلوم کہ یہ موم بتی کہاں سے آئی۔ اسے بجھا تو دو۔" یہ کہہ کر راشدہ آگے بڑھی۔

اس نے پہلے تو آہستہ سے ایک پھونک ماری۔ اس پھونک سے موم بتی کی لو محض جھلملا کر رہ گئی۔ پھر راشدہ نے ذرا زور سے پھونک ماری۔ اس کے بعد اس نے دو تین پھونکیں متواتر ماریں لیکن جلتی موم بتی نہ بجھی۔ اس کی ہر پھونک پر موم بتی کی لو بھڑک کر رہ جاتی۔

"رہنے دو مت بجھاؤ۔" نیلم نے کسی انجانے خوف سے لرز کر کہا۔

''امی سے پوچھیں چل کر۔''

''ہاں چلو۔''

صابرہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو نیلم کے کمرے میں کسی نے موم بتی روشن کردی ہے اور پھونک مارنے سے بھی نہیں بجھ رہی ہے تو وہ سہم گئی۔ اب وہ ایسی باتوں سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ کمرے میں نہ گئی۔ اس نے نیلم سے کہا۔ ''بیٹی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر آؤ، بابر اور اکبر آجائیں پھر دیکھیں گے۔''

''خالہ آپ تو راشدہ سے بھی زیادہ ڈرنے لگی ہیں۔'' نیلم نے ہنس کر کہا۔

''ہاں بیٹی، ان باتوں سے ڈرنا ہی چاہئے، تجھے معلوم نہیں اس نے میرا کیا حشر کیا تھا، پھر مامو فرقان کے ساتھ کیا ہوا۔'' صابرہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ ''توبہ میری۔''

''خالہ، وہ ایک موم بتی ہے جو جل رہی ہے۔''

''موم بتی ہے تو بجھانے سے بجھتی کیوں نہیں۔'' صابرہ نے چمک کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اچھی والی موم بتی ہے اسے بجھانے کے لئے زوردار پھونک چاہئے۔''

''وہ موم بتی تمہاری سنگھار میز پر رکھی کس نے اور جلائی کیوں۔'' صابرہ نے پھر سوال کیا۔

''ہاں، یہ سوال آپ کا بجا ہے، یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔ اکبر بھی گھر میں نہیں ہیں ان پر شبہ کر لیا جاتا کہ شاید انہوں نے رکھی ہو۔''

''اکبر اور بابر تو صبح کے نکلے ہوئے ہیں۔''

''آؤ راشدہ ذرا دوبارہ چل کر دیکھتے ہیں کہ موم بتی بجھ گئی یا جل رہی ہے۔''

''نیلم آپ کو ڈر نہیں لگ رہا۔''

''موم بتی سے کیا ڈرنا۔''

''جانے وہ کس نے رکھی ہو۔''

''کسی نے بھی رکھی ہو؟ ہے تو موم بتی۔'' نیلم نے خلاف توقع بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں ہوں جا کر۔''

صابرہ اور راشدہ نے اسے جانے سے روکنا بھی چاہا مگر روک نہ سکیں۔ دونوں کی ز گنگ ہو گئیں۔

نیلم بڑے اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف چلی۔

جب اس نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا تو حیران رہ گئی۔

واہ کیا مسحور کن خوشبو تھی۔

ایسی خوشبو کہ دماغ تک معطر ہو جائے، روح سرشار ہو جائے، جسم جھومنے لگے، رقص میں آجائے، یہ حسین خوشبو اس موم بتی سے آرہی تھی جو اب بجھ چکی تھی۔ اس بجھی ہوئی شمع سے اگر بتی کی لرح دھواں اُٹھ رہا تھا اور خوشبو پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔

اس سحر انگیز خوشبو نے نیلم پر ایسا جادو کیا کہ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کمرے میں کیوں آئی تھی۔ کیا دیکھنے آئی تھی۔

نیلم ابھی سنگھار میز کے قریب ہی پہنچی تھی کہ کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ نیلم نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ اُلجھن کا شکار ہوئی نہ ڈری۔ اس کے دل و دماغ پر بس خوشبو نے بسیرا کر لیا تھا۔

وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ بے خود ہوئی جاتی تھی اس پر نشہ سا طاری تھا۔ کیف آگیں لمحات اس کے دل پر ساون بھادوں کی طرح برس رہے تھے۔

وہ نشے میں جھومتی ہوئی بیڈ کی طرف بڑھی اور اس پر شہزادیوں کی طرح نیم دراز ہو گئی۔

سنگھار میز کے شفاف آئینے میں اسے اپنا پورا سراپا نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی قاتل آنکھوں ے خود کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک حسین دوشیزہ تھی لیکن اس وقت وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس قدر سین کہ اس کا جی چاہا کہ وہ اُٹھے اور اپنے آپ کو چوم لے۔

پورے کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں بھر چکا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اس دھویں سے دَم نہیں گھٹ رہا تھا بلکہ یہ جی چاہ رہا تھا کہ لمبے لمبے سانس لے کر اس دھویں کو زیادہ سے زیادہ اپنے سینے میں اُتار لیا جائے۔

آئینہ دیکھتے دیکھتے نیلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آئینے میں ہے۔ وہ جو بھی تھا سفید ریشمی لباس میں تھا اور بہت پُرکشش تھا۔

نیلم پر سرشاری طاری تھی، اس نے اپنی نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔ اسے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا وہ کون ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن اُدھر کوئی نہ تھا۔

نیلم نے پھر آئینے کی جانب دیکھا، وہاں وہ موجود تھا اس مرتبہ وہ نیلم کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔

نیلم نے پھر پلٹ کر دیکھا، پیچھے کوئی موجود نہ تھا اور جب دوبارہ آئینے پر نظر ڈالی تو وہ وہاں کھڑا تھا وہ جو کوئی بھی تھا صرف آئینے کے اندر تھا، کمرے میں موجود نہ تھا۔

کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا، کمرے کے گوشے گوشے میں خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بڑا خواب آگیں ماحول تھا۔ اس دل موہنے والے ماحول میں کوئی پس منظر میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا دھندلا وجود دماغ پر چھا رہا تھا۔

نیلم نے آئینے پر نظریں گاڑ دیں۔ تب اس بت کافر نے جنبش کھائی۔ وہ آئینے میں آگے کی طرف

بڑھا، اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی اور کالی سیاہ آنکھوں میں ہیرے کی چمک تھی۔ وہ آئینے سے اس طرح نکلا جیسے کوئی دروازے سے نکلتا ہے۔

وہ آئینے سے نکل کراب بالکل اس کے مقابل آ گیا۔

وہ چھ فٹ کا ایک پُروقار مرد تھا۔ سر پر سفید صافہ، گلے میں سچے موتیوں کی مالا، صافے پر دمکتا ہیرا، چہرے کے یونانی نقوش، وہ کسی ملک کا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔

نیلم نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی، ایسا حسین مرد اس نے اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کی وجاہت میں گم ہو گئی۔ اس کی پُرکشش اور پُروقار شخصیت میں کھو گئی۔

وہ اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی، وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی، پتھر کی ہو گئی تھی۔

''کیا بات ہے، مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گی۔'' شہزادہ بولا۔ وہ بولا کیا یوں سمجھو کہ دور تک گھنٹیاں بجتی چلی گئیں۔ ایسی سحر انگیز آواز اس نے کاہے کو سنی تھی۔

''جی۔'' وہ ایک دَم چونک اُٹھی۔ اس کی محویت ٹوٹی تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس جوان رعنا کی سحر انگیز شخصیت میں کھو گئی تھی۔ اسے شرم آئی اسے اپنی محویت پر بڑی ندامت ہوئی۔ وہ لڑکی ہو کر اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے لڑکے لڑکی کو دیکھتے ہیں۔

''جی کیا؟'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گی۔''

''ہاں آپ بیٹھیے نا۔'' نیلم نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کہاں بیٹھوں؟'' اس نے پوچھا، اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''وہ کرسی لے لیجیے۔'' نیلم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے دیوار سے لگی کرسی کو پکڑ کر اُٹھایا اور بیڈ کے نزدیک لا کر رکھ دی۔ پھر وہ کسی شہزادے کی طرح اس پر بیٹھ گیا، بڑی تمکنت، بڑی شان سے۔

''کون ہیں آپ؟'' نیلم نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

''مجھے جانتی نہیں؟'' شہزادے نے تھوڑی سی حیرت سے کہا۔

''نہیں...... جانتی ہوتی تو میں پوچھتی کیوں۔'' نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

''میرے بارے میں جاننا چاہتی ہیں؟'' شہزادے نے سوال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ہوں۔'' نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیوں آخر؟'' پھر سوال ہوا۔

''مجھے نہیں معلوم کیوں، لیکن میں جاننا چاہتی ہوں۔'' نیلم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا

''میں آپ کو اچھا لگا ہوں۔'' شہزادے نے اپنی چمکتی آنکھوں سے نیلم کو دیکھا۔

''شاید۔'' نیلم نے سحر زدہ انداز میں کہا۔

''کیا واقعی؟'' یہ سن کر شہزادہ ایک دَم کھل اُٹھا۔ ''میں بڑا خوش نصیب ہوں۔''

''کیوں اس میں خوش نصیبی کی کیا بات ہے؟''

''اصل میں، میں آپ کے سامنے ڈرتا ڈرتا آیا تھا، جانے کیا ہو، آپ کہیں مجھے ناپسند نہ کر دیں۔ کہیں نفرت سے منہ نہ پھیر لیں۔''

''میں آپ سے نفرت کیوں کروں گی بھلا۔''

''میرے دل میں بس ایک خوف سا تھا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اب تو وہ خوف آپ کے دل میں نہ رہا۔''

''نہیں، اب نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' نیلم نے پوچھا۔

''میرا نام قرل ہے۔''

''یہ کیا نام ہوا بھلا؟'' نیلم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''پسند نہیں آیا۔'' وہ بولا۔

''کچھ عجیب سا ہے، کیا معنی ہوئے بھلا اس کے۔'' نیلم نے ملائمت سے کہا۔

''آپ کی دنیا میں سب سے زیادہ کیا چیز چمکتی ہے۔''

''میری دنیا میں۔'' نیلم نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولی۔ ''سورج۔''

''قرل کے معنی سورج ہی کے ہیں آپ ٹھیک سمجھیں۔''

''میں نے اس طرح کا نام پہلی بار سنا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں، آپ کی دنیا میں اس طرح کے نام کہاں ہوتے ہیں۔''

''یہ آپ میری دنیا، میری دنیا کیا کر رہے ہیں، کیا آپ اس دنیا کے نہیں ہیں؟''

''نہیں، میں اس دنیا کا نہیں ہوں لیکن آپ کی دنیا میں بسنا ضرور چاہتا ہوں۔''

''میری دنیا میں بسنا چاہتے ہیں۔'' نیلم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میری دنیا میں بسنا تھا تو پہلے آئے ہوتے۔''

''کیوں اب کیا ہوا؟''

''میری دنیا بس چکی ہے، میری شادی ہو چکی ہے۔'' نیلم نے وضاحت کی۔

''ہاں، میں جانتا ہوں لیکن میں اس شادی کو مانتا نہیں، ویسے آپ نے شادی کرنے میں بہت

جلدی کی، میرا انتظار بھی نہ کیا۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ آئیں گے۔'' وہ کیا کہہ رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا۔

''اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آؤں گا تو آپ میرا انتظار کرتیں۔''

''شاید۔'' نیلم نے اپنی مخمور نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''یہ بات آپ یقین سے نہیں کہیں گی، خیر آپ اقرار کریں نہ کریں لیکن میں اپنی محبت کا اقرا کرتا ہوں۔'' شہزادے نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو کب سے جانتا ہوں۔''

''نہیں مجھے معلوم نہیں۔''

''میں نے آپ کو پہلی بار سیّد پور کی ایک گلی میں دیکھا تھا۔ آپ کی حسین صورت دیکھ کر میں اپ آپ میں نہ رہا۔ آپ کی دلکش چال کو دیکھ کر میں اپنا آپ بھول گیا، آپ کی زلف کا اسیر ہو گیا۔''

''لیکن آپ تو مجھے سیّد پور میں کہیں نظر نہیں آئے۔''

''میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا، آپ کے بہت قریب لیکن آپ نے توجہ ہی نہ دی۔'' اس شکوہ کیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ مجھے نظر آتے اور میں آپ کو نظر انداز کر دیتی، آپ اتنے خوب صور شخص ہیں کہ دُنیا کی کوئی لڑکی آپ کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔''

''کبھی اپنے بارے میں بھی غور کیا ہے۔''

''میں تو ایک معمولی سی لڑکی ہوں، ایک عام سی۔''

''آپ نے مجھے محصور کیا ہے اور مجھے حصار میں لینے والی لڑکی کبھی عام نہیں ہو سکتی۔ نیلم تم بہ خوب صورت ہو، تم میرے دل میں بس چکی ہو، تمہیں اب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تمہیں اب کو نہیں چھو سکتا۔'' قرل آپ سے تم پر آ گیا۔ اس نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔

نیلم کو اپنا نام سن کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ وہ اپنی پلکوں کا شامیانہ اُٹھا کر بولی۔ ''آپ میرے نا سے بھی واقف ہیں۔''

''میں نے کہا نا کہ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔''

''حیرت ہے۔ آپ چھ ماہ سے میرے ساتھ ہیں اور کبھی نظر نہیں آئے۔''

قرل ابھی جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔

دستک کی آواز سن کر وہ کھڑا ہو گیا اور پھر آئینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا نیلم اب ہم چلتے ہیں، جاتے جاتے میں اپنی محبت کی شمع جلائے جاتا ہوں۔ وہ دیکھو۔'' یہ کہہ کر قرل نے

ہاتھ اُٹھایا۔

اس کا ہاتھ اُٹھتے ہی سنگھار میز پر رکھی ہوئی موم بتی جل اُٹھی۔

''یہ موم بتی میں نے یہاں رکھی تھی۔ یہ میری محبت کی مظہر ہے اس شمع کو کوئی نہیں بجھا سکتا، جس طرح تمہاری محبت کو کوئی میرے دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس شمع کو کمرے سے باہر نہ لے جانا۔ اسے بجھانے کی کوشش نہ کرنا، یہ شمع محبت میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روشن کر دی ہے۔''

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں، پھر ملیں گے۔'' یہ کہہ کر قرل آئینے کی طرف بڑھا اور آئینے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلم دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

دروازے پر اکبر کھڑا تھا۔

نیلم، اکبر کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں عجیب پراسراریت تھی۔ اکبر مسکراہٹ کی اس تبدیلی کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت نیلم کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

نیلم نے اکبر کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا۔ وہ اندر آیا اور بولا۔ ''یہ خوشبو کیسی ہے، بڑی مسحور کن ہے۔''

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''نیلم تم کمرے میں موم بتی دیکھنے آئی تھیں، پھر یہیں رہ گئیں، تم نے دروازہ بھی بند کر لیا، کیا کر رہی تھیں دروازہ بند کر کے۔'' اکبر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کب آئے شوروم سے۔'' نیلم نے اس کے سوال کا جواب گول کر کے اپنا سوال کر دیا۔

''ابھی آیا ہوں، گھر آیا تو موم بتی کا قصہ معلوم ہوا۔ تمہارے بارے میں، میں نے پوچھا تو امی نے بتایا کہ تم کمرے میں ہو، میں یہاں آیا تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔'' پھر اس کی نظر موم بتی پر پڑی۔

''ارے یہ تو جل رہی ہے۔''

''ہاں اکبر، یہ اب جلتی رہے گی، اسے اب کوئی نہیں بجھا سکتا ہے۔'' نیلم نے عجیب لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب نیلم، میں سمجھا نہیں۔'' اکبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''میں نے کہا ہے اس شمع کو اب کوئی نہیں بجھا سکتا، یہ جلتی رہے گی۔''

''میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا بات ہوئی بھلا، یہ موم بتی ہے۔ آخر کتنی دیر جلے گی، گھنٹے، دو گھنٹے، اس کے بعد خود بخود بجھ جائے گی، لیکن تم کہہ رہی ہو کہ یہ جلتی رہے گی۔'' اکبر نے کہا۔

''نہیں یہ عام موم بتی نہیں ہے۔'' نیلم پراسرار لہجے میں بولی۔

"اسے لایا کون، یہ سنگھار میز پر آئی کس طرح، کچھ پتہ چلا۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے سب معلوم ہوگیا ہے۔"

"ذرا مجھے بھی بتاؤ۔" اکبر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں کچھ بتا نہیں سکتی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" نیلم نے تشکیک بھرے لہجے میں کہا۔

"نیلم تم آج کیسی بہکی بہکی بات کر رہی ہو، تمہیں کیا ہوگیا۔"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نیلم نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا۔" اکبر نے طنزیہ انداز میں کہا اور خاموشی سے موم بتی کی طرف بڑھا۔

موم بتی کے قریب پہنچ کر اس نے اس کا معائنہ کیا۔ وہ تقریباً ایک فٹ لمبی تھی۔ گولائی دو انچ رہی ہوگی۔ اس کا رنگ سرخ تھا، وہ کافی دیر سے جل رہی تھی لیکن ایک قطرہ موم بھی نہیں پگھلا تھا۔

اس نے جھک کر پھونک ماری، پہلے آہستہ سے، پھر زور سے لیکن موم بتی کا کچھ نہ بگڑا۔ اس کی لو پھونک کے ساتھ جھلملائی اور پھر سیدھی ہوگئی۔

اکبر کو بڑی حیرت ہوئی پھر اس نے لگاتار جلدی جلدی پھونکیں ماریں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات والا نکلا۔ پھونکوں سے وہ شمع بجھائی نہ گئی۔

اکبر اب سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس نے نیلم کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اکبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نشے میں ہے۔ اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ نیلم کے قریب آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ نیلم غیر ارادی طور پر تھوڑا سا پرے کھسک گئی۔

"نیلم یہ سب کیا ہے۔ تم بولتی کیوں نہیں۔" اکبر کے لہجے میں بڑی اُلجھن تھی۔

"کیا بولوں، اکبر میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس شمع کو اب کوئی نہیں بجھا سکے گا۔" نیلم نے بڑے یقین سے کہا۔

"میں اسے بجھا کر چھوڑوں گا۔" اکبر کو بھی غصہ آ گیا۔

"تو پھر اور کوشش کر دیکھو۔" نیلم نے اسے چیلنج کیا۔

"ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر کمرے سے نکل گیا۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں گیا وہاں سے اسٹیل کی ایک پلیٹ اٹھائی اور فوراً واپس کمرے میں آ گیا۔

راشدہ اور صابرہ نے اسے پلیٹ لے جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہولیں۔

اکبر نے سنگھار میز کے قریب پہنچ کر وہ اسٹیل کی پلیٹ اس موم بتی کے اوپر رکھ دی، چند سیکنڈ کے بعد اُٹھائی تو دبی ہوئی لو پھر سیدھی ہوگئی۔ موم بتی بدستور جلتی رہی پھر اس کی نظر اسٹیل کی پلیٹ پر پڑی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پلیٹ میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوگیا تھا۔ موم بتی کی لو اس قدر تیز تھی کہ

چند سیکنڈوں میں اس نے اسٹیل کو پگھلا کر رکھ دیا۔

اکبر نے چاہا کہ اس پلیٹ کو موم بتی پر کھینچ مارے لیکن صابرہ نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھبرا کر بولی۔ "نہیں بیٹا، ایسا مت کرنا اگر یہ موم بتی پلیٹ لگنے کی وجہ سے سنگھار میز پر گر گئی تو یاد رکھو سنگھار میز جل کر راکھ ہو جائے گی، پورا گھر آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔"

"پھر امی میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک آتا ہوں۔" اکبر غصے میں بولا۔

"نہیں۔" نیلم ایک دم تڑپ کر بولی۔ "اس موم بتی کو کمرے سے باہر نہ لے جانا۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"کیوں۔" اکبر نے حیرت سے نیلم کو دیکھا۔ "کیا ہو جائے گا؟"

"کچھ نہیں معلوم کیا ہو جائے۔" نیلم کانپ اُٹھی۔

"کیا عورتوں والی بات کرتی ہو۔" اکبر نے قدرے غصے سے کہا۔ "میں ابھی اسے اُٹھا کر باہر پھینکتا ہوں۔"

"رہنے دو اکبر، جب نیلم منع کر رہی ہے تو مان جاؤ۔" اس مرتبہ صابرہ نے کہا۔ وہ لرز رہی تھی۔

"ارے امی کیا بات کرتی ہیں، آپ بھی نیلم کی باتوں میں آ گئیں۔ یہ موم بتی ہے کوئی سانپ تو نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے موم بتی اُٹھانے کے لئے ہاتھ میں پکڑ لی۔

پھر وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی اُنگلیاں بری طرح جھلس گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے موم بتی نہ پکڑی ہو کوئی لال انگارہ سلاخ پکڑی ہو۔

اس کی اُنگلیاں اس بری طرح جلی تھیں کہ اُنگلیوں کی چربی تک دکھائی دینے لگی تھی۔ شدید جلن ہو رہی تھی، اکبر کمرے سے باہر نکل آیا۔ صابرہ نے دواؤں کی الماری سے ایک ٹیوب نکالی اور مرہم اس کی اُنگلیوں پر مل دیا۔ مرہم لگانے کے بعد بھی کافی دیر تک جلن نہ گئی۔ اکبر پورے گھر میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اسے کسی کل چین نہ تھا، پھر بہت دیر بعد اس کی جلن کم ہوئی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ صبح تک اس کی اُنگلیوں کے زخم بالکل ٹھیک ہوگئے۔

اس واقعے کے بعد پھر کسی نے موم بتی کو ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کی۔ اسے بجھانے کی کوشش نہ کی گئی۔ وہ سنگھار میز پر رکھی دن رات جلتی رہی۔ جلنے کے باوجود وہ پگھلی، نہ چھوٹی ہوئی۔ جیسی پہلے دن تھی ویسی ہی رہی۔ سید پور کے جن نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ شمع میری محبت کی مظہر ہے، اسے کوئی نہیں بجھا سکتا اور واقعی اسے کوئی نہیں بجھا سکا۔

ماموں فرقان بھی نہیں۔

جب سے ماموں فرقان کا عمل ناکام ہوا تھا اور وہ کوڑھ میں مبتلا کر دیئے گئے تھے اور ان کی دکان کو

جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا تب سے وہ کچھ سہم سے گئے تھے۔ موم بتی کا پتہ چلنے پر وہ گلشن آئے ضر
لیکن وہ حالات و واقعات سن کر اور موم بتی کو دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے یہی مشورہ
کہ اس شمع کو نہ چھیڑو تمہارا کیا لیتی ہے اسے جلنے دو۔

تب سے گھر کے ہر فرد نے اس موم بتی کو اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔

اس حیرت انگیز موم بتی کو ماموں فرقان کے علاوہ خاندان کے کسی اور فرد نے نہ دیکھا۔ گھر و
نے اور کسی کو یہ بات بتائی بھی نہ تھی کہ خواہ مخواہ تماشا بنے گا۔ اگر کوئی خاندان کا فرد گھر آتا، پاس پ
کے یا ملنے جلنے والے دوست احباب آتے تو اس بیڈروم کو بند کر دیا جاتا۔

جب سے اس بیڈروم میں شمع روشن ہوئی تھی نیلم کی کیفیت بدل گئی تھی۔

اب وہ زیادہ تر اس بیڈروم میں ہی رہتی تھی، ناشتہ کر لیا، بیڈروم میں آ گئی، کھانا کھا لیا پھر بیڈ
میں آ گئی، رات کو تھوڑی بہت دیر ٹی وی دیکھا اور پھر بیڈروم کا رُخ کیا۔

ایک تبدیلی اور اس میں آئی تھی۔ اس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ بیڈروم سے بھاگتی تھی۔ را
کو صابرہ کے پاس سوتی تھی، بیڈروم میں اکبر تنہا سوتا تھا لیکن اب وہ دن بھر بیڈروم میں گھسے ا
چاہتی تھی۔ رات کو البتہ وہ صابرہ کے ساتھ سو جاتی تھی۔

لیکن جس دن سے اس کمرے میں شمع روشن ہوئی تھی اس رات سے اکبر وہاں نہ سو سکا تھا۔

اس رات اکبر کا ہاتھ جلا ہوا تھا، ویسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

کوئی بارہ بجے کے قریب اسے ''میاؤں'' کی خوفناک آواز آئی۔ وہ لحاف میں سٹ کر رہ گیا
کسی نے اس کے جسم سے لحاف اُتار لیا۔ لحاف دُور قالین پر گرا۔

اکبر نے جب کروٹ لے کر لحاف کی طرف دیکھا تو وہ کانپ اُٹھا۔ وہ خوفناک کالا بلا لحاف
اندر سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے گدھے کے برابر ہو گیا پھر اس نے غرا کر اکبر کی طرف دیکھا او
اگلی دونوں ٹانگیں جھکا کر اس نے اکبر پر جست لگانے کے لئے پر تولے۔

اکبر کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ گرتا پڑتا کمرے سے نکل بھاگا۔ اس رات کے بعد سے اکبر کی ا
بیڈروم میں سونے کی ہمت نہ ہوئی۔

اب رات کو وہ بیڈروم خالی رہنے لگا۔ نیلم، صابرہ اور راشدہ اکٹھا ایک کمرے میں سوتیں۔ ا
گیسٹ روم میں سوتا اور بابر اپنے کمرے میں۔

ایک دن دوپہر کا کھانا کھا کر نیلم کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے بیڈروم میں آ کر لیٹی تو ا
کے لیٹتے ہی کمرے میں مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اس خوا
سے رُوح تک معطر ہو جاتی تھی، جسم و جان پر ایک کیف سا چھا جاتا تھا۔

اس خوشبو کے ساتھ ہی اس کمرے میں ہلکا ہلکا دُھواں پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ چونک پڑی یہ تو کسی کے آنے کی علامات تھیں۔ اس نے گھوم کر سنگھار میز کے آئینے کی طرف دیکھا وہاں وہ موجود تھا۔

نیلم فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ دھیرے دھیرے آئینے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ زرق برق لباس پہنے تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا چمک رہی تھی۔ آج وہ صافہ باندھے ہوئے نہ تھا۔ اس کے سنہری گھنگھریالے بال سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر سرخ رنگ کی ایک پٹی بندھی تھی۔ اس پٹی کے درمیان ایک بڑا سا ہیرا اٹکا ہوا تھا۔

وہ شہزادوں کی طرح قدم اُٹھاتا اس کے بیڈ کے نزدیک آ گیا۔ نیلم نے فوراً لحاف سمیٹ لیا۔ اس کے بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔

''شکریہ۔'' اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آئی۔ اس نے اپنی چمکتی آنکھوں سے نیلم کو دیکھا پھر وہ اس کے مقابل بیڈ پر بیٹھ گیا۔

وہ اس قدر حسین لگ رہا تھا کہ نیلم کوشش کے باوجود اس پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔

''اب مجھ سے ڈر تو نہیں لگتا؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' نیلم نے فوراً کہا۔ ''ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا۔''

''اچھا۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

''آپ کئی دن کے بعد آئے ہیں۔'' نیلم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میرا انتظار تھا آپ کو؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر میں کہوں ہاں تو؟''

''تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''اور اگر میں کہوں نا؟''

''تو میں انتظار کروں گا، اس وقت کا جب تم میرا انتظار کرو گی۔''

''قزل، تم کون ہو؟''

''تم نے میرا نام لیا، مجھے تم کہا، یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔''

''لیکن میرا سوال گم ہو گیا۔''

''تمہارا کچھ گم نہیں ہوگا، گم تو میں ہوا ہوں، اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہوں، جب سے تمہیں دیکھا ہے، تب سے میں تمہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اور کچھ نظر نہیں آتا۔''

"قرل میں نے پوچھا کہ تم کون ہو۔" نیلم نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"نیلم میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں، میں پھر بتاتا ہوں میں ایک جن ہوں۔ ایک انسان۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"یہ بھی میں تمہیں بتا چکا ہوں، میں تمہیں چاہتا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ تم میرے سا بیٹھی رہو، میں تمہیں دیکھتا رہوں، دیکھتا رہوں، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نیلم نے پریشان ہو کر کہا۔

"میری دُنیا میں سب کچھ ممکن ہے، ہاں تمہاری دُنیا کی میں نہیں جانتا۔" قرل نے بڑے یٗ سے کہا۔

"میں چاہوں بھی تو ممکن نہیں۔" نیلم نے اپنی دُنیا کی بات کی۔

"تم چاہو گی تو سب کچھ ممکن ہو جائے گا تم چاہو تو۔" قرل نے راہ دکھائی۔

"میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، میرا شوہر ہے، میرے گھر والے ہیں اور......" نیلم کی با ادھوری رہ گئی۔

"تم یہ بھول جاؤ کہ تم شادی شدہ ہو، تم نے دیکھا کہ شادی کر کے اکبر کو کیا ملا اور اسے کچھ بھی نہیں۔ وہ تمہیں چھو بھی نہیں سکتا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ نیلم، تمہارے اور اپنے درمیان کسی تیسرے آدمی کا وجود برداشت نہیں کروں گا۔ یہ بات اپنے ذہن اچھی طرح بٹھا لو۔" قرل نے اسے سمجھایا۔

"میں کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" نیلم اُلجھن کا شکار ہو گئی۔

"بس جیسا میں کہوں ویسا کرتی جاؤ، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"میرا شوہر اور میرے گھر والے؟" نیلم اپنے شوہر اور گھر والوں کے لئے پریشان تھی۔

"سب محفوظ رہیں گے، اس وقت تک جب تک وہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کریں گے نیلم میرا راستہ روکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جن لوگوں نے میری راہ میں آنے کی کوشش کی، ان کا انجا بھی تم دیکھ چکی ہو۔" قرل نے صاف لہجے میں اسے بتایا۔

"مجھے اب اپنے انجام کی فکر ہے، میرا کیا ہوگا۔" نیلم نے فکر مندی سے کہا۔

"انجام کی فکر کسے ہے، محبت کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، محبت اندھی ہوتی ہے اسی لئے وہ انجا کی پروا نہیں کرتی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، مجھے انجام کی فکر نہیں ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا، م تو بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری دُنیا والے میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ وہ مجھ سے تمہیں نہ چھین پائیں

ے۔" قرل نے بڑے یقین سے کہا۔

قرل اپنی کہہ رہا تھا، نیلم اپنی سنانا چاہتی تھی لیکن وہ سن نہیں رہا تھا تب نیلم خاموش ہو گئی۔ وہ وشی سے قرل کو دیکھتی رہی۔ قرل اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

پھر وہ مسکراتا ہوا اُٹھا اور آئینے میں غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلم لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی اور چھت کو گھورنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک یب کشمکش جاری تھی۔ چھت کو گھورتے گھورتے اس کی آنکھوں میں نیند اُتر آئی۔ وہ سو گئی۔

ایک دن سب لوگوں نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا۔

اکبر کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ نیلم سے شادی کی اس کو بے انتہا خوشی تھی۔

شادی کے بعد اس نے ایک ماہ کے لئے ہنی مون پر جانے کا پروگرام تیار کر لیا تھا لیکن اس کے ارے پروگرام خاک میں مل گئے تھے ہنی مون تو دُور کی بات تھی، ابھی اس کی زندگی میں سہاگ ات تک نہ آئی تھی۔ کراچی آتے ہی دہشت زدگی کے پے در پے واقعات پیش آئے تھے۔ اس رح کے واقعات کا تو لاہور جاتے ہوئے ہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو آج تک جاری تھا۔

پچھلے دو، چار دنوں سے کچھ گھر میں امن و امان تھا، جب سے گھر میں شمع روشن ہوئی تھی، تب سے ھ سکون ملا تھا البتہ نیلم بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت گم صم بیٹھی رہتی تھی۔ کوئی اگر کچھ کہتا تو را دیتی۔

تب اکبر نے پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔

ماموں کا گھرانہ اور بابر کے گھر والے اس پکنک میں شامل تھے۔ ایک کوسٹر کرائے پر لے لی گئی۔

شتے کے فوراً بعد ہی یہ لوگ گھر سے نکل گئے۔ آج سردی زیادہ نہ تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دیاں رخصت ہو گئی ہوں۔ کراچی کا موسم محبوب کے مزاج کی طرح ہے، جانے کس وقت بدل ائے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مندر کے کنارے ایک ہٹ کرائے پر لے لی گئی۔ چھٹی کا دن تھا، آہستہ آہستہ رش بڑھتا گیا۔

نیلم شادی سے پہلے جب کراچی آئی تھی تو وہ سمندر پر گئی ضرور تھی لیکن نہائی نہیں تھی۔ جانے کیوں ں مچلتی لہروں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

لیکن اس دن اکبر نے اس کے دل سے سمندر کا خوف دُور کر دیا۔ اس نے راشدہ، شمسہ اور نیلم کو پنے ساتھ لیا اور سمندر کی طرف بڑھ گیا۔ نیلم سمندر میں اُترنے سے جھجکنے لگی تو راشدہ اور شمسہ نے س کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور وہ اسے کھینچتی ہوئی سمندر میں لے گئیں۔

نیلم کا خیال تھا کہ سمندر کا پانی ٹھنڈا ہوگا لیکن ایسا نہ تھا۔ سمندر کا پانی گرم تھا، جب سمندر کی ایک

بڑی لہر کنارے کو چھوکر واپس ہوئی تو نیلم کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔اس نے
ماری، سمندر میں اُترنے کا نیلم کا پہلا تجربہ تھا۔اس کی چیخ سن کر راشدہ اور شمسہ نے خوب مذا
اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔تھوڑی دیر میں نیلم لہروں کی عادی ہوگئی۔وہ بھی شمسہ اور راشدہ کی طر
سے کھیلنے لگی۔

اکبر کو سمندر کی لہروں سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی۔وہ اس کے نزدیک ہی
اس نے آگے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔''آؤ نیلم آگے چلو۔''

نیلم نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔وہ کچھ سوچ کر خوف سے کانپ اُٹھی تھی
نے گھبرا کر کہا۔''اکبر خدا کے لئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔''

لیکن اکبر پر جیسے جنون طاری ہوگیا تھا۔اس نے نیلم کا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔وہ اس
ہوالے جا رہا تھا۔آگے ہی آگے۔

یہاں تک کہ سمندر کی ایک بڑی لہر ان کے سروں پر آ پہنچی۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بڑی لہر نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔لہر اتنی پُرزور
اکبر کے ہاتھ سے نیلم کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

جب وہ لہر واپس گئی تو اکیلا اکبر سمندر میں کھڑا ہانپ رہا تھا۔

نیلم کا کہیں پتہ نہ تھا۔

''ہائے، میری بچی۔'' صابرہ نے نیلم کو سطح آب پر نہ پا کر اپنا دل تھام لیا۔

صابرہ اور ریحانہ ممانی سمندر کے کنارے پتھروں پر بیٹھی تھیں۔وہ سمندر کی لہروں کا دُور ہی
نظارہ کر رہی تھیں۔اُنہیں سمندر میں نہانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔وہ اس وقت نیلم اور اکبر کے بار
میں باتیں کر رہی تھیں۔بابر اور ماموں فرقان کنارے کے قریب ہی پانی میں بیٹھے تھے۔ان
آگے راشدہ اور شمسہ تھیں جو ایک دوسرے پر پانی اُچھال رہی تھیں۔

پانی میں سب سے آگے نیلم اور اکبر تھے۔

جب اکبر، نیلم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمندر میں آگے کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا تو یہ منظر گھر کے س
افراد دیکھ رہے تھے۔

ماموں فرقان نے اسے زیادہ آگے جانے سے آواز لگا کر منع بھی کیا تھا۔''اکبر زیادہ آ
مت جاؤ۔''

مگر اکبر نے ماموں فرقان کی بات سنی کہاں تھی۔اس پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔وہ نی
کو کھینچتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔شاید وہ نیلم کو لے کر سمندر کی لہروں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔

سمندر کی ایک بڑی لہر نے ایک جھٹکے سے انہیں جدا کر دیا۔اکبر کے پاؤں زمین سے اُکھڑ گئے۔
لہر کے ساتھ بہہ گیا۔اس کے کانوں اور آنکھوں میں پانی بھر گیا۔اس نے بڑی مشکل سے اپنے
م ریت پر جمائے اور اپنی آنکھوں کا پانی جھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ کیا ہوا، اس کا دماغ مختل ہوگیا پھر جب اسے یاد آیا تو وہ
بے قرار ہو کر اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔

وہ جس کا ہاتھ اس نے تھاما تھا، وہ اب کہیں نہیں تھی۔

ماموں فرقان کی آوازیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں۔''اکبر، اکبر واپس آجاؤ، ایک خوفناک لہر
ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔'' اکبر نے ماموں فرقان کی آواز پر سامنے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو واقعی
یک اونچی لہر اس کی طرف آ رہی تھی لیکن اکبر نے اس کی پروانہ کی۔وہ مضبوطی سے اپنے قدم جمائے
کھڑا رہا۔اسے کسی لہر کی فکر نہ تھی۔وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیلم کو تلاش کر رہا تھا۔

اونچی نیچی لہروں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔نیلم کہیں نظر آئے اور وہ اس کی طرف لپکے۔

اس بڑی لہر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی ماموں فرقان، اکبر تک پہنچ گئے تھے اور اسے کھینچتے
ہوئے کنارے کی طرف لے آئے۔

''ماموں، مجھے چھوڑ دیجئے آپ کو معلوم نہیں کہ نیلم ڈوب گئی ہے۔''

''اکبر ہوش میں آؤ، سمندر اس وقت بہت بپھرا ہوا ہے تم اچھے تیراک بھی نہیں ہو، ڈوب جاؤ
گے۔'' ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

خواتین کے چیخنے چلانے پر کئی مرد جو کنارے پر نہا رہے تھے، اس طرف بھاگے جہاں نیلم کو لہر نے
ہڑپ کر لیا تھا۔بابر محافظوں کی تلاش میں باؤلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا لیکن محافظوں کا
کہیں پتہ نہ تھا۔پھر کنارے پر گھومنے والے ایک دو غوطہ خوروں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔یہ
غوطہ خور عوام میں سے تھے۔اکبر سمندر میں جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا تب صابرہ اس کے سامنے
ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''میرے لال ہوش میں آ۔نیلم کو بچانے کے لئے بہت لوگ سمندر میں کود گئے ہیں۔تُو نہ جا۔''

''صابرہ ٹھیک کہہ رہی ہے تم مت جاؤ۔تمہارے ہوش و حواس درست نہیں ہیں، تم زیادہ تیر نہ سکو
گے۔'' ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نیلم بس اچانک ہی غائب ہوگئی تھی۔سمندر میں ڈوبنے والا بار
بار آب پر آتا ہے لیکن وہ ایک مرتبہ بھی کہیں نظر نہ آئی۔

لوگوں نے اس بڑی لہر کو ان کے سروں سے گزرتے دیکھا تھا اور پھر نیلم اس طرح غائب ہوگئی تھی

جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سمندری جانور اس کی ٹانگ گھسیٹ کر لے
غوطہ خوروں نے بڑی دیر تک اور بڑی دُور تک نیلم کو تلاش کیا لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آئی۔ بالآخر سب تھک ہار کر ایک ایک کر کے کنارے پر پہنچ گئے۔

ابھی نیلم کے ڈوبنے کے بارے میں قیاس آرائی ہو رہی تھی کہ اچانک کسی نے کہا۔ ''نیلم میں بیٹھی ہے۔''

یہ مژدۂ جانفزا سنانے والی راشدہ تھی۔ وہ باتھ روم جانے کے لئے ہٹ میں آئی تھی کہ اس نیلم پر پڑی۔ وہ فرش پر ساکت آنکھوں سے کسی نظر نہ آنے والے نقطے کو گھور رہی تھی۔

اسے راشدہ کے آنے کا پتہ چلا نہ جانے کا۔ وہ پتھر کی مورتی بنی خاموش بیٹھی رہی۔ راشدہ ہوئی واپس آئی۔ اس نے چیخ چیخ کر نیلم کے ہٹ میں موجود ہونے کا اعلان کیا۔

یہ سن کر سب سے پہلے اکبر ہٹ کی طرف بھاگا۔ ''راشدہ، تم سچ کہہ رہی ہو نا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' بابر نے حیرت سے کہا اور تقریباً دوڑتے ہوئے ہٹ کی طرف چلا۔

''نیلم کے ساتھ سب ممکن ہے۔'' ماموں فرقان نے گہرا سانس لے کر کہا۔ وہ بھی تیز قدم ہٹ کی طرف چلے۔

''اللہ، تیرا شکر ہے۔'' صابرہ نے اس خبر کو سن کر فوراً اللہ کا شکر ادا کیا اور ممانی ریحانہ سے ''ممانی ریحانہ آئیں جلدی ہٹ میں چلیں۔''

ہٹ میں سب سے پہلے داخل ہونے والا اکبر تھا، پھر بابر، اس کے بعد ماموں فرقان پہنچے پھر خواتین۔

نیلم نے اب بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کر دیا تھا۔

اس کے سر کے بال کھل چکے تھے، اب وہ اس کے سر کے گھومنے کے ساتھ فضا میں لہرا رہے تھے۔ وہ اپنے سر کو زور زور سے گھما رہی تھی۔

سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے، کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھتا اور اسے جھومنے سے روک دیتا۔

پھر وہ خود ہی جھومتے جھومتے اچانک رُک گئی اور اس نے اپنا سر جھکا لیا، چند لمحے سجدے میں رہی، اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اُٹھایا۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے سامنے کھڑے اہل خا دیکھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ راشدہ اور شمسہ اس کی آنکھیں دیکھ کر ماموں فرقا اور بابر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ یہ نیلم کی آنکھیں تھی ہی نہیں، یہ تو کسی خونی کی آنکھیں معلوم ہو

نیں۔ یہ خونی آنکھیں گھومتے گھومتے اکبر پر رک گئیں۔

''تو وہ تُو ہے۔'' نیلم کی آواز بھی بدل گئی۔ وہ کرخت مردانہ آواز میں بولی۔

اکبر کچھ نہ بولا، خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''میں نے تجھ کو پہلے منع نہیں کیا تھا کہ میرا ہاتھ نہ پکڑ، مگر تُو نہیں مانا۔ آخر تُو میرا ہاتھ کیوں پکڑتا ہے۔ تُو باز کیوں نہیں آتا۔'' وہ غصے سے بھرے سخت لہجے میں بول رہی تھی۔

''بس جی بچے سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' ماموں فرقان نے فوراً بات کو سنبھالا دیا۔

''فرقان تُو کیوں بولتا ہے، یہ کیوں نہیں بولتا۔ کیا اس کے منہ میں زبان نہیں ہے۔'' نیلم نے سے گھورا۔

تب ماموں فرقان نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ''اکبر معافی مانگ لو۔''

''میں نہیں مانگوں گا معافی۔ میں کس بات کی معافی مانگوں، میں نے کیا کیا ہے۔ میرا جرم کیا ہے۔ یلم میری بیوی ہے۔'' اکبر نے غصے سے کہا۔

''لالے، تُو ہمارے سامنے اکڑتا ہے۔ تُو جانتا نہیں کہ ہم نے اچھے اچھوں کی اکڑ نکال دی ہے۔ یہ تیرے برابر فرقان کھڑا ہے، اس سے پوچھ، اپنی ماں صابرہ کے حال سے عبرت پکڑ۔'' نیلم نے اپنی ال انگارہ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

ایک دَم اکبر کے دماغ میں ٹیس سی اُٹھی۔ وہ بے اختیار سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''جو ہمیں نہیں مانتا، ہم اس سے منوا لیتے ہیں۔ تجھے فوراً معافی مانگنا ہوگی اور آئندہ کی لئے توبہ کرنا دگی۔ یاد رکھ ہم بہت زبردست ہیں۔''

اب صابرہ آگے بڑھی۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ کھ کر نرمی سے دبایا اور گھبرائے لہجے میں بولی۔ ''اکبر ضد مت کرو، جو یہ کہتے ہیں فوراً مان لو۔''

اس کے سر میں اتنی شدت کا درد تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سر کو کسی آہنی شکنجے نے جکڑ لیا ہو۔ وہ بمشکل بولا۔ ''ٹھیک ہے، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ نہ ہوگی۔''

''یہ ہوئی نہ بات۔'' نیلم نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور پھر بولی۔ ''اچھا اب ہم جاتے ہیں۔''

یہ کہہ کر نیلم سجدے میں چلی گئی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اُٹھایا تو وہ نارمل ہو چکی تھی۔

اس نے اپنے چاروں طرف بھیڑ دیکھی تو وہ گھبرا گئی۔ وہ فوراً اُٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ صابرہ اور ممانی ریحانہ فوراً اس کے پیچھے چلی گئیں۔

گھر کے افراد کے علاوہ کچھ تماشائی بھی ہٹ میں آ گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ جس کو ہم

سمندر میں ڈھونڈ رہے تھے، وہ ہٹ میں بیٹھی ہے تو ان کا تجسس جاگنا ایک فطری سی بات تھی۔ ا
سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آ رہی تھی کہ ایک لڑکی جو سمندر کی لہروں میں گم ہوئی تھی، وہ اچا
ہٹ میں کیسے پہنچ گئی لیکن جب ان لوگوں نے اس کی حالت دیکھی اور اُنہیں اندازہ ہوا کہ لڑکی پ
کا سایہ ہے تو پھر ان کے ذہنوں میں کوئی سوال نہ رہا، وہ جن کی طاقت پر تبصرے کرتے ہوئے
سے نکل گئے۔

بابر نے ماموں فرقان کی طرف دیکھا، وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہیں ماموں؟''

''یہی سوچ رہا ہوں کہ اکبر نے معافی مانگ کر عقل مندی کا ثبوت دیا، ورنہ جانے کیا ہو جاتا'' ماموں فرقان بولے۔

''ماموں، نیلم کی زندگی تو خراب ہوئی ہی، اس لڑکے کی زندگی بھی تباہ ہو گئی۔'' بابر نے افسو سے کہا۔

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔'' ماموں فرقان نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھو ا اس کے سامنے اکڑنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''میں اکبر کو سمجھا دوں گا۔'' بابر نے کہا۔

''اکبر بہت سمجھدار لڑکا ہے، اس نے اب تک بہت صبر سے کام لیا ہے۔ بالآخر وہ انسان ہی ہے صبر کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ اسے اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر سمندر میں جا سکے۔ اس سید پور کے جن نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ کیا چاہتا ہے۔'' ماموں فرقا افسردہ لہجے میں بولے۔

کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

صابرہ نے نیلم سے سمندر کا احوال دریافت کیا لیکن اس نے کچھ نہ بتایا، وہ خاموش بیٹھی رہی۔

پھر راشدہ اور شمسہ کے اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا مجھے بس ا ہی یاد ہے کہ ایک بڑی لہر نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں یہاں ہٹ میں کیسے آئی، مجھے نہیں معلوم۔ مجھے جب ہوش آیا تو آپ سب لوگ میرے گرد کھڑے تھے۔''

پھر مزید کسی نے نیلم سے اس معاملے میں کرید نہ کی۔ اسے جتنا معلوم تھا، وہ اس نے بتا دیا تھا۔

اس واقعے نے اکبر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اسے اندر ہی اندر بہت غصہ تھا، اس سے ناکردہ گناہ کی معافی منگوائی گئی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا کہ سب کے سامنے اسے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آگ بھری

نی۔ وہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا کبھی وہ ہٹ کے ٹیرس پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور سمندر میں ایک دوسرے کے پیچھے لپکتی لہروں کا نظارہ کرنے لگتا، ان لہروں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھ کر اس کا دل کھول لھتا۔ وہ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو جاتا پھر وہ اندر ہٹ میں آ جاتا۔ ماموں فرقان یا صابرہ کے پاس جا بیٹھتا، بالکل خاموش۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر باہر آ جاتا۔ ہٹ کی سیڑھیاں اُتر کر سمندر کے کنارے ریت پر بھاگنے لگتا۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھبراہٹ طاری تھی، حواس پر غصہ سوار تھا۔ جب بھی اسے معافی مانگنے کا خیال آتا، اس کے حلق میں کڑواہٹ گھل جاتی۔ اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا اور جیسے جیسے اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا، ویسے ویسے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔

اسے ماموں فرقان پر بھی غصہ تھا۔ وہ اسے اب تک صبر کی تلقین کرتے رہے تھے اور وہ اب تک صبر سے کام لیتا رہا تھا لیکن اُنہوں نے کر کے کچھ نہ دیا۔ پوری رات قبرستان میں بھی گزاری اور ایک ذرا سی غلطی نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ اگر وہ اس دن ذرا سی عقل مندی سے کام لے لیتے تو اب تک اس جن کا قصہ پاک ہو چکا ہوتا پھر اس کے سامنے دادا غفور کا چہرہ آ جاتا۔ اُنہوں نے بھی کچھ کر کے نہ دیا تھا، بس باتیں ہی باتیں تھیں، میں یہ کر دوں گا، میں وہ کر دوں گا۔

اس کے خیال میں بات اب ان دونوں کے بس کی نہیں رہی تھی۔ وہ جن ان دونوں پر حاوی آ گیا تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔

یہ کیسی بے بسی اور بے چارگی تھی۔

اس کے دوست کہتے تھے کہ اکبر تُو کس جنجال میں پھنس گیا ہے۔ نیلم کو اس کے گھر بھجوا دے اور دوسری شادی کر لے۔ نیلم گھر میں رہے گی تو گھر میں اسی طرح کی دہشت پھیلتی رہے گی۔ خوفناک واقعات پیش آتے رہیں گے، تجھے گھر میں ایک منٹ کو بھی سکون نہ ملے گا۔ پھر تجھے شادی کر کے کیا ملا۔ کیا فائدہ ہوا۔ تُو نیلم سے اس طرح دُور ہے جیسے وہ تیری بیوی ہی نہیں۔ یہ کس طرح کی شادی ہے۔

اس کے دوست اس سے جو کچھ کہتے وہ سب سمجھتا تھا، سب جانتا تھا، جس طرح کے حالات سے وہ گزر رہا تھا، ان کے کرب سے اچھی طرح واقف تھا لیکن وہ نیلم کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے طلاق دینا ہوتی تو وہ اپنی ماں کے کہنے میں آ کر اسے کب کی طلاق دے چکا ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے حالات سے دوچار کرنے میں نیلم کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ وہ خود مجبور تھی، وہ چابی والا کھلونا بن گئی تھی، اس میں جتنی چابی بھر دی جاتی اس کے مطابق وہ بول کر خاموش ہو جاتی۔

نیلم کو وہ شادی سے پہلے سے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کیلئے اس نے بڑی کوشش کی تھی، اللہ سے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعائیں مانگی تھیں، اس کا حُسن قیامت ڈھانے والا تھا، وہ جب بھی نیلم کو دیکھتا،

اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر جم جاتیں۔

نیلم اسے اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی سو مسکرا کر کہتی۔ ''بس بھی۔''

''کیا بس بھی۔'' وہ جان کران جان بن جاتا۔

''دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔'' نیلم کو صاف کہنا پڑا۔

''نیلم تمہیں احساس ہے کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔''

''نہیں تو۔'' نیلم نے سادگی سے کہا۔ ''مجھے تو کوئی احساس نہیں، بس عام سی لڑکی ہوں۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ عام سی لڑکی ہو، اگر عام سی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں تو پھر خاص کیا؟ ہوں گی۔'' اکبر نے کہا۔

''آپ کے خیال میں، میں کوئی خاص لڑکی ہوں۔'' نیلم نے پوچھا۔

''ہاں، بہت خاص، ایک دم اسپیشل۔'' اکبر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو بہت اچھی لگتی ہوں۔'' نیلم نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں، بہت۔'' اکبر نے والہانہ انداز میں کہا۔

نیلم، اکبر کو واقعی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک ادا پر صدقے واری جاتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے سامنے رہے۔ اگر کاروباری مجبوری نہ ہوتی تو وہ گھر بیٹھ جاتا اور اسے دیکھے جاتا۔

اتنی محبت، اتنا عشق اور اتنی چاہت کے باوجود وہ اس کیلئے ابھی تک شجر ممنوع بنی ہوئی تھی۔

یہ کیسا ظلم تھا۔

وہ اس کی ہو کر بھی، اس کی نہ تھی۔

یہ کیسی بے بسی تھی۔

اکبر کا دماغ گھوم رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا، اگر اس وقت وہ جن اس کے سامنے آجا وہ جانے کیا کر دے۔ اسے پھاڑ کھائے۔ اس جن نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی اور آج اس معافی منگوا کر اس کی انا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔

اکبر ریت پر بیٹھا بیکراں سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے جسم کو چھو کر واپس جا تھیں۔ پکنک کا مزہ ختم ہو گیا تھا۔ یہاں آتے ہی بدمزگی ہو گئی تھی۔

دوپہر کا کھانا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، سب نے مل کر کھایا۔ اکبر نے دو چار لقمے زہر مار پھر ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گاڑی میں بھی اکبر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا، اس توہین کا اثر اس کے ذہن سے زائل ہو

ہو رہا تھا۔

تب ماموں فرقان اُٹھ کر اس کے پاس چلے گئے، اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی۔

ماموں فرقان کو اپنے نزدیک پا کر اس نے ایک مرتبہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

ماموں فرقان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کر لیا پھر انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو انہوں نے دیکھا کہ اس کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ماموں فرقان کا دل کٹ گیا۔

''روتا کیوں ہے پگلے؟'' ماموں فرقان نے خود اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''ماموں فرقان، میں کیا کروں، آپ دیکھ رہے ہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' اکبر نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔

''میں تیرے دکھ کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن رونے سے کام نہ بنے گا۔''

''میں کہاں رو رہا ہوں؟'' اکبر نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں شاباش۔'' ماموں فرقان نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''یہ بات ہوئی نا۔''

''ماموں فرقان، کیا اس جن سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔'' اکبر نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

ماموں فرقان نے فوراً اپنی آنکھیں جھکا لیں، وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ خفت آمیز لہجے میں بولے۔

''بس بیٹا کیا بتاؤں، ذرا سی چوک ہو گئی، ورنہ نجات تو تمہیں کب کی مل چکی ہوتی اس سے۔''

''ماموں فرقان، وہ جو ہونا تھا، ہوا، اب آگے کی سوچیں، دادا غفور سے کچھ بات کریں؟''

''اچھا، بیٹا میں ان کے پاس جاؤں گا۔ میں ان سے بات کروں گا، لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ نیلم سے دُور رہنا، مجھے ڈر ہے، وہ کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں فرقان یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اب اس سے ڈرنے لگے ہیں۔'' اکبر نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے، میں اس سے ڈرا نہیں ہوں، لیکن محتاط ضرور ہو گیا ہوں۔''

''اچھا ماموں یہ بتائیں، وہ میرا کیا بگاڑے گا، کیا مجھے جان سے مار دے گا۔''

''نہیں، موت اور زندگی تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' ماموں فرقان نے بڑے یقین سے کہا۔

''بس تو پھر۔''

''اکبر، تمہارے ذہن میں کیا بات آرہی ہے، کہیں تم اس سے ٹکرانے کی تو نہیں سوچ رہے۔ بیٹا ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ تم ایک لاوا اُبلتے آتش فشاں کا کیا بگاڑ سکتے ہو، وہ ہم جیسے لوگوں کو جل

دے گیا، تم تو اس کے سامنے بچے ہو، جیسے ہاتھی کے سامنے ایک چیونٹی۔"

"لیکن ماموں فرقان کبھی کبھی ایک چیونٹی بھی ہاتھی کی جان کا عذاب بن جاتی ہے۔"

"ایسا کبھی اتفاق سے ہوتا ہے۔"

"کیا پتہ یہ اتفاق میرے ساتھ ہی پیش آجائے۔"

"تم کیا سوچ رہے ہو، تم کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"ابھی تو مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں لیکن اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، مجھے غصہ آنے لگا ہے، میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔"

"بیٹا تم جنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ یہ کتنی خطرناک شے ہوتے ہیں۔ ان سے اُلجھنا آسان کام نہیں۔" ماموں فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کوئی غلط قدم اُٹھانے سے پہلے مجھ سے ضرور پوچھ لینا۔"

بابر علی پچھلی سیٹ پر بیٹھا، ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں اس نے اب تک کوئی مداخلت نہ کی تھی، لیکن اکبر کے عزائم جان کر وہ چپ نہ رہ سکا۔ اسے اپنے بیٹے کی ذہنی کیفیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ بے تابی کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ اب اس کا کچھ نہ کچھ تو ردعمل ہونا تھا، لیکن بابر جانتا تھا کہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اکبر کا اس میں ہاتھ ڈالنا، شعلوں سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اس نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فوراً کہا۔ "بیٹے، ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں تم پریشان کیوں ہوتے ہو، ہم موجود ہیں۔"

"ہاں، ابو، میں جانتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر نے خاموشی اختیار کرلی، گہری خاموشی۔

اس گہری خاموشی میں بڑا راز چھپا ہوا تھا، اس نے اپنے طور پر طے کرلیا تھا کہ اب وہ خود کچھ کرے گا۔ ماموں فرقان اور دادا غفور سے اس نے جو توقعات وابستہ کرلی تھیں، وہ پانی پر لکیر ثابت ہوئی تھیں۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ارادوں کو ظاہر کرے اس لئے اس نے مکمل سکوت اختیار کرلیا۔

پکنک سے واپسی پر سب پر گہری خاموشی طاری تھی۔ جتنا شور شرابا پکنک پر جاتے ہوئے تھا اتنا ہی سکوت واپسی پر طاری تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ پکنک سے نہ واپس ہوئے ہوں کسی کو دفنا کر آرہے ہوں۔

گلشن پہنچ کر بابر کے گھر والے گاڑی سے اُتر گئے جب کہ ماموں فرقان اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے رہے۔

بابر اور صابرہ نے چاہا بھی کہ وہ لوگ چائے وغیرہ پی کر جائیں، لیکن ماموں فرقان راضی نہ ہوئے

اس طرح وہ پکنک والی گاڑی میں اپنے گھر عزیز آباد روانہ ہوگئے۔

چائے کی سب کو طلب ہو رہی تھی۔ راشدہ نے چائے بنائی۔ چائے پی کر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔

اکبر ٹی وی لاؤنج میں اکیلا بیٹھا، آج کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

اکبر نے ریسیور اُٹھایا اور بولا۔ "ہیلو۔"

"میں واجدہ بول رہی ہوں۔"

"جی خالہ آپ کیسی ہیں؟"

"بیٹے میں ٹھیک ہوں، آج صبح سے میں مسلسل ٹیلیفون کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں، لیکن لائن ملتی ہی نہ تھی کبھی انگیج ملتا اور کبھی کہیں اور لائن مل جاتی۔ ایک دوبار ایسا ہوا کہ گھنٹی بجتی رہی کسی نے اُٹھایا نہیں۔ اب بڑی مشکل سے ملا ہے۔" واجدہ نے اپنی روداد سنائی۔

"خالہ جان، ہم لوگ گھر پر نہیں تھے، سمندر پر پکنک منانے گئے ہوئے تھے۔"

پکنک کا سن کر واجدہ کو بڑی خوشی ہوئی، پکنک پر جانے کا مطلب تھا کہ گھر کے حالات پرسکون ہیں۔

"پکنک پر گئے تھے۔" واجدہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ "کون کون گیا تھا۔"

"ہم لوگ تھے اور ماموں فرقان کا گھرانہ۔"

"اچھا، تمہاری امی کا کیا حال ہے۔" واجدہ نے پوچھا۔

"جی وہ ٹھیک ہیں؟"

"نیلم کہاں ہے؟"

"وہ ابھی تو یہیں تھی۔ شاید آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی ہے، میں بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر نے ریسیور رکھا، پلٹ کر دیکھا تو صابرہ پیچھے کھڑی تھی۔

"اکبر کس کا فون ہے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"امی، خالہ کا ہے، آپ جب تک بات کریں، میں نیلم کو بلا کر لاتا ہوں۔"

نیلم اپنے کمرے میں سونے کیلئے لیٹ چکی تھی۔ اکبر نے واجدہ کے فون کی اطلاع دی وہ فوراً اُٹھ کر بھاگی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو صابرہ، واجدہ کو سمندر پر پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا رہی تھی۔ نیلم کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کی اور بولی۔ "لو، نیلم آگئی ہے، اس سے بات کرلو۔"

واجدہ کو جو خوشی ان کے پکنک پر جانے کا سن کر ہوئی تھی وہ، وہاں پیش آنے والے واقعات سے ہوا ہوگئی تھی۔

نیلم نے ریسیور پکڑ کر اپنے کان سے لگایا۔ بڑے ادب سے اپنی ماں کو سلام کیا، پھر پوچھا۔ ''ا
آپ کیسی ہیں اور میرے ابو کا کیا حال ہے؟''

''ہم دونوں ٹھیک ہیں اور تمہیں یاد کرتے ہیں۔'' واجدہ نے بڑی محبت سے کہا۔

''میری آنکھوں میں بھی آپ لوگ ہروقت سمائے رہتے ہیں۔'' نیلم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''نیلم تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے، کیا کروں۔'' واجدہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''امی، میرا بھی یہی حال ہے، میں خود یہی چاہتی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔

''نیلم تم کچھ دنوں کیلئے اکبر کو لے کر لاہور آجاؤ، اگر اکبر کو فرصت نہ ہو تو میں انہیں بھیج دوں
تمہیں جا کر لے آئیں گے۔'' واجدہ نے تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے امی، لیکن اس معاملے میں دادا غفور سے پوچھنا ہوگا۔'' نیلم نے کہا۔

''نیلم پھر تم ایسا کرو، ذرا صابرہ کو فون دو، میں ان سے بات کرتی ہوں۔'' واجدہ بولی۔

''جی اچھا امی۔'' یہ کہہ کر نیلم نے ریسیور صابرہ کی طرف بڑھایا۔ ''امی آپ سے بات
چاہتی ہیں۔''

پھر واجدہ اور صابرہ کافی دیر تک فون پر بات کرتی رہیں۔ نیلم کو بہت تھکن ہو رہی تھی وہ وہاں
اُٹھ کر اپنے بیڈروم میں آگئی۔

ابھی اسے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں نیند اُتری ہی تھی کہ اسے کمر
میں وہ مسحور کن خوشبو پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کمرے میں خوشگوار دھواں بھرنے لگا تھا۔

وہ آگیا تھا۔

نیلم کی نیند اُڑ گئی، وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا اور وہ اس کے بیڈ کے نزد
کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑا سحر تھا۔ نیلم اس کی طرف بے خودی میں دیکھتی رہی۔

''کہاں جانے کا پروگرام بن رہا ہے؟'' قرل نے سوال کیا۔

''امی چاہتی ہیں کہ میں ان کے پاس لاہور ہو آؤں۔'' نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

''یہاں ہمیں اکیلا چھوڑ جائیں گی؟'' قرل نے بڑی محبت سے سوال اُٹھایا۔

''چند دنوں کی تو بات ہے۔'' نیلم نے تسلی دی۔

''نہیں نیلم تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں بڑی مشکل سے تو میں نے حالات کو سازگار کیا ہے، جب
فضا سازگار ہو گئی ہے تو تم مجھے چھوڑ جانا چاہتی ہو۔ مجھ پر ایسا ظلم مت کرو۔ میں اب تمہاری جدائی کس
قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ نیلم تم کان کھول کر سن لو، تمہیں چاہے غفور جانے کو کہے یا فرقان لیکن
کراچی سے جاؤ گی نہیں، اس وقت تک جب تک میں تم سے جانے کو نہ کہوں، تم یہ بات اچھی طرح

سمجھتی ہو کہ میں جو کچھ کہہ دیتا ہوں، اس پر عمل بھی کروا لیتا ہوں۔'' قرل نے کسی حد تک تحکمانہ لہجہ
اختیار کیا۔

''میں، میں جانتی ہوں۔'' نیلم نے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

''جانتی ہو تو پھر انجان نہ بنو، آج کی رات ہم دونوں کیلئے بہت اہم ہے۔ میں اب چلتا ہوں،
صابرہ اس طرف آ رہی ہے تم لاہور جانے سے صاف انکار کر دو گی۔''

یہ کہہ کر وہ آئینے میں غائب ہو گیا، اس کے غائب ہوتے ہی کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔
چند لمحوں بعد صابرہ کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرے میں زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو آدمی کو پاگل کر دیتی تھی۔ صابرہ نے
کمرے میں آکر گہرے گہرے سانس لئے اور بولی۔ ''بڑی پیاری خوشبو ہے کمرے میں کیا
اسپرے کیا ہے تم نے۔''

''جی، میں نے کوئی چیز اسپرے نہیں کی۔'' نیلم نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''پھر یہ خوشبو۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی، اس کی نظر جلتی موم بتی پر پڑی، جلتی موم بتی کو دیکھ کر وہ ایک
دم خوفزدہ ہو گئی، اس نے پھر خوشبو کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔

''میں نے دادا غفور سے بات کر لی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نیلم کا لاہور جانے میں کوئی حرج نہیں، چلی
جائے۔ کل انہوں نے بابر کو بلایا ہے شاید کوئی تعویذ وغیرہ دیں گے تمہارے لئے۔'' صابرہ نے بتایا۔

''لیکن خالہ میں لاہور نہیں جانا چاہتی۔'' نیلم نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہیں، یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' صابرہ یہ سن کر ایک دم پریشان ہو گئی۔ ''آخر کیوں، اس فیصلے کی وجہ
کیا ہے؟''

''وہ نہیں چاہتے کہ میں جاؤں۔'' نیلم نے بڑے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن اکبر نے تو مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ وہ تو تمہیں لاہور بھیجنے کیلئے راضی ہے بلکہ وہ خود
تمہیں لاہور لے جانا چاہتا ہے۔''

''میں اکبر کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' نیلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پھر کس کی بات کر رہی ہو۔'' صابرہ کے چہرے پر الجھن تھی۔

''میں بات کر رہی ہوں......'' نیلم کچھ بتاتے بتاتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

اس کی نظریں آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں، نیلم بولو، تم کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔'' صابرہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

سنگھار میز کے آئینے کی طرف صابرہ کی پیٹھ تھی، اس لئے اسے وہ نظر نہیں آ رہا تھا جو نیلم کو نظر آ رہا

تھا۔ آئینے میں قرل تھا اور وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے بارے میں بتانے سے منع کر رہا
نیلم کی آنکھیں بدستور آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔ صابرہ نے اس قدر انہماک سے اسے آ
طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس نے گردن گھمائی۔

صابرہ کے گردن گھماتے ہی قرل آئینے سے غائب ہو گیا۔ صابرہ کو وہاں کچھ نظر نہ آیا تو وہ
کی طرف پلٹی اور بولی۔ ''ہاں، نیلم بتاؤ، تم کس کی بات کر رہی تھیں۔''

''جی میں تو کسی کی بات نہیں کر رہی تھی۔'' نیلم نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

''پھر تم لاہور جانے کی تیاری کرو، اکبر خود تمہارے ساتھ جائے گا۔'' صابرہ نے اس کی
کیفیت کے پیش نظر اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھی۔ اس نے اپنی بات کہی اور کمرے
نکل آئی۔

نیلم نے بھی اس سے زیادہ اُلجھنا پسند نہ کیا۔ اس نے اس کی بات سنی اور خاموش رہی۔
وہ جانتی تھی کہ قرل کی اجازت کے بغیر دنیا کا کوئی آدمی اسے لاہور نہیں لے جا سکتا۔

سمندر میں نہانے کی وجہ سے اس کے جسم پر ریت جمی ہوئی تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کی وجہ سے
تک تھکن کم ہو گئی تھی۔ ریت کی وجہ سے اسے بے چینی ہو رہی تھی اس لئے اس نے سوچا کہ جا کر نہا
وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔

باتھ روم میں وہ بڑی دیر تک گرم پانی کا شاور لیتی رہی۔ نہا کر اسے بڑا سکون ملا، نہاتے
اسے ایک دو بار یہ احساس ہوا تھا، جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ لیکن اسے نظر کچھ نہ آیا، وہ اسے اپ
سمجھ کر باتھ روم سے باہر آ گئی تھی۔

باتھ روم میں ایک قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ نیلم خود کو کپڑوں سے بے نیاز کرتے وقت کبھی آئینے
سامنے نہیں کھڑی ہوتی تھی۔ اسے بڑی شرم آتی تھی۔ اس نے آج تک اپنے خوبصورت جسم کو آ
میں آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا، جب اسے یہ احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس نے ایک گہری
آئینے پر ڈالی۔ آئینے کے اندر دُور تک کوئی نہ تھا تب اس کی نظر اپنے مرمریں جسم پر جم کر رہ گئی
قدر حسین جسم تھا، سانچے میں ڈھلا، تراشیدہ، آنچ دیتا ہوا۔ آج اسے پہلی بار اپنے جسم کی کش
اندازہ ہوا۔ اس نے گھبرا کر کچھ شرما کر اپنے شعلہ بدن کو تولیہ میں لپیٹ لیا۔

جب وہ باہر نکلی تو اکبر کمرے میں موجود تھا۔ وہ نہا دھو کر آیا تھا اور ملیشیا کلر کے ریشمیں شلوار
میں خاصا چمک رہا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو چمکتی نگاہوں سے دیکھا۔

نیلم نے اپنے بالوں کو تولیہ میں لپیٹ کر جُوڑا سا بنایا ہوا تھا، وہ اس وقت سرخ رنگ کے سوٹ

تھی۔ اس کا سفید گلابی چہرہ جیسے نور کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ آدمی دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے۔

اکبر نے جب اس کے سراپے پر نظر ڈالی تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی، وہ اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس سے کس قدر دُور تھی۔ وہ اس کیلئے شجر ممنوع تھی، وہ اس شجر کے سائے میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ یہ اس پر کیسا ظلم تھا۔

اچانک اکبر کے دل میں ایک ابال سا اُٹھا، دماغ پر غبار سا چھایا، جنون کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا وہ کیوں نہ آج ہمت کر کے شجر ممنوع کو چھو لے۔ ویسے وہ اس طرح کی کئی کوششیں ماضی میں کر چکا تھا اور ہر مرتبہ کسی عذاب میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔

آج ہی تو اس سے معافی منگوائی گئی تھی۔

لیکن اس وقت نیلم کو باتھ روم سے باہر آتے دیکھ کر جانے کیوں اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے، وہ شجر ممنوع کو چھونے چلا تھا۔

اکبر کی آنکھوں کے رنگ بدلتے دیکھ کر نیلم سہم سی گئی۔ اس نے جلدی سے الماری سے شال نکال کر اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری کر لی اور اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر اپنے گیلے بالوں کو جھٹکنے لگی۔

اکبر کو اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

نیلم نے اچانک آئینے پر نگاہ ڈالی تو وہ سہم سی گئی، اکبر اس کے پیچھے کھڑا تھا جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ اکبر نے کچھ سوچ کر اسے چھونے کا ارادہ ملتوی کر دیا وہ دھیرے سے بولا۔ ''نیلم۔''

اس کی آواز سن کر نیلم نے پہلے اسے آئینے میں دیکھا پھر وہ اس کی طرف مڑ گئی۔ ''جی۔''

''نیلم لگتا ہے جیسے تم میری بیوی نہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' نیلم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ رہا تمہارا رویہ کہہ رہا ہے، تم دن بدن تبدیل ہوتی جا رہی ہو، اب تم میں پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ تم مجھ سے دُور ہوتی جا رہی ہو۔ پہلے میں تمہاری آنکھوں میں ہوتا تھا، لیکن اب میں تمہاری آنکھوں سے مٹتا جا رہا ہوں۔''

''یہ محض آپ کا احساس ہے۔'' نیلم نے ایسے ہی بات کو ٹالنے کیلئے کہا...... ''میں آپ کی ہوں ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔''

''نیلم میں اب تم سے دُور نہیں رہ سکتا۔'' اکبر نے تڑپ کر کہا۔

''سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں بڑا ڈرتی ہوں خدانخواستہ آپ کو

کوئی بڑا نقصان نہ پہنچ جائے۔'' نیلم نے گھبرا کر کہا۔

بڑے نقصان کی بات سن کر اکبر سہم سا گیا وہ ہر مرتبہ اس طرح کی کوشش کے نتیجے میں نت ۔ عذابوں میں مبتلا کیا گیا تھا۔ ماموں فرقان نے بہت واضح طور پر نیلم سے دُور رہنے کی تنبیہہ کی اور وہ اس ہدایت پر عمل بھی کر رہا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کامیاب ہونے کی بس ایک ہی صورت تھی کہ نیلم کو اس خبیث سے نجا دلا دی جائے۔

اور اس پر قابو پانا اتنا آسان نہ تھا۔ دادا غفور اور ماموں فرقان جیسے لوگ اس معاملے میں نا ہو چکے تھے، اس کی تو بساط ہی کیا تھی۔

اکبر کا سارا جنون جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس پر ایک دم اداسی کا دورہ پڑا۔ اس نے نیلم کو بے بسی اور حسرت سے دیکھا۔ پھر وہ سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔

نیلم نے اسے اس طرح جاتے دیکھا تو اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

وہ اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتی تھی، لیکن وہ اس کیلئے کر کچھ نہیں سکتی تھی۔

اکبر کے اس طرح حسرت زدہ انداز میں لوٹ جانے کے بعد نیلم نے ایک گہرا سانس لیا اور ا خوبصورت گیلے بالوں سے جلدی جلدی پانی جھٹکنے لگی تھی۔

شال اتار کر اس نے بیڈ پر اچھال دی اور اپنے شانوں پر تولیہ پھیلا کر ریشمیں خوبصورت بالو اس پر چھوڑ دیا تاکہ گیلے بالوں سے قمیض گیلی نہ ہو۔

اچانک اس کی نظر بیڈ کی چادر پر پڑی وہ بیڈ کے نیچے سے آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

نیلم اسے دیکھ کر ایک دَم جم کر کھڑی ہو گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر اس مرتبہ ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا۔

یہ وہی کالا بلا تھا جسے دیکھتے ہی جسم میں کپکپی دوڑ جاتی تھی، لیکن اس وقت وہ بڑے اطمینان اسے دیکھ رہی تھی۔ کالے بلے نے بیڈ کے نیچے سے نکل کر ایک زوردار انگڑائی لی اور پھر وہ نیلم قدموں میں لوٹنے لگا۔

کالے بلے کا سخت جسم اس کی نرم ملائم ٹانگوں سے رگڑ کھا رہا تھا۔ اسے گدگدی سی محسوس ہو تھی، وہ فوراً بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب کالے بلے نے اپنی سرخ سرخ زبان سے اس کے گورے گورے حد خوبصورت پیروں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ نیلم نے جھرجھری سی لی۔ اس کے بدن میں آگ سی گئی۔ اس نے ایک کمزور سی کوشش کی اپنے پاؤں اُٹھانے کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس آنکھوں میں رنگ اترنے لگے ایک نشہ تھا جو اس پر چھائے چلا جا رہا تھا۔

پھر اچانک ہی کمرے میں راشدہ داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔

راشدہ نے اپنے سامنے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر وہ کانپ اُٹھی وہ کالا بلا نیلم کے پاؤں چاٹ رہا ا اور نیلم اس بلے کو پر کیف نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

راشدہ کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا، ٹانگیں لرز اُٹھیں، ہاتھ کانپ اُٹھے، پیالی پھسل کر قالین گری اور وہ ایک چیخ مار کر اُلٹے قدموں واپس بھاگی۔

راشدہ کی چیخ سن کر نیلم نے اپنی مخمور نظریں دروازے کی طرف اُٹھائیں اس نے راشدہ کو اس قدر واس بھاگتے دیکھ کر اسے آواز دی۔ ''راشدہ، راشدہ۔''

لیکن راشدہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ اس نے صابرہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا اور جب اس نے صابرہ کو وہ سب بتایا جو وہ دیکھ کر آ رہی تھی تو صابرہ لرز کر رہ گئی۔

راشدہ کے کمرے سے بھاگنے کے بعد، کالے بلے نے اپنی سرخ آنکھوں سے نیلم کو دیکھا اور پھر یڈ کے نیچے گھس گیا۔

چند لمحوں بعد پورا گھر اس کے کمرے میں آ گیا، لیکن اب یہاں کچھ نہ تھا، نیلم آئینے کے سامنے ڑی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

''ہائے نیلم تم ٹھیک تو ہو'' صابرہ نے جلدی سے اسے اپنے گلے لگا لیا۔

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' نیلم نے یہ بات اس انداز سے مسکرا کر کہی کہ پھر کوئی اور سوال رنے کی کسی میں ہمت نہ پڑی۔

کمرے میں اب کوئی چیز نہ تھی جس کے بارے میں سوال کیا جاتا۔ راشدہ نے جو منظر دیکھا تھا اس کے بارے میں خود نیلم کو کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن وہ چپ تھی اس کی چپ میں بڑی پُراسراریت تھی۔ تب ان لوگوں نے قیاس کر لیا کہ راشدہ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کی نظر کا فریب تھا۔

یہ کوئی نہ جان سکا کہ یہ فریب خود نیلم نے دیا تھا۔

خود نیلم کو اپنے آپ پر حیرت تھی۔ اس کی کالے بلے سے روح فنا ہوتی تھی وہ اس کی آواز سن لیتی یا س کی منحوس شکل دیکھ لیتی تو لرز اُٹھتی تھی، لیکن آج جانے کیا ہوا تھا کہ اس کے دل سے کالے بلے کا ول اچانک نکل گیا تھا۔ اس کے قدموں میں لوٹتا وہ کالا بلا اسے اچھا لگا تھا۔

رات کو حسب معمول وہ صابرہ کے کمرے میں سوئی۔ رات کے وقت نیلم کے بیڈروم کو لاک کر دیا ہا تا تھا تو آج بھی کر دیا گیا۔

نیلم بیڈ کے ایک کنارے پر تھی اس کے برابر صابرہ تھی اور صابرہ کے اس طرف راشدہ سو رہی تھی۔ اس رات نیلم کو نیند نہیں آ رہی تھی، وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھیں۔

''کیا ہوا، نیلم نیند نہیں آ رہی کیا۔'' صابرہ نے اسے کروٹیں بدلتے دیکھ کر پوچھا۔

''جی۔'' نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

''نیند کی گولی دے دوں۔'' صابرہ نے کہا۔

''نہیں، نیند کی گولی کھا کر میری طبیعت عجیب سی ہو جاتی ہے۔'' نیلم نے کہا...... ''میں
گی۔ آخر کب تک نیند نہیں آئے گی، آپ سو جائیں۔''

پھر صابرہ کو نیند آ گئی، راشدہ پہلے ہی سو چکی تھی۔

نیلم کو ابھی تک نیند نہیں آئی تھی۔ سامنے دیوار گیر گھڑی میں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ کچھ نیلم کو نیند نہیں آ رہی تھی، دوسرے بار بار دماغ میں یہ خیال آ رہا تھا کہ یہاں سے اُٹھ کرا روم میں چلی جائے۔ اس خواہش پر اسے خود حیرت تھی۔

یہ خیال سمندر کی لہروں کی طرح اس کے دل کے کناروں سے ٹکرا رہا تھا۔

یہ خواہش اس کے دل پر ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھی۔

کوئی اسے بلا رہا تھا۔

پھر اس خواہش نے بپھرے سمندر کی شکل اختیار کر لیا۔ طوفانی موجیں ایک کے بعد ایک پتھر دل پر سر پٹک رہی تھیں۔ کوئی اسے بلا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کہیں دور وہ آواز سنا رہی تھی۔

''آؤ نیلم...... آؤ نیلم...... آؤ نیلم۔''

پھر اس سے رہا نہ گیا۔ اس کا دل جیسے مچل اُٹھا وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے صابرہ اور راشد چہروں پر نظر ڈالی وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں۔

وہ بلاوا جو مسحور کن خوشبو کی طرح تھا، مسلسل اس کی سماعت پر شبنمی قطروں کی طرح برس رہا اسے آواز دے رہا تھا۔

''آؤ نیلم...... آؤ نیلم...... آؤ نیلم۔''

اس بلاوے میں کس قدر چاہت تھی، کس قدر پیاس تھی۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے راشدہ اور صابرہ کے چہروں پر نظر ڈالی۔ کمرے واٹ کا نیلا بلب روشن تھا۔ اس نیلی روشنی میں دونوں کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھیں۔

وہ آواز...... وہ خوشبو جیسی آواز، مسحور کن بلاوا مسلسل اس کے در دل پر دستک دے رہا تھا۔

''آؤ نیلم...... آؤ نیلم...... آؤ نیلم۔''

اب وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح چل پڑی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے، لیکن پھر وہ جا رہی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ مڑ کر بیڈ پر نظر ڈالی اور پھر آہستگی دروازہ بند کر دیا۔

اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ رات کو بیڈ روم کو مقفل کر دیا جاتا ہے اور کہاں ہوتی ہے، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے یہ خیال اس کے دماغ میں کہ بیڈ روم تو بند ہوگا۔ اس خیال کے آنے کے باوجود اس کے قدم رکے نہیں۔

وہ سحر زدہ معمول کی طرح آگے بڑھتی رہی۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ فوراً کھل گیا۔

وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی اور پھر اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

پھر سحر ہوئی وہ صبح کتنی قیامت خیز تھی۔

سب سے پہلے صابرہ کی آنکھ کھلی، گھر میں سب سے پہلے وہی اُٹھتی تھی، دودھ والا گیٹ بجا رہا تھا۔

صابرہ نے ایک نظر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ راشدہ بیڈ پر موجود تھی لیکن نیلم نہیں تھی۔

صابرہ نے فکر نہ کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔

سب سے پہلے اس نے جا کر دودھ لیا کچن میں جا کر ہلکی آنچ پر دودھ رکھا۔ صحن سے اخبار اُٹھایا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

نیلم اب بھی بیڈ پر نہ تھی۔

صابرہ نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور بیڈ پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگی۔

اخبار دیکھتے دیکھتے وہ اچانک فکر مند ہو گئی۔ نیلم اگر باتھ روم میں ہوتی تو اب تک نکل آتی۔ وہ کہاں گئی۔ صابرہ نے اخبار ایک طرف ڈالا۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر باتھ روم کے دروازے پر گئی۔ اس ہاتھ سے دروازہ بجایا اور اپنے کان دروازے پر لگا دیے۔ اندر سے کوئی آہٹ نہ سنائی دی۔

پھر اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔

باتھ روم خالی پڑا تھا، وہاں کوئی نہ تھا۔

صابرہ تیزی سے واپس آئی، اس نے راشدہ کو اُٹھایا۔ راشدہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بیٹھتے بولی۔ ''جی امی کیا ہوا؟''

''بیٹی، وہ نیلم نہیں ہے۔''

''امی وہ گھر میں ہی ہوں گی اور کہاں جائیں گی۔''

''مجھے تو خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔''

"امی اب آپ کو تو ہر وقت خطرہ محسوس ہوتا رہتا ہے۔ کس قدر ڈرپوک ہوگئی ہیں آپ۔" نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتی ہوں جا کر۔"

راشدہ پورے گھر کا چکر لگا آئی۔ اس نے سب کمرے جھانک لئے لیکن نیلم کا بیڈروم کیوں کہ وہ رات کو اس نے خود لاک کیا تھا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی رات کو اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔

اب راشدہ کو بھی فکر ہوئی اس نے صابرہ سے گھبرا کر کہا۔ "امی، نیلم بھابھی تو گھر میں کہیں نہیں"

"راشدہ تُو جا کر ذرا اکبر کو اُٹھا، میں بابر کو اُٹھاتی ہوں۔" صابرہ پُرتشویش لہجے میں بولی۔

دونوں کے کمرے مخالف سمتوں میں تھے۔ راشدہ گیسٹ روم کی طرف بھاگی۔ صابرہ نے کے کمرے کا رخ کیا۔ راستے میں نیلم کا بیڈروم پڑتا تھا۔

صابرہ نے چلتے چلتے ایسے ہی اس کے دروازے پر لگے ہینڈل کو گھما کر دیکھا۔

دروازہ فوراً کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی کمرے کے اندر سے بڑی مسحور کن خوشبو آئی۔ صابرہ نے جلدی سے پورا کھول دیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

قالین پر گلاب کی پتیوں کی کوئی ایک فٹ اونچی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پورے کمرے میں گلا پتیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

بیڈ پر بھی ڈھیروں گلاب کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں اور اس گلاب کی پتیوں کے نرم اور خوشبو دا پر نیلم لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر تازگی اور آسودگی تھی، وہ بڑی پُرسکون نیند سو رہی تھی۔

اس کا جسم کپڑوں سے بے نیاز تھا، صابرہ نے جلدی سے بیڈ سے نیچے پڑے لحاف کو اس پر ڈا

اتنے میں اکبر گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "کہاں گئی نیلم۔"

پھر بابر پریشان ہوتا کمرے میں آیا۔ "صابرہ کیا ہوا؟"

کمرے میں جو دونوں نے قدم رکھا تو گلاب کی پتیوں نے ان کا سواگت کیا۔ مہکتا گلاب کی پتیوں کا دبیز بستر، جلتی ہوئی شمع، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے سوتی ہوئی نیلم۔

کتنی کہانیاں تھیں جو آپ ہی آپ دل میں جنم لے رہی تھیں۔ ہونٹوں سے پھسل رہی تھیں یہ ان کہی کہانیاں جو رات کا فسانہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بیان کر رہی تھیں۔ ان کہانیوں کو ہر باتوں کو محسوس کر کے اکبر کے دل پر چھری سی چل رہی تھی۔ یہ سب کیا تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

صابرہ پر لرزہ طاری تھا۔ بابر محوِ حیرت تھا۔ راشدہ کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

سب کے سب سوئی ہوئی نیلم کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہاں نیلم نہ ہو، نیلم کی لاش پڑی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی رو نہیں رہا تھا، یا سب رو رہے تھے۔

اچانک نیلم نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

یہ نیلم کی آنکھیں نہ تھیں۔ یہ کسی اور کی آنکھیں تھیں۔ لال انگارہ۔

"آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں، دیکھتے نہیں کہ یہاں دلہن لیٹی ہے۔ آپ لوگ جائیں یہاں سے، اسے آرام کرنے دیں۔" یہ نیلم کی آواز نہ تھی۔ یہ کسی اور کی آواز تھی۔ یہ سیّد پور کے جن کی آواز تھی۔

یہ سن کر سب سے پہلے صابرہ بھاگی، اس کے بعد راشدہ پھر کمرے سے بابر نکلا اس کے بعد اکبر۔

کوئی گیارہ بجے تک "دلہن" کمرے میں آرام کرتی رہی۔

پھر وہ خود ہی کمرے سے باہر آگئی۔

وہ سفید جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں بیش قیمت ہیرے کا ہار تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر خاموشی سے صابرہ کے کمرے میں چلی گئی۔

نیلم کسی سے ایک لفظ نہ بولی۔ نہ ہی کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔

نیلم کے کمرے کی جب صفائی کی گئی تو اس میں سے منوں گلاب کی پتی برآمد ہوئی، جب بیڈ پر سے گلاب کی پتیوں کو صاف کیا گیا تو ایک اور حیرت انگیز بات سامنے آئی۔

پورے بیڈ پر نوٹوں کی گڈیاں بڑے سلیقے سے برابر برابر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بابر نے ان نوٹوں کی گڈیوں کو شمار کیا تو کل رقم پچیس لاکھ بنی۔ ایک کروڑ کی چوتھائی۔

شبہ ہوا کہ یہ نوٹ جعلی ہوں گے لیکن یہ شبہ بھی غلط نکلا، وہ کرنسی کھری اور سچی تھی۔ اس سارے واقعہ کی ماموں فرقان کو اطلاع دی گئی۔

ماموں فرقان دکان سے سیدھے گلشن پہنچے۔ ابھی وہ گیٹ پار کر کے گھر میں داخل ہی ہو رہے تھے کہ نیلم اندر سے ایک دم بپھری ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔

"فرقان تُو کیوں آیا ہے، جا واپس چلا جا اور آئندہ اس گھر کی دہلیز پار نہ کرنا ورنہ تجھے وہ سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔" نیلم اپنی لال لال آنکھیں نکالے، مردانہ آواز میں بول رہی تھی۔

ماموں فرقان کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ وہ ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن ان کے گھر والے تو محفوظ نہ تھے۔ وہ انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا۔ کوئی بھی شعبدہ دکھا سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی بھگتے ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے اس وقت اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا، وہ الٹے پاؤں گھر سے واپس نکل گئے۔

ماموں فرقان کے اس طرح چلے جانے سے گھر والوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔ وہ مایوس ہو کر خوف ز
بتلا ہو گئے۔ ماموں فرقان کے چلے جانے کے بعد نیلم نے باری باری اپنی انگارہ آنکھوں سے سب
گھورا اور پھر مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کی مسکراہٹ سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

اکبر کا آج لاہور جانے کا پروگرام تھا۔ جہاز کے ٹکٹ لینے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ نیلم ۔
لاہور چلنے کیلئے پوچھا۔ ''نیلم میں، ریزرویشن کرانے جارہا ہوں۔''

''مجھے نہیں جانا کہیں، سمجھے۔''

نیلم نے جب مردانہ آواز میں آنکھیں گھما کر ''سمجھے'' کہا تو اکبر کو پسینہ آ گیا۔

بابر نے لاہور فون کر دیا کہ نیلم نہیں آسکے گی۔ ساتھ ہی واجدہ کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔
واجدہ اور فیاض حسین گھبرا کر دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔

نیلم اپنے ماں باپ کو دیکھ کر ان سے لپٹ گئی اور لپٹی ہوئی بہت دیر تک سسک سسک کر روتی رہی۔
واجدہ کی بُری حالت تھی۔ وہ بار بار نیلم کا سر اپنے کاندھے سے اُٹھا کر اس کی پیشانی اور رخسارو
کو چومتی اور پھر ''میری جان، میری بیٹی'' کہہ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی۔

نیلم اگرچہ واجدہ کی سگی بیٹی نہ تھی، لیکن اس نے ہمیشہ اس کو سگا ہی سمجھا تھا یا شاید سگو
بھی زیادہ۔

اس نے اسے بڑی توجہ اور بڑے پیار سے پالا تھا۔ نیلم کے اگر کانٹا بھی چبھ جاتا تو واجدہ ک
محسوس ہوتا جیسے اس کے اپنے دل میں چھری گھس گئی ہے۔

نیلم کے بارے میں اسے فون پر جو کچھ معلوم ہوا تھا، اسے اس نے ہولا کر رکھ دیا تھا، وہ بڑ
تک اس کو اسی طرح چوم چوم کر روتی رہی۔

جب کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تو فیاض حسین نے ماں بیٹی کو آہستگی سے الگ کیا۔ نیلم ماں سے ا
ہوئی تو وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی، اب فیاض حسین بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

پھر بڑی مشکل سے یہ آنسوؤں کی برسات بند ہوئی۔

صابرہ، نیلم اور واجدہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بابر، فیاض حسین کو لے کر ڈرائنگ روم
چلا گیا۔ اکبر کبھی ماں کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی وہ باپ کے پاس چلا جاتا۔

دونوں جگہ ایک ہی کہانی چل رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر جب سب لوگ اکٹھا ہوئے تو نیلم اچانک بیٹھے بیٹھے جھومنے لگی۔

پھر جھومتے جھومتے نیلم نے ایک دم سر اُٹھایا اور واجدہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہ
بولی۔ ''امی۔''

''ہاں، بیٹا بولو۔'' واجدہ صوفے سے نیچے اتر آئی اور پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قالین
پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''امی، آپ انارکلی کی چاٹ کھائیں گی۔'' نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی آواز بدلی تھی
نہ آنکھیں۔

''بیٹا انارکلی لاہور میں ہے اور لاہور یہاں سے بہت دُور ہے۔'' واجدہ نے کہا۔

''یہ سب مجھے نہ بتائیں، آپ کھانے کا اقرار کریں۔''

''اچھا، اگر میں کھانے کا اقرار کروں، تو کیا تم مجھے چاٹ کھلا دو گی۔''

''جی بالکل۔'' نیلم نے بڑی بے نیازی سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''لیکن کیسے؟'' واجدہ نے سوال کیا۔

''ایسے۔'' نیلم نے یہ کہہ کر اپنا سیدھا ہاتھ آگے پھیلایا تو اس پر چاٹ کی پلیٹ نمودار ہو گئی۔

''لیں امی کھائیں۔'' نیلم نے پلیٹ واجدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے حیرت زدہ ہو کر پلیٹ لے لی۔ پھر اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے چمچے سے چاٹ
کھائی یہ چاٹ کی پلیٹ واقعی انارکلی کی اس مخصوص دکان کی تھی جہاں وہ اکثر چاٹ کھایا کرتے تھے۔
اس دکان کی چاٹ کا ذائقہ ہی الگ تھا۔

پھر نیلم بار بار اپنا ہاتھ فضا میں پھیلاتی رہی، ہر بار اس کے ہتھیلی پر ایک پلیٹ نمودار ہو جاتی۔ جب
سب لوگوں کیلئے چاٹ کی پلیٹ مکمل ہو گئی تو آخر میں اس نے اپنے لئے چاٹ کی پلیٹ منگوائی۔ پھر وہ
مزے لے لے کر چاٹ کھانے لگی۔

واجدہ اور فیاض دو دن کراچی میں رہے۔ وہ نیلم کو اپنے ساتھ لے جانے کیلئے آئے تھے لیکن نیلم
لاہور جانے کیلئے تیار نہ تھی۔ ان دو دنوں میں متعدد بار واجدہ نے نیلم سے لاہور جانے کیلئے کہا تھا پہلے
تو وہ مسکرا کر ٹالتی رہی۔

لیکن جب واجدہ کا اصرار بڑھا اور اس نے فیصلہ کن انداز میں نیلم سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی، نیلم
تمہارے ابو کو ریزرویشن کیلئے بھیج دوں۔''

تو اسے ایک دم جلال آ گیا، اس کی آنکھیں، اس کی نہ رہیں، اس کی آواز اس کی نہ رہی، آنکھیں
لال انگارہ ہو گئیں اور آواز مردانہ ہو گئی۔

''ارے بے وقوف، کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی ہے۔ تُو نیلم کو لاہور لے جانہ سکے گی، کیوں خواہ
مخواہ اسے پریشان کر رہی ہے۔ تیری نیلم سے ملاقات ہو گئی، اسے بہت جان، جا اپنا رستہ لے۔''

''بی بی آپ کی مرضی، آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف اسے کہیں نہیں لے

جاؤں گی۔'' واجدہ نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

''بس پھر ٹھیک ہے، تُو لوٹ جا۔''

اس تنبیہہ کے بعد واجدہ نے فیاض حسین سے واپس چلنے کو کہا۔ فیاض حسین کچھ اور ہی سوچ ر اس نے اپنے دل کی بات واجدہ سے کہی۔ ''ہم کیوں نہ نیلم کو کچھ بتائے بغیر اسے اپنے لے جائیں۔''

''ارے نہیں فیاض، ایسا غضب نہ کرنا۔ وہ ہمیں برباد کردے گا۔'' واجدہ نے سہم کر کہا۔

پھر وہ دونوں بے بس ہو کر لاہور واپس لوٹ گئے۔ پچھلی مرتبہ دادا غفور نے نیلم کو جانے کردیا تھا تو اس مرتبہ سیّد پور کا جن آڑے آگیا تھا۔

واجدہ اور فیاض حسین کے جانے کے بعد نیلم نے پھر سے پُراسرار خاموشی اختیار کرلی۔ کو سے لاکھ سوال کرتا، اگر اس کا جی چاہتا تو جواب دیتی ورنہ ہونٹ سیئے بیٹھی رہتی۔

شام کو بیٹھے بٹھائے اسے جانے کیا سوجھی کہ اپنا عروسی جوڑا نکال کر استری کرنے لگی۔

راشدہ نے اسے جوڑا استری کرتے دیکھا تو صابرہ کو جا کر بتایا۔

صابرہ بھاگی ہوئی، نیلم کے کمرے میں آئی۔ اب وہ دوپٹے پر استری پھیر رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو نیلم۔''

''اپنا جوڑا استری کر رہی ہوں۔''

''کیوں نیلم۔''

''پہنوں گی، آج شادی کا جوڑا پہننے کو جی چاہ رہا ہے۔'' نیلم نے سادگی سے کہا۔ اور پھر اپ میں مگن ہوگئی۔

وہ بڑی بے نیازی سے اپنے کپڑے استری کرنے میں مگن تھی۔ اس نے پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھ صابرہ کمرے میں موجود ہے یا واپس چلی گئی۔

صابرہ سنگھار میز پر جلتی ہوئی موم بتی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب شمع تھی اسے جلتے ہو دن ہوگئے تھے مگر مجال ہے جو ذرا سی بھی پگھلی ہو...... جانے وہ کس موم کی بنی تھی۔

''نیلم۔'' صابرہ نے دھیرے سے پکارا۔

''جی۔'' نیلم نے پوچھ مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

''بیٹی، یہ کپڑے تم کیوں استری کر رہی ہو، کیا اکبر نے کہا ہے؟'' صابرہ نے سوال کیا۔

''نہیں اکبر نے کچھ نہیں کہا وہ کیا کہیں گے وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' نیلم نے کھوئے لہجے میں جواب

''پھر آج اچانک عروسی جوڑے کا کیسے خیال آگیا۔'' صابرہ نے کریدا۔

''ان کی خواہش ہے کہ آج میں دلہن کے روپ میں ان کے سامنے جاؤں۔'' نیلم نے آہستگی سے کہا۔

''اُن کی؟'' صابرہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''اکبر کی بات کر رہی ہو؟''

''ارے نہیں۔'' نیلم نے استری کرتے ہوئے صابرہ کو مڑ کر دیکھا، اس کے چہرے پر ایک عجیب پُراسرار مسکراہٹ تھی...... ایک عجیب سا حجاب تھا۔

''پھر کس کی بات کر رہی ہو؟'' صابرہ نے فکرمندی سے کہا۔

''میں تو ان کی بات کر رہی ہوں جو سامنے کھڑے ہیں۔'' نیلم بڑے پُراسرار انداز میں بولی۔

''لیکن یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' صابرہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

صابرہ نے سنگھار میز کے آئینے میں دیکھا لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہ آیا...... لیکن وہ خوف میں ضرور مبتلا ہوگئی...... پھر اچانک اس کی نظر جلتی ہوئی موم بتی پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ موم بتی کے برابر وہ خوفناک کالا بلا اطمینان سے بیٹھا اپنے اگلے پاؤں چاٹ رہا ہے۔

کالے بلے کو دیکھ کر صابرہ کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ فوراً تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔

صابرہ کے جانے کے بعد کالے بلے نے سنگھار میز سے چھلانگ لگائی اور نیلم کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ نیلم کو ذرا بھی ڈر نہ لگا وہ اپنا کام کرتی رہی اور وہ اپنا کام کرتا رہا اس کے قدموں میں لوٹتا رہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نیلم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نیلم کو اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تو راشدہ نے فوراً صابرہ کو بتایا۔

''نیلم بھابھی اپنے کمرے میں گئی ہیں؟''

''لیکن رات کو تو وہ کبھی اپنے کمرے میں نہیں گئی۔'' صابرہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''اب جانے لگی ہیں؟'' راشدہ بولی۔

''ذرا دیکھو تو کیا کر رہی ہے؟'' صابرہ نے ہدایت کی۔

''اچھا دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر راشدہ نے نیلم کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لاک نہ تھا۔ راشدہ نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا کمرے میں نیلم کا کہیں پتہ نہ تھا۔

راشدہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ نیلم اچانک کہاں غائب ہوگئی...... ابھی تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیلم کہاں غائب ہوگئی، باتھ روم کا دروازہ کھلا...... نیلم عروسی جوڑا پہنے وہاں سے برآمد ہوئی، اگرچہ نیلم نے راشدہ کو دروازے میں کھڑے دیکھ لیا تھا، لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی...... وہ بڑے اطمینان سے سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں میں برش پھیرنے لگی...... بالوں کو سنوار کر اس نے میک اپ کرنا شروع کر دیا۔

راشدہ نے دروازہ آہستہ سے بند کردیا اور پھر تیزی سے چلتی ہوئی صابرہ کے پاس پہنچی۔

''شادی کا جوڑا پہن چکی ہیں اور اب میک اپ کر رہی ہیں۔'' راشدہ نے رپورٹ پیش کی۔

''کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔'' صابرہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''پتہ نہیں امی۔''

''بھلا بتاؤ یہ سونے کا وقت ہے یا بناؤ سنگھار کا...... وہ سونے کے بجائے دلہن بننے میں لگی ہے۔'' صابرہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''ذرا اس سے پوچھ کیا آج رات وہ اپنے کمرے میں ہی سوئے گی۔''

''امی آپ خود جا کر پوچھ لیں، مجھے ان کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''اچھا چھوڑ اس سے کیا پوچھنا اس نے سونا ہوگا تو خود ہی آجائے گی ہمارے کمرے میں۔'' صابرہ نے لاپروائی سے کہا۔ اصل بات یہ تھی کہ خود اس میں ہمت نہ تھی کہ نیلم کے کمرے میں جا کر بات کرے۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب اکبر باہر سے واپس آیا۔ راشدہ نے گیٹ کھولا۔

''اکبر بھائی ایک بات بتاؤں آپ کو۔'' راشدہ سے رہا نہ گیا، اس نے فوراً رپورٹ پیش کرنے کی اجازت چاہی۔

''ہاں جی، ضرور بتائیں۔'' اکبر نے خوشدلی سے کہا۔

''نیلم بھابھی آج دلہن بنی بیٹھی ہیں۔'' راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ۔'' اکبر نے پوچھا۔

''اپنے بیڈروم میں۔'' راشدہ نے بتایا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں خود جا کر۔'' اکبر نے کہا۔

اکبر سیدھا اپنے بیڈروم کی طرف گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر سے لاک تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا...... دروازہ کھلتے ہی کمرے سے ایک مسحور کن خوشبو کا جھونکا آیا، اکبر نے قدم اندر بڑھانے کی کوشش کی لیکن نیلم نے اسے فوراً روک دیا اور بڑے [illegible] سے بولی۔ ''کیوں آئے ہو یہاں، جاؤ یہاں سے۔''

پھر اس نے اکبر کو پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔ اکبر نے اندر سے چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ پھر سے کھٹکھٹائے یا واپس چلا جائے اتنے میں کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ صابرہ تھی اس نے بڑی نرمی سے اکبر کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

''آجاؤ بیٹا۔'' صابرہ نے آہستگی سے کہا۔

اکبر ایک گمبھیر خاموشی کے ساتھ اپنی ماں کے ہمراہ چلا آیا۔

وہ رات اکبر نے جیسے کانٹوں پر گزاری...... کبھی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا...... کبھی ٹہلنے لگتا...... پھر ٹہلتے ٹہلتے دھم سے بیڈ پر گر پڑتا...... اور کسی زخمی پرندے کی طرح بستر پر تڑپنے لگتا۔

اسے جب بھی نیلم کا خیال آتا...... اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگتی وہ دلہن کا روپ دھارے دوسرے کمرے میں بند تھی اور وہ یہاں کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔

شادی سے پہلے اکبر نے کبھی خواب آور گولی کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شادی کے بعد وہ اکثر گولیوں کا استعمال کرنے لگا تھا۔ نیند نہ آتی تو وہ ٹی وی ٹرالی کو اپنے کمرے میں کھینچ لاتا اور کوئی فلم دیکھنے بیٹھ جاتا...... لیکن ہوتا یوں کہ اس کی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر ہوتیں لیکن دماغ کہیں اور ہوتا۔

پچھلے واقعات گزرے ہوئے حادثات اس کے دماغ کی اسکرین پر نظر آرہے ہوتے...... تب وہ جھنجھلا کر ٹی وی بند کر دیتا اور ایک خواب آور گولی کھا کر سو جاتا...... آج اس کے دل پر اس قدر بوجھ تھا کہ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آرہے تھے، گلا رندھ رندھ جاتا تھا اس کے کمرے میں ایک دلچسپ انگلش فلم پڑی تھی وہ اسے دیکھنے کیلئے آج لایا تھا لیکن اس وقت اس فلم کو دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

جب ذہنی الجھن اور دل کا درد مزید سوا ہوا تو اس نے شیشی سے ایک نہیں چار گولیاں نکالیں باتھ روم میں جا کر پانی سے گلاس بھرا...... اور دو دو کر کے گولیاں پانی سے نگل لیں۔

چار گولیاں کھاتے ہی ایک دم جسم میں سنسنی سی پھیل گئی، وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بستر پر آیا اور ڈھیر ہو گیا، اس نے بمشکل لحاف اوڑھا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا محسوس ہو رہا تھا حالانکہ کمرے میں ٹیوب روشن تھی۔

اسے پسینہ آرہا تھا اور وہ خود کو نرم نرم روئی میں دھنستا محسوس کر رہا تھا پھر اسے گرد و پیش کا ہوش نہ رہا۔

ہوش تو نیلم کو بھی نہ تھا...... اس کی رات کس طرح گزری تھی۔ یہ شاید اسے بھی معلوم نہ تھا۔

اکبر نیند کی چار گولیاں کھا کر مدہوش ہوا تھا تو نیلم کے اس مسحور کن خوشبو نے ہوش چھین لئے تھے۔

صبح جب نیلم کی آنکھ کھلی تھی تو اس کے جسم میں سخت درد تھا جسم ٹوٹ رہا تھا تپ رہا تھا...... آنکھ کھلنے کے باوجود اس سے اٹھا نہ گیا...... اس کے ہاتھ پاؤں سے جیسے کسی نے جان نکال لی تھی...... وہ خاصی دیر اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے لیٹی رہی...... اور گزری رات کے بارے میں سوچتی رہی۔

صبح کو جب اکبر کافی دیر تک اپنے کمرے سے نکل کر باہر نہ آیا تو صابرہ کو فکر ہوئی۔

ناشتہ میز پر لگ چکا تھا...... بابر علی ناشتہ کر رہا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''یہ اکبر کہاں رہ گیا۔'' بالآخر اس نے پوچھا۔ ''آج ناشتہ نہیں کرے گا؟''

''اکبر اپنے کمرے میں ہے...... شاید سو رہا ہے...... میں دیکھتی ہوں جا کر۔'' یہ کہہ کر صا
اُٹھ گئی۔

''ابو آپ کو چائے دوں۔'' صابرہ کے جانے کے بعد راشدہ نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا آدھا کپ دے دو۔'' بابر علی اپنا خالی کپ اس کے سامنے رکھا اور بولا۔ ''نیلم بھی نا
نہیں آ رہی؟''

''بھابھی آج کل دیر سے اُٹھتی ہیں، وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔'' راشدہ نے بتایا۔

''اچھا۔'' بابر علی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

''سنیں۔'' اچانک صابرہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''ذرا اکبر کو دیکھیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔''

''یا اللہ خیر۔'' بابر نے فکر مند ہو کر کہا اور فوراً اُٹھ گیا۔ ''کیا ہوا۔''

''وہ بالکل بے سدھ پڑا ہے جیسے بیہوش ہو۔'' صابرہ نے بتایا۔

بابر علی تیزی سے گیسٹ روم پہنچا...... اکبر واقعی اتنی گہری نیند میں تھا کہ اس پر بیہوشی کا گمان
ہوتا تھا۔

بابر علی نے اس کا سر ہلا کر کئی آوازیں دیں۔ ''اکبر اکبر، بیٹے اکبر۔''

باپ کی آواز سن کر اکبر نے بمشکل آنکھ کھولی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر چند سیکنڈ و
بعد آنکھیں بند کر لیں اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں، نیند سے بوجھل تھیں۔

اس کو دوبارہ سوتے دیکھ کر بابر علی نے اسے پھر ہلایا۔ ''بیٹے، اکبر اُٹھو، کیا شوروم نہیں جانا۔''

باپ کی آواز سن کر ایک مرتبہ اس نے پھر آنکھ کھولی اور آنکھیں چڑھا کر بولا۔ ''آں۔''

اور اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

''یہ کیا ہو گیا ہے اسے۔'' بابر علی، صابرہ سے مخاطب ہوا۔ ''اس قدر گہری نیند۔''

''کہیں اس نے خواب آور گولی تو نہیں کھا لی...... کئی راتوں سے بے خوابی کا شکار تھا، میں نے ہی
اسے ایک گولی لینے کا مشورہ دیا تھا۔'' صابرہ نے بتایا۔

''مجھے لگتا ہے اس نے ایک ساتھ کئی گولیاں کھا لی ہیں، ایک گولی اس قدر گہری نیند نہیں لاتی ہے
بابر علی نے اکبر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دن کوئی بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی...... وہ بھی راشدہ کے شور مچانے پر۔

''اکبر بھائی، اُٹھیں نا آخر کب تک سوئیں گے۔''

اکبر اس کی آواز پر اُٹھ کر بیٹھ گیا، لیکن بیٹھا بیٹھا پھر جھومنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نی
بھری تھی اسے اپنا جسم شکستہ سا محسوس ہو رہا تھا...... گلا بے حد خشک تھا...... زبان پر کانٹے سے چ

رہے تھے۔

''ٹھہریئے، میں آپ کیلئے اسٹرانگ سی چائے بنا کر لاتی ہوں، ایسے نہیں کھلیں گی آپ کی آنکھیں...... اِدھر آپ سوئے ہوئے ہیں، اُدھر نیلم بھابھی بھی سوئی ہوئی ہیں...... دونوں کو گرم گرم چائے دیتی ہوں...... پھر شاید دونوں کی نیند اُڑ جائے۔''

نیلم کا نام سن کر اکبر کی نیند فوراً اُڑ گئی۔

اسے گزری رات کا فسانہ یاد آ گیا۔ نیلم کا دلہن بننا...... کمرے میں بند ہونا اور اسے دھتکار دینا...... نیلم کی وہ غصیلی آواز اب بھی اس کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گھس رہی تھی۔

''کیوں آئے ہو یہاں، جاؤ یہاں سے۔''

''راشدہ چائے بنانے سے پہلے ٹھنڈا پانی پلا، میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔'' اکبر نے راشدہ سے کہا اور اپنا گلا ہاتھ سے مسلنے لگا۔

''اتنی سردی میں ٹھنڈا پانی پئیں گے آپ۔'' راشدہ نے حیرت سے کہا۔

''راشدہ بحث نہ کر۔'' اکبر نے ڈانٹ کر کہا۔

''اچھا لاتی ہوں، غصہ تو نہ ہوں۔'' راشدہ نے جلدی سے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

راشدہ چند لمحوں میں فریج سے ایک ٹھنڈی بوتل نکال لائی۔ گلاس بھر کر اس نے اکبر کو پانی دیا۔

اکبر نے یخ پانی کو اتنی تیزی سے غٹاغٹ پیا کہ راشدہ حیران رہ گئی۔

''اور۔'' اکبر نے گلاس آگے بڑھایا۔

اس طرح اکبر نے تین گلاس ٹھنڈے پانی کے پیئے اور پھر باتھ روم میں منہ ہاتھ دھونے کیلئے چلا گیا۔

منہ ہاتھ بھی اس نے ٹھنڈے پانی سے دھویا...... منہ دھوتے ہوئے اسے خیال آیا کہ رات کو اس نے چار خواب آور گولیاں کھائی تھیں...... پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔

''کیا یہ خودکشی کی کوشش تھی؟''

اس کے ذہن نے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا...... لیکن ضمیر کے کسی گوشے سے آواز آئی شاید ایسا ہی ہو...... اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بڑا خطرناک رجحان اس کے اندر پرورش پا رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر جب اکبر پہنچا تو راشدہ ٹی کوزی سے کیتلی ڈھکے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میز پر صابرہ بھی موجود تھی۔ اس نے ابھی ٹھیک سے ناشتہ نہیں کیا تھا بس شوہر کے ساتھ ایک کپ چائے پی تھی۔ اکبر کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد راشدہ نے انڈے کی پلیٹ اس کے سامنے کی اور ایک ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگی تو اکبر بولا۔ ''نہیں راشدہ میں صرف چائے پیوں گا۔''

''کیوں، اکبر بارہ بجے اُٹھے ہو، اب بھی بھوک نہیں لگی۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''نہیں امی، اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا...... کچھ عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے۔''

''ایک بات بتاؤں اکبر، دیکھو جھوٹ مت بولنا۔''

''جی امی فرمائیں، آپ جانتی ہیں کہ میں جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں۔''

''رات کو تم نے کتنی گولیاں کھائی تھیں۔'' صابرہ نے سوال کیا۔

''جی چار۔'' اکبر نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

''غضب خدا کا۔'' صابرہ نے غصے سے کہا۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے...... اس بے وقوفی کا آخ
مقصد تھا۔ تم نہیں جانتے کہ ان گولیوں کا کیسا سخت ری ایکشن ہوتا ہے۔''

''ہاں، امی میں جانتا ہوں لیکن امی کیا آپ میرے ری ایکشن سے بھی واقف ہیں...... مجھ پ
گزر رہی ہے، اسے جانتی ہیں۔''

''میں سب جانتی ہوں، لیکن میں کیا کروں تم نے میری بات مانی ہی نہیں...... اگر تم میری با
مان لیتے تو آج تمہیں چار اکٹھی گولیاں کھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔'' صابرہ نے افسوس بھرے
میں کہا۔

''امی میں نے آپ کی کیا بات نہیں مانی۔'' اکبر نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''کہاں مانی، میں نے کہا تھا نیلم کو طلاق دیدو، تم نے دی طلاق اسے۔''

''امی چھوڑیں اس بات کو۔'' اکبر نے بے نیازی سے کہا۔

''کیوں اس بات کو کیوں چھوڑ دوں...... اس گھر میں جو تباہی پھیلی ہے وہ صرف نیلم کی وجہ
پھیلی ہے...... ہمارا تو دن رات کا چین حرام ہو کر رہ گیا ہے۔''

''امی اس میں نیلم کا کیا قصور ہے، یہ واقعہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔''

''ہم نے تمام دنیا کی لڑکیوں کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے کیا۔''

''فرض کریں امی خدانہ کرے ایسا ہو اگر آپ کی بیٹی راشدہ اس عذاب میں مبتلا کر دی جائے تو
آپ اُسے گھر سے نکال دیں گی۔''

''ارے تو، تو اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے...... احمقانہ باتیں کرنے لگا ہے...... پھر جو تیر
جی میں آتا ہے کر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔'' یہ کہہ کر صابرہ غصے میں بھری میز سے اُٹھ کر چلی گئی۔

راشدہ اسے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

''معاف کر دینا بہن، میں نے تیرے بارے میں الٹی سیدھی بات کہہ دی ہے...... میرا مقصد
امی کو سمجھانا تھا...... ان کے پاس سارے مسائل کا بس ایک ہی حل ہے طلاق...... لیکن راشدہ م

اسے طلاق نہیں دے سکتا...... میں اس کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا...... یہ میرے بس میں نہیں ہے،
میں تو خود عذاب جھیل رہا ہوں...... امی سے کہنا مجھے مزید عذاب میں مبتلا نہ کریں۔''

وہ واقعی عذاب جھیل رہا تھا اور اس عذاب کی شدت کا اندازہ اس کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا، کسی اور کو کیسے ہو سکتا تھا، جس پر گزرتی ہے بس وہی جانتا ہے۔

خواب آور گولیوں کی وجہ سے اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ نیند کے اثرات ابھی باقی تھے لیکن اس نے سوچا کہ وہ گھر پر رہا تو اس کا دماغ مزید سن ہو جائے گا، اس لئے وہ کپڑے تبدیل کر کے شوروم چلا گیا۔

نیلم جب اپنے کمرے سے نہا دھو کر نکلی تو اکبر گھر سے جا چکا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں گئی۔ راشدہ نے اسے کچن میں جاتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گئی۔

''نیلم بھابھی آپ میز پر چلیں، میں لاتی ہوں ناشتہ۔'' راشدہ نے کہا۔

نیلم چولہے پر کیتلی رکھ کر ماچس ڈھونڈ رہی تھی۔ راشدہ کے آ جانے پر وہ خاموشی سے کچن سے نکل آئی اور ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے راشدہ سے رسماً بھی نہ کہا کہ نہیں میں خود بنا لوں گی ناشتہ۔

نیلم کو بڑی زبردست بھوک لگی تھی، اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا معمول سے کچھ زیادہ ہی کھایا پھر دو کپ چائے پی کر وہ خاموشی سے اُٹھ گئی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

نیلم نے بڑی پُر اسرار خاموشی اختیار کر لی تھی۔ زیادہ تر اس کا وقت اپنے بیڈروم میں ہی گزرتا، اس کے بیڈروم میں جاتے ہوئے راشدہ ہچکچاتی...... صابرہ نے اس کمرے کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راشدہ کبھی کبھار اس کے کمرے میں جھانک لیتی تھی، لیکن اب اس نے بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کمرے میں جاتے ہوئے اسے اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

نیلم اب بہت مشکل سے ہی کسی سے بات کرتی تھی۔ جو اس کے سامنے رکھ دیا جاتا وہ کھا لیتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ پہلے وہ کچن میں راشدہ اور صابرہ کا ہاتھ بٹا لیا کرتی تھی، لیکن اب اس نے کچن کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''لایئے امی میں کر دیتی ہوں۔''

''آخر تم یہ سب کب تک کرو گی، یہ سب کام نیلم کو کرنے چاہئیں آخر وہ اس گھر کی بہو ہے۔''

''امی وہ اس قابل کہاں ہیں کہ کچھ کام کر سکیں، انہیں بیٹھے بیٹھے دورہ پڑ جاتا ہے...... کیا آپ نے اس دن نہیں دیکھا تھا جب وہ روٹیاں پکا رہی تھیں، وہ کھڑے کھڑے جھومنے لگی تھیں اور ان کے ''پٹے نے آگ پکڑ لی تھی، وہ تو میں اتفاق سے وہاں پہنچ گئی تھی ورنہ وہ جھلس کر رہ جاتیں۔'' راشدہ

نے کہا۔

''پتہ نہیں اس گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔''

''امی آپ نے کیا نیلم بھابھی کا چہرہ غور سے دیکھا ہے۔''

''نہیں تو، کیوں؟''

''ان میں اب پہلے جیسی بات نہیں رہی، دس پندرہ دن کے اندر ان کے چہرے پر مردنی سے چھا گئی ہے...... یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں جونکیں روزانہ ان کا خون چوستی ہوں...... چہرے کی شادابی ماند پڑ گئی ہے...... ایسا لگتا ہے جیسے انہیں دیمک لگ گئی ہے۔''

''راشدہ دیمک لکڑی کو لگتی ہے۔'' صابرہ نے اسے ٹوکا۔

''امی جانے کیوں انہیں دیکھ کر مجھے یہی احساس ہوتا ہے جیسے انہیں دیمک لگ گئی ہے۔''

''وہ ہر وقت تو دلہن بنی رہتی ہے۔'' صابرہ نے غصے سے کہا۔

شروع شروع میں اس وقت سے جب نیلم گلاب کی پتیوں کی سیج پر پائی گئی تھی، اس نے یہ وتیرہ لیا تھا کہ شام ہوتے ہی وہ نہانے دھونے کپڑے استری کرنے اور دلہنوں کی طرح سجنے لگ جاتی رفتہ رفتہ اس شدت میں کمی آ گئی۔ سجتی سنورتی وہ آج بھی تھی، لیکن دلہنوں کی طرح نہیں۔

ان دن پندرہ دنوں میں اس میں بڑی تبدیلی آئی، اس کا حسن ماند پڑتا جا رہا تھا۔ راشدہ کا اس کے بارے میں یہ خیال بالکل صحیح تھا، وہ واقعی کسی دیمک زدہ لڑکی کی طرح دکھائی دینے لگی تھی۔

نیلم نے اکبر سے بھی بولنا چھوڑ دیا تھا، وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن اجنبیوں کی طرح...... ان سیاروں کی مانند تھے جو ایک ہی سورج کے گرد گھومتے ہیں، لیکن آپس میں کبھی نہیں ملتے، ایک دوسرے کے سامنے سے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔

ایک دن بابر اور اکبر شوروم سے واپس آئے تو گھر میں ہنگامہ تھا۔

وہ دونوں گاڑی کھڑی کر کے فوراً گھر کے اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیلم کو دورہ پڑا ہے۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر چڑھی بیٹھی تھی اور جھوم رہی تھی۔

جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو نیلم نے سر اٹھایا اور مردانہ کرخت آواز میں بولی۔ ''ہاں آ گیا...... اکبر تو بھی آ گیا...... اب تم دونوں آ گئے ہو تو ایک بات غور سے سن لو...... تمہیں اس گھر کو خالی کرنا ہوگا۔''

''گھر خالی کرنا ہوگا۔'' بابر نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر عمل کروانا بھی جانتے ہیں۔ ہمارے ایک اشارے پر گھر کا سامان باہر سڑک پر جا سکتا ہے، لیکن فی الحال ہم ایسا نہیں کریں گے اگر تم لوگوں نے کل شام تک یہ گھر خالی

کیا تو پھر دیکھنا کیا تماشا ہوتا ہے۔''

اکبر کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بابر نے اسے اشارے سے سختی سے منع کر دیا۔

''لیکن ہم جائیں کہاں؟'' بابر نے آہستگی سے کہا۔

''جہنم میں۔'' نیلم نے اپنی لال لال آنکھوں سے بابر کو گھورا۔

''لیکن جناب آپ خود سوچیں اتنے کم وقت میں ہمارا مکان خالی کرنا کس طرح ممکن ہوگا۔ مکان خالی کرنے کیلئے دوسرا مکان ڈھونڈنا ہوگا۔ اتنی جلدی مکان کہاں مل جائے گا۔ اگر مل بھی گیا تو مکان کا سامان شفٹ کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔ آپ دس پندرہ دن کا وقت دے دیجیے۔'' بابر نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''بالکل نہیں۔ کل شام تک ہر صورت میں مکان خالی کرنا ہوگا۔ میرے لئے یہ بہت آسان ہے کہ اس گھر کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دوں لیکن میں تم لوگوں کا نقصان نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم کسی کرائے کے مکان میں جاؤ۔ اسی لئے تم لوگوں کو پچیس لاکھ روپے فراہم کر دیے ہیں۔ اتنی رقم میں تمہیں اس علاقے میں ایک اچھا مکان مل جائے گا۔ اگر پیسوں کی کمی بیشی ہو تو وہ بھی فراہم کر دیے جائیں گے۔ میں جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا ہے۔ یہ رعایت بھی میں نیلم کی وجہ سے دے رہا ہوں ورنہ میں چاہتا تو مکان بھی خالی ہو جاتا اور تم لوگوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آتا۔'' نیلم نے کرخت مردانہ آواز میں کہا۔

''جی، بہت بہتر ہم ہر قیمت پر کل شام تک یہ مکان خالی کر دیں گے۔'' بابر علی نے بلا سوچے سمجھے ہامی بھر لی۔

''ہاں یہ ہوئی نا بات۔'' نیلم نے خوش ہو کر کہا۔ ''ویسے اپنے بیٹے کو بھی سمجھاؤ اس کے دماغ میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ یہ ہم سے ٹکر لینے کی سوچ رہا ہے، یہ چاہتا ہے کہ مکان خالی نہ کیا جائے۔''

''ارے نہیں جناب، آپ فکر نہ کریں۔ میں نے آپ سے مکان خالی کرنے کا وعدہ کیا ہے، میں کل شام تک آپ کو مکان خالی کر کے دوں گا۔''

سیدپور کے جن نے اکبر کے بارے میں بڑی صحیح رائے قائم کی تھی۔ اسے مکان خالی کر کے جانے کے مسئلے پر شدید غصہ تھا۔ وہ کسی قیمت پر مکان چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ وہ اس سے ٹکرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب کہ بابر علی نے خود ہتھیار ڈال دیے تھے۔ بابر ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اتنے عرصے میں اس گھر میں جو ہوا تھا وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے نزدیک جن کی بات مان لینا عقلمندی تھی۔

نیلم جب نارمل ہو گئی تو اکبر نے اس مسئلے پر بابر سے بات کی۔

''ابو آپ نے مکان خالی کرنے کا وعدہ کیوں کرلیا۔ ہم کل شام تک کس طرح مکان خالی کری
گے۔ بارہ گھنٹے میں مکان کی تلاش اور پھر سامان کی منتقلی کس طرح ممکن ہے۔''

''دیکھیں بیٹا صبح کیا ہوتا ہے۔ تم پریشان نہ ہو میں سب بھگت لوں گا۔''

''لیکن ابو ہمیں چاہیے کہ ہم مکان خالی نہ کریں، یہ ہمارا ذاتی مکان ہے۔ آخر ہم اسے کیوں
چھوڑیں وہ خود کہیں اور شفٹ کیوں نہیں ہو جاتا۔''

''اکبر تم ذرا غور کرو تو اس نے ہمیں اس مکان کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔''

''ہمیں نہیں چاہیے اس کی رقم میں نے تو اس وقت بھی اس میں آگ لگا دینا چاہی تھی مگر آپ
روک دیا تھا۔'' اکبر نے خفگی سے کہا۔

''میں نے ٹھیک کیا تھا، دیکھ لو اب وہ روپیہ ہی ہمارے کام آئے گا۔ ہم اس کے مقابلے میں اب
اچھا گھر خرید سکیں گے۔ رقم میں اگر کمی بیشی ہو تو وہ اسے پورا کرے گا۔''

''ابو، میں اس طرح نہیں سوچنا چاہتا۔ میں رقم کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا۔ ہمیں اس کی رقم کو ا
کے منہ پر مار دینی چاہیے۔''

''بیٹے جوش سے کام نہیں چلے گا، ہمیں ہوش سے کام کرنا ہوگا۔ جذباتی نہ بنو اس طرح مسئلہ اور ا
جائے گا میں اسے اشتعال میں لانا نہیں چاہتا۔'' بابر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اکبر کیلئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اکبر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیّد پور کا جن کیا کھیل، کھیل رہا تھا، وہ اس مکان کو کیوں خا
کرانا چاہتا تھا۔

کیا وہ نیلم کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

اس کے سر سے اپنا منحوس سایہ ہٹا لینا چاہتا تھا۔

اگر ایسا تھا تو پھر اس مکان کو خالی کر دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

لیکن اکبر کا دل جانے کیوں اس مفروضے پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس جن سے اس با
کی توقع کرنا کہ وہ خود بخود نیلم کو چھوڑ جائے گا۔ ایسا ہی تھا جیسے کسی بلی کا چوہے کو دیکھ کر اس
پیچھے نہ بھاگنا۔

اس پوری رات اکبر کو نیند نہ آئی۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور بستر پر کروٹیں بدل بدل کر سوچتا ر
یہاں تک کہ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر جب بیدار ہونے کا وقت تھا تو اکبر کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی کچھ دیر بعد ہی گم
نیند سو گیا۔

بابر خلاف معمول آج پہلے اُٹھ گیا۔ اس نے صابرہ کو اُٹھایا اور دونوں مل کر سوچنے لگے کہ کیا کیا
ائے۔ مکان خالی کرنے کیلئے شام تک کا وقت تھا۔ اگر صرف ان لوگوں کو ہی مکان چھوڑنا ہوتا تو یہ
سئلہ اتنا مشکل نہ ہوتا۔ وہ اُٹھ کر ماموں فرقان کے گھر چلے جاتے۔ ان کا مکان اگرچہ زیادہ بڑا نہ تھا
ر بھی وہاں کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ایک دو ٹھکانے اور بھی تھے۔

لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ مکان مع سامان شفٹ کرنا تھا اور سامان بھی اس گھر میں تھوڑا بہت نہ تھا
ہلے ہی کیا کم سامان تھا کہ نیلم کے جہیز نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔

صابرہ نے مشورہ دیا کہ آج کا اخبار دیکھو۔

بابر نے پہلے برائے فروخت مکانوں کے اشتہار پر نظر دوڑائی۔ اس کے بعد کرایہ پر خالی مکانوں
ے اشتہارات دیکھے۔ ایک اشتہار انہیں اپنے مطلب کا مل گیا۔ مکان گلشن میں ہی تھا، اشتہار میں
یے گئے فون پر بابر نے بات کی اور فوراً ہی صابرہ کو گاڑی میں بٹھا کر مکان دکھانے کیلئے لے گیا۔

وہ اس مکان کو دیکھنے آنے والے پہلے کرایہ دار تھے۔ جلد ہی سارے معاملات طے ہو گئے۔

جب وہ وہاں سے واپس آئے تو خالی گھر کی چابی ان کے ہاتھ میں تھی۔

بابر اور صابرہ جب خالی گھر کی چابی لے کر واپس پہنچے تو اکبر ابھی پڑا سو رہا تھا۔

راشدہ نے گھر کا گیٹ کھولا تو بابر نے سب سے پہلے اکبر کے بارے میں ہی سوال کیا۔ ''اکبر اُٹھا۔''

''نہیں، ابو وہ تو سو رہے ہیں۔'' راشدہ نے جواب دیا۔

''اور نیلم۔'' بابر نے پھر پوچھا۔

''وہ بھی نہیں اُٹھیں، ان کا کمرہ بند ہے۔'' راشدہ نے بتایا۔

''اچھا جا کر اکبر کو اُٹھاؤ۔''

''مکان کا کیا بنا، ابو۔'' راشدہ نے پوچھا۔

''مکان مل گیا ہے یہاں سے قریب ہی ہے اور اچھا ہے۔'' بابر نے بتایا۔

''خدا کا شکر ہے۔'' راشدہ نے سکون کا سانس لیا اور اکبر کو اُٹھانے چل دی۔

جب وہ اکبر کے کمرے میں پہنچی تو دروازے میں ہی ٹھٹھک گئی۔ اس نے جو منظر دیکھا وہ بڑی حد
لک ناقابل یقین تھا۔ اس نے جلدی اپنی آنکھوں کو مسلا مگر وہ منظر غائب نہ ہوا۔

راشدہ جب گھر کا گیٹ کھولنے گئی تھی اس وقت تک نیلم کا کمرہ بند تھا۔ نیلم اپنے کمرے سے باہر
ہیں آئی تھی لیکن اس وقت نیلم، اکبر کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ بیڈ پر اکبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔
کبر بے سدھ سو رہا تھا۔ نیلم اس کے چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اوپر
ٹھا ہوا تھا شاید وہ اکبر کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنا چاہتی تھی۔

دروازے پر آہٹ پا کر نیلم ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئی
راشدہ نے اس کے چہرے پر نمایاں طور پر گھبراہٹ دیکھی۔ نیلم نے راشدہ سے کوئی بات
بلکہ نظریں بھی نہ ملائیں، وہ نظریں بچا کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ راشدہ نے بھی اس
بات نہ کی۔ اس سے کوئی بات ہو ہی نہیں سکی۔ وہ نیلم کو اکبر کے سرہانے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

نیلم کے کمرے سے چلے جانے کے بعد اس نے اکبر کو زور زور سے ہلا کر اُٹھایا۔ ''اکبر
اکبر بھائی۔''

''کیا ہو گیا راشدہ خیریت تو ہے۔'' اکبر نے آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''اکبر بھائی، جلدی اُٹھیں، آپ کو ابو بلا رہے ہیں، ہمیں مکان مل گیا ہے۔''

''مکان مل گیا ہے؟'' اکبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیسے مل گیا۔'' وہ حیران تھا۔

''یہ آپ کو ابو بتائیں گے، چلیں جلدی۔'' راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ''اور ہاں آپ کو
حیرت انگیز بات بتاؤں۔''

''ہاں بتاؤ۔'' اکبر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''میں جب کمرے میں آئی تو......'' راشدہ بتاتے رک گئی وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ بات بھائی
بھی چاہیے یا نہیں۔

لیکن تیر کیوں کہ کمان سے نکل چکا تھا لہٰذا اکبر نے اس سے اگلوا کر چھوڑا۔

راشدہ نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ''میں جب کمرے میں آئی تو آپ کے سرہانے نیلم بھا
بیٹھے پایا۔''

اکبر کیلئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ اسے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور بے انتہا حیرت بھی۔

''وہ میرے سرہانے بیٹھی کیا کر رہی تھی۔'' اکبر نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''وہ......'' راشدہ بتاتے بتاتے پھر رک گئی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے یہ کیسے بتاتی کہ وہ آپ
بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور آپ کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

''راشدہ جھجکو مت، تم نے جو دیکھا ہے وہ صاف صاف بتا دو۔'' اکبر نے اس کا حوصلہ بڑھا

''آپ بھابھی سے خود پوچھ لیجئے گا نا۔'' راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اکبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو سب لوگ جمع ہو چکے تھے۔ خلاف توقع نیلم نے
اس ناشتے کی تیاری میں اس نے راشدہ کا ہاتھ بٹایا تھا، وہ اس وقت خاصی نارمل دکھائی دے رہ
اکبر اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچن سے میز تک آتے اور پھر واپس جاتے نیلم سے کئی

نظریں ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں اکبر کیلئے پھر سے پہچان جاگ اُٹھی تھی۔ نیلم کی خوبصورت آنکھوں
میں اکبر کیلئے محبت کی چمک تھی۔

ناشتہ مکمل طور پر چننے کے بعد، وہ اکبر کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

بابر علی نے مکان ملنے کی روداد سنائی۔ اکبر کو مکان مل جانے پر وہ بھی آسانی سے، بڑی خوشگوار
حیرت ہوئی۔ چلو ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب صرف سامان کی منتقلی باقی تھی۔

دونوں باپ بیٹے نے مل کر طے کیا کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ درمیان میں صابرہ لقمہ دیتی رہی،
لیکن نیلم نے کوئی مداخلت نہ کی وہ خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔

البتہ وہ اپنی پلکوں کی بھاری جھالر اُٹھا کر اکبر کو گاہے گاہے دیکھ لیتی تھی۔

ان نظروں میں بڑی گہرائی تھی، وہی گہرائی جو دو چاہنے والوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اکبر چاہ رہا
تھا کہ اسے موقع ملے تو وہ نیلم سے اپنے کمرے میں آنے کی وجہ پوچھے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرے۔
شادی کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ نیلم، خود اکبر کے پاس پہنچ گئی تھی۔

ورنہ اب تک تو اکبر ہی نیلم کے پاس پہنچتا رہا تھا اور منہ کی کھاتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بابر ناشتے کی میز سے اُٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی صابرہ بھی چلی گئی۔ سامان کی
پیکنگ کا مسئلہ تھا پھر راشدہ اکیلی میز پر رہ گئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کباب میں ہڈی بنی
ہوئی ہے۔

نیلم اور اکبر دونوں آمنے سامنے جمے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چائے پی رہے تھے اور
ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا میز سے اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

تب راشدہ نے میز سے برتن سمیٹے اور وہاں سے اُٹھ گئی۔

راشدہ کے جانے کے بعد نیلم نے اکبر کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ان نگاہوں میں جہاں محبت تھی
وہاں کہیں دُور حسرت بھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی، یہ مسکراہٹ بھی بڑی پُراسرار تھی۔
اس مسکراہٹ میں جہاں خوشی تھی، وہیں دکھ بھی تھا۔

''نیلم تم آج میرے کمرے میں آئی تھیں؟ میرے پاس بیٹھی تھی؟''

''راشدہ نے تمہیں بتا دیا۔'' نیلم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اکبر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا...... ''یقین کرو یہ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی،
کاش اس وقت میں جاگ رہا ہوتا۔''

''اگر جاگ رہے ہوتے تو بھی کچھ نہ ہوتا۔ جب قسمت سو جائے تو پھر بندے کے جاگنے یا نہ
جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' نیلم نے بڑے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیلم کیا ہماری قسمت سوگئی ہے؟ کیا ہماری زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔"

"مجھے تو یہی نظر آتا ہے۔" نیلم نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"نیلم تم مایوس ہوگئی ہو۔" اکبر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں مایوس نہیں ہوں، میں جانتا ہوں کہ اچھا وقت ضرور آئے گا۔"

"کاش ایسا ہوسکتا۔" نیلم کی آنکھوں میں بڑی حسرت تھی۔

"میں جو جانتی ہوں، وہ تم نہیں جانتے، میں جو دیکھ رہی ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔"

"نیلم تم کیا دیکھ رہی ہو۔" اکبر نے پوچھا۔

"اکبر میں اپنے سامنے مکمل تاریکی دیکھ رہی ہوں، اور اندھیرا بالکل قبر جیسا ہے۔"

"نیلم خدا کے واسطے ایسی باتیں مت کرو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، ایسی مایوسی کی باتیں کر کے میرا دل نہ دہلاؤ۔ تم جانتی نہیں ہو کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔"

"لیکن لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔" نیلم نے کہیں دور نظریں جمائے کہا۔

"ہماری قسمت میں کیا لکھ دیا گیا ہے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہماری قسمت میں اندھیرا لکھ دیا گیا ہے۔ جب گہرا اندھیرا چھا جائے تو پاس بیٹھا ہوا بھی آدمی نظر نہیں آتا۔ بس اکبر اب گہرا اندھیرا چھایا ہی چاہتا ہے۔"

"ہم نے مکان کرائے پر حاصل کرلیا ہے، ہم شام تک نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے کیا پتہ نیا گھر ہمارے لئے خوشیاں لے آئے۔ تم جس دلدل میں پھنس گئی ہو شاید اس سے نجات مل جائے۔"

"اکبر تم بہت بھولے ہو، تمہیں دلدل کا اندازہ نہیں۔ دلدل میں جب ایک بار آدمی پھنس جائے پھر اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔" نیلم نے دلیل دی۔

"نیلم تم اس قدر مایوسی کی باتیں کیوں کررہی ہو۔" اکبر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا چاہا، لیکن نیلم نے گھبرا کر فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں۔" وہ خوف سے لرزنے لگی۔

"نیلم میں نے پکا عہد کرلیا ہے، میں تمہیں اس عذاب سے نجات دلا کر رہوں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔" اکبر نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر پکا عہد کیا۔

نیلم نے یہ سن کر قہقہہ لگایا یہ بڑا بے ہنگم قہقہہ تھا۔

اکبر نے اسے غور سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ نیلم اب نیلم نہ رہی تھی اس کی آنکھیں لال انگارہ ہوگئی تھیں اور یہ بے ہنگم قہقہہ اس کا نہ تھا، یہ قہقہہ مردانہ تھا۔

"اچھا تو یہاں حلف اُٹھایا جارہا ہے۔" نیلم نے کرخت مردانہ آواز میں کہا۔ "قسمیں کھائی جارہی ہیں، نجات کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں۔ ارے بے وقوف تو ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ تیرے بڑے ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے، تو، تُو کوئی چیز ہی نہیں۔ چل اُٹھ یہاں سے۔ گھر کا سامان باندھ اور جا یہاں سے۔"

اکبر نے نیلم کی حالت بدلتے دیکھ کر خاموشی اختیار کرلی، وہ ایک لفظ نہ بولا۔

"تُو ہم سے ٹکرانے کی سوچ رہا ہے۔ اپنی جان دینے کی بات کررہا ہے۔ کیا تُو اور کیا تیری جان۔ تیرا وجود ہمارے سامنے دیے کی لو کی طرح ہے، ایک پھونک ماردوں تو دیا دھواں دینے لگے۔"

اکبر نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"چپ چاپ کیوں بیٹھا ہے، بولتا کیوں نہیں۔ ابھی تو بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ نیلم نے تجھے جو بتادیا ہے اسے گرہ میں باندھ لے اب تیرے لئے اندھیرا ہی اندھیرا ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

"میں اس تاریکی کو اجالے میں تبدیل کردوں گا۔" بالآخر اکبر سے چپ نہ رہا گیا، وہ بول اُٹھا۔

"بولا، بولا۔" نیلم نے تالیاں بجائیں اور مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم کمسن ہو۔"

"تم آخر اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"اس نے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔" نیلم نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "اس کے حُسن نے ہمیں مارا ہے۔ اس کی خوبصورت زلفوں کے ہم اسیر ہوئے ہیں۔"

"تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ نیلم میری بیوی ہے۔" اکبر کے لہجے میں خفگی تھی۔

"میں نہیں جانتا، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیلم میری ہے، میری رہے گی۔"

"تم مجھ پر ظلم کررہے ہو، یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے۔"

"ظلم تو تم مجھ پر کررہے ہو، تین بول پڑھ کر اس پر اپنا قبضہ ظاہر کررہے ہو۔ تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اسے طلاق دے کر، اس سے دستبردار کیوں نہیں ہوجاتے۔"

"یہ تمہارا مطالبہ ہے۔" اکبر نے سوال کیا۔

"نہیں میرا مشورہ ہے۔" نیلم ہنسی۔ "مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تمہارے نکاح میں ہے۔ میرے سامنے اس کاغذی نکاح کی حیثیت ہی کیا۔ یہ مشورہ میں تمہاری بھلائی کیلئے دے رہا ہوں۔ کیوں کہ نیلم کو تم اپنی بیوی سمجھ کر خواہ مخواہ ہلکان ہوئے جارہے ہو۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ نیلم کو تمہارے پنجے سے آزاد کروا کر رہوں گا۔" اکبر نے مستحکم لہجے میں کہا۔

یہ سن کر نیلم نے بلند آہنگ اور بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی آواز پورے کمرے میں گونج گئی۔

گھر کے سارے افراد ڈائننگ ٹیبل کی طرف بھاگے۔

''بے وقوف لڑکے، تم ہر وقت میری چٹکی میں رہتے ہو۔ تمہیں جب چاہوں مسل دوں لیکن ! ایسا نہیں کروں گا۔ تم آزاد ہو۔ میں بھی آزاد ہوں۔ اب یہ مقابلہ آزادانہ ہوگا۔'' یہ کہہ کر نیلم نے ا زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنا سر میز پر جھکا دیا۔

بابر، صابرہ اور راشدہ جب میز کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے نیلم کو میز پر سر رکھے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' بابر نے پوچھا۔

''نیلم، اے نیلم۔'' صابرہ نے نیلم کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

''جی۔'' نیلم نے سر اُٹھایا تو وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' صابرہ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

نیلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلے تو خالی خالی نظروں سے صابرہ کو دیکھتی رہی پھر ایک دم اُٹھ کمرے کی طرف چلی گئی۔

''اکبر، کیا ہوا تھا؟'' اب بابر، اکبر سے مخاطب ہوا۔

''وہ آگیا تھا، وہ مجھے چیلنج کر کے گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کسی مچھر کی طرح مجھے اپنی سے مسل سکتا ہے۔ لیکن آج میں نے بھی اسے بتادیا ہے کہ میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں، اس کا مقابلہ کروں گا۔ میں نیلم کو اس کے پنجے سے آزاد کروا کر رہوں گا۔ اب یہ مقابلہ آزادانہ ہو'' اکبر نے بتایا۔

یہ سب سنا تو بابر اور صابرہ کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ انہیں اپنے بیٹے کی نادانی پر غصہ اکبر کی اس سیّد پور کے جن کے سامنے حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ واقعی جب چاہے اسے چٹکی سے مسل تھا۔ دادا غفور اور ماموں فرقان جیسے طاقتور لوگ اس کا کچھ نہ بگاڑ پائے تھے پھر اکبر اس سے خوا کیوں الجھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ یہ کیا نادانی کر رہا تھا۔

پھر کافی دیر تک بابر اور صابرہ اسے سمجھاتے رہے تھے اور جتنا وہ اسے سمجھاتے رہے تھے اتنا اندر سے پُرعزم، مستحکم اور پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ بظاہر اس نے والدین کی نصیحت کے سامنے سر جھکا لیکن اندر سے اس نے سر اُٹھا لیا تھا۔

سیّد پور کے جن کی ہدایت کے مطابق اس گھر کو سورج نکلنے سے پہلے خالی کر دیا گیا۔ گھر میں سامان تھا۔ ٹرک کو دو تین پھیرے لگانے پڑے۔

سامان منتقل ہونے کے بعد، گھر کے افراد نے خالی گھر کا آخری چکر لگایا۔

صابرہ نے اس گھر کو بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا بڑی دلچسپی اور لگن سے اس گھر کی تزئی

آرائش کی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جس گھر کو وہ اپنا سمجھ کر اتنی محبت سے سجا بنا رہی ہے ایک دن اس کا نہ رہے گا۔ اس سے خالی کروا لیا جائے گا۔

صابرہ کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ خالی کمروں میں گھومتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے جنہیں وہ دوپٹے کے کنارے سے صاف کر لیتی۔

بابر نئے گھر میں تھا۔ یہاں اس گھر میں صابرہ، راشدہ، نیلم اور اکبر تھے۔ سب لوگ خاموش تھے۔ اداس تھے اور کیوں نہ اداس ہوتے انہیں ان کے گھر سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

صابرہ آگے تھی اس کے پیچھے راشدہ، نیلم اور اکبر چل رہے تھے گھر کا آخری پھیرا تھا، اس کے بعد معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا تھا، اس گھر کا دروازہ ان پر ہمیشہ کیلئے بند ہو جانا تھا یا یہ بے دخلی عارضی تھی۔

صابرہ ایک ایک کمرے میں جا کر ان کے در و دیوار کو اپنی آنکھوں میں بھر رہی تھی اس گھر کے آگے پیچھے صابرہ نے کتنی محنت سے طرح طرح کے پودے لگائے تھے، پھول اگائے تھے۔ اس گھر کے آنگن کو گلشن بنایا تھا۔

آج اسی گلشن کو خدا حافظ کہنا پڑ رہا تھا۔

صابرہ نے پورے گھر کا چکر لگانے کے بعد پھر سے اندر جانا چاہا تو اکبر نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بس امی...... چلئے...... یہ گھر آپ کا ہے، آپ ہی کا رہے گا۔ اسے اس طرح نہ دیکھیے جیسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔'' اکبر نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''اللہ، تیری زبان مبارک کرے۔'' صابرہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اکبر کو دیکھا اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولی۔ ''آؤ اب چلیں۔''

''اکبر بھائی، آپ گھر کے تمام کمروں کو بند کر کے دروازے لاک کر دیں، یہ لیجیے چابیاں، تب تک ہم چل کر گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔'' راشدہ نے اکبر کی طرف چابیوں کا گچھا بڑھاتے ہوئے کہا۔

پھر صابرہ، راشدہ اور نیلم گھر سے باہر نکل گئیں اکبر کو جلد آنے کی تلقین کر کے۔

اکبر نے سب سے پہلے اپنے بیڈروم کو بند کیا۔

وہ موم بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ پہلے وہ سنگھار میز پر رکھی رہتی تھی لیکن سنگھار میز کے نکل جانے کے بعد اس موم بتی کو کمرے کے فرش پر رکھ دیا گیا تھا۔

کمرہ بالکل خالی تھا بس ایک موم بتی تنہا جل رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، یہ جلتی ہوئی لَو بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔

اکبر کی شمع سے نظر ہٹی تو اس نے دیکھا کہ موم بتی سے تھوڑے فاصلے پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اگلے

دونوں پاؤں کو چاٹ رہا تھا اور اس کی گول گول لال انگارہ آنکھیں اکبر کو گھور رہی تھیں۔

اکبر نے جلدی سے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا اور پھر اس نے جب تالا لگانا چاہا تو تالے میں چابی گھومی۔ جیسے تالے کو زنگ لگ چکا ہو۔ اکبر نے چابی نکال کر ایک نظر اس کے نمبر کو دیکھا چابی کا نم ٹھیک تھا۔ تب اس نے زیادہ زور آزمائی مناسب نہ سمجھی۔ وہ تالا بند کیے بغیر دوسرے کمرے کی طر بڑھ گیا۔

لیکن وہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ چابی درست ہونے کے باوجود تالے میں نہ گھومی پھر ایک ایک کر کے اس نے سارے دروازے آزما ڈالے۔ کسی دروازے میں چابی نہ لگی، کوئی تالا بند نہ ہوا۔

مجبوراً وہ گھر کے تمام دروازوں کو کھلا چھوڑ آیا۔

باہر آ کر اس نے گیٹ بند کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تالا تھا۔ اس تالے کو گیٹ میں ڈالنا تھا۔

اکبر نے سوچا جس طرح گھر کے تمام دروازوں کے تالے ناکارہ ہو چکے ہیں اسی طرح یہ تالا بھی ناکارہ ہو چکا ہوگا اور اب اس گھر کو بالکل کھلا چھوڑنا پڑے گا۔

اکبر نے چلتے چلتے اس بڑے تالے میں یہ سوچ کر چابی گھمائی کہ وہ بھی نہیں گھومے گی لیکن وہ گھوم گئی۔ اکبر کو خوشی ہوئی کم از کم اس گھر کا مین گیٹ تو بند ہو سکے گا۔

پھر اکبر نے گھر سے باہر نکل کر آہنی گیٹ کو بند کیا اور اس میں بڑا سا تالا ڈال کر چابی گھما دی۔

تالے سے چابی نکال کر اکبر نے تالے کو دو تین جھٹکے دیے تالا بند ہو چکا تھا۔

اکبر نے ایک گہرا سانس لیا۔ گھر پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور تیزی سے چلتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔

خواتین پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں اور اس کی شدت سے منتظر تھیں۔

''اکبر گھر کے تمام دروازے بند کر دیے؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''جی امی، دروازے تو تمام بند کر دیے ہیں لیکن تالا کسی کو نہیں لگا سکا۔'' اکبر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے! وہ کیوں؟'' راشدہ نے پوچھا۔

''باوجود کوشش کے کسی تالے میں چابی نہیں گھومی۔'' اکبر نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

''یہ تو بہت بُرا ہوا'' صابرہ نے پریشان ہو کر کہا...... ''سارا گھر کھلا پڑا ہے کوئی گھر میں گھس سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ خطرہ تو ہے لیکن شکر ادا کریں کہ گیٹ پر تالا لگ گیا اگر وہ بھی بند نہ ہوتا تو ہم کیا کر لیتے گھر کو اسی طرح کھلا چھوڑنا پڑتا۔''

''اکبر بھائی آپ چوکیدار سے کہہ دیجیے گا وہ خیال رکھے گا۔''

اکبر کو جہاں اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ تھا وہاں ایک خوشی بھی تھی کہ نیلم اس کے ساتھ تھی جب جن نے نیلم کے ذریعے آج شام تک گھر خالی کرنے کا حکم دیا تھا تو اکبر کے ذہن میں تھا کہ جیسے ہی گھر خالی ہوگا کچھ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ نیلم کو اس خالی گھر میں چھوڑنا ناگزیر ہو جائے گا۔

خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ گھر سیّد پور کے جن نے نیلم کیلئے خالی کرایا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس جن نے خود بخود نیلم کا پیچھا چھوڑ دیا ہو، ایسا کبھی ہوا تو نہیں ہے کہ کسی لڑکی پر جن کا سایہ ہوا ہو اور وہ خود بخود ہی غائب ہو گیا ہو۔ بغیر عمل کے جن کبھی جان نہیں چھوڑتا۔

بہر حال جو بھی صورت حال تھی اب تک اکبر کے حق میں تھی۔

گھر خالی کر دیا گیا لیکن نیلم اس کے ساتھ تھی اور وہ خوش ہوتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پانسہ پلٹ نہ جائے اگر آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو پھر اس بات کے امکانات روشن ہو جائیں گے کہ نیلم کا اس جن سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔

نیلم اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھی تھی، صابرہ اور راشدہ پیچھے تھیں۔

ہوا کی وجہ سے نیلم کے خوبصورت بال بار بار اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔ اکبر ترچھی نظروں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ خوبصورت چہرے کو چومتی ہوئی حسین زلفیں ایک مسحور کن نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

کیا یہ خوبصورت چہرہ ہمیشہ کیلئے اس کا ہو گیا تھا۔

اکبر کا بار بار جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوشی سے بھرپور قہقہہ لگائے لیکن اندر سے اسے کوئی قہقہہ لگانے سے روک رہا تھا۔

ابھی ٹھہرو، انتظار کرو، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ابھی جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ نیلم سے دُور رہے گا، وقت کا انتظار کرے گا۔

نئے گھر پہنچے تو بابر ان کا منتظر تھا۔

وہ بیل بجتے ہی گیٹ کی طرف بھاگا۔

جب اس نے فرنٹ سیٹ پر نیلم کو اکبر کے ساتھ بیٹھا دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ جانے کیوں اس کے دل میں یہ بات بار بار آ رہی تھی کہ نیلم ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئے گی، اسے خالی گھر میں ہی روک لیا جائے گا۔

اس وقت گھر مال گودام بنا ہوا تھا۔ سامان اتار کر ایسے ہی رکھ دیا گیا تھا۔

پھران لوگوں نے ایک کمرہ بیٹھنے اُٹھنے کیلئے تیار کرلیا۔ باقی سامان آہستہ آہستہ سیٹ ہوتا رہے گا کچن کواس قابل کیا گیا کہ چائے بنائی جاسکے۔

رات کو اکبر کھانا باہر ہوٹل سے لے آیا۔ سب لوگوں نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانا کھا کر اکبر نے آئس کریم کھانے کی تجویز پیش کی۔

بابر نے کہا'' بھئی تم لوگ چلے جاؤ میں گھر میں رہوں گا۔ سب لوگ جائیں تو گھر کو تالا لگانا پڑے گا، ویسے بھی میں تھک گیا ہوں۔''

بابر نے جانے سے معذرت کی تو صابرہ کیسے جاتی۔ اس نے بھی تھکن کا بہانہ کردیا۔

اب رہ گئی راشدہ تو وہ جانے کیلئے تیار تھی لیکن صابرہ نے کچھ سوچ کر اسے بھی روک لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے ساتھ جانے والی صرف نیلم رہ گئی۔

''تم کیا کہتی ہو۔''

''میں چلوں گی آپ کے ساتھ۔'' نیلم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''پیدل چلیں گے، مارکیٹ نزدیک ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' نیلم نے کہا۔

''اچھا امی ہم ابھی آتے ہیں۔'' اکبر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''اکبر بھائی آئس کریم لانا نہ بھولئے گا۔'' راشدہ نے زور سے کہا۔

''اچھا، اچھا نہیں بھولوں گا۔''

''یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ٹہلنے نکلے تھے۔ تنہائی کا یہ موقع انہیں آج تک میسر نہیں آیا تھا۔ اکبر بہت خوش تھا لیکن اس خوشی میں وہ کوئی بے اعتدالی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نیلم آج میں بہت خوش ہوں۔''

''اپنا گھر خالی کر کے بھی۔'' نیلم نے اس کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں اپنا گھر چھوڑ کر بھی، نیلم جانتی ہو کیوں؟''

''نہیں، میں نہیں جانتی۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتی، مجھے خوشی سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں آخر؟'' اکبر نے پوچھا۔

''اس خوشی کیلئے میں کیسے خوش ہوں، جو میرے نصیب میں ہی نہیں۔''

''کیا تم آج خود کو ہلکا پھلکا نہیں محسوس کرتی ہو۔ کیا کوئی بوجھ تمہارے سر سے نہیں ہٹا۔''

''نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے لئے سب کچھ پرانا ہے۔''

''مجھے تو روشنی نظر آرہی ہے۔'' اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ مانگے کا اجالا ہے۔'' نیلم نے دھیرے سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اکبر بولا۔

''مجھے دُور تک روشنی نظر نہیں آرہی، تاریکی ہی تاریکی چھائی ہے۔''

''نیلم خدا کے واسطے اچھی باتیں کرو مجھے خواب دکھاؤ خود خواب دیکھو۔''

''ایسے خواب دیکھنے کا کیا فائدہ جن کے کرچی کرچی ہونے کا احتمال ہو۔''

''پھر وہی مایوسی کی بات۔ نیلم تمہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''میں کیا جانوں مجھے کیا ہو گیا ہے، بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں جل رہی ہوں۔''

''نیلم کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتیں جیسے تم آزاد ہو گئی ہو۔''

''میں کہاں ہوئی ہوں آزاد۔ میرے ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے۔ میرے جسم کو شعلوں سے باندھ دیا گیا ہے۔'' نیلم نے بڑے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو نیلم، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے تو کچھ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا اکبر، بس تم مجھے معاف کر دینا، مجھے مجبور جان لینا۔''

''نیلم ایک بات بتاؤ، دیکھو سچ کہنا۔''

''جی، سچ کہوں گی، فریب سے کام نہ لوں گی۔ تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔''

''جس طرح میں تم سے محبت کرتا ہوں کیا ویسے ہی تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔''

''اکبر اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ نہ چل رہی ہوتی۔''

''یہ میری بات کا جواب نہ ہوا۔'' اکبر نے شکوہ کیا۔

''آج کی رات گزر جانے دو، صبح تمہیں خود بخود اپنی بات کا جواب مل جائے گا۔''

''اس چھوٹی سی بات کیلئے مجھے پوری رات انتظار کرنا ہو گا۔ خیر کوئی بات نہیں، میں کروں گا، انتظار۔ مجھے تو انتظار کی جیسے عادت ہو گئی ہے۔''

''تم بہت اچھے انسان ہو اکبر۔'' نیلم نے بڑی محبت سے کہا۔ ''تم نے میرے لئے بہت عذاب جھیلے ہیں۔ کاش میں تمہیں ان عذابوں سے بچانے کی سکت رکھتی۔''

نیلم نے سچ کہا تھا وہ واقعی اسے عذابوں سے بچانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

یہ دونوں آئس کریم کھا کر واپس آئے۔ گھر کے افراد کیلئے بھی آئس کریم لیتے آئے۔

پھر رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ طے ہوتا رہا کہ کون، کون سا کمرہ لے گا۔ سامان کہاں رکھا جائے گا۔ سامان کو کس طرح سیٹ کیا جائے گا۔

پھر وہ لوگ ایک ہی کمرے میں جہاں جسے جگہ ملی پڑ کر سو گیا۔

صبح سب سے پہلے اکبر کی آنکھ کھلی۔ اس نے کروٹ لے کر اس جگہ کو دیکھا جہاں نیلم سوئی تھی۔ وہاں نیلم نہ تھی۔

تب اسے اپنے سینے پر رکھے کسی کاغذ کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے سینے سے اس کاغذ کو اُٹھا لیا اور فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

یہ نیلم کا خط تھا۔

اس کاغذ پر چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ بھورے رنگ کا کاغذ تھا۔ شاید کسی لفافے سے پھاڑا گیا تھا۔ بال پین سے آڑھے ترچھے جملے لکھے ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت عجلت میں یہ جملے تحریر کیے گئے ہوں۔ اکبر نے خط پڑھنے سے پہلے خط لکھنے والے کا نام دیکھا۔ خط کے آخر میں لکھا تھا۔

''تمہاری نیلم۔''

میری نیلم۔ اکبر کو اس کا تمہاری نیلم لکھنا بہت اچھا لگا۔ پھر اس نے جلدی جلدی خط پر نظر ڈالی لکھا تھا۔

اکبر...... جان نیلم......

میں جا رہی ہوں۔ میرا تعاقب نہ کرنا۔ میں خالی گھر میں جا رہی ہوں، میں اب وہیں رہوں گی۔ یہ چند گھنٹے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے ہیں، ان کی مجھے بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ تین بجنے والے ہیں، وہ مجھے لینے آتے ہوں گے۔ مجھے معاف کر دینا، میں بہت مجبور ہوں۔ میں تمہیں خوشیاں نہ دے سکی لیکن ملا مجھے کچھ نہیں۔ بس آگ ہی آگ ملی ہے۔ میں اس آگ میں آہستہ آہستہ جل رہی ہوں، جھلس رہی ہوں، میں رو سکتی ہوں، نہ چیخ سکتی ہوں۔ بس سسک رہی ہوں۔ ایک دن آئے گا کہ میں اسی طرح سسکتے سسکتے مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں تو میری لاش میرے ماں باپ کو بھجوا دینا۔ اچھا اللہ حافظ۔

تمہاری، نیلم

اس خط کو پڑھ کر اکبر سناٹے میں آ گیا۔ وہ اسی لئے تو رات کو خوش نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سے کہیں آواز آ رہی تھی کہ نیلم کا تمہارے ساتھ چلے آنا ضروری نہیں کہ خوشی کا باعث ہو لہٰذا خوشی منانے میں عجلت پسندی سے کام نہ لو...... اور ہوا بھی وہی۔

یہ خوشی اسے چند گھنٹوں کیلئے ملی۔ یہ چند گھنٹے بطور بھیک اس کی جھولی میں ڈالے گئے۔ وہ بھی نیلم کے اصرار پر...... اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ نیلم کو بھی اس سے محبت ہے ورنہ اسے کیا ضرورت تھی چند گھنٹوں کی بھیک لینے کی۔ جانے کتنی خوشامد کر کے اس نے یہ چند گھنٹے حاصل کیے ہوں گے۔ نیلم کس قدر مجبور ہے، وہ کتنی مظلوم ہے۔ جانے وہ کیسی آگ میں جل رہی ہے۔ کن شعلوں میں گھری

ہے۔ رونا چاہے تو رو بھی نہیں سکتی۔

کیا میری نیلم اسی طرح سسک سسک کر مر جائے گی۔ میں اس کیلئے کچھ نہ کر سکوں گا۔ میں نیلم کے ماں باپ سے ان کے جگر کے ٹکڑے کو اس لئے اپنے ہمراہ لایا تھا کہ اس کی لاش انہیں بھجوا دوں۔ کیا سوچیں گے اس کے ماں باپ میرے بارے میں...... ان کی گڑیا سی بیٹی کی جان نکال کر لاش انہیں پارسل کر دی۔ کیا اسی لئے ان لوگوں نے مجھے اپنی بیٹی دی تھی۔

جیسے جیسے وہ سوچتا جا رہا تھا، اس کے دماغ کی رگیں کھنچتی جا رہی تھیں۔

وہ اس وقت شدید اعصابی دباؤ میں تھا۔ جسم میں بے کلی بڑھ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دے۔

آنکھوں میں اندھیرا اتر رہا تھا، دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اس نے نیلم کے خط کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اچانک صابرہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے اکبر کو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اکبر کا چہرہ دیکھ کر صابرہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

''اکبر، میرے بیٹے، تجھے کیا ہوا؟'' صابرہ تقریباً چیختی ہوئی اُٹھی۔

اکبر نے ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ بے کسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

صابرہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے سے لگا لیا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟''

پھر اچانک اسے نیلم کا خیال آیا۔ اس نے گردن گھما کر اس جگہ کو دیکھا جہاں نیلم کا بستر لگا ہوا تھا، وہ جگہ خالی تھی۔

''ارے نیلم کہاں گئی؟''

تب اکبر نے اپنی جیب سے وہ خط نکال کر صابرہ کے حوالے کر دیا۔ اکبر کا ہاتھ لرز رہا تھا اور پلکوں پر موتی جھلملا رہے تھے۔

صابرہ نے اکبر سے پرچہ لے کر جلدی جلدی پڑھا۔ جوں جوں وہ خط پڑھتی گئی۔ اس کا رنگ بدلتا گیا۔ جب آخری سطر پر پہنچی تو اس کا کلیجہ جیسے کھنچ گیا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

''اے اللہ، اس بچی پر رحم کر۔'' صابرہ نے دل تھام کر دعا مانگی۔

ان دونوں کی باتوں کے شور سے بابر علی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ راشدہ بھی اُٹھ بیٹھی۔

صابرہ نے بغیر کچھ بتائے بابر علی کے سامنے نیلم کا پرچہ کر دیا۔ بابر نے حیرت سے پہلے صابرہ کو

دیکھا...... پھر ہاتھ بڑھا کر پرچہ لے لیا۔ پرچہ پڑھ کر اسے بہت دکھ ہوا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی تھی جب میں نے نیلم کو تم لوگوں کے سا
واپس آتے دیکھا تھا......''

''اکبر تُو پریشان نہ ہو۔'' صابرہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ اپنے گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔

اس کے جسم میں لرزش تھی۔

صابرہ نے اس کا چہرہ اس کے گھٹنوں سے نکالا پھر اسے اپنی طرف کیا۔ صابرہ اس کا چہرہ دیکھ
تڑپ اُٹھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''ارے بے وقوف روتا کیوں ہے؟'' صابرہ نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''امی، میں کیا کروں؟'' اکبر نے سسکتے ہوئے کہا۔

''ہمت سے کام لو، تمہارے رونے سے کیا ہوگا؟'' صابرہ نے اسے تسلی دی۔

''اکبر بیٹے کسی کے رونے سے کچھ نہ ہوگا، ہم سب بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے...... اور جو
کچھ نہ کیا جا سکتا ہو، وہاں آنسو بہانے کا فائدہ۔ خود کو ہلکان مت کرو بیٹے......'' بابر علی نے اسے سمجھا
لیکن آنسو اس کے بس میں کب تھے۔ وہ آتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں
کی طرح برس رہے تھے۔ وہ یہاں بھی مجبور تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے جانے کتنی دیر تک اپنی قسمت کو روتا رہا۔

جب آنسو خوب بہہ گئے۔ من کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ تب وہ اُٹھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ لباس
تبدیل کیا اور گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلنے لگا۔

گاڑی کی چابی لے جاتے دیکھ کر صابرہ نے اسے پکارا...... ''اکبر......''

''جی امی......'' وہ جاتے جاتے رک گیا۔

''کہاں جا رہے ہو، بیٹے ناشتہ نہیں کرنا۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''ابھی آتا ہوں امی۔''

''آخر جا کہاں رہے ہو؟''

''میں نے کہا نا، ابھی آتا ہوں......'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ اس نے صابرہ کو
بولنے کا موقع نہ دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خالی گھر کا رخ کیا۔

دن خاصا چڑھ آیا تھا لیکن آسمان پر گھرے بادل ہونے کی وجہ سے اس کا احساس نہیں

تھا۔ سورج بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے سردی بھی اچھی
خاصی تھی۔

رات کو شاید بارش ہوئی تھی...... سڑکوں کے کنارے جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ بادل اب بھی گھرے
تھے۔ لگتا تھا جیسے جلدی بارش شروع ہونے والی ہے۔

یہ بادل رات کے بارہ بجے کے بعد سے چھانا شروع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ گیارہ ساڑھے
گیارہ بجے تک باتیں کرتے رہے پھر سب ہی تھکے ہوئے تھے اس لئے اپنے اپنے بستروں میں
جا گھسے اور سو گئے۔

اگر اکبر کو یہ معلوم ہوتا کہ نیلم آج رات اس سے جدا ہو جائے گی تو کبھی نہ سوتا۔ جب سب سو گئے تو
نیلم اپنے بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکبر اس کے سامنے ہی لیٹا تھا۔ سب بے خبر اور بے سدھ سو رہے
تھے۔ نیلم، اکبر کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

وہ اس وقت تک جب تک اس کے جانے کا وقت نہیں ہو گیا یونہی خاموشی سے اکبر کو دیکھتی رہی۔
اسے معلوم تھا کہ وہ آج رات اس سے جدا ہو جائے گی۔ کون جانے پھر وہ اکبر کو دیکھ بھی سکے گی یا
نہیں۔ وہ اس مہلت سے جو اسے ملی تھی، پورا پورا فائدہ اُٹھا لینا چاہتی تھی۔ یہ آخری دیدار تھا۔ خاموش
ملاقات تھی۔

اگر اکبر کو یہ معلوم ہوتا کہ نیلم بجائے سونے کے اس کے چہرے کو چاند سمجھ کر دیکھ رہی ہے تو وہ
کاہے کو اپنی آنکھیں بند کرتا۔ وہ اپنی پیاسی آنکھوں میں نیلم کی حسین صورت بھر لیتا۔ اسے اپنی آنکھوں
میں بسا لیتا، سما لیتا۔

ڈھائی بجے کے قریب نیلم کو کالے بلے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف
دیکھا مگر کالا بلا کہیں نہ دکھائی دیا۔

تب جلدی جلدی نیلم نے اکبر کے نام پرچہ لکھا اور اس کے سینے پر رکھ دیا۔

وہ جانتی تھی کہ کسی بھی وقت بلاوا آنے والا تھا۔ بلاوا آنے تک وہ اکبر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

پھر وہ آواز آئی۔ اس کے دماغ میں کہیں دُور سے وہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ اسے بلا رہا تھا۔

''آؤ نیلم...... آؤ نیلم...... آؤ نیلم۔''

تب وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ گیٹ پر پہنچی
تو گیٹ خود بخود کھل گیا۔

اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک بجی سجائی بگھی سامنے کھڑی ہے اور اس بگھی

میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں۔ دو سفید گھوڑے۔

نیلم کو گیٹ سے باہر آتا دیکھ کر وہ سیّد پور کا جن شہزادے کے رُوپ میں بگھی سے نیچے اترا۔ ا
نے آگے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ تھاما۔

نیلم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ کسی شعلے پر رکھا گیا ہو۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بصد احترام اسے لئے بگھی کی طرف بڑھا۔ اس کو بگھی میں بیٹھنے کی مدد کی....

نیلم جب بگھی میں بیٹھ گئی تو وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''چلو۔'' اس نے حکم دیا۔

سیّد پور کا جن کے حکم پر بگھی چل پڑی۔

نیلم کو بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ جب وہ بگھی میں بیٹھی تھی تو کوچوان کی جگہ پر کوئی نہ تھا۔ پھر یہ بگھی
کیسے چل پڑی تھی۔ اس نے تھوڑا اچک کر دیکھنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے کوچوان کی سیٹ پر کوئی بش
نظر نہیں آیا۔

بگھی نے اب رفتار پکڑ لی تھی لیکن گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نہیں آرہی تھی یہ کیسے گھوڑے تھے؟
پختہ سڑک پر بے آواز چل رہے تھے پھر اسے احساس ہوا کہ بگھی سڑک پر نہیں چل رہی بلکہ بگھی سڑک
پر اڑ رہی ہے۔

نیلم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ابھی چند سیکنڈ ہی ہوئے ہوں گے آنکھیں بند کیے کہ اسے بگھی کے
رکنے کا احساس ہوا، اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو پرانے گھر کے سامنے پایا۔

سیّد پور کے جن نے اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی گیٹ خود بخود کھلتا چلا گیا۔

جب پورا گیٹ کھل گیا تو بگھی گھر کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ پھر بگھی رکی تو وہ اترا۔ اس نے
نیلم کو سہارا دے کر بگھی سے اتارا۔ گھر میں داخل ہو گئے۔

نیلم نے دروازہ بند ہونے سے پہلے جب باہر دیکھا تو اسے وہاں بگھی نظر نہ آئی۔

گھر کا دروازہ بند ہوتے ہی آسمان پر بادل آپس میں ٹکرائے۔ بڑے زور کی گرج پیدا ہوئی بج
اتنی زور سے چمکی کہ پورا آسمان روشن ہو گیا۔

اس زوردار گرج چمک کے بعد چھما چھم بارش شروع ہو گئی۔

نیلم جب شام کو اس گھر سے گئی تھی تو یہ گھر بالکل خالی ہو چکا تھا، بس اس کے بیڈروم میں شمع جل
رہ گئی تھی، لیکن اس وقت جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پورا گھر سامان سے
بھر چکا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ بڑے قرینے سے رکھی تھی اور جو چیز بھی تھی وہ اپنی جگہ بہترین تھی۔ ڈرائنگ
روم، بیڈرومز، ٹی وی لاؤنج، کچن غرض گھر کا کوئی کونا ایسا نہ تھا جو اشیاء سے خالی ہو۔

یوں لگتا تھا جیسے اس گھر سے کوئی گیا ہی نہ ہو جیسے یہ گھر خالی ہوا ہی نہ ہو۔

پورا گھر دیکھ کر نیلم اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ سیّد پور کا جن شہزادے کے رُوپ میں اس کے ساتھ
ساتھ چل رہا تھا۔ نیلم گھر کا معائنہ کر رہی تھی اور وہ خاموشی سے اس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

بیڈروم میں ایک خوبصورت سنگھار میز پر شمع روشن تھی۔

یہ شمع محبت تھی اور اسے سیّد پور کے جن نے روشن کیا تھا۔ یہ عجیب شمع تھی اتنا عرصہ مسلسل جلنے کے
بعد بھی ذرا سی بھی نہ پگھلی تھی۔

اس کمرے میں وہ مسحور کن خوشبو بسی ہوئی تھی جو اس کے ہوش لوٹ لیا کرتی تھی۔

نیلم ایک گہرا سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس بیڈ پر انتہائی نرم، ملائم اور ریشم جیسا بستر بچھا ہوا تھا۔
ایسا بستر کہ آدمی بیڈ پر بیٹھے تو محوِ خواب ہونے کو جی چاہے۔

نیلم اس ریشمیں بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

سیّد پور کے جن نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بڑی محبت سے بولا۔ ''نیلم آپ کو اپنا گھر پسند آیا۔''

''ہاں اچھا ہے، خوب سجایا ہے آپ نے۔'' نیلم نے رسمی تعریف کی۔

''تمہاری اس سے ملاقات ہو گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' نیلم نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا کیا باتیں ہوئیں ہمیں نہیں بتائیں گی۔'' اس نے اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔

''کوئی خاص بات نہیں، بس رسمی سی۔'' نیلم نے بتایا۔

''وہ اداس تو ہوا ہوگا؟'' سیّد پور کے جن نے سوال کیا۔

''اس وقت تو نہیں تھا، صبح ہو تو ہو۔'' نیلم نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے اسے کچھ بتایا نہیں؟''

''نہیں، میں نے اسے کچھ نہیں بتایا، بس اشاروں اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ کھل کر
ا نے اس سے کچھ نہیں کہا کہ پریشان ہو جاتا۔ چند گھنٹوں کی جو خوشی اسے ملی تھی، وہ بھی اکارت
ل۔ میں اس کے نام ایک پرچہ لکھ آئی ہوں صبح اُٹھ کر پڑھے گا تو سب کچھ جان لے گا۔''

''تم اسے چھوڑ کر اُداس ہو۔'' سیّد پور کے جن نے پوچھا۔

نیلم کا جی چاہا کہ فوراً ہاں کہہ دے لیکن وہ جانتی تھی کہ ''ہاں'' کہہ کر اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا، لہٰذا اس
ا پنے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ ''میں کیوں ہوتی اُداس۔ میں آپ کو اُداس دکھائی دیتی ہوں۔''

یلم کے اس جواب نے سیّد پور کے جن کو خوش کیا۔

''آج کی رات کس قدر حسین ہے، باہر ابر کرم برس رہا ہے اور اندر تمہارے حُسن کی چاندنی برس

رہی ہے آج کی رات۔ جو مانگو گی آناً فاناً حاضر کر دیا جائے گا۔"

"میں جو مانگوں گی وہ آپ مجھے دے نہ سکیں گے، اگر ایسا ہونا ہوتا تو میں اس گھر میں تنہا جاتی۔" نیلم نے اداس ہو کر کہا۔

"نیلم ہم سے وہ نہ مانگو جو ہم دے نہیں سکتے، ہم سے وہ مانگو جو ہم دے سکتے ہیں۔ ہم آپ نہ مانگو۔ اپنے وجود کی آزادی نہ مانگو، ہم تو خود تمہارے قیدی ہیں۔ ایک قیدی کسی کو کیا کر سکتا ہے۔ تمہیں آزاد کرنا ہمارے بس سے باہر ہے اگر تم آزاد ہو گئیں تو ہم مر جائیں گے۔ نیلم برستی بارش کی قسم ہم سے ہمارا وجود نہ مانگو۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"فکر مند نہ ہوں، میں آپ سے کچھ نہیں مانگ رہی، میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے کیا دے ہیں کیا نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے مقدر میں کیا لکھ دیا گیا ہے۔ میرے مقدر میں شعلے لکھ گئے ہیں۔ سو مجھے ان شعلوں سے گزرنا ہوگا، اس آگ سے کھیلنا ہوگا۔" یہ کہہ کر نیلم نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

"نیلم۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں اسے پکارا۔ "رومت، اس برستی بارش کی قسم میں آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے نیلم کا بازو چھوا۔

نیلم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی شعلے نے اسے چھو لیا ہو۔

"پھر میں کیا کروں؟" نیلم نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے بھیگی نظروں سے دیکھا۔

"کچھ مت کرو، تم نے کچھ نہیں کرنا، فی الحال اتنا کرو کہ اپنی خوبصورت آنکھوں سے آنسو تم جانتی ہو کہ اب یہ گھر تمہارا ہے۔ اس گھر میں اب ہم دونوں نے رہنا ہے۔ اس گھر حکمرانی ہوگی جو تم چاہو گی وہ تمہیں مل جائے گا، ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں تمہارے حاضر ہو جائے گا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، تمہاری خوشی کی خاطر میں ہر وہ کام کر گزر جو تمہیں مسرت دے گا۔ نیلم تم نہیں جانتیں میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں، تمہارا دیوانہ ہوں۔"

یہ کہہ کر سیڈ پور کے جن نے ہاتھ فضا میں پھیلایا تو اس کے ہاتھ پر ایک سفید رومال آ گیا۔ اس نے نیلم کی طرف بڑھایا۔ "لو نیلم اپنی آنکھیں پونچھ لو۔ باہر کیا کم بارش ہو رہی ہے۔"

نیلم نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور اپنی خوبصورت آنکھوں کو صاف کرنے لگی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔" سیڈ پور کا جن بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

نیلم نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، بولی کچھ نہیں۔

"وہ صبح آئے گا۔" اس نے کہا۔

"کون آئے گا؟" نیلم نے پوچھا۔

"پرچہ پڑھنے کے بعد وہ سیدھا ادھر کا رخ کرے گا۔"

"اچھا آپ اکبر کی بات کر رہے ہیں۔" نیلم نے اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ آئے گا، اس گھر کی گھنٹی بجائے گا، گیٹ کو زور زور سے پیٹے گا۔" اس نے کہا۔

"پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔" نیلم نے پوچھا۔

"تم بہری ہو جاؤ گی۔ تمہیں کچھ نہیں سنائی دے گا۔" سیڈ پور کے جن نے بتایا۔

"کیا میں واقعی بہری ہو جاؤں گی۔"

"نہیں تمہیں بہرہ بننا ہوگا، تمہیں سب کچھ سنائی دے گا لیکن کچھ نہیں سنائی دے گا۔"

"اچھا۔" نیلم نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا۔ اس سانس میں دکھ تھا۔

اسی وقت زور سے بجلی کڑکی، آسمان پر دھاکے ہونے لگے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کہیں آس پاس ہی بجلی گری ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے کی بجلی چلی گئی۔

کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ بس ایک شمع تھی جو جل رہی تھی۔

صبح ہوئی، یہ ایک ٹھنڈی اور ابر آلود صبح تھی۔

اکبر بڑی اسپیڈ سے خالی گھر کی طرف آ رہا تھا اس کا ذہن خالی تھا اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ خالی گھر کی طرف کیوں جا رہا ہے، کیا اسے یہ امید تھی کہ نیلم سے اس کی ملاقات ہو جائے گی۔ اور وہ کسی طرح اسے اپنے ساتھ لے آئے گا یا پھر وہ یہ سوچ کر گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ تصدیق کرنے آیا تھا کہ نیلم گھر میں موجود ہے یا نہیں۔

اکبر کے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی، نیلم کے خط نے اسے تڑپا دیا تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے بغیر کسی ارادے کے خالی گھر کی طرف چل پڑا تھا۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ گاڑی کی کھڑکی سے بیٹھے بیٹھے اس نے خالی گھر پر نظر ڈالی۔ گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا، گیٹ بند تھا، اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔

تب اسے خیال آیا کہ وہ چابی تو لایا ہی نہیں۔ چابی صابرہ کے پاس تھی، صابرہ کو معلوم تھا کہ وہ خالی گھر کی طرف جا رہا ہے پھر اس نے یاد نہ دلایا، یہ نہ کہا کہ چابی لیتے جاؤ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے خیال ہی نہیں آیا ہو۔

اکبر نے سوچا کہ گیٹ جوں کا توں بند ہے پھر نیلم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ خالی گھر میں جا رہی ہے، وہ کس طرح اندر گئی ہوگی، گیٹ کافی اونچا تھا اور اس کے اوپر نوکیلی میخیں لگی ہوئی تھیں،

کسی لڑکی کا گیٹ پر چڑھ کر گھر میں جانا اتنا آسان نہ تھا۔

یہ کیا چکر ہے۔ پھر نیلم کہاں گئی؟

اب وہ گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے دونوں گیٹ کے درمیان جو جھری تھی اس سے جھانک کر اس جھری سے گھر کا دروازہ نظر آرہا تھا جو بند تھا، گھر میں کسی قسم کی زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے پھر اکبر نے پیچھے ہٹ کر کال بیل پر ہاتھ رکھا۔

گھنٹی کی آواز خالی گھر میں دُور تک گونج گئی۔ نیلم سو رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس کی فوراً کھل گئی، وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

گھنٹی پھر بجی یہ اکبر کا مخصوص انداز تھا گھنٹی بجانے کا۔ نیلم سہم گئی کہ دروازے پر وہ آگیا ہے۔ کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نکلی پھر ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اس نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ کھسکایا کھڑکی سے گھر کا گیٹ صاف نظر آتا تھا۔ دروازہ بند تھا، اسے اکبر نظر نہ آیا بس یہ احساس ہی تھ اکبر گیٹ کے اس طرف موجود ہے۔

اکبر نے کئی مرتبہ اپنے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔ ہر مرتبہ اس کا دل زور زور سے دھڑکا مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر پہنچ جائے۔

لیکن اسے معلوم تھا کہ حدود توڑنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ حکم کے مطابق بہری بن گئی۔

اسے سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔

اب اکبر مین گیٹ زور زور سے پیٹ رہا تھا، لیکن اسے کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔

وہ باہر تھا نیلم پردے کے پیچھے کھڑی تھی اور دل کا درد آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

دیوار کے اس طرف ریشمیں پردوں کے پیچھے نیلم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے۔ دیوار کی دوسری طرف اکبر پر جنون کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

وہ گھر کے گیٹ کو زور زور سے پیٹ رہا تھا اور چیخ چیخ کر سوال کر رہا تھا۔

''نیلم تم کہاں ہو......! نیلم تم کہاں ہو؟''

اکبر کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز نیلم کے دل میں ٹیسیں بن کر اتر رہی تھی۔ وہ بار بار اپنا دل مس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔

تب اچانک ہی نیلم نے اپنی پیٹھ پر تپش محسوس کی...... کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا اس مڑ کر دیکھا سیّد پور کا جن شہزادے کے روپ میں اس کی پشت پر کھڑا تھا۔

''آؤ نیلم! اپنے کمرے میں چلو۔''

''نیلم تم کہاں ہو......؟ نیلم تم کہاں ہو؟'' اکبر کی باہر سے دیوانہ وار آواز آرہی تھی۔

''تم جو آواز سن رہی ہو، ابھی چند لمحوں میں ختم ہو جائے گی۔ اس دیوانے کے والدین اسے لینے کیلئے آرہے ہیں اب تم چلو یہاں سے...... اپنا وقت ضائع مت کرو۔''

یہ کہہ کر سیّد پور کے جن نے اس کا ہاتھ تھام لیا...... یوں لگا جیسے کسی شعلہ نے کسی حسین گلاب کو پنے ہاتھ میں جکڑ لیا ہو۔

گیٹ کے اس پار، ایک ٹیکسی آکر رکی...... بابر علی جلدی سے اترا اس کے پیچھے صابرہ لپکی۔

اکبر پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی، وہ زور زور سے گیٹ پیٹ رہا تھا اور چیخ چیخ کر سوال کر رہا تھا۔

''نیلم تم کہاں ہو......؟ نیلم تم کہاں ہو؟''

نیلم جہاں تھی وہاں اسے گونگا بہرہ بنا دیا گیا تھا، وہ کیا جواب دیتی۔

بابر علی نے بڑی محبت سے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا...... اکبر نے پلٹ کر دیکھا تو اپنی پشت پر اپنے باپ کو پایا...... باپ کی شکل دیکھ کر اسے کچھ ہوش سا آیا۔

صابرہ اس سے آکر لپٹ گئی...... ''میرے بچے تجھے کیا ہو گیا ہے...... آ ہمارے ساتھ چل۔''

تب اکبر نے کچھ نہ کہا...... وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا...... بابر علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی...... اور وہ تیزی سے واپس ہو گئے۔

گھر پہنچ کر صابرہ نے اعصاب کو سکون پہنچانے والی دوائیں جو ڈاکٹر نے اس کو لکھ کر دی تھیں وہ اکبر کو کھلائیں اور اسے آرام سے ایک بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر کے بعد اکبر کو نیند آگئی۔

سہ پہر کو اس کی آنکھ کھلی...... صابرہ نے زبردستی اسے تھوڑا سا کھانا کھلا دیا...... وہ کھانا کھانے سے احتراز کر رہا تھا اس کی بھوک جیسے ختم ہو گئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے پھر گھر سے نکلنے کی تیاری کی...... تو صابرہ اس کے آڑے آگئی۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ذرا باہر جا رہا تھا......'' اکبر نے سفید جھوٹ بولا۔

''اکبر تمہیں میری قسم ہے اب تم اس خالی گھر کی طرف نہیں جاؤ گے۔''

''امی مجھے نیلم کی فکر ہے...... وہ کہاں ہے؟''

''وہ اسی گھر میں ہے، وہ کہاں جائے گی۔''

''امی، وہ وہاں نہیں ہے، اگر وہ وہاں ہوتی تو ضرور باہر آجاتی۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، وہ اسی گھر میں ہے...... جب وہ پرچہ لکھ گئی ہے کہ وہ خالی گھر میں

جارہی ہے تو اس میں شبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ وہیں ہے اور کہاں جائے گی؟"

"مجھے یقین نہیں آتا، میں ایک بار اور اسے جا کر دیکھ آؤں۔"

"میں تمہیں اپنی قسم دے چکی ہوں...... تم نے اب اس خالی گھر کا رخ کیا تو مجھے زندہ نہ پاؤ گے

"امی، اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" اکبر نے اپنی ماں کو لپٹا لیا۔ "اچھی امی

نہیں جارہا، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

صابرہ نے اسے تو جانے سے روک دیا لیکن مغرب کے بعد صابرہ اور بابر علی نے خالی گھر کا

کیا...... اندھیرا گہرا ہو گیا تھا...... ان کا خیال تھا کہ وہ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہوگا، لیکن انہیں

دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی...... گھر کے ہر کمرے کی بتی روشن تھی بلکہ گیٹ پر لگی بتیاں بھی جل رہی تھیں

یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ گھر خالی ہے۔

بابر علی نے گیٹ کے سامنے گاڑی روک لی...... اور صابرہ کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے؟ گھنٹی بجاؤں......" بابر علی نے پوچھا۔

"چھوڑیں، کہیں کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔"

صابرہ کے اس طرح کہنے پر بابر علی کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی...... اس نے فوراً گا

اسٹارٹ کی اور گھر کے سامنے سے تیر کی طرح نکل گیا۔

اب گاڑی کا رخ عزیز آباد کی طرف تھا۔

ماموں فرقان کو ان لوگوں کے گھر خالی کرنے کا پتہ نہ تھا...... گھر انہوں نے اچانک ہی خالی

تھا...... اس لئے ان دونوں نے سوچا کہ ماموں فرقان کو تازہ ترین صورت حال بتا دی جائے۔ سا

ہی نئے گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا جائے تاکہ وہ گھر آئیں تو انہیں کوئی دقت نہ ہو۔

ماموں فرقان اور ان کے گھر والے دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

لیکن جب صابرہ نے گھر خالی کرنے کی روداد سنائی تو ماموں فرقان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔" ماموں فرقان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "خیر تم لوگ پریشا

ہو۔ اکبر کہاں ہے؟"

اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی۔

گھنٹی کی آواز سن کر شمسہ اُٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی تو ماموں فرقان نے اسے روکا

"ٹھہرو بیٹے میں دیکھتا ہوں دروازے پر کون ہے؟"

"ابو آپ بیٹھیں میں دیکھتی ہوں اس وقت دروازے پر ضرور کوئی میری سہیلی ہوگی۔" شمسہ نے

"اچھا پھر تم جا کر دیکھو۔" وہ پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔

مسہ نے جا کر دروازہ کھولا تو اسے اپنے سامنے اکبر کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"اکبر صاحب آپ ہیں؟" شمسہ کے لہجے میں حیرت اور سوال تھا۔

"کیوں، پھوپھی جان آپ کیا سمجھیں؟" اکبر نے مسکرا کر کہا۔

"بھتیجے میں یہ سمجھی کہ میری کوئی سہیلی آئی ہے، ابو دروازہ کھولنے آرہے تھے یہی سوچ کر میں نے

آنے سے روک دیا تھا۔" شمسہ نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ماموں ہیں گھر میں۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"ماموں بھی ہیں اور آپ کے امی ابو بھی موجود ہیں۔" شمسہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"ہیں یہ لوگ یہاں ہیں۔" اکبر یہ کہہ کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں آیا۔

"ارے اکبر تم۔" صابرہ نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"اور امی آپ یہاں۔" اکبر نے سوال کیا۔ "آپ لوگ بتا کر نہیں آئے کہ ماموں کے گھر

ہے ہیں۔"

"تم گھر پر راشدہ کو اکیلا چھوڑ کر آئے ہو۔" صابرہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"امی آپ نے کیوں کہ خالی گھر جانے سے منع کر دیا تھا، لیکن میرا جی گھبرا رہا تھا، میں نے سوچا کہ

ا سے مل آؤں میرا خیال تھا کہ آپ لوگ کہیں آس پاس ہی گئے ہیں، آپ جلد گھر پہنچ جائیں

لں راشدہ کو بتا کر گھر سے نکل آیا مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ لوگ ماموں کے گھر گئے ہیں تو میں

ھر سے نہ نکلتا۔"

"اچھا خیر کوئی بات نہیں تم یہاں بیٹھو ہم لوگ چلتے ہیں۔" صابرہ نے بابر علی کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چلیں جی راشدہ گھر پر اکیلی ہے وہ ڈرتی بھی بہت ہے اور گھر بھی نیا ہے۔"

"ارے بھئی کھانا وانا کھا کر چلے جانا۔" ماموں فرقان نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں، ماموں اب چلیں گے اگر اکبر نہ آیا ہوتا تو ہم ضرور کھانا کھا کر جاتے ویسے بھی یہاں آنے

صد آپ کو حالات سے آگاہ کرنا تھا اور نئے گھر کا پتہ بتانا تھا سو بتا دیا ہے باقی باتیں آپ اکبر سے

ئیے گا۔" بابر علی نے کہا۔

"اور آپ دونوں کے حصے کا کھانا بھی انہیں کھلا دیں۔" شمسہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" صابرہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ماموں خدا حافظ اور ممانی کسی دن شمسہ کو لے کر پورے دن کے لئے آ جائیں نا

ی طرف۔"

"ہاں صابرہ میں آؤں گی۔" ممانی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ابو آپ جاتے ہوئے چوکیدار سے کہہ دیجیے گا کہ وہ ہمارے گھر کا خیال رکھے۔'' اکبر
سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بابر نے گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔

صابرہ اور بابر کو دروازے تک رخصت کرنے کے بعد ماموں فرقان نے اکبر کے کندھے
رکھ کر اسے قریب کر لیا اور بولے۔ ''ہاں بھئی اکبر سناؤ کیا حال چال ہیں؟''

''ماموں حال چال تو آپ کو امی ابو سے معلوم ہو گئے ہوں گے، لیکن مجھے آپ سے ایک
ہے۔'' اکبر نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا جناب؟'' ماموں فرقان نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''آپ نے تو ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔''

''اکبر بس میں تمہیں کیا بتاؤں آج کل ذرا کاروبار میں الجھا ہوا ہوں فرصت ہی نہیں ملتی۔
فرقان نے مصالحت آمیز جواب دیا۔

اکبر کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ماموں فرقان نے کیوں کنارہ کشی اختیار کر لی تھی
کے جن نے انہیں خاصا نقصان پہنچایا تھا اگر دادا غفور نہ ہوتے تو ماموں فرقان کی جانے کیا
ہو جاتی۔

اس گھر سے جہاں سیّد پور کے جن کا بسیرا تھا، کترانا بالکل فطری بات تھی۔ اکبر بڑا حقیقت
انسان تھا وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ماموں فرقان کی جگہ ہوتا تو وہ اتنا بھی ساتھ نہ دیتا جتنا انہوں
تھا، ان کا جواب سن کر اس نے زیادہ اس موضوع پر بات نہ کی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''ماموں میں کیا کروں؟''

''کیا کرنا چاہتے ہو؟'' ماموں فرقان نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

''ماموں میں کوئی عمل کرنا چاہتا ہوں میں نے عہد کر لیا ہے کہ نیلم کو اس کے پنجے سے
رہوں گا بس آپ مجھے کوئی عمل بتا دیں۔'' اکبر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اکبر بیٹے میں نے عمل کیا تھا وہ ایک مشکل عمل تھا، قبرستان میں عمل کرنا کوئی آسان کام
عمل میں نے تمہاری خاطر کیا تھا، اس معصوم لڑکی کیلئے کیا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ وہ کامیاب
اس کے دھوکے میں آ گیا ورنہ اس سے تمہیں کب کی نجات مل چکی ہوتی۔'' ماموں فرقان
سانس لے کر کہا۔

''ماموں جو ہوا سو ہوا اب آگے سوچنا ہے۔'' اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہاری طرف نہیں جا سکا یہ اور بات ہے لیکن میں تم سے غافل نہیں رہا، میں نے

ئی لوگوں سے بات کی ہے۔ میں کوئی عامل ڈھونڈ رہا ہوں کوئی ایسا عامل جو واقعی ان مسائل کو سمجھتا
لتہ اور پکا ہو۔''

''دادا غفور کیا کہتے ہیں؟''

''وہ بیچارے کیا کہیں گے ان کے پاس جو اسلحہ تھا وہ ہم آزما چکے۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''پھر کیا ماموں، نیلم اس کی قید میں گھٹ گھٹ کر مر جائے گی؟'' اکبر افسردگی سے بولا۔

''اللہ کرے۔'' ماموں فرقان نے فوراً کہا۔ ''مجھے ایک کتاب نہیں مل رہی ہے؟''

''کون سی کتاب ماموں؟''

''میرے پاس ایک کتاب تھی اس میں کچھ عملیات درج تھے خاص طور سے جنات کے بارے
۔ بڑی نادر کتاب تھی وہ۔ میں نے اسے تلاش تو کیا ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر آئی نہیں اب مجھے اس
ب کو اچھی طرح تلاش کرنا ہو گا۔ اکبر وہ کتاب مل گئی تو تمہارا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔''

''ماموں اس کتاب کو ضرور ڈھونڈ یئے۔'' اکبر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ''آپ کہیں تو میں کسی دن
ے آ جاؤں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر تلاش کروا لوں گا۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں میں گھر میں ہر اس جگہ ڈھونڈ چکا ہوں جہاں اسے ہونا چاہیے بس
الماری اور رہ گئی ہے اس الماری میں زیادہ تر کتابیں بھری ہوئی ہیں جو میں علیگڑھ سے اپنے
لایا تھا، اس میں دادا کی عطا کردہ کتابیں بھی خاصی ہیں۔ وہ عملیات کی کتاب بھی انہیں کی تھی
الماری میں تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی چابی نہیں مل رہی ہے۔ اب اس تالے کو توڑنا پڑے گا۔''
ں فرقان نے کہا۔

''آپ تالا نہ توڑیں میں ایسا کرتا ہوں کہ کسی تالے والے کو بلا لاتا ہوں وہ گھر آ کر چابی بنا جائے
''اکبر نے تجویز پیش کی۔

''ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔'' ماموں فرقان نے کہا..... ''ویسے وہ تالا اتنی آسانی سے ٹوٹنے
ی نہیں۔ وہ لیور والا تالا ہے اور وہ بھی علیگڑھ کا۔''

سرے دن صبح ہی اکبر لیاقت آباد سے ایک تالے والے کو پکڑ لایا۔ ماموں فرقان دکان پر جانے
یاری کر رہے تھے۔ اکبر کو دیکھ کر انہوں نے دکان پر جانا ملتوی کر دیا۔

لے والے نے الماری کے تالے کو ہاتھ میں لے کر معائنہ کیا پھر اسے الٹ پلٹ ایک نظر
ں فرقان کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ''بڑا زبردست تالا ہے۔''

''اس کی چابی تو بن جائے گی نا۔'' ماموں فرقان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اکبر بول اُٹھا۔

''میاں آپ دکان پر تو کہہ رہے تھے کہ بیشک چابی نہ بنے بس تالا کھل جائے۔'' تالے والے

نے اکبر کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں کوئی حرج نہیں۔'' ماموں فرقان بولے۔ ''چابی بے شک نہ بنے مگر یہ کھل جائے۔''

''ارے صاحب آپ فکر ہی نہ کریں جمن تالے والا آپ کے گھر آیا ہے، اب تالا بھی کھلے گا اور چابی بھی بنے گی۔'' یہ کہہ کر جمن تالے والے نے اپنی جیب سے ماسٹر کی نکالی۔

پھر اس چابی کو تالے میں ڈال کر حرکت دی تو فوراً کھل گیا۔

''ارے واہ جمن صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔'' اکبر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

پھر پانچ منٹ میں جمن تالے والے نے گھس گھسا کر اس کی نئی چابی بنا دی اور اپنا معاوضہ لے کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ماموں فرقان نے الماری کھولی۔ یہ الماری کیوں کہ ایک عرصے سے بند پڑی تھی اس لئے اس کے اندر خاصے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔

یہ الماری دیوار میں بنی ہوئی تھی اس میں تین خانے تھے ان تینوں خانوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ ساری کتابیں پرانی تھیں، دیمک زدہ اور کرم خوردہ۔

ماموں فرقان نے ایک ایک کر کے سارے خانے دیکھ ڈالے لیکن عملیات کی وہ کتاب جس کی انہیں سخت ضرورت تھی کہیں نظر نہ آئی۔ اکبر کو ماموں فرقان کی تلاش سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے الماری کی کتابیں خالی کر دیں اور پھر ایک ایک کر کے انہیں الماری میں رکھتا گیا۔

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات...... وہ کتاب الماری میں موجود نہ تھی۔

ماموں فرقان کو قوی امید تھی کہ وہ کتاب الماری میں ضرور موجود تھی اسے الماری میں نہ پا کر سخت مایوسی ہوئی یہ آخری امید تھی جو ٹوٹ گئی تھی۔

ماموں فرقان سے زیادہ اکبر کا دل ٹوٹا اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

''ماموں اب کیا ہو گا؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو؟ اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔''

''ماموں یہ لوگ جو شہر کے مختلف علاقوں میں بیٹھے ہیں اور خود کو پروفیسر اور ماہر عملیات کہتے ہیں کیا ان سے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔''

''ارے نہیں ان کے چکروں میں نہ پڑ جانا۔ یہ سب ڈھونگی ہیں لوٹنے کھسوٹنے والے۔ کیا کریں گے۔'' ماموں فرقان نے سختی سے کہا۔

''پھر ماموں۔'' اکبر کو کوئی راستہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

''میں دکان پر بیٹھا اکثر لوگوں سے معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں ایک دو لوگوں نے

ہے پوری معلومات سامنے آئیں تو پھر ان میں سے کسی سے ملا جائے۔''

''ماموں اب یہ کارروائی ذرا تیز کر دیں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو حالات اب زیادہ سنگین ہو گئے ہیں، ایک دو دن میں تمہاری طرف آؤں گا۔ انشاء اللہ اس وقت ضرور میرے پاس تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ہو گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ صحیح آدمی کا پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اچھے اور نیک لوگ چھپے رہتے ہیں وہ خود کو ظاہر نہیں کرتے اگر وہ خود کو ظاہر کر دیں تو ضرورت مندوں کا ان کے گرد ہجوم ہو جائے، سایہ دُور کرنے والے عملیات بہت مشکل ہوتے ہیں ان کی وجہ سے جان جوکھوں میں پڑ جاتی ہے۔ اگر عمل میں ذرا سا نقص رہ جائے تو معاملہ الٹا ہو جاتا ہے۔ عمل کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لئے اچھے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ خود کو چھپا کر رکھیں۔'' ماموں فرقان نے سمجھایا۔

''کمال ہے ماموں، اچھے لوگ سامنے آتے نہیں اور جو سامنے ہیں وہ اچھے ہیں نہیں پھر میرے جیسے لوگ کیا کریں۔'' اکبر نے بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا تھا بھلا، بس انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنا کہا۔ ''صبر کرو بیٹا۔''

''ماموں اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، میری نیلم قید میں ہے اور آپ کہتے ہیں بیٹا صبر کر، اب نہیں ہوتا مجھ سے صبر۔'' یہ کہہ کر اکبر ماموں فرقان کے گھر سے نکل آیا۔

ماموں فرقان، ممانی ریحانہ، شمسہ سبھی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں۔

مین روڈ پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی وہ جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا، ٹیکسی ڈرائیور نے گردن گھما کر پوچھا۔ ''کدھر جائیں گے صاحب۔''

اکبر سوچ میں پڑ گیا وہ ٹیکسی میں بیٹھ تو گیا تھا لیکن اس وقت اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اعصابی دباؤ ایک دم بڑھ گیا تھا۔ پہلے خیال آیا کہ گلشن کہے لیکن وہ گھر جا کر کیا کرتا۔ پھر اس نے سوچا کہیں گھومنے چلے۔ سمندر سے اسے عشق تھا فوراً اس کے ذہن میں کلفٹن کا خیال آیا پھر اس نے مزید سوچے بغیر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا...... ''بھائی کلفٹن چلو۔''

''اچھا صاحب۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر میٹر ڈاؤن کیا۔

آج سردی زیادہ نہ تھی پھر بھی کلفٹن پر رش نہ تھا وہ دیوار پر بیٹھ گیا۔ سامنے وہ جہاز تھا جو ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ اس نے سوچا اس کی زندگی کا جہاز بھی تو اسی طرح ریت میں دھنس گیا ہے کوئی نہیں جو اس جہاز کو ریت سے نکال کر زندگی کے سمندر میں رواں دواں کر دے۔

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھا کلفٹن کی طرف آ رہا تھا تو اس کے دل پر گھٹا سی چھائی تھی۔ اپنی

بے بسی کا احساس کر کے بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے وہ ان آنسوؤں کو بڑے ..
سے پی جاتا تھا۔

لیکن اس وقت دیوار پر بیٹھ کر اس ریت میں دھنسے ہوئے جہاز کا نظارہ کرتے ہوئے بے اختیا..
اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ جہاز دھندلا گیا۔

اکبر نے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

تبھی پیچھے سے آواز آئی۔

''روتا کیوں ہے۔''

اکبر نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا وہ کوئی ملنگ تھا، اس نے ایک میلا اور پھٹا سا تہبند باندھ رکھا تھا، اس
کے جسم پر قمیض نہ تھی۔ کالی داڑھی، چمکتی آنکھیں، کشادہ پیشانی، سانولی رنگت۔

''روتا کیوں ہے بچہ۔'' اس نے ایک انگلی اُٹھا کر اکبر سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بابا۔'' یہ کہہ کر اکبر نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پانچ کا نوٹ اس کی
طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو۔''

''نہیں چاہیے، ہمیں تیرا یہ نوٹ۔'' وہ جیسے غصے میں آ گیا۔

''کم ہیں زیادہ دے دوں دس روپے۔''

''ہمیں کچھ نہیں چاہیے بچہ، ہماری بات غور سے سن جا مزار پر جا۔'' یہ کہہ کر وہ ملنگ ایک سیکنڈ کیلئے
بھی وہاں نہ رکا۔

''بابا سنو تو۔'' اکبر کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ دبا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد سمندر کی لہروں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھتا رہا اور اس ملنگ کے رویے
غور کرتا رہا وہ عجیب فقیر تھا، اس نے پیسے بھی نہ لئے اور مزار کی طرف جانے کا مشورہ دے گیا۔

اکبر کے دل میں ایک خیال آیا اور پھر وہ خیال گہرا ہوتا گیا۔

کیوں نہ وہ مزار کی طرف جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مزار کی طرف
چل دیا۔

مزار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی رقت طاری تھی آنسو بار بار
آنکھوں کی قید سے آزاد ہونے کیلئے مچل مچل جاتے تھے۔

مزار پر اس وقت کوئی خاص رش نہ تھا، اس نے ایک کونے میں کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور اللہ سے
دعا مانگنے لگا۔

''اس عالم کے رب اور دوسرے عالموں کے رب سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب میں غروب

کرنے والے، رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کرنے والے اے اللہ تو ازل ہے تو ابد ہے
میں نے ہمیشہ تجھ ہی سے مانگا ہے اور تجھی سے مانگوں گا، اے انسانوں اور جنوں کے بنانے والے مجھے
اس جن سے نجات دلا۔ اے اللہ مجھ پر رحم کر تو ہی کریم اور بخشنے والا ہے۔''

اس کے ہاتھ دعا کو اُٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ
دھیرے دھیرے اپنے رب سے مخاطب تھا۔

اس رب سے جو انسان کے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے، جو سب کی سنتا ہے سب کچھ
دیکھتا ہے، جس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا جو بہتے دریاؤں میں ہے۔ گرتے آبشاروں میں
ہے، اونچے پہاڑوں میں وہ ہر جگہ ہے وہ کہاں نہیں ہے۔

دعا کر کے اس نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیرے اور خاموشی سے مزار کے باہر آ گیا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے سامنے اس کی نظر پڑی تو اسے وہ ملنگ ایک سیڑھی پر بیٹھا نظر آیا وہ ملنگ،
اکبر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

جب اکبر اس کے نزدیک پہنچا تو اس ملنگ نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آ بیٹھ جا۔''

اکبر نے اس کے برابر بیٹھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ ''تُو مزار پر گیا؟''

''بابا آپ ہی نے تو کہا تھا۔'' اکبر نے کہا......

''مزار میں جا کر تُو نے کیا کیا۔'' ملنگ نے پوچھا۔

''میں نے فاتحہ پڑھی اور اپنے رب سے دعا مانگی۔'' اکبر نے بتایا۔

''کس بات کی دعا۔''

''اس جن سے نجات کی دعا جس نے میری بیوی کو قید کر لیا ہے۔''

''تو کبھی ملیر گیا ہے۔'' ملنگ نے اچانک پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں۔'' اکبر نے فوراً جواب دیا۔

''پھر تُو ملیر جا وہاں املی والے بابا سے مل، راستہ دکھانے والا تو اللہ ہے، نجات دلانے والا تو اللہ
ہے کیا عجب کہ تجھے اس کے ذریعے نجات مل جائے بس اب جا مجھے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔'' یہ
کہہ کر ملنگ نے اکبر کے جانے کا بھی انتظار نہ کیا خود ہی اُٹھ گیا اور مزار کی تیزی سے سیڑھیاں
چڑھنے لگا۔

اسے کچھ دیر اوپر جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ مزار میں غائب ہو گیا تھا تو اکبر سیڑھیاں
اُترنے لگا۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا تھا۔ اکبر نئی روشنی کا لڑکا تھا، اسے ان قلندروں، ملنگوں ا فقیروں کی دنیا کا کچھ علم نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہوتے ہوئے کتنے باخبر ہو ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے کوئی دیوار، دیوار نہیں ہوتی یہ جہاں تک چاہے دیکھ سکتے ہیں جہاں تک چاہیں جا سکتے ہیں۔

اکبر کو ان قلندر قسم کے فقیروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ انہیں ادھر ادھر سڑکوں کے فٹ پاتھوں لیٹے بیٹھے دیکھتا اور ان کے قریب سے گزر جاتا۔

آج بھی اس کا ذہن اس واقعہ کو قبول نہیں کر رہا تھا وہ معمول کے مطابق یہاں سے سرسری طور گزر جانا چاہتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کو کسی مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دینا چاہتا تھا۔

ہاں ایک بات ضرور اس کے دماغ میں ہتھوڑے برسا رہی تھی کہ اگر یہ سب محض اتفاق تھا تو ا ملنگ نے ساحل سمندر سے مزار تک تعاقب کیوں کیا تھا۔ بے شک وہ اس بات کو اہمیت دے یا دے یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا۔ یہ واقعہ اتفاقی ضرور تھا لیکن غیر اہم ہرگز نہ تھا۔

وہ مزار سے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچ گیا شام اپنے پر سمیٹ رہی تھی۔ رات اپنے پ کھول رہی تھی۔ مغرب کے وقت ویسے بھی ہر سُو سناٹا چھا جاتا ہے ہر طرف ایک اداسی سی جاتی ہے۔ شاید یہ سورج ڈوبنے کا ردعمل ہوتا ہے جبکہ صبح سورج نکلتا ہے تو ایک خوشی کا اح جاگتا ہے۔

اس وقت گھر میں بھی سناٹا طاری تھا۔ دروازہ راشدہ نے کھولا تھا اور وہ خاموشی سے بغیر کچھ اس کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

گھر کا سامان بڑی حد تک سیٹ ہو چکا تھا۔ بس چھوٹی موٹی ردوبدل جاری تھی صابرہ اس میں لگی ہوئی تھی اور بابر اس کی مدد کر رہا تھا۔

اکبر ٹی وی لاؤنج میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گیا وہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔

''اکبر بھائی چائے لاؤں آپ کیلئے۔'' راشدہ نے پوچھا۔

اکبر منہ سے کچھ نہ بولا صرف اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا ہوا بیٹے۔'' صابرہ اس کے نزدیک آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کس چیز کا امی۔'' اکبر نے پوچھا۔

''تم ماموں کی طرف گئے تھے وہ کتاب ملی کہ نہیں پہلے تو یہ بتاؤ کہ الماری کا تالا بھی کھلا تھا کہ

''امی الماری کا تالا تو کھلوا دیا تھا لیکن وہ کتاب نہیں ملی۔'' اکبر نے بتایا۔

''ارے یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' صابرہ نے اپنے ہاتھ مسلے۔

''ہاں ماموں خود بہت پریشان تھے انہیں قوی توقع تھی کہ وہ کتاب الماری سے ضرور مل جائے گی۔'' اکبر نے کہا۔

''پھر اب وہ کیا کہہ رہے تھے۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''انہوں نے حسب معمول مجھے صبر کرنے کو کہا ہے۔'' اکبر نے پھیکی مسکراہٹ سے ماں کو دیکھا۔

''صبر تو کیے بیٹھے ہیں۔'' صابرہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ اچھے عامل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔'' اکبر نے مزید بتایا۔

''کب تک ملے گا وہ عامل؟'' صابرہ نے سوال کیا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔'' اکبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''بابر بھی کوشش کر رہے ہیں شاید کوئی نجات دہندہ مل ہی جائے۔'' صابرہ نے بتایا۔

نجات دہندہ کا سن کر اکبر کو فوراً کلفٹن والے ملنگ کا خیال آیا۔

''امی آج میں کلفٹن گیا تھا وہاں مجھے ایک فقیر ملا۔ میں دیوار پر بیٹھا ریت میں دھنسے ہوئے جہاز کو دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک فقیر کو پایا۔ میں نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے سختی سے کہا، نہیں چاہیے ہمیں تیرا نوٹ۔ میں سمجھا شاید یہ پیسے کم ہیں اس لئے وہ لینے سے انکار کر رہا ہے۔ میں نے پھر دس روپے دینے کی پیشکش کی تو اس نے پھر اسی غصے سے کہا...... ہمیں کچھ نہیں چاہیے بچے۔ جا مزار پر جا۔ یہ کہہ کر وہ فقیر چلا گیا میں نے اس فقیر کو کوئی اہمیت نہ دی آرام سے بیٹھا رہا پھر جانے کیوں دل بار بار مزار کی طرف جانے کیلئے اکسانے لگا آخر میں اس قدر بے چین ہوا کہ مزار کی طرف چل دیا۔''

''اکبر بھائی چائے۔'' راشدہ نے اکبر کی طرف چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''راشدہ تیرے ابو کہاں ہیں؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''وہ ڈرائنگ روم میں ہیں، تصویر لگا رہے ہیں۔''

''ذرا انہیں بھیج۔'' صابرہ نے کہا۔

اکبر سمجھ گیا کہ صابرہ، بابر کو کیوں بلا رہی ہے، وہ بابر کو بھی یہ داستان سنوانا چاہتی تھی۔ اکبر نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بابر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''ہاں بھئی کیا ہوا؟'' بابر نے آتے ہی پوچھا۔

''ادھر آئیں۔'' صابرہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اکبر آج کلفٹن گیا تھا وہاں اسے ایک فقیر ملا، اکبر ذرا پھر سے سنا۔''

اکبر نے دوبارہ جہاں تک صابرہ کو سنایا تھا سنا دیا۔ یہ بات کہ وہ دیوار پر بیٹھا رہا تھا اور اس ملنگ

نے عقب سے آکر کہا تھا روتا کیوں ہے بچے۔ صابرہ سے چھپالی تھی۔ یہ بات اس نے بابر کو بھی نہ بتائی۔ یہ بات وہ کیسے بتاتا۔

یہ بات بتانے والی کہاں تھی بھلا۔

مزار تک جانے، وہاں دعا مانگنے، واپس ہونے، ملنگ کے ملنے اور املی والے بابا کے پتہ بتانے تک، اکبر نے سارے واقعہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

ساری بات سن کر بابر نے کہا۔ ''بڑی حیرت میں ڈالنے والی ہے۔''

''ابو، حیرت میں ڈالنے والی بات تو اس وقت ہوتی جب وہ فقیر میرے کچھ بتائے بغیر جن کا ذکر کرتا اور املی والے بابا کا پتہ بتاتا۔'' اکبر اس واقعہ کو اہمیت دینے کیلئے تیار نہ تھا۔

''بیٹا کیا حرج ہے اگر تم ملیر چلے جاؤ۔'' صابرہ نے اسے ترغیب دی اور اپنے شوہر سے تائید چاہی۔

''کیوں جی؟''

''ہاں جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس علاقے کا مشہور آدمی ہوگا۔ پتہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔'' بابر نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابو میں کسی دن جا کر املی والے بابا سے مل آؤں گا۔'' اکبر نے کہا۔

''اپنے ساتھ کسی دوست کو لے جانا تم نے تو وہ علاقہ دیکھا بھی نہ ہوگا یا کہو تو میں چلوں۔''

''نہیں ابو، آپ زحمت نہ کریں میں اپنے ساتھ کسی دوست کو لے لوں گا۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے میں کرلوں گا آسانی سے۔'' اکبر نے اپنے باپ کو یقین دلایا۔

پھر اکبر نے کچھ دیر گھر میں آرام کیا اس کے بعد وہ گھر سے نکل گیا۔ اس نے اپنے ایک دوست طارق کے گھر کا رخ کیا۔

اکبر کے گھر سے نکلنے کے بعد فرقان ماموں آگئے۔ ایک تو انہوں نے نیا گھر دیکھنا تھا دوسرے انہیں اکبر کی فکر تھی وہ جس موڈ میں ان کے گھر سے نکلا تھا وہ ان کیلئے باعث تشویش تھا۔

گھر میں داخل ہو کر پہلے انہوں نے گھر کا ایک چکر لگایا۔ نئے مکان کی تعریف کی اور پھر اکبر کے بارے میں پوچھا۔ ''اکبر کہاں ہے؟''

''وہ ماموں، آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے نکلا ہے۔ اپنے کسی دوست کی طرف گیا ہے۔''

''بھئی اس وقت میں خاص طور سے اس کیلئے آیا تھا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''کیوں ماموں خیریت تو ہے۔'' اس مرتبہ بابر نے پوچھا۔

''بھئی، وہ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکلا تھا میں نے سوچا جا کر اس سے معذرت کرلوں۔''

''ماموں آپ کیسی باتیں کررہے ہیں اس کے ایک ہاتھ لگایا ہوتا۔ وہ ٹھیک ہو جاتا۔''

''بھئی، اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میرا بھی یہی ردعمل ہوتا۔ اب آدمی کب تک صبر کرے، آخر صبر کی بھی کوئی حد ہونا چاہیے۔ اکبر بیچارے نے تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی صبر کرلیا ہے۔'' ماموں فرقان نے دکھی لہجے میں کہا۔

''بابر، ماموں کو آج کا واقعہ بتاؤ۔''

''کیا ہوا بھئی، خیریت تو ہے؟''

''شاید صبر کا پھل ملنے والا ہے۔''

''اچھا، وہ کیسے؟'' ماموں فرقان نے سوال کیا۔

''آپ کے گھر سے نکل کر وہ ادھر آنے کے بجائے سیدھا کلفٹن چلا گیا تھا۔ وہاں اسے ایک فقیر ملا۔ اس نے اسے مزار پر جانے کی ہدایت کی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مزار کی طرف چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ طاقت اسے مزار کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مزار سے فاتحہ اور دعا مانگ کر جب وہ نیچے آیا تو اسے وہ فقیر دوبارہ مل گیا۔ اس نے اسے اپنے نزدیک بٹھایا اور ملیر میں کسی املی والے بابا کا بتایا کہ وہ اس سے جا کر ملے۔ اس کے ذریعے ممکن ہے کہ اس جن سے نجات مل جائے۔''

بابر نے اس ملاقات کی روداد بیان کی پھر ماموں فرقان سے پوچھا۔ ''ماموں آپ نے کسی املی والے بابا کا سنا ہے۔''

''نہیں، میرے علم میں تو کوئی نہیں ہے لیکن میں معلوم کرلوں گا، ملیر کے کئی لوگوں سے واقف ہوں۔ میں ان سے پوچھ کر بتا دوں گا۔''

''ماموں، آپ کا کیا خیال ہے کہ اکبر کو اس بابا سے جا کر ملنا چاہیے۔''

''ہاں، ضرور ملنا چاہیے کیا عجب نجات کا راستہ نظر آجائے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گھر کی بیل بجی۔ راشدہ دروازے پر گئی۔ بابر کا خیال تھا کہ اکبر آیا ہوگا لیکن دروازے پر اکبر نہ تھا۔

راشدہ نے آکر بتایا۔ ''ابو، چوکیدار گل خان آیا ہے۔''

''اچھا وہ کیسے آگیا۔'' بابر کو حیرت ہوئی۔

بابر کے ساتھ ماموں فرقان بھی گیٹ پر پہنچے۔ گل خان نے بڑے احترام سے سلام کیا اور پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ ''صاحب جی آپ نے کہا تھا کہ خالی مکان کا خیال رکھوں، لیکن صاحب جی وہ خالی کدر اے۔ اُودر تو رہتا ہے کوئی۔''

''گل خان یہ تم کیا کہہ رہے ہو، ادھر کوئی نہیں رہتا ادھر ہم رہتے تھے۔'' بابر علی نے بتایا۔

''نہیں صاب جی اُودر ضرور کوئی رہتا۔ رات کو گھر کی ساری بتیاں جل جاتی ہیں۔ صبح صبح اندر سے

فرش دھلنے کی آواز آتی ہے۔ پانی باہر بہہ کر آتا ہے۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔ ام نے کسی کو اندر جاتے باہر آتے نہیں دیکھا۔ صاب جی اُودر کون لوگ رہتا ہے۔"

"گل خان وہاں کوئی نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔"

"بجلی کا رات کو جلنا، صبح کو بجھنا یہ امارا وہم نہیں اے، حقیقت ہے۔ آپ امارے ساتھ چل کر دیکھو اس وقت بھی گھر کی ساری بتیاں جلتی اے۔"

گل خان نے جو دیکھا تھا وہ صحیح تھا وہ اپنی بات پر اڑا رہا بابر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ گل خان کو کیسے سمجھائے۔ اس جن کا تذکرہ کرے یا نہ کرے۔

تب ماموں فرقان نے بابر کو اشارہ کیا وہ تھوڑا بہت اس مکان کے بارے میں بتا دے۔ ماموں فرقان کی ہدایت پر بابر نے گل خان کو بتا دیا کہ اس مکان پر سایہ وغیرہ ہے اسی لئے ہم لوگوں نے اس کو خالی کر دیا ہے تم اس گھر سے دُور ہی رہنا اس کے اندر جھانکنے یا اندر جانے کی کوشش نہ کرنا۔

اس ہدایت کو سن کر گل خان خاموشی سے واپس چلا گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے بابر کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

اسے بابر کی بات پر واقعی یقین نہیں آیا تھا۔

بھلا، یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اس گھر میں کوئی سایہ ہے۔ جو گھر کی بتیاں جلاتا بجھاتا ہے، گھر کی صفائی اور دھلائی کرتا ہے ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟

گل خان کوئی چالیس کے پیٹے میں تھا وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں کراچی آیا تھا۔ پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنی عمر اس نے مختلف علاقوں اور بنگلوں کی چوکیداری کرتے ہوئے گزاری تھی۔ اس نے آج تک کراچی کے کسی بنگلے یا علاقے کے بارے میں یہ نہ سنا تھا کہ یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔

آج اسے پہلی بار کسی نے بتایا تھا کہ اس بنگلے میں جن کا سایہ ہے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی تھی کہ وہ اس گھر سے دُور رہے۔

یہ جن والی بات اس کے گلے سے ہرگز نہیں اتر رہی تھی، وہ ایک مضبوط جسم اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ ضد کا پورا اور دھن کا پکا تھا۔

اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ اس مکان سے ہرگز دُور نہیں رہے گا بلکہ آس پاس رہ کر اس کا مشاہدہ کرے گا اور اگر ممکن ہوا تو وہ اس گھر کی دہلیز پھلانگ کر اندر چلا جائے گا۔ وہاں جا کر دیکھے گا کہ جن گھر کے کس کونے میں بیٹھا ہے۔

اسے یہ بات معلوم تھی کہ اندر سے پورا گھر کھلا ہوا ہے صرف مین گیٹ پر تالا پڑا ہے۔

گل خان کی سیدھی کھوپڑی میں جو الٹی بات سما گئی تھی، اب اسے نکالنے والا کوئی نہ تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی تھی جس سے وہ گلی کے کتوں کو دھمکایا کرتا تھا۔ یا پھر بجلی کے کھمبوں کو بجایا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اس طرح چور بھی ڈرے رہتے ہیں اور مکین بھی ہوشیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ محض اس کا خیال تھا اس کے کھمبوں کو بجانے کے باوجود چور اپنا کام کر جاتے اور مکین سوتے رہ جاتے۔

لاٹھی کے علاوہ اس کی واسکٹ کی جیب میں ایک لمبا سا چاقو بھی تھا۔ یہ چاقو اس کے پاس بہت عرصے سے تھا یہ چاقو بھی کسی چور پر استعمال نہیں ہوا تھا البتہ دن میں پھل اور سبزی کاٹنے کے کام ضرور آتا تھا۔

گل خان نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ ایک غریب علاقے میں، ایک نیم پختہ مکان میں رہائش پذیر تھا۔ رات کی چوکیداری کے بعد وہ کوئی سات آٹھ بجے تک اپنے گھر پہنچتا پھر وہ آرام کے بعد شام کو اپنے علاقے سے نکل پڑتا مغرب کے وقت وہ اس علاقے میں آ جاتا جہاں کی چوکیداری اس کے ذمے تھی۔

اس علاقے میں ایک پان کا کھوکھا تھا، کلو پنواڑی سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی، وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کلو کے پاس آ بیٹھتا، تھوڑی سی گپ شپ کے بعد وہ ایک ہوٹل سے رات کا کھانا کھاتا اور دوبارہ کلو کے پاس آ بیٹھتا پھر وہ اس وقت تک وہاں رہتا جب تک کلو اپنی دکان نہ بند کر جاتا۔ اس دکان کی حفاظت کی ذمے داری بھی گل خان کی تھی۔ کلو کے دکان بند کر جانے کے بعد وہ موتی جڑی ہوئی ڈبیہ سے نسوار نکال کر اپنے منہ میں ڈالتا تھا اور لاٹھی پکڑ کر علاقے کا گشت شروع کر دیتا۔

بابر علی کا نیا گھر، کلو پنواڑی کی دکان سے زیادہ دُور نہ تھا اور کلو پنواڑی کی دکان خالی گھر کے نزدیک ہی تھی۔ نماز کو جاتے اور ہوٹل میں کھانا کھانے کیلئے اس خالی گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس گھر کی روشنیاں گل خان کی نظر میں آ گئی تھیں۔

بابر علی سے مل کر وہ سیدھا کلو کے پاس پہنچا۔ اس نے کلو سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ کلو یہ بات سن کر بہت ہنسا۔ بولا۔ "گل خان، کیا فضول بات کرتے ہو آج کے زمانے میں جن بھوت کہاں اور وہ بھی کراچی کے گھروں میں۔ یہاں کے بچے ہی اتنے شریر ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہے، بھلا جن اس کے درمیان کہاں رہے گا۔"

"لیکن کلو، صاب بولتا اُودر جن اے تم اس گھر سے دُور رہو۔" گل خان نے بحث کی۔

"اچھا یہ بات ہے تو رات کو چلیں گے ادھر، میں نے کبھی جن نہیں دیکھے ہیں۔ میں بھی ذرا دیکھ لوں گا۔"

پھر گل خان اور کلو پنواڑی رات گئے تک اس موضوع پر بات کرتے رہے اور ہنستے رہے کبھی کوئی

راہ گیر کمبل اوڑھے ادھر سے گزرتا تو کلو نعرہ لگاتا۔ ''گل خان وہ دیکھ جن جارہا ہے۔''

آج خاصی سردی تھی۔ بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کلو نے اپنی دکان بند کی اور پھر وہ دونوں خالی گھر کی طرف چل دیے۔

کلو تقریباً اس کا ہم عمر تھا لیکن جسامت کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ نہ تھا، وہ دبلا پتلا تھا جبکہ گل خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔

وہ باتیں کرتے بالآخر خالی گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ گل خان نے پھاٹک کی جھری میں سے اندر جھانک کر دیکھا اس جھری میں سے جہاں تک نظر آرہا تھا، وہاں کوئی نہ تھا ہر سُو سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''اندر تو کوئی نظر نہیں آرہا۔''

''گل خان، گیٹ کو لاٹھی سے بجاؤ۔'' کلو نے مشورہ دیا۔

گل خان نے فوراً اپنی لاٹھی سیدھی کی اور زور زور سے گیٹ پر مارنے لگا اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ سڑک پر دُور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ بجنے کی آواز دُور تک گونج گئی۔

''بس بس۔'' کلو نے گل خان کو روکا۔ ''ذرا ٹھہرو، اب اندر جھانک کر دیکھتے ہیں لیکن اس گیٹ سے کچھ نظر نہ آئے گا، دیوار کی طرف آجاؤ میں تمہیں سہارا دیتا ہوں، تم دیوار پر چڑھ جاؤ۔''

''ٹھیک اے۔'' گل خان نے دیوار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ کلو کی مدد سے دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار پر بیٹھ کر دُور تک دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے اندر کوئی نظر نہیں آیا اندر گھر کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں، لیکن پردوں کے پیچھے سے روشنی چھن کر آرہی تھی۔

''کلو اُودر تو کوئی بھی نہیں، دروازہ بند ہے۔''

''گل خان، شور مچاؤ، پوچھو اندر کوئی ہے۔''

گل خان نے کلو پنواڑی کی ہدایت پر نعرہ لگایا۔ ''ارے اندر کوئی اے، اے تو باہر آؤ۔''

''کوئی نکلا۔'' کلو پنواڑی نے پوچھا۔

''نہیں، کلو، کوئی بدبخت نہیں نکلا۔'' گل خان نے غصے کا اظہار کیا۔

''اچھا، پھر تم اندر کود جاؤ اور اندر سے گیٹ کی کھڑکی کھول دو، پھر ہم دونوں اندر چلتے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک اے۔'' یہ کہہ کر گل خان دیوار کے اس پار کود گیا پھر ادھر سے کوئی آواز نہ آئی۔

کلو پنواڑی فوراً گیٹ کی طرف بھاگا اور زور سے چیخا۔ ''گل خان۔''

''آتا اے، آتا اے۔'' گل خان کی اندر سے آواز آئی۔

''خیریت تو ہے۔'' کلو پنواڑی نے پوچھا۔

''آں، وہ تو ہے، اُودر ہمارا قمیض کانٹوں میں پھنس گیا تھا۔'' ادھر سے گل خان بولا۔

پھر کلو پنواڑی کو گیٹ کی کھڑکی کھولنے کی آواز آئی۔ کھڑکی کھول کر گل خان نے سر باہر نکالا اور کلو پنواڑی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آجاؤ اندر۔''

کلو پنواڑی نے خاصا جھک کر کھڑکی پار کی۔ گل خان نے کلو پنواڑی کے اندر آنے کے بعد کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگادی۔

اب دونوں نے گھر کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ پختہ راستے پر جانے کے بجائے وہ دونوں لان میں داخل ہو گئے۔ لان کے درمیان اور اس کے اطراف میں پودے لگے ہوئے تھے۔ لان سے گزرنے کے بعد وہ گھر کے صدر دروازے پر پہنچے۔

دونوں نے خاموشی سے لان کراس کیا تھا اب بند دروازے کے سامنے پہنچ کر ان کے دلوں میں تھوڑی سی دھکڑ پکڑ شروع ہوئی۔ دروازہ بجانے کیلئے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہل کون کرے۔

پھر گل خان نے ہمت کی اس نے دروازے پر دستک دینے کیلئے ہاتھ رکھا تو دروازہ تھوڑا سا کُھل گیا۔ اندر سے گلاب کے پھولوں جیسی خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا۔

''یہ خالی مکان میں گلابوں کی خوشبو؟'' کلو پنواڑی نے سوال کیا۔

''اندر گلاب کے پودے رکھے ہوں گے۔'' گل خان نے جواب دیا۔ ''آؤ، اندر چلو۔''

دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر داخل ہو گئے اندر روشنی تھی، راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا وہ دونوں قالین پر چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ بائیں جانب ایک دروازہ تھا وہ بند تھا، اس پر ہاتھ رکھا تو وہ کُھل گیا گل خان نے اندر جھانکا۔

یہ ڈرائنگ روم تھا خوبصورتی سے سجا ہوا، قالین اور قیمتی صوفوں سے آراستہ۔

پھر ایک ایک کر کے انہوں نے سارے کمرے جھانک لئے۔ سارے کمروں میں سامان تھا۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ گھر خالی ہوا ہے یہاں سے سارا سامان لے جایا جاچکا ہے۔

پورا گھر سجا ہوا تھا لیکن گھر میں کوئی نظر نہ آیا۔ اس گھر میں ایک دروازہ ایسا بھی تھا جو اندر سے بند تھا۔ ان لوگوں کے ہینڈل گھمانے کے باوجود وہ نہیں کُھلا تھا۔ گل خان نے چابی کے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا، لیکن اندر کچھ نظر نہ آیا اندر شاید اندھیرا تھا۔

پھر ان لوگوں نے اس بند دروازے کو چھوڑ کر کچن کا رخ کیا وہاں چولہے پر ایک دیگچی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں سالن تھا۔ مرغی پکی ہوئی تھی۔ ایک رومال میں چند روٹیاں تھیں۔ کچھ جھوٹے برتن

سنک میں پڑے تھے۔ ایک کپ رکھا تھا جس میں تھوڑی سی چائے تھی، غرض باورچی خانہ یہ بتا رہا تھا کہ اس گھر میں کوئی موجود ہے، لیکن گھر میں کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔

کلو اور گل خان کیلئے یہ ساری چیزیں حیرت کا باعث تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال جواب کر رہے تھے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب یہ گھر خالی کر دیا گیا تھا تو اس میں سامان کہاں سے آیا اور سب سے حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ باورچی خانے میں کھانے پینے کی اشیاء کیسے موجود تھیں۔ کچن میں رکھا ہوا فریج بھی کھانے پینے کے لوازمات سے بھرا ہوا تھا۔

فریج میں رکھے ہوئے لال لال سیب دیکھ کر کلو پنواڑی کا جی مچل اُٹھا، اس نے ایک سیب نکال لیا اور اس میں منہ مارا سیب کاٹتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مٹی کھالی ہو۔ اس نے فوراً تھوک دیا اور اس کھائے ہوئے سیب کو واپس فریج میں رکھ دیا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' گل خان نے پوچھا۔

''سیب ہے یا مٹی کا ڈلا'' کلو تھوکتا ہوا بولا۔

''کیا کہتے ہو۔'' گل کو یقین نہ آیا۔

''چکھ کر دیکھ لو، تمہیں یقین آجائے گا۔'' کلو نے پیشکش کی۔

گل خان نے سیب چکھا تو اسے بھی یہی احساس ہوا جیسے مٹی کھا رہا ہو اس نے فوراً تھوک دیا اور بولا۔''بدبخت یہ سیب کیسا ہے۔''

''گل خان، میرے خیال سے یہاں سے نکل لو۔'' کلو پنواڑی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' گل خان نے پوچھا۔

''نہیں، ڈر کیسا؟'' کلو پنواڑی نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں کچن سے نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ ٹرالی پر ایک نیا چمکتا ہوا ٹیلیویژن رکھا تھا اور ٹرالی کے ایک خانے میں وی سی آر بھی موجود تھا۔

کلو پنواڑی آگے بڑھ کر دونوں چیزوں کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت ''میاؤں'' کی آواز آئی۔

دونوں نے چاروں طرف نظر دوڑائیں لیکن دکھائی کچھ نہ دیا۔

چند لمحوں بعد پھر ''میاؤں'' کی آواز آئی۔ یہ آواز نزدیک سے آئی تھی۔

''یہ آواز تو بلی کی ہے لیکن بلی کہیں نظر نہیں آرہی۔'' کلو پنواڑی نے کہا۔

گل خان نے ٹرالی کے پیچھے جھانکا صوفے کے نیچے دیکھا لیکن انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

''میاں، میاؤں'' کی آواز بدستور آرہی تھی۔

''اوے، بدبخت تو کدر اے، سامنے آ۔'' گل خان نے زور سے کہا۔

گل خان کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس کو بدبخت کہہ کر اپنی بدبختی کو آواز دے رہا ہے تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ خاموشی سے کلو پنواڑی کو اس گھر سے لے کر نکل جاتا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

تب وہ ٹرالی کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس نے اپنی لال انگارہ آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔''میاؤں'' اس آواز میں بڑی دہشت تھی۔

''کالا بلا۔'' کلو پنواڑی کی اس پر نظر ڈالی تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔''یہ یہاں چھپا ہوا تھا۔''

وہ کالا بلا، اب ٹرالی سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ اس نے قالین پر اپنی اگلی دونوں ٹانگوں پر جھک کر انگڑائی لی اور پھر اس نے اپنی نظریں گل خان پر جما دیں۔

گل خان بڑے دل گردے کا مالک تھا، اس نے ڈرنا سیکھا ہی نہ تھا لیکن اس وقت کالے بلے کی آنکھیں دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈ اترنے لگی، یاالٰہی یہ کیسا بلا ہے۔

اب کالے بلے نے گل خان کو دیکھ کر غرانا شروع کیا، اس کی غراہٹ خوف میں مبتلا کر دینے والی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے گل خان پر چھلانگ لگائی اور اس کے کندھے پر سوار ہو گیا۔

گل خان کو توقع نہ تھی کہ اس میں اتنا وزن ہوگا، اس کے اندر گدھے برابر وزن تھا۔ گل خان اس کا وزن برداشت نہ کر سکا وہ پیچھے کی طرف گرا۔ کالے بلے نے گل خان کے گرتے گرتے اس کے دائیں کان کی طرف اپنا منہ بڑھایا اور اس کا کان بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔

گل خان تکلیف کی شدت سے چیخا اور پھر اُٹھ کر بھاگا۔ گل خان کا یہ حشر دیکھ کر کلو پنواڑی کی حالت پتلی ہوگئی وہ بھی گل خان کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگا۔

کلو کو بھاگتے دیکھ کر کالے بلے نے اس پر بھی چھلانگ لگائی اور اس کا بھی وہی حشر کیا جو گل خان کا کیا تھا۔ اس کا کان بھی بھنبھوڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دیا۔

کلو پنواڑی، کالے بلے کے وزن کی وجہ سے منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر اُٹھ کر بھاگا۔

گل خان آگے تھا، وہ اپنے کٹے کان پر ہاتھ رکھے، بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ اس مکان کے مالک نے اس سے سچ کہا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے اس سے دُور رہنا۔

اب دونوں کو پتہ چل گیا تھا کہ آسیب کیا ہوتا ہے، جن بھوت کا سایہ کسے کہتے ہیں۔

وہ جا رہے تھے کہ کوئی سواری مل جائے تو کسی طرح اسپتال پہنچ جائیں۔

ایک گشتی پولیس وین ادھر سے گزر رہی تھی پولیس پارٹی نے دو بندوں کو بگٹٹ بھاگتے دیکھا تو گاڑی ان کے سروں پر جا کر روک دی اور ایک پولیس والے نے للکارا۔''خبردار، جو بھاگنے کی

کوشش کی۔"

وہ دونوں فوراً رک گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ دونوں نہ رکے تو پولیس ان کا جن سے بھی بُرا ح[ال] کرے گی۔

"اوئے ہم لوگ واردات کر کے بھاگے ہو۔" پولیس والے نے لتاڑا۔

"نا جی نا، تھانے دار جی، میں کلو پنواڑی ہوں، نزدیک ہی میرا پان کا کھوکھا ہے، یہ گل خان۔ اس علاقے کا چوکیدار۔ ہم شریف لوگ ہیں جی۔"

"اوئے، آج کل شریف لوگ ہی واردات کرتے ہیں اور یہ تم دونوں نے اپنے کانوں پر کیو[ں] ہاتھ رکھے ہوئے ہیں ذرا اپنے ہاتھ تو ہٹاؤ۔" پولیس والے نے غصے سے کہا۔

اور جب دونوں نے اپنے کان سے ہاتھ ہٹائے تو وہاں کان ہی نہ تھے اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔

"اوئے۔ یہ کیا ہوا؟"

تب ان دونوں نے گھبرا گھبرا کر پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل بیان کی۔

ان دونوں کے بیان کے مطابق ایک کالے بلے نے ان پر حملہ کر کے ان کے کان کاٹے تھے او[ر] وہ گیٹ کی چھوٹی کھڑکی سے باہر آئے تھے۔

لیکن جب پولیس وین خالی گھر کے گیٹ پر پہنچی تو وہ چھوٹی کھڑکی اندر سے بند ہو چکی تھی اس کے علاوہ وہ مکان اب تاریکی میں ڈوب چکا تھا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس مکان میں کوئی رہائش پذی[ر] ہے۔ گیٹ پر پڑا تالا بدستور بند تھا۔

پولیس پارٹی نے ان دونوں "جھوٹوں" کو اپنی وین میں ڈالا، اسپتال سے ان کی مرہم پٹی کروا[ئی] اور تھانے کے لاک اپ میں بند کر دیا۔

وہ دونوں رات بھر حوالات کے ایک کونے میں پڑے کراہتے رہے۔ اپنی قسمت کو کوستے رہے اور سوچتے رہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ خالی گھر پر شک کر کے خود کو عذاب میں مبتلا کر لیا۔ اگر اس گھر کی بجلیاں رات کو خود بخود جل جاتی تھیں یا صبح کو اندر سے فرش دھوئے جانے کی آوازیں آتی تھیں اور پانی بہہ کر گیٹ سے باہر آتا تھا تو آتا رہتا۔ بجلی جلتی بجھتی رہتی۔ اس کا کام چوکیداری تھا، وہ نگرانی کرتا رہتا، ایک ذرا سے تجسس نے گل خان کو ایک کان سے محروم کر دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے دوست کو بھی مروایا۔ کلو بیچارہ بھی مفت میں کن کٹا ہو گیا۔

صبح ہوئی تو ان دونوں کو تھانے کے انچارج کے سامنے پیش کیا گیا۔

تھانے کا انچارج معصوم علی شاہ محض نام کا معصوم تھا لوگ اسے "ظالم شاہ" کے نام سے یاد کرتے تھے اس کے ظلم کی داستانیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اصل مجرموں پر ہاتھ نہ ڈالنا، اگر غلطی سے

پکڑے جائیں تو ان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بھگا دینا اور معصوم لوگوں کو پکڑ کر اپنی کارکردگی میں اضافہ کرنا، اس کا شعار تھا، وہ ایک انتہائی اکھڑ مزاج اور سخت گیر شخص تھا۔ اس کے ماتحت اس کے سامنے تھر تھر کانپتے تھے اور پیٹھ پیچھے اس کو دل کھول کر گالیاں دیتے تھے۔

معصوم علی شاہ کا جبڑا ہمہ وقت سختی سے بند رہتا تھا۔ اس نے مسکرانا کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ یوں بھی پولیس کو بھلا مسکرانے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس اگر مسکرائے گی تو مجرموں کو تو پھر کھلی چھٹی مل جائے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر پولیس والے کو بطور خاص ہدایت کی جاتی ہے، تھانے میں آنے والے ہر شخص کو شیر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ منہ سختی سے بند رکھا جائے اور جتنی بے عزتی ممکن ہو، وہ فوراً کر دی جائے۔

معصوم علی شاہ کا موڈ آج صبح ہی صبح خراب ہو گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی معصوم علی شاہ کیلئے کسی صور اسرافیل سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ادھر پہلی گھنٹی بجی اور ادھر اس نے ریسیور جھپٹ کر اُٹھایا۔ وہ پہلی گھنٹی کو بھی پورا نہ ہونے دیتا تھا۔

حسب معمول اس وقت بھی اس نے ٹیلیفون پر جھپٹا مارا۔

"ہالو۔" وہ ہیلو اس انداز میں کھینچ کر اور اتنے زور سے کہتا کہ پورا تھانہ گونج اُٹھتا۔

"جمعہ بازار۔" ادھر سے کسی نے تمسخر سے کہا۔

"اوئے، یہ تانوں جمعہ بازار لگدا اے۔ اے تھانڑاں، تھانڑاں اے۔" یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور ٹیلیفون کرنے والے کو ایک زوردار گالی دی۔

چند لمحوں بعد ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی معصوم شاہ نے جھپٹ کر ریسیور اُٹھایا اور چیخا۔ "ہالو۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" ادھر سے بڑی ملائمت سے پوچھا گیا۔

"اوئے تو نے کہاں فون کیا ہے، توان پڑآں، نا دس اوئے۔" معصوم علی شاہ دھاڑا۔

"میں نے تو جناب پاگل خانے فون کیا ہے۔" ادھر سے پھر بڑی رسانیت سے جواب دیا گیا۔

پاگل خانے کا نام سن کر معصوم علی شاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے غصے میں فون کرنے والے کو دو تین بھاری بھاری گالیاں دیں پھر فون بند کر دیا۔

لیکن ادھر سے جو فون کر رہا تھا، شاید اس نے قسم کھائی تھی کہ آج معصوم علی شاہ کا بلڈ پریشر کسی قیمت پر نارمل نہیں ہونے دے گا۔ اس نے فون بند ہوتے ہی، پھر دوبارہ رنگ کیا۔

معصوم علی شاہ کی میز پر رکھا ہوا ٹیلیفون پھر چیخا۔

"ہالو۔" معصوم علی شاہ نے حسب معمول پورا تھانہ سر پر اُٹھالیا۔

''ہاں، بھئی گینڈے آپ کے کیا حال ہیں؟'' ادھر سے، بہت محبت سے پوچھا گیا۔

اگرچہ معصوم علی شاہ کا ڈیل ڈول کسی گینڈے جیسے ہی تھا لیکن وہ یہ سن کر بھڑ اُٹھا۔ اس نے ریوالو نکال لیا اور ریوالور کی نال ماؤتھ پیس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھے شوٹ کردوں گا۔''

جواب میں اِدھر سے قہقہہ سنائی دیا۔

قہقہہ سن کر معصوم علی شاہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا اس کے منہ سے گالیاں، گولیوں کی طرح نکلنے لگیں پھر اس نے فون بند کر دیا۔

''اوئے بالے۔'' معصوم علی شاہ نے آواز دی۔

باہر کھڑا سپاہی اقبال شیخ، فوراً چق اُٹھا کر اندر آیا اٹینشن ہو کر اس نے سلیوٹ مارا اور مودبانہ اندا میں بولا۔ ''جی سر۔''

''بالے، ابھی فون کی گھنٹی بجے گی، کوئی کتے کا بچہ کئی دن سے فون پر پریشان کر رہا ہے ذرا اس کو دو چار کراری کراری سنا دینا۔'' معصوم علی شاہ نے اسے ہدایت کی اور میز پر سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا کر سگریٹ سلگانے لگا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے ابھی ایک کش ہی کھینچا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

معصوم علی شاہ نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا اقبال شیخ نے ریسیور اُٹھاتے ہی ٹیلیفون کرنے وا کو ایسی ایسی گالیاں سنائیں کہ معصوم علی شاہ کا دل خوش ہو گیا۔ اس نے تعریفی نظروں سے اقبال کو دیکھا۔

لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ اقبال شیخ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ ریسیور کانپنے لگا اور وہ ''جی سر، سوری سر۔'' کی گردان کرنے لگا۔

بالے کو سیدھا ہوتے دیکھ کر معصوم علی شاہ کی حالت بھی پتلی ہو گئی اسے اندازہ ہو گیا کہ کس کا فو ہے اور اقبال شیخ نے جو نئی نئی گالیاں سنائی ہیں، ان کا سامع کون ہے اور اگلے چند لمحوں میں کیا ہو والا ہے۔

پھر بالے نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور معصوم علی شاہ کی طرف بڑھایا۔ ''بڑے صاحب کا فو ہے، بات کریں۔''

معصوم علی شاہ نے ریسیور ہاتھ میں پکڑ کر، کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا اور مؤدب ہو کر بولا ''حکم سر۔''

اسے معلوم تھا کہ اس ''حکم سر'' کے جواب میں اسے کیا سننا پڑے گا۔ ''بڑے صاحب'' ادھر سے جو کچھ کہا، وہ اسے تلخ گھونٹ سمجھ کر پیتا رہا۔ بڑے صاحب بہت غصے میں تھے انہوں

معصوم علی شاہ کو دل کھول کر سنائیں اور پھر غصے میں فون بند کر دیا۔ انہوں نے کیوں فون کیا تھا، یہ بھی نہ بتایا۔

یہی وجہ تھی کہ آج صبح ہی صبح معصوم علی شاہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

جب گل خان اور کلو پنواڑی کو معصوم علی شاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اپنے ماتحت پر برس پڑا اور جانے اسے کیا کیا سنا ڈالیں۔ جب غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوا، بلڈ پریشر کا گراف نیچے آیا تو اس نے کلو اور گل خان کے چہروں پر نظر ڈالی۔

''ان بندروں کو کہاں سے لائے ہو؟'' معصوم علی شاہ نے اپنے ماتحت پولیس افسر نادر حسین سے پوچھا۔

''سر جی۔ رات کے گشت پر یہ دونوں ہاتھ آئے ہیں، چور ہیں؟''

''نہیں جی، ہم لوگ چور نہیں ہیں۔'' کلو نے فوراً کہا۔

''اوئے چپ۔'' معصوم علی نے آنکھیں نکالیں۔ ''تجھ سے کس نے کہا ہے بولنے کو۔ ہاں، نادر، ان بندروں نے کیا چرایا ہے، چوری کا مال کدھر ہے۔''

''ہم بندر نہیں ہیں، انسان ہیں۔'' اس مرتبہ گل خان بولا۔ ''ام نے کوئی سامان نہیں چرایا۔''

''اوئے، ایسے ہوتے ہیں انسان۔ تمہارے جیسے انسان ہونے لگیں تو پھر بندروں کا کیا بنے گا۔'' معصوم علی شاہ نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اپنے خیال میں اس نے کوئی زبردست بات کہی تھی۔

''نادر، کیا کیس ہے؟'' معصوم علی شاہ نے اپنا بے ہنگم قہقہہ روک کر پوچھا۔

نادر نے ان دونوں کو جس طرح پکڑا تھا، انہوں نے جو بیان دیا تھا اور خالی گھر میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب معصوم علی شاہ کو تفصیل سے بتایا اور آخر میں بولا۔ ''ان دونوں کا بیان ہے، ان کے کان کالے بلے نے کاٹے ہیں اور وہ کالا بلا ان کے خیال کے مطابق کوئی جن ہے جس نے اس گھر پر قبضہ کر لیا ہے اور مالک مکان کو کرائے کے گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''اوئے، یہ کیا بکواس ہے۔'' معصوم علی شاہ اپنے ماتحت پر گرجا۔ ''تمہیں تو فوراً لائن حاضر کر دینا چاہیے۔ پولیس میں ہو کر تم نے ان بندروں کے بیان پر یقین کر لیا۔''

''ام بندر نہیں ہیں۔'' گل خان نے پھر تردید کی۔

''بیان تو تم لوگوں نے بندروں جیسا دیا ہے، انتہائی جانورانہ، اوئے تمہارے بیان پر محض ہنسا جا سکتا ہے یقین نہیں کیا جا سکتا۔'' معصوم علی شاہ یہ کہہ کر ہنسا۔

''پہلے ہمارا بھی، یہی خیال تھا، اس مکان میں کوئی آسیب، جن بھوت نہیں ہے۔ آج کے زمانے میں بھلا جن بھوت کہاں؟ اور اسی تجسس کے مارے، ہم اس گھر میں داخل ہوئے تھے وہاں ہمارا یہ حشر

ہوا کہ ایک کان سے محروم ہو گئے۔'' کلو نے بڑے افسوس سے کہا۔

''لیکن تم لوگوں کا بیان تھا کہ تم لوگ اس گھر کے گیٹ کی چھوٹی کھڑکی سے باہر آئے اور اس گھر کی تمام لائٹیں جل رہی تھیں لیکن جب ہم نے چیک کیا تو گیٹ کی کھڑکی اندر سے بند تھی اور گھر کی ایک لائٹ بھی روشن نہ تھی۔''

''ہم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے، آپ کو یقین نہیں تو اس بنگلے کے مالک بابر علی صاحب کو بلوا کر پوچھ لیجیے۔ انہوں نے گل خان کو اس گھر سے دُور رہنے کی ہدایت کی تھی لیکن وہ تو ہم دونوں کی مت ماری گئی تھی کہ تصدیق کرنے کیلئے اس گھر میں کود گئے۔'' کلو پنواڑی نے کہا۔

''اوئے نادر، ان بندروں کو پاگل خانے پہنچا، انہیں تھانے کیوں لے آیا۔'' معصوم علی شاہ نے اپنے ماتحت افسر کو غصے سے دیکھا۔

''سر جی، آپ اجازت دیں تو میں اس گھر کے مالک بابر علی کو تھانے بلوا لوں۔'' نادر حسین نے معصوم علی شاہ کے غصے کی پروا نہ کی۔ اس کی ذہن میں تجسس جاگ گیا تھا، وہ اس کیس کی حقیقت کو جاننا چاہتا تھا۔

''کیا تُو سمجھتا ہے، اس گھر میں واقعی کوئی سایہ وایہ ہے۔'' معصوم علی شاہ نے نادر حسین کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

''سر جی، اس کیس سے مجھے دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ......''

''اوئے، بے وقوفا، ایسے خشک کیس سے دلچسپی لین دا کی فائدہ، کوئی ایسا کیس پکڑ جس میں چار پیسے بننے کا امکان ہو۔'' معصوم علی شاہ یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اُٹھا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

نادر حسین ذرا مختلف پولیس والا تھا اسے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے آسیب، جن بھوت اور چڑیلوں سے متعلق بہت کہانیاں پڑھی تھیں لیکن دیکھا کچھ نہیں تھا۔ ان کہانیوں کو اس نے محض کہانیاں سمجھ کر ہی پڑھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہ کہانیاں حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ جائیں گی۔

نادر حسین کو گل خان اور کلو کے بیان پر یقین نہ تھا لیکن انہوں نے بابر علی کے بارے میں جو بیان دیا تھا اس سے حقیقت کا کچھ اندازہ ہونے کا امکان تھا۔

اس نے گل خان اور کلو کو تھانے کے لاک اپ میں ڈالا اور ان سے بابر علی کا پتہ لے کر دو سپاہیوں کو بابر علی کے گھر کی طرف روانہ کر دیا۔

دونوں سپاہی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بابر علی کے گھر پہنچے ایک سپاہی نے موٹر سائیکل سے اتر کر گھر کی گھنٹی بجائی جبکہ دوسرا سپاہی موٹر سائیکل پر بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد گھر کا گیٹ کھلا، راشدہ نے باہر جھانکا۔ گیٹ پر پولیس دیکھ کر وہ ذرا جھجکی وہ فوراً پیچھے ہو گئے۔ تب اس سپاہی نے کہا۔ ''بی بی، بابر صاحب کا مکان یہی ہے۔''

''ہاں جی، یہی ہے۔'' راشدہ نے جواب دیا۔

''کیا وہ گھر پر ہیں۔'' سپاہی نے پوچھا۔

''جی ہاں، ہیں۔'' راشدہ نے کہا۔

''ذرا انہیں باہر بھیجیں۔'' سپاہی بولا۔

راشدہ یہ سن کر گھبرائی ہوئی اندر پہنچی، بابر اس وقت شوروم جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اکبر اپنے ایک دوست کے گھر جا چکا تھا۔

''راشدہ کون ہے دروازے پر۔'' بابر علی نے پوچھا۔

''ابو، دو پولیس والے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں۔'' راشدہ نے بتایا۔

''پولیس والے۔'' بابر علی نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے بلا رہے ہیں، اچھا میں دیکھتا ہوں۔''

بابر علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس والے اس کے دروازے پر کیوں آئے ہیں، گیٹ پر پہنچ کر اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میرا نام بابر علی ہے۔ فرمائیے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے۔''

''بابر صاحب آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ صاحب نے بلایا ہے۔'' اس سپاہی نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''تھانے۔'' بابر علی حیرت زدہ رہ گیا۔ ''آخر کیوں؟''

''یہ تو آپ کو تھانے چل کر ہی پتہ چلے گا؟'' سپاہی نے جواب دیا۔

''کسی نے میرے خلاف کوئی رپورٹ درج کرائی ہے؟'' بابر نے پوچھا۔

وہ سپاہی جو موٹر سائیکل پر ذرا دُور کھڑا تھا، گاڑی اسٹارٹ کر کے بابر علی کے قریب آیا اور بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں چکر کیا ہے؟''

''جی بتائیں۔'' بابر علی نے کہا۔

''اصل میں آپ کا چوکیدار میرا مطلب ہے آپ کے علاقے کا چوکیدار پکڑا گیا ہے۔ میں گل خان کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کلو پنواڑی بھی ہے۔ وہ کل رات آپ کے خالی گھر سے خون میں نہائے ہوئے بھاگ رہے تھے کہ پکڑے گئے انہوں نے جو بیان دیا ہے اس پر کسی کو یقین نہیں آ رہا آپ کو تصدیق کیلئے بلایا گیا ہے بس اتنی سی بات ہے۔'' اس سپاہی نے سمجھایا۔

یہ سن کر بابر علی کی جان میں جان آئی اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں اندر سے اپنی گاڑی کی چابی لے آؤں۔''

کچھ دیر کے بعد دونوں سپاہی موٹر سائیکل پر آ گئے اور بابر علی اپنی کار میں پیچھے چل رہا تھا۔ منٹ کے بعد وہ تھانے کی حدود میں داخل ہو گئے۔

نادر حسین، بابر علی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جب بابر علی اس کے کمرے میں داخل ہوا اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ بابر کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے ساتھ آئے سپاہیوں سے کہا۔ ''ذرا ان دونوں کو بھیجو۔''

چند لمحوں بعد گل خان اور کلو پنواڑی کمرے میں داخل ہو گئے۔ گل خان نے بابر علی کو دیکھا تو وہ ا کی طرف لپکا اور بولا۔ ''صاب جی، آپ آ گئے، صاب جی آپ انہیں بتاؤ کہ ام چور نہیں ہے۔''

''ہاں، گل خان میں جانتا ہوں کہ تم چور نہیں ہو۔'' بابر علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر کرو، اب میں یہاں آ گیا ہوں، تمہارے بارے میں جو غلط فہمی ہو گئی ہے، وہ میں دُور کر دوں گا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ تم دونوں کے کان پر پٹی کیوں بندھی ہے؟''

''صاحب جی، اس کالے بلے نے ہمارے کان کاٹ لئے۔'' اس مرتبہ کلو پنواڑی بولا۔

''کالے بلے نے؟'' بابر علی نے حیرت ظاہر کی۔ ''کیا تم لوگ مکان میں داخل ہوئے تھے اگر لوگوں نے ایسا کیا ہے تو سخت غلطی کی۔ گل خان میں نے تمہیں اس مکان سے دور رہنے کو کہا تھا ہوا کیا؟''

تب گل خان اور کلو پنواڑی نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی۔

نادر حسین بالکل خاموشی سے ان دونوں کا بیان سنتا رہا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ دونوں رات دیتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے چُپ ہونے کے بعد نادر حسین نے ان دونوں کو پکڑنے کی تفصیل اس کے بعد وہ بابر علی سے مخاطب ہوا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے؟''

بات کیوں کہ کافی آگے بڑھ چکی تھی، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بابر علی ساری کہانی دے، ایک ایک بات بتا دے اس نے کہا۔ ''جناب یہ ایک لمبی کہانی ہے؟''

''لیکن میں پھر بھی تمام واقعات جاننا چاہوں گا۔'' نادر حسین نے کہا۔

''گل خان کو میں نے اس خالی گھر کے بارے میں سرسری سا بتایا، بس اتنا ہی کہ وہ گھر آسیب ہے وہ اس سے دُور رہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات سن کر اسے جوش چڑھ جائے گا اور میری کی تصدیق کرنے کیلئے یہ میرے گھر میں داخل ہو جائے گا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ایسا کرنے ہے تو میں اسے ذرا تفصیل سے بتا دیتا۔ اس کالے بلے کی خونچکاں داستان سنا دیتا جس نے ہمارا گھر کو اجاڑ دیا ہے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔''

''بابر صاحب، تمہید اب کافی ہو گئی، آپ اب اصل معاملے پر آئیں۔'' نادر حسین نے بابر علی کو

''یہ کہانی میں آپ کو صرف تنہائی میں سناؤں گا۔'' بابر علی بولا۔

''ٹھیک ہے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' یہ کہہ کر نادر حسین نے ایک سپاہی کو آواز دی۔ گل خان اور کلو پنواڑی کو باہر لے جانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کہ جب تک میں نہ بلاؤں کوئی کمرے میں داخل نہ ہو۔

تنہائی میسر آنے کے بعد بابر علی نے اپنی کہانی شروع کی۔ یہ کہانی ٹرین سے شروع ہوئی۔ ٹرین ہیں کالے بلے کی آمد، لاہور میں عجیب و غریب واقعات کا پیش آنا، نیلم اور اکبر کی شادی میں طرح طرح کی رکاوٹیں، پھر شادی کا جیسے تیسے ہونا، بارات کی کراچی واپسی، خوفناک واقعات کی ابتداء، نیلم کی کہانی، وہ کس کی بیٹی ہے، سیّد پور کس طرح پہنچی، کس طرح جن اس پر عاشق ہوا اور اس نے اکبر کو کس کس طرح پریشان کیا۔ یہاں تک کہ گھر بھی خالی کروا لیا۔

نادر حسین بت بنا سارے واقعات کو بڑی دلچسپی اور غور سے سنتا رہا۔ وہ پولیس والا تھا، شک و شبہ س کی گھٹی میں پڑا تھا۔ تفتیش اس کے خون میں شامل تھی واقعات سننے کے بعد اس نے بے شمار سوالات کیے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ بابر علی نے جو کچھ کہا ہے وہ حقائق پر مبنی ہے، اس نے سچ بولا ہے تو وہ معصوم علی شاہ کے کمرے میں پہنچا۔

اس نے معصوم علی شاہ کو اس انداز سے رپورٹ پیش کی کہ وہ اکھڑ مزاج پولیس افسر جو اپنے خیالات میں بڑا صاف اور سخت تھا، ان واقعات کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ معصوم علی شاہ کو جن بھوتوں پر ذرہ بھر بھی یقین نہ تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو جن بھوت کہا کرتا تھا۔

''ہم پولیس والوں سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے، جن بھوت کی تو حقیقت ہی کیا۔''

معصوم علی شاہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''نادرے، تو کیا چاہتا؟''

''شاہ جی، ایک مظلوم لڑکی اس خالی گھر میں قید ہے، ہمیں اس کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔ یہ تو سیدھا سیدھا اغوا کا کیس ہے۔''

''چل پھر تیار ہو جا۔'' معصوم علی شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کس لئے شاہ جی۔'' نادر حسین نے پوچھا۔

''تفتیش پر چلتے ہیں، میں نے کبھی جن نہیں دیکھا، آج چل کر دیکھ لیتا ہوں، نادرے تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کیسے اعلیٰ افسر سے تیرا واسطہ پڑا تھا۔'' یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے اپنا ریوالور چیک کیا اور کرسی سے اُٹھ گیا۔

نادر حسین کی توقع نہیں تھی کہ معصوم علی شاہ اس کی رپورٹ سن کر اس قدر بے تاب ہو جائے گا، خود ہی تفتیش پر چل دے گا وہ تو خود تفتیش پر جانے کیلئے معصوم علی شاہ سے اجازت لینے آیا تھا۔ معصوم علی

شاہ کی دلچسپی دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ لوگ تھانے سے نکل گئے۔

اس مرتبہ بابر علی اپنی گاڑی میں آگے تھا۔ معصوم علی شاہ اور نادر حسین چار سپاہیوں سمیت اپنی پو
وین میں پیچھے تھے۔ کوئی دس بارہ منٹ بعد بابر علی نے اپنی گاڑی، خالی گھر کے سامنے روک لی۔

بابر علی گاڑی سے اتر کر گھر کے گیٹ کی طرف آیا، اتنے میں پولیس پارٹی بھی اپنی گاڑی سے ا
گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

معصوم علی شاہ نے اس خالی گھر کو بغور دیکھا اور بولا۔ ''اے وے جن باشا کی رہائش۔ او
مکان تو جن باشا نے اچھا پکڑا ہے۔''

بابر علی خاموش رہا اس نے کوئی رائے نہ دی۔

''شاہ جی مکان ہی نہیں اس نے لڑکی بھی اچھی پکڑی ہے، نیلم بہت خوبصورت لڑکی ہے؟''

''اوئے نادرے، تانوں کی پتہ۔''

''مجھے بابر صاحب نے بتایا ہے۔''

''اچھا، پھر تالا کھولو۔'' معصوم علی شاہ نے ڈنڈے سے تالے کو ہلایا۔ ''چابی کدھر ہے؟''

بابر علی گھر سے چلا تھا تو اس نے احتیاطاً گھر کی چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی اس نے تالا
کھولنے کے بجائے چابی نادر حسین کی طرف بڑھائی۔ ''یہ ہے جی، چابی۔''

نادر حسین نے مسکراتے ہوئے چابی بابر کے ہاتھ سے لے لی اور بولا۔ ''لایئے میں کھولوں تالا۔''

نادر حسین نے آگے بڑھ کر تالے میں چابی ڈالی اور دائیں جانب گھمائی چابی فوراً گھوم گئی۔
کھل گیا۔ اس نے تالا کنڈے سے نکال کر بابر علی کے حوالے کیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے گیٹ کو
زوردار دھکا دیا، گیٹ کے دونوں پٹ تیزی سے کھلتے چلے گئے۔

سب سے پہلے مکان کے احاطے میں معصوم علی شاہ نے قدم رکھا پھر بابر اور نادر ساتھ ساتھ
اس کے بعد چاروں سپاہی داخل ہوئے۔

نادر حسین نے پیچھے پلٹ کر ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ''گیٹ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دو۔''

''میرا خیال ہے کہ گیٹ بند ضرور کروا دیں لیکن کنڈا نہ لگائیں۔'' بابر علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ارے، بابر صاحب آپ تو خاصے ڈرے ہوئے ہیں آپ فکر نہ کریں ہم آپ کے ساتھ
ہمیں دیکھ کر شیطان بھی پناہ مانگتا ہے، جن بھوت کیا چیز ہیں۔'' پھر معصوم علی شاہ، سپاہی سے مخا
ہوا۔ ''اچھا ٹھیک ہے صرف گیٹ بند کر دو، کنڈی نہ لگانا۔''

''جی، سر۔'' سپاہی نے کہا اور گیٹ بند کر دیا۔

''اوئے کون کیندا سی کہ اس گھر کا فرش صبح صبح دھلتا ہے، یہاں تو فرش پر اتنی ریت جمی ہوئی ہے۔
راہ میں پتے پڑے ہوئے ہیں۔'' معصوم علی شاہ نے دُور تک نظریں دوڑائیں۔

''یہ چوکیدار گل خان کا بیان تھا۔''

''اوئے، ان بندروں کو تھانے کیوں چھوڑ آئے انا نوں وی نال لانا سی۔'' معصوم علی شاہ نے کہا۔

''میں نے دونوں سے چلنے کو کہا تھا شاہ جی تو وہ کہنے لگے ہم نے اپنا دوسرا کان نہیں کٹانا۔'' نادر
حسین نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''اوئے بے وقوف دے پتر۔'' معصوم علی شاہ نے غصے میں دونوں کو ایک ایک عدد موٹی گالیوں
سے نوازا پھر بولا۔ ''نادرے، مجھے تو اس گھر میں کوئی آبادی نہیں لگدی، کیوں جی، یہ گھر آپ نے کب
خالی کیا ہے۔''

''دو تین دن ہوئے ہیں۔'' بابر علی نے بتایا۔

''اچھا، آپ کوئی فرق محسوس کر رہے ہیں، جیسا چھوڑ کر گئے تھے، مکان کیا ویسا ہی نہیں ہے۔''
اس مرتبہ نادر بولا۔

''مجھے تو ویسا ہی نظر آ رہا ہے۔'' بابر علی نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

اب یہ لوگ مکان کے بڑے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

''گھر کھولو جی۔'' معصوم علی شاہ نے بابر سے کہا۔

''گھر کھلا ہوا ہے شاہ جی، ان کا بیان ہے کہ گھر کے گیٹ کے سوا کہیں تالا نہیں لگا تھا۔'' نادر حسین
نے وضاحت کی۔

''چلیں پھر اندر۔'' معصوم علی شاہ نے بابر کو اشارہ کیا۔ ''آگے بڑھیں۔''

''میں چلوں آگے؟'' بابر علی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھہریں، میں چلتا ہوں آگے۔'' نادر حسین نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

نادر حسین نے آگے بڑھ کر بہت آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

تھوڑا سا دروازہ فوراً کھل گیا۔ معصوم علی شاہ نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ وقت
دیکھ کر اس نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

نادر حسین پریشان ہوا کہ یہ اچانک معصوم علی شاہ کو کیا ہوا، اس نے پوچھا۔ ''شاہ جی کی ہویا۔''

''اوئے نادرے، ہویا کچھ نہیں، میں نے ٹائم وے خیا سی، پورے بارہ بجے ہیں۔''

یہ سن کر نادر حسین اور بابر نے بھی گھڑیاں دیکھیں اور دونوں مسکرا پڑے۔

''بڑا خطرناک وقت ہے شاہ جی۔'' نادر حسین نے ہنستے ہوئے معصوم علی شاہ سے کہا۔

''اوئے، فکر نہیں۔'' یہ کہہ کر معصوم علی شاہ نے پورا دروازہ کھول دیا اور اندر قدم بڑھایا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے حبس زدہ ہوا باہر آئی۔ یہ ایسی ہی بو تھی جیسے عموماً بند گھروں سے آتی ہے

''اوئے کتھے گلابوں دی خوشبو، سانوں تو بند ہوا کی بو آندی پئی اے۔'' معصوم علی شاہ نے آ بڑھتے ہوئے کہا۔

''یہ بیان بھی انہی کا تھا، گل خان اور کلو کا۔''

''اوئے، نادرے ان بندروں کو نال لاناسی۔''

''ام بندر نہیں انسان اے۔'' اچانک گل خان کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کس طرف سے آئی اندازہ کوئی نہ لگا سکا۔

آواز سنتے ہی معصوم علی شاہ نے چاروں طرف دیکھا اور پھر نادر حسین سے مخاطب ہوا۔ ''نا جو میں نے سنا ہے کیا تو نے بھی وہ سنا ہے۔''

''جی، شاہ جی میں نے بھی سنا ہے۔''

پھر اس نے بابر علی اور سپاہیوں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی گل خان کی آواز کی تصدیق اندر کمروں کے دروازے سارے کے سارے بند تھے۔ ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا، وہاں نہ ٹی وی وی سی آر، فرش ننگا تھا اور فرش پر اچھی خاصی ریت جمی ہوئی تھی کہ جوتوں کے نشان بن رہے تھے

گھر میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھ وہ اندر سے بالکل خالی تھا وہاں بھی فرش پر ریت جمی ہوئی تھی۔

پھر گل خان اور کلو کے بیان کی تصدیق کیلئے گھر کا کچن دیکھا گیا وہ بھی خالی پڑا تھا۔ نادر حسین گیس کے چولہے پر بطور خاص انگلی پھیر کر دیکھا، چولہے پر ریت جمی ہوئی تھی وہاں فریج تھا نہ پر پکی ہوئی ہنڈیا اور نہ جھوٹے برتن۔

''نادرے، تیرے ان بندروں کا ایک بیان بھی صحیح نہیں ہے، میں تانوں کیندا نہیں سی۔ اے فراڈ اے، ان دونوں کو جا کر پھینٹی لا۔ خواہ مخواہ ساڈا وکت برباد کیتا۔''

''لیکن شاہ جی بابر صاحب نے بھی تو بیان دیا ہے۔''

''اوئے، بیان دیا ہے تو تصدیق کروا، یہ تیرے سامنے کھڑے ہیں۔''

''میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ کہا ہے۔'' بابر نے مستحکم انداز میں کہا۔

''سچ کہا ہے تو پھر بتاؤ لڑکی کہاں ہے۔ لڑکی برآمد ہو تو ہم جن باشا کے خلاف ایف آئی آر ورنہ پولیس کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر آپ کو حوالات کی سیر کرنا ہوگی۔'' معصوم علی شاہ نے لہجہ اختیار کیا اسے ڈرانے کیلئے دھمکی دی۔

''لڑکی یہیں ہے، میں آپ کو نیلم کا خط دکھا سکتا ہوں، جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ خالی گھر جا رہی ہے۔'' بابر نے جواب دیا۔

''اوئے بھولے باشا، تمہاری بہو تمہیں چمکا دے گئی ہے، وہ جانے اس وقت کس کے ساتھ عیش کر رہی ہوگی۔'' معصوم علی شاہ بالآخر پھکو پن پر اتر آیا۔

''ایسا نہ کہیں جی، نیلم بہت معصوم لڑکی ہے۔'' بابر علی نے احتجاج کیا۔

''اوئے بالکل میری طرح۔'' معصوم علی شاہ نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''اوئے، میرے باپ نے میرا نام معصوم رکھ دیا، میں تمہیں کہیں سے معصوم نظر آتا ہوں۔''

نادر حسین نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ گھر چھان ماریں، گھر کی چھت اور پچھواڑہ بھی دیکھیں۔ اگر گھر میں لڑکی کہیں موجود ہو تو آ کر اطلاع دیں۔

پانچ منٹ میں سپاہیوں نے پورا گھر چھان مارا لیکن انہیں انسان کی بچی تو دور کی بات ہے وہاں چڑیا کا بچہ بھی دکھائی نہ دیا۔

''اب بولو جی۔'' معصوم علی شاہ نے بابر کو تیز نگاہوں سے گھورا۔

اس سے پہلے کہ بابر علی کچھ بولتا نادر حسین نے اس سے پوچھا۔ ''وہ آپ نے ایک موم بتی کا ذکر بھی کیا تھا جسے کوئی نہیں بجھا سکا تھا اور وہ پگھلی بھی نہ تھی، وہ موم بتی کہاں ہے۔''

''وہ میرے بیٹے اکبر کے بیڈروم میں تھی۔''

''ذرا دکھاؤ تو۔'' معصوم علی شاہ نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اوئے کیوں جھوٹ بول رہا ہے۔''

بابر علی نے فوراً نیلم کے بیڈروم کا رخ کیا، گھر کا ایک ایک دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن بند تھا تو بیڈروم۔ سپاہیوں نے بھی اس دروازے کو بند پایا تھا۔

بابر علی نے جب اس دروازے کے ہینڈل کو گھما کر کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ ''کیسے بند ہو گیا۔'' سپاہیوں نے کہا یہ دروازہ شروع سے بند ہے۔

نادر حسین کو خیال آیا کہ گل خان اور کلو نے بھی اپنے بیان میں ایک کمرے کے دروازے کو مقفل پایا تھا۔

''آپ کے خیال کے مطابق اسے کھلا ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں۔'' بابر علی سوچتا ہوا بولا۔

''وہ کیوں۔'' نادر حسین نے سوال کیا۔

''وہ اس لئے کہ جب اس گھر کے دروازوں کو تالا لگانے کی کوشش کی گئی تو کسی دروازہ پر تالا نہیں لگا تھا، وہ موم بتی اسی کمرے میں ہے۔'' بابر نے جواب دیا۔

"اچھا، ذرا ادھر ہٹیں۔" نادر حسین نے بابر علی سے کہا۔

بابر علی کے دروازے سے ہٹنے کے بعد وہ آگے آیا اس نے ہینڈل کو گھما کر اور پھر دروازے پر دبا ڈال کر دیکھا پھر اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"شاہ جی، تالا بند نہیں ہے، اندر سے کنڈی بند ہے۔" نادر حسین نے کہا۔

"اوئے اندر کون ہو سکدا اے۔" معصوم علی شاہ نے سوال کیا۔

"نیلم ہوگی۔" بابر نے کہا۔

"اچھا، پھر انوں آواج مارو۔"

"جی۔" بابر کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

"شاہ جی کہہ رہے ہیں، اسے آواز دے کر باہر نکالیں۔" نادر حسین نے بات صاف کی۔

"اچھا۔" بابر علی نے پھر زور سے کہا۔ "نیلم کیا تم اندر ہو؟ نیلم باہر آ جاؤ، میرے سا پولیس ہے۔"

لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

تب معصوم علی شاہ کی شامت آئی اس نے تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کی جیسے اس نے سوراخ سے آنکھ لگائی، ویسے ہی کسی نے اس کی آنکھ میں تیز دھار کی نوکیلی چیز گھسیڑ دی معصوم علی شاہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اس کا ایک ہاتھ آنکھ پر رکھا ہوا تھا اور چہرے پر شدید تکلیف آثار تھے۔

"شاہ جی، کیا ہوا؟" نادر حسین نے اس کا ہاتھ آنکھ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آنکھ سے خون بہہ رہا

"شاہ جی، آپ فوراً اسپتال جائیں، آپ کی آنکھ سے خون بہہ رہا ہے، یہ شدید زخمی ہے۔" حسین نے فکرمندی سے کہا پھر ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ "تم شاہ جی کو فوراً اسپتال لے جاؤ۔"

پولیس وین میں معصوم علی شاہ نے اسپتال کا رخ کیا، وہ جاتے جاتے نادر حسین کو ہدایت کر گیا وہ دروازہ توڑ کر لڑکی کو برآمد کرے اور تھانے لے آئے۔

لیکن معصوم علی شاہ کو پھر تھانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا وہ تو اسپتال بھی نہ پہنچ سکا۔

اس کی آنکھ میں شدید تکلیف تھی اتنی تکلیف کہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی اس نے کو اور تیز چلانے کی ہدایت کی پھر گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

ایک موڑ پر اس کی ٹکر ایک سامان لدے ٹرک سے ہوگئی، ٹکر اتنی شدید تھی کہ پولیس وین قلابازیاں کھا کر دور جا گری اور اس میں فوراً ہی آگ لگ گئی۔ اس آگ کے بجھنے تک معصوم علی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ وہ نیلم کو تھانے کی حدود میں دیکھنے کی حسرت لئے چل بسا۔ پولیس

ڈرائیور بھی اس حادثے میں جاں بحق ہوگیا۔

معصوم علی شاہ کے اسپتال چلے جانے کے بعد نادر حسین گھوم کر باہر گیا اس نے کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن شیشے اس طرح کے تھے کہ ان سے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

تب نادر حسین نے ریوالور کے دستے سے شیشہ توڑنے کا ارادہ کیا۔

ابھی اس نے ریوالور کا دستہ شیشے پر مارنے کیلئے ہاتھ اوپر اُٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ نادر حسین نے غصے سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ریوالور پانچ چھ فٹ کے فاصلے زمین پر پڑا ہوا تھا اور دور تک کوئی نہ تھا۔ وہ باقی تینوں سپاہیوں کو دروازے پر چھوڑ آیا تھا کہ وہ پیچھے کا جائزہ لے کر ابھی آرہا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور کس طرح نکل گیا۔ اس نے اپنا ریوالور جھک کر اُٹھایا لیکن وہ ابھی ریوالور اُٹھا کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ کسی نے اسے بڑے زور سے دھکا دیا اتنے زور سے کہ وہ اوندھے منہ پکے فرش پر گرا۔ اس کا منہ ریوالور پر پڑا اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا اور خون بھل بھل کر کے نکل آیا۔

وہ بھاگتا ہوا گھر کے اندر پہنچا اس کے منہ سے خون بہتا دیکھ کر سب پریشان ہوگئے۔

بابر علی نے باتھ روم کا راستہ دکھایا۔ نادر حسین نے پانی سے کلیاں کیں لیکن خون بند نہیں ہوا ابھی وہ باتھ روم میں لگے شیشے میں اپنے ٹوٹنے والے دانت کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی "میاؤں" کی خوفناک آواز سنائی دی۔

سیّد پور کا جن پانی کی ٹنکی پر بیٹھا تھا وہ اس وقت بہت غصے میں تھا اس نے نادر حسین پر چھلانگ لگائی۔ نادر حسین اس کا وزن نہ سنبھال سکا وہ الٹ کر گرا اور اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ نادر حسین کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔

نادر حسین کے گرتے ہی کالے بلے نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے اس کے دونوں کان کاٹ لئے۔ نادر حسین پاگلوں کی طرح باتھ روم سے نکل کر بھاگا۔

سپاہیوں نے جو اسے خون میں نہایا دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے نادر حسین کے ساتھ ہی دوڑ لگائی۔

پھر وہ منظر بھی دیکھنے والا تھا کہ چار پولیس والے چوروں کی طرح ڈرے سہمے سڑک پر بھاگے جا رہے تھے۔

بابر علی بھی جلدی سے گھر سے نکل آیا اس نے گیٹ بند کر کے تالا لگایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کا

راستہ لیا اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جن کے عتاب سے بچ گیا تھا۔

نادر حسین اپنا ایک دانت اور دو کان گنوا کر اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس نے بعد میں نہ صرف ا تھانے سے بلکہ اس شہر سے ہی اپنا تبادلہ کروالیا۔

بابر علی گھر پہنچا تو اس کی بُری حالت تھی۔ صابرہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اسے شب کہیں پولیس نے اسے مارا پیٹا نہ ہو۔

اس نے بڑی فکرمندی سے بابر علی کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''صابرہ، بس مت پوچھو کہ آج کیا ہوا ہے؟''

پھر جب اس نے گل خان، کلو پنواڑی، معصوم علی شاہ اور نادر حسین پر گزرنے والی قیامت کا ذکر ا تو صابرہ کانپ کر رہ گئی۔

بے اختیار صابرہ کا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے چلا گیا۔ سیّد پور کے جن نے اس کی چوٹی جلادی تھی۔ کے پیچھے ایک چاند سا بنا ہوا تھا کھال ایک دم چکنی ہوگئی تھی اور وہاں اب تک کوئی بال نہ اگا تھا۔

صابرہ کو وہ سب یاد آ گیا جو اس پر گزرا تھا۔ سیّد پور کے جن نے اسے ایک عذاب میں مبتلا کر تھا۔ اس پر قیامت توڑی تھی نتیجے میں صابرہ کو کہنا پڑا تھا کہ ہاں میں تمہارے ہونے کا اقرار کر ہوں، تم ہو۔ یہ وہ صابرہ تھی جو جن بھوتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی، ان کے وجود سے منکر تھی، جو ا خاندان بھر میں نڈر مشہور تھی۔ اب اس ''نڈر بیگم'' کا یہ حال تھا کہ پتا بھی کھڑکھڑاتا تو وہ سہم جاتی تھی

اس وقت بھی اس نے بابر علی کی زبانی پولیس کی درگت کا حال سنا تو کپکپا اُٹھی۔ ایک طرف ا خوشی بھی ہوئی کہ بابر علی وہاں سے صاف بچ کر آ گیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد بابر علی کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے اکبر کے بارے میں پوچھا۔ ''ا ابھی تک نہیں آیا وہ کیا کہہ کر گیا تھا۔''

''اس کا ایک دوست ہے طارق وہ اس کے پاس گیا ہے، پھر وہ دونوں ملیر جائیں گے، وہا طارق کا کوئی دوست رہتا ہے، پھر وہ املی والے بابا کا پتہ کریں گے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ دوپہر تک آ جا گا ابھی تک تو آیا نہیں اس وقت ایک بج رہا ہے۔'' صابرہ نے تفصیل سے بتایا۔

''اب وہ گیا تو ضرور کچھ نہ کچھ کر کے آئے گا۔'' بابر علی نے کہا......

''بھئی، مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے جن کی آج کی کارروائی سن کر، کہیں وہ ہمارے بیٹے کو نہ نقصان پہنچا دے۔'' صابرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

''پریشانی تو مجھے بھی ہے لیکن اس طرح ڈر کر بیٹھ جانے سے کیا ہوگا؟''

''میں نے اسے کتنی بار کہا ہے کہ اس مسئلے سے اپنی جان چھڑالے مگر وہ سنتا ہی نہیں۔''

''وہ کس طرح، صابرہ۔''

''ارے، نیلم کو طلاق دے کر، وہ کون سی میری بہن کی سگی بیٹی ہے اور اگر ہوتی بھی تو میرے بیٹے کی جان سے زیادہ تھوڑے ہی عزیز ہوتی لیکن وہ تو اس پر ایسا عاشق ہوا کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، کہیں خدانخواستہ کوئی نقصان نہ اُٹھا بیٹھے۔'' صابرہ نے فکرمند ہو کر کہا۔

''اب نیلم کو اس خالی گھر میں بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا، نہ جانے بیچاری پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

''ہاں، یہ تو ہے، اس کی حالت واقعی قابل رحم ہوگی۔'' صابرہ نے تاسف سے کہا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی بابر علی خود اُٹھ کر گیٹ تک گیا۔ دروازے پر اکبر تھا دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ دونوں کے ہی پاس ایک دوسرے کو سنانے کیلئے بہت کچھ تھا لیکن دونوں خاموش رہے۔

گھر کے اندر آ کر جب اکبر بیڈ پر لیٹ گیا تو صابرہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا اکبر، خیر تو ہے؟''

''تھک گیا امی؟'' اکبر نے آسودگی سے ہاتھ پاؤں پھیلا لئے۔

''آج تجھے معلوم ہے، تیرے جانے کے بعد کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' اکبر گھبرا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ویسے سب خیریت ہے۔''

''آخر ہوا کیا؟ کچھ بتائیں تو۔'' اکبر نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''گھر پر پولیس والے آئے تھے، تیرے ابو کو تھانے بلا کر لے گئے۔''

''تھانے!'' اکبر پریشان ہوگیا۔ ''وہ کیوں؟''

''تھانے میں چوکیدار گل خان اور اس کا ایک دوست کلو پنواڑی موجود تھا۔ دونوں کو رات کو پولیس نے ہمارے گھر سے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ انہوں نے جو بیان دیا تھا، اس کی تصدیق کیلئے تمہارے ابو کو بلایا گیا تھا، لو وہ تمہارے ابو آ گئے، ان سے سن لو، اب ساری روداد مجھے تو ان پولیس والوں کا خیال آتا ہے تو جسم میں جھرجھری سی آ جاتی ہے۔''

بابر علی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، وہ اکبر کے نزدیک ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے تھانے سے لے کر گھر واپسی تک جو کچھ دیکھا تھا، وہ بیان کر دیا۔

اکبر نے ساری داستان سن کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''یہ تو بہت بُرا ہوا ابو۔''

''ہاں ہوا تو بُرا لیکن انہیں میری بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ انہیں تو گل خان اور کلو پنواڑی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس پر بھی یقین نہ تھا حالانکہ دونوں کے کان کٹے ہوئے تھے میں نے انہیں جو کچھ سنایا، اس پر ان لوگوں نے یقین نہ کیا شاید وہ سمجھ رہے تھے، میں انہیں بے وقوف بنا رہا ہوں یا میں کوئی

پاگل شخص ہوں یا پھر میں جھوٹ بول رہا ہوں، یوں بھی جو واقعات ہمارے ساتھ پیش آئے ہیں وہ قابل یقین کہاں ہیں۔ سب سے بڑی مثال تو یہ صابرہ بیٹھی ہیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی یہ جن کے وجود سے منکر تھیں، بالآخران کو ماننا پڑ گیا، یقین آ گیا۔ پولیس والوں کو تم نے صرف زبانی ہی بتایا تھا وہ بھلا ایسے نا قابل یقین واقعات پر آنکھ بند کر کے کس طرح یقین کر لیتے، سوانہوں نے تفتیش کی ٹھانی اور اس گھر میں ان پولیس والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ اب انہیں جنات کے وجود کے بارے میں بھی یقین آ گیا ہوگا۔ اچھا، اکبر میں نے تو ساری روداد سنا دی، اب تم بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی؟ املی والے بابا کا سراغ ملا کہ نہیں یا اس قلندر نے ایسے ہی ہانک دی تھی۔'' بابر نے پوچھا۔

''ارے، آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' صابرہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

''ہاں، ابو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، میں نے پورا ملیر چھان مارا ہے لیکن کہیں املی والے بابا کا سراغ نہیں ملا۔'' اکبر نے بڑی مایوسی سے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر دونوں میاں بیوی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

صابرہ اور بابر کی حیرت بجا تھی آخر ایسا کیوں ہوا؟ اکبر کو املی والے بابا کا پتہ ٹھکانہ کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ کیا اس ملنگ نے ویسے ہی ہانک دی تھی لیکن اکبر کو وہ ملنگ جس طرح ملا تھا اس میں فریب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آخر اسے کیا پڑی تھی کہ سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے لڑکے کو مزار جانے کا مشورہ دے اور پھر ملیر میں املی والے بابا سے ملنے کی ہدایت کرے ضرور کہیں گڑبڑ ہوئی ہے۔

''بیٹا لوگوں سے پوچھتے۔'' صابرہ نے اس سے کہا۔

''امی کافی لوگوں سے پوچھا لیکن سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔'' اکبر نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں کی کوئی مشہور شخصیت نہیں ہے۔'' بابر نے اظہار خیال کیا۔

''ملیر کوئی چھوٹی جگہ تو نہیں ہے اس کراچی میں پڑوسی، پڑوسی کا پتہ نہیں بتا سکتا۔''

صابرہ نے کہا۔ ''بیٹا تم ایک مرتبہ اور جا کر پتہ کرو۔''

''امی مجھے پتہ معلوم ہو تو پتہ بھی کروں اس طرح اب کہاں مارا پھروں؟''

''پھر کلفٹن چلے جاؤ اس فقیر کو ڈھونڈ کر اس سے صحیح پتہ معلوم کرو۔'' صابرہ نے مشورہ دیا۔

''ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔'' بابر نے تائید کی۔

''اچھا اب کل جاؤں گا اب تو میں خاصا تھک گیا ہوں۔''

''نہیں بیٹا کل نہیں آج، اس کام میں دیر نہ کرو ابھی تم کچھ دیر سو جاؤ پھر شام کو اُٹھ کر چلے جانا۔'' بابر نے ہدایت کی۔

''اچھا ابو۔'' اکبر نے کہا۔

لیکن اکبر کو کلفٹن جانے کی ضرورت نہ پڑی وہ تھکا ہوا تھا ہی جلدی ہی گہری نیند سو گیا۔

اس نے خود کو کلفٹن والے مزار کی سیڑھیوں پر پایا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور ادھر ادھر بیٹھے ہوئے فقیروں کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔

تب کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ایک مضبوط اور کھردرا ہاتھ تھا۔

اکبر نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنے مقابل ایک ملنگ کو پایا۔

''ہمیں ڈھونڈ رہا ہے بچہ؟''

''جی بابا میں نے سارا ملیر چھان مارا مجھے املی والے بابا کا پتہ نہیں چلا۔''

''گلیوں اور محلوں میں ڈھونڈتا پھرا تو املی والے بابا کو، ارے جنگل میں جا، کسی گوٹھ میں پتہ کر جا ہے جا۔''

یہ کہہ کر اس ملنگ نے اکبر کو دھکا دے دیا فوراً اکبر کی آنکھ کھل گئی اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا ن وہ خواب اتنا صاف اور واضح تھا اسے لگا جیسے وہ خود مزار پر گیا تھا اس ملنگ نے خواب میں نہیں قیقت میں اس کا پتہ بتایا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی اس نے ملیر کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس نے گلی محلوں کے بجائے جنگل کا رخ کیا ہ انہیں باغ نما جنگل میں املی والے بالا کا سراغ مل گیا۔ اس گھنے جنگل کے شروع میں ایک چائے ہوٹل تھا جہاں اونچی آواز میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ سب چرسی معلوم تے تھے ایک آدمی بھی شریف دکھائی نہ دیتا تھا۔

اکبر نے کسی چرسی سے پوچھنے کے بجائے براہ راست ہوٹل کے مالک سے بات کی اس سے املی لے بابا کا پتہ پوچھا اس نے کہا۔ ''اندر چلے جائیں جنگل میں کافی آگے جا کر ایک نہر آئے گی اس کے درمیان ایک بھاری سا املی کا درخت ہے اسی درخت کے نیچے وہ بابا بیٹھا مل جائے گا لیکن تم اس کا پتہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ہمیں ملنا ہے۔''

لیکن وہ تو کسی سے نہیں ملتا، اگر کوئی اس کے پاس جانے کی کوشش کرتا ہے تو پتھر مار کر بھگا دیتا ہے۔'' ہوٹل والے نے انکشاف کیا۔

''کوئی تو ہوگا جو بابا کے پاس آتا جاتا ہوگا آخر بابا کھاتا پیتا کہاں سے ہوگا؟'' اکبر کا دوست ق بولا۔

''لیکن جناب وہاں کوئی نہیں جاتا یہ بات بالکل درست ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ کھاتا پیتا کہاں

سے ہوگا تو اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں رات کے بارہ بجے محفل بجتی ہے۔"

"محفل بجتی ہے، کس قسم کی محفل؟" اکبر نے پوچھا۔

"یہ کوئی نہیں بتا سکتا اس لئے کہ رات کو وہاں کوئی نہیں جا سکتا ایک دو لوگوں نے جانے کی کوشش بھی کی ہے تو وہاں سے اندھے اور گونگے ہو کر لوٹے ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "آپ لوگ نوجوان ہیں، طالبعلم معلوم ہوتے ہیں، آپ لوگ کہاں باباؤں کے چکر میں پڑ گئے۔"

"آپ یہ بتائیں دن میں جانے میں تو کوئی خطرہ نہیں؟" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں۔" ہوٹل والے نے جواب دیا۔

"کیا اندر موٹر سائیکل جا سکتی ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"ہاں جا سکتی ہے۔" ہوٹل والے نے بتایا۔

"اچھا جناب آپ کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر اکبر طارق کے ساتھ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔

طارق کے دوست شاکر نے بھی اپنی موٹر سائیکل سنبھالی اور وہ جنگل میں داخل ہوئے۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا یہاں مختلف قسم کے درخت لگے ہوئے تھے انہیں درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی نما راستہ تھا وہ اس راستے پر ہو لئے۔

آگے طارق اور اکبر تھے پیچھے شاکر تھا۔ شاکر کبھی ایسے گھنے جنگل میں داخل نہیں ہوا تھا پھر املی والے بابا کے بارے میں ہوٹل والے نے جو نقشہ کھینچا تھا اس سے اس کے دل میں ہول بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کی پھر طارق اور اکبر جب درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے تو شاکر نے فوراً اپنی موٹر سائیکل کو بریک لگائے، پیچھے گھمائی اور گاڑی کو ریس دے کر بڑی رفتار سے جنگل سے نکل گیا۔

طارق اور اکبر باتیں کرتے جا رہے تھے آگے جا کے انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے جا رہے ہیں پیچھے شاکر نہیں ہے تو اکبر نے کہا۔ "یہ شاکر کدھر رہ گیا؟"

"پیچھے نہیں ہے؟" طارق نے مڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اکبر نے گردن گھما کر دیکھا۔ "یار پیچھے تو دُور دُور تک دکھائی نہیں دے رہا، گاڑی روکو ذرا۔"

طارق نے موٹر سائیکل روک لی، دونوں نے کچھ دیر انتظار کیا ان کا خیال تھا کہ اگر کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہوگا تو آ جائے گا لیکن ان کا انتظار بے سود ثابت ہوا۔

"پیچھے چل کر دیکھیں؟" اکبر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ واپس چلا گیا وہ تھوڑا ڈرپوک بندہ ہے پھر اس ہوٹل والے نے اندھا اور گونگا

ـنے کی کہانی سنا دی، جنگل بھی سنسان ہے وہ ڈر کر بھاگ گیا، آؤ تم گاڑی پر بیٹھ ہم آگے چلتے ـ۔" طارق نے کہا۔

پھر اکبر، طارق کے پیچھے بیٹھ گیا۔ طارق نے کک لگائی اور موٹر سائیکل نے رفتار پکڑ لی۔

تھوڑا اندر جا کر ہموار راستہ اونچا نیچا ہونے کے علاوہ چھوٹے بڑے پتھروں سے پُر تھا جب گاڑی چلانا ممکن نہ رہا تو طارق نے گاڑی کھڑی کر دی اور وہ دونوں پتھروں پر چلتے آگے بڑھنے لگے۔ ـئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد انہیں جنگل ختم ہونے کا احساس ہوا ایک تو اندھیرا کم ہو چکا تھا ـرے درختوں کے تنوں کے درمیان سے آسمان جھلکنے لگا تھا۔

پھر وہ نہر نظر آ گئی۔

نہر جنگل کے اختتام پر تھی۔ نہر کے اس پار کھلا میدان تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ تھا اور بہت آگے کچھ ـے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ شاید وہ کوئی گوٹھ تھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر دونوں نے سوچا کہ اب کدھر جایا جائے اس لئے کہ وہ جہاں نکلے تھے وہاں ـں نہر میں کوئی املی کا درخت نظر نہ آیا تھا۔ نہر کیوں کہ سیدھی نہ تھی آگے جا کر بل کھا گئی تھی اس لئے ـر تک دیکھنا بھی ممکن تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نہر کے دائیں طرف جایا جائے یا بائیں جانب۔

"اب کیا کریں؟" اکبر نے سوال کیا۔

"میرے خیال میں پہلے بائیں جانب چلتے ہیں، ادھر اگر املی کا درخت نہ ہوا تو واپس آ کر دائیں ـب چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے ایسا کر لیتے ہیں۔"

"ایک کام اور کرنا ہوگا۔" طارق بولا۔

"وہ کیا؟"

"جب ہم واپس آئیں گے تو ہمیں یہ یاد نہ رہے گا ہم کہاں سے نہر پر نکلے تھے۔ یہ اگر یاد نہ رہا تو ـہی میں موٹر سائیکل کو تلاش کرنا آسان نہ ہوگا۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں دو چار پتھر ایک ـرے کے اوپر رکھ کر نشانی لگا دیتے ہیں۔" طارق نے تجویز پیش کی۔

"یار تو نے بہت عقلمندی کی بات کی ورنہ واپسی میں ہم ضرور راستہ بھول جاتے۔"

پھر اکبر اور طارق نے مل کر پانچ پتھر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر ایک سنگ میل بنا دیا اور اب وہ ـر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔

آگے جا کر نہر دھیرے دھیرے گھومتی گئی پھر وہ جیسے ہی سیدھی ہوئی تو وہ دونوں خوشی سے ـل پڑے، سامنے ایک بہت موٹے تنے کا لمبا چوڑا املی کا درخت موجود تھا۔ یہ درخت نہر کے

درمیان تھا۔ نہر میں زیادہ پانی محسوس نہ ہوتا تھا۔ درخت کے چاروں طرف ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا، اسی چبوترے میں ایک جگہ سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چھوٹی بڑی سیڑھیاں تھیں جو قدرتی طور پر بن گئی تھیں۔

درخت کے تنے میں ایک بڑا سا محراب نما شگاف تھا، اس محراب کے نیچے ایک بڑا سا پتھر اور اس پتھر پر وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا، املی والا بابا۔ آلتی پالتی مارے گوتم بدھ کی طرح آسن جمائے۔

اسے دیکھ کر دونوں کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا۔

دُور تک کوئی آدم نہ آدم زاد۔ جنگل تھا، پتھر تھے، نہر میں بہتا پانی تھا اور کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آوازیں بھی آجاتی تھیں۔

وہ دونوں خاموشی سے چلتے اس درخت کے سامنے پہنچ گئے۔

املی کے درخت اور ان کے درمیان مشکل سے پندرہ بیس گز کا فاصلہ ہوگا۔ املی والے بابا کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر کے سفید بال کاندھوں پر پڑے تھے اور سفید داڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔ سرخ سفید اور توانا جسم، قد بھی اچھا۔

چبوترے پر چھوٹے بڑے بہت سے پتھر پڑے تھے، ہوٹل والے نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ یہاں آنے والوں کو پتھر مار کر بھگا دیتا ہوگا۔ یہ دونوں بھی سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ کب بابا آنکھ کھولے، کب انہیں دیکھے اور کب اُٹھ کر سنگ برسائے۔

پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لال انگارہ آنکھیں۔ اکبر کو کالے بلے کی آنکھیں یاد آگئیں۔

وہ اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔

املی والے بابا نے آنکھیں کھول کر ان دونوں کو دیکھا پھر وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے دونوں کی آمد پر غصہ آگیا ہو۔ اُٹھ کر وہ دونوں کی طرف تیزی سے بڑھا۔

اکبر اور طارق نے دوڑنے کی تیاری کر لی کہ جیسے ہی وہ مارنے کیلئے پتھر اُٹھائے گا فوراً فرار اختیار کر لیں گے لیکن بابا نے کوئی پتھر نہ اُٹھایا وہ چبوترے کے آخری سرے پر آیا اور چیخ کر بولا ''تم میں زخمی کون ہے؟''

دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ بابا کی زخمی سے کیا مراد ہے۔

املی والے بابا نے دونوں کو گوں مگوں کی حالت میں دیکھا تو پھر چیخا۔

''بولتے کیوں نہیں اگر تم میں کوئی زخمی نہیں ہے تو اپنا راستہ لو ہمیں کیوں پریشان کرنے آئے ہو۔''

''بابا یہ ہے زخمی۔'' طارق نے بابا کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ زخمی ہے تم کون ہو؟''

''میں اس کا دوست ہوں جی۔'' طارق نے جواب دیا۔

''اچھا، تیماردار ہو۔'' املی والے بابا نے کہا۔

''آپ ایسا سمجھ لیں۔'' طارق بولا۔

املی والے بابا نے پھر اکبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''تم آؤ اکیلے۔''

یہ کہہ کر املی والا بابا پلٹ گیا اور محراب دار کھوکھے میں پتھر پر بیٹھ گیا۔

طارق نے اکبر کو ٹہوکا دیا۔ ''جاؤ فوراً۔''

''پانی میں کیسے جاؤں؟'' اکبر ہچکچایا۔

''ارے جوتے موزے اتار دو...... پتلون کے پائینچے اوپر کر لو اور پانی میں گھس جاؤ...... یہ پانی ادہ گہرا نہیں ہے...... تمہارے گھٹنوں سے نیچے ہی ہوگا۔'' طارق نے راہ دکھائی۔

''تمہیں یہ کیسے پتہ کہ پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔''

''میرا اندازہ ہے۔''

''اگر پانی زیادہ گہرا ہوا تو کیا ہوگا؟''

''پانی میں ایک دو قدم بڑھا کر دیکھ لو اندازہ ہو جائے گا...... میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں گا...... پانی میں نے سے پہلے کوٹ بھی اتار لو...... اگر پانی گہرا بھی ہوا تو کوٹ نہ بھیگے۔''

''بے وقوف اس کنارے کھڑا کیا سوچتا ہے...... آتا کیوں نہیں؟'' املی والے بابا نے اسے اتے دیکھ کر ڈانٹ لگائی۔

اکبر کوٹ اتارنے جا رہا تھا املی والے بابا کی ڈانٹ سن کر اس نے کوٹ اتارنے کا ارادہ ی کر دیا اور جلدی سے پانی میں قدم رکھا اس نے گھبراہٹ میں جوتے موزے بھی نہ رے تھے۔

نہر میں پانی واقعی زیادہ نہ تھا دو فٹ تک بلند ہوگا وہ جلدی سے پانی پار کر کے چبوترے پر چڑھ گیا۔

طارق اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ اکبر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے وہ ت اور تشویش کے ملے جلے جذبات میں گھرا ہوا تھا۔

چبوترے کی آڑھی ترچھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اکبر کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا ریں توڑ کر باہر آجائے گا، حلق خشک ہو رہا تھا اور دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

اکبر اوپر پہنچا تو اس نے بابا کو آنکھیں بند کیے بیٹھے پایا۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے ہاتھ باندھ ڑا ہوگیا۔

''بیٹھ جا۔'' املی والے بابا نے آنکھیں بند کیے کیے ہدایت کی۔

اکبر فوراً ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔

تب املی والے بابا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ بڑی بڑی اور لال انگارہ آنکھیں...... ان آنکھوں کو دیکھ کر اکبر کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ یہ آنکھیں تو کالے بلے کے مقابلے میں زیادہ خوف میں مبتلا کرنے والی تھیں۔

''کیوں آیا ہے یہاں؟'' املی والے بابا نے پُرجلال لہجہ اختیار کیا۔

''میں جی، دو تین دن پہلے سمندر پر گیا تھا، وہاں میری ملاقات......''

''وہاں تیری ملاقات نیاز محمد سے ہوئی...... اس نے تجھے مزار کا راستہ دکھایا...... پھر اس نے میرا پتہ بتایا، تو کل سارا ملیر چھان گیا مگر تجھے ہم نہ ملے...... نیاز محمد نے پھر تیری مدد کی اور اس کے بتائے ہوئے اشاروں پر بالآخر تُو یہاں پہنچ گیا...... یہی بتانا چاہتا ہے نا تُو ہمیں۔'' املی والے بابا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ارے بے وقوف ہم یہ نہیں پوچھ رہے کہ تُو یہاں کس کے ذریعے آیا...... ہمیں اپنی آمد کی وجہ بتا۔''

اکبر نے جب املی والے بابا کی زبانی یہ سنا تو اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ سب بابا کو کس طرح معلوم ہو گیا۔ اسے یہ یقین ہو گیا کہ بابا کوئی اونچی چیز ہے۔

''بابا، اب میں اپنی زبان سے کیا بتاؤں، آپ تو اندھیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' اکبر نے ہمت کر کے کہا۔

املی والے بابا نے کوئی جواب نہ دیا...... اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو ان میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

''سیّد پور کے جن کا ستایا ہوا ہے۔'' املی والے بابا نے انکشاف کیا۔

''جی بابا! اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے...... وہ میری بیوی کو لے اڑا ہے...... اس نے اسے قید کر لیا ہے...... وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا...... بابا جی! آپ مجھ پر رحم کریں...... کسی طرح اس جن سے نجات دلا دیں۔''

''ہم رحم کرنے والے کون ہیں؟ رحم کرنے والا اللہ ہے...... ہم تو اس بساط دنیا کے ایک حقیر سے مہرے ہیں...... تُو فکر نہ کر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' املی والے بابا کی آنکھوں میں اب محبت کی جھلک تھی۔

''بابا جی! میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔'' اکبر نے بڑے خلوص سے کہا۔

''تُو اچھا لڑکا ہے...... تجھ میں صبر شکر بہت ہے...... تُو سچا بھی ہے...... تُو ہمیں پسند آیا ہے، تُو نیاز

ی پسند آیا تھا...... وہ تجھے روتا ہوا نہ دیکھ سکا...... خیر فکر نہ کر...... ہم تیرے لئے ضرور کچھ نہ کچھ
ں گے...... ہم ایک دو دن میں اپنا ایک سپاہی بھیجیں گے...... ہو سکتا ہے نیاز محمد کو ہی بھیج دیں......
تجھے اپنے گھر کا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں...... تیرا گھر اب بھی ہماری آنکھوں میں ہے۔ جا اب
...... تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہوئے...... تُو جشن منانے کی تیاری کر...... اور یہ لے۔'' املی
ے بابا نے قریب ہی زمین پر پڑی ہوئی کوئی چیز اُٹھائی اور مٹھی بند کر کے اس کی طرف بڑھائی۔

کبر نے جلدی سے اپنی ہتھیلی پھیلا دی...... ایک پانچ پیسے کا سکہ اس کے ہاتھ پر گرا...... اکبر نے سکے کو حیرت سے دیکھا۔

''اس سکے کو ایک کپڑے میں سی کر اپنے بازو پر باندھ لینا تو سیّد پور کے جن کے شر سے محفوظ رہے
ناءاللہ...... اب جا، وہ تیرا تیماردار اس کنارے کھڑا پریشان ہو رہا ہے...... اور ہاں ایک بات
...... بہت غور سے...... ہمارے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے...... ہم اپنے اردگرد ان خواہشوں
ے انسانوں کو دیکھنا نہیں چاہتے، ہمارے پاس کام بہت ہیں...... اسی لئے ہم دنیا سے دُور اس
ں میں بیٹھے ہیں۔ ہماری دنیا بالکل مختلف ہے...... خواہشوں بھرے انسان اس کا اندازہ بھی نہیں
سکتے...... جا اب جا۔'' یہ کہہ کر املی والے بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کبر خوشی خوشی اُٹھا...... اس نے پانچ پیسے کے سکے کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا...... اور تیزی
یڑھیوں کی طرف بڑھا...... ٹیڑھی میڑھی میڑھیاں اس نے احتیاط سے پار کیں...... پانی میں قدم
ور پھر جلدی جلدی چلتا کنارے پر آ پہنچا۔

کنارے پر پہنچا طارق نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا...... وہ اس کے ہاتھ کے سہارے سے اوپر
رے پر آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' طارق نے پوچھا۔

''بس نکل چلو یہاں سے، آگے چل کر بات ہو گی۔'' اکبر نے کہا۔

طارق نے پھر کوئی سوال نہ کیا...... دونوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے...... پھر جب موڑ آیا تو اکبر
پیچھے مڑ کر دیکھا...... اس محراب دار کھوکھے میں کوئی نظر نہ آیا...... اکبر نے سوچا...... املی والا بابا اُٹھ
تنے کے پیچھے چلا گیا ہو گا۔

اپنے بنائے ''سنگ میل'' پر پہنچے تو انہوں نے وہاں ایک بندر بیٹھا دیکھا۔ یہ بندر انہیں دیکھتے ہی
یک ہی ایک درخت پر چڑھ گیا۔

یہ لوگ پھر جنگل میں داخل ہو گئے۔

موٹر سائیکل کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے گدی پر ایک بندر بیٹھا دیکھا۔

''یار! یہ بندر کہاں سے آ گئے۔'' طارق نے حیرت سے کہا۔

''یہ ہماری موٹر سائیکل کی حفاظت کر رہا ہے۔'' اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

بندر ان دونوں کو دیکھ کر سیٹ پر بیٹھا بیٹھا اچھلا اور درخت کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر اس پر جھولنے لگا۔ پھر وہ شور مچاتا درخت کے اوپر چلا گیا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہ دونوں تیزی سے اس جنگل سے نکل کر باہر آ گئے۔

ہوٹل والے نے ان دونوں کو جنگل سے نکلتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے ان کو روکا۔

''صاحب لوگ! کچھ چائے وائے پئیں۔''

''نہیں شکریہ، ہم اب جا رہے ہیں۔ کچھ جلدی ہے۔''

''کیا ہوا، آپ لوگوں کی ملاقات ہوگئی۔'' ہوٹل والے نے پوچھا۔

''نہیں کہاں ہوئی۔ آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم نزدیک پہنچے تو انہوں نے ہم پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔ ہم فوراً ہی وہاں سے بھاگ لئے۔'' اکبر نے دانستہ غلط بیانی سے کام لیا اور پھر اس نے طارق کو اشارہ کیا۔

طارق نے بڑی برق رفتاری سے گاڑی وہاں سے نکال لی۔ ہوٹل والا حیرت سے ان کی بھیگی پینٹ کو دیکھتا رہ گیا۔

راستے میں اکبر نے طارق کو گفتگو کا لب لباب بتا دیا اور ساتھ ہی اسے ہدایت کر دی کہ وہ آئندہ کسی کو املی والے بابا کا پتہ نہ بتائے، کسی کو وہاں سے کچھ نہیں ملے گا بس پتھر ہی پتھر ملیں گے۔

طارق، اکبر کو اس کے گھر کے گیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا۔

اکبر نے گیٹ پر کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں سیدھی کیں جو موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ املی والے بابا سے اس کی ملاقات بڑی کامیاب رہی تھی۔ وہ بابا واقعی بڑا روشن ضمیر تھا۔ اکبر کو اسے کچھ بتانا ہی نہ پڑا۔

اکبر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ پیسے کے سکے کو نکالا۔ سکہ اس کی جیب میں موجود تھا۔ یہ ایک چمکتا ہوا سکہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی ڈھل کر نکلا ہو۔

اس نے اس سکے کو مٹھی میں بند کر لیا اور گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔

تھوڑی دیر کے بعد راشدہ نے گیٹ کھولا، وہ اکبر کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''اکبر بھائی! آپ آ گئے؟''

''جی راشدہ بہن، میں آ گیا۔'' اکبر نے خوش دلی سے کہا۔

''اوہو، بڑے چہک رہے ہیں آج، خیر تو ہے۔'' راشدہ نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

''بہن اب خیر ہی خیر ہے۔'' اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابو شوروم سے واپس آ گئے۔''

''نہیں، ابھی نہیں آئے۔ یہ وقت ان کی واپسی کا تو نہیں۔''

''امی ہیں گھر میں۔''

''ہاں امی گھر میں ہیں، امی کہاں جائیں گی بھلا، کیا بات ہے بھائی اکبر، سب کو پوچھا جا رہا ہے۔ لوم ہوتا ہے کوئی لمبی خوشی مل گئی ہے آپ کو، مجھے نہیں بتائیں گے۔'' راشدہ نے ہنس کر پوچھا۔

اب وہ دونوں گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ صابرہ نے گھنٹی کی آواز سن لی تھی۔ وہ باہر کی طرف آ رہی کہ دیکھے دروازے پر کون آیا ہے۔ اکبر نے صابرہ کو آتے دیکھا تو خوشی میں چلایا۔ ''امی۔''

پھر وہ بھاگ کر ماں سے لپٹ گیا۔

کافی عرصے کے بعد صابرہ نے اپنے بیٹے کے چہرے پر خوشی دیکھی تھی۔ اس کا کھلتا ہوا چہرہ دیکھ صابرہ کے دل میں انار سے چھوٹنے لگے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لہرا گئے، اس نے اپنے بیٹے ٹا لیا۔ ''میرا بیٹا۔''

''امی، آپ کو معلوم ہے، میں کس سے مل کر آ رہا ہوں۔'' اکبر نے پوچھا۔

''کس سے بیٹا۔'' صابرہ بولی۔

''امی، املی والے بابا سے۔'' اکبر نے خوش ہو کر بتایا۔

کوئی اور وقت ہوتا، یہ جن کا چکر نہ ہوتا اور اس نے اکبر کے منہ سے کسی بابا کا نام سنا ہوتا تو وہ فوراً کے کان پکڑ لیتی اور آئندہ کسی بابا سے ملنے سے توبہ کروا لیتی لیکن اس وقت اس نے اپنے بیٹے کی سے املی والے بابا کا نام سنا تو پھول کی طرح کھل اٹھی۔

''اکبر سچ۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جی امی، بالکل سچ۔'' اکبر نے یقین دلایا۔

''کیا بات ہوئی، کچھ تو بتاؤ۔'' صابرہ بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''امی، وہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، مجھے انہیں کچھ نہیں بتانا پڑا۔ انہوں نے سب کچھ اپنی سے بتا دیا۔'' اکبر نے بتایا۔

''انہیں پتہ لگ گیا کہ تم کس سلسلے میں آئے ہو۔'' صابرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، امی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہاں کیا ہوا؟'' یہ کہہ کر اکبر نے ایک ایک بات اپنی ماں کو یل سے بتا دی۔

رہ نے اکبر کی بات بڑی دلچسپی سے سنی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات ہرگز کہ املی والے بابا نے کچھ بتائے بغیر ہی سب کچھ کیسے بتا دیا۔

اکبر نے پانچ پیسے کے اس سکے کو گھر میں آتے ہوئے جیب میں ڈال لیا تھا۔اس نے اپنی
سے اس سکے کو نکالا اور صابرہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

صابرہ نے اس چمکتے ہوئے سکے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔اس کا خیال تھا کہ بابا کا دیا ہوا
مختلف چیز ہوگا،لیکن وہ تو عام سا سکہ تھا۔بس فرق اتنا تھا کہ وہ بالکل نیا تھا جیسے ابھی ٹکسال سے
آیا ہو۔

''راشدہ۔'' صابرہ نے اس سکے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی امی۔'' راشدہ نے جواب دیا۔

''ذرا کوئی کپڑا تو لاؤ۔'' صابرہ نے کہا۔

''کیسا کپڑا امی۔'' راشدہ بولی۔

''بھئی،اس سکے کو کپڑے میں سینا ہے۔کوئی بھی پاک کپڑا لے آؤ۔اچھا ٹھہرو۔میں خود
ہوں جا کر،مشین میں دھاگا تو ہوگا۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''جی ہاں،امی ہے۔'' راشدہ نے کہا۔

صابرہ اس سکے کو مٹھی میں دبا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔دس منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس
ہاتھ میں ایک سبز رنگ کی پٹی تھی۔درمیان سے وہ پٹی چوڑی تھی وہاں سکہ سلا ہوا تھا۔

''کس ہاتھ پر باندھنا چاہیے۔'' صابرہ نے پوچھا۔

''سیدھے ہاتھ پر ہی باندھنا چاہیے۔'' اکبر بولا۔

''ٹھیک ہے،لاؤ باز کھولو۔'' صابرہ نے کہا

''اچھا امی۔'' یہ کہہ کر اکبر نے کوٹ اتار دیا،پھر قمیض کے بٹن کھول کر آستین اوپر چڑھالی

تب صابرہ نے اس کے داہنے بازو پر اس سکے کو کس دیا۔سکہ بندھوانے کے بعد اکبر نے
آستین نیچے کر لی۔پھر اس نے قمیض کے اوپر سے بندھی ہوئی پٹی پر ہاتھ پھیرا۔

صابرہ اس کے بازو پر سکہ باندھ کر پیچھے ہٹی تو اسے اچانک خوف سا محسوس ہوا۔
بازو پر پٹی باندھتے ہی صابرہ کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے کانوں میں جو آواز سنائی دی وہ
طرح خوش آئند نہ تھی۔

صابرہ جلدی سے اکبر کے نزدیک ہو گئی اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں چا
طرف دیکھا۔

''کیا ہوا امی؟'' اکبر اپنی ماں کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''مجھے لگتا ہے وہ آ گیا ہے۔'' صابرہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''کون امی،آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟'' اس مرتبہ راشدہ نے گھبرا کر پوچھا۔

صابرہ نے بولنے کیلئے منہ کھولا لیکن اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی۔

اکبر اور راشدہ حیرت اور فکرمندی سے صابرہ کو دیکھ رہے تھے۔

وہ دونوں پریشان تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صابرہ کو اچانک کیا ہو گیا تھا وہ کس کی آمد کا ذکر
کر رہی تھی۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں.زبان گنگ کیوں ہو گئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا
جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو،خوفزدہ ہو۔

تب اکبر نے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا اور اعتماد سے بولا۔''امی آپ چپ کیوں ہو گئیں بتائیں نا
یہاں کون آ گیا ہے؟''

''اکبر میں نے ابھی اس کی آواز سنی تھی وہی خوفناک آواز،اے اللہ اپنا رحم کر۔'' صابرہ پر اب کپکپی
طاری ہو گئی تھی۔

''امی ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔'' راشدہ نے کہا......

''آواز تو مجھے بھی کوئی نہیں سنائی دی آپ نے پتہ نہیں کیا سن لیا۔'' اکبر بولا۔

''اکبر میں جیسے ہی تمہارے بازو پر پٹی باندھ کر ہٹی تو مجھے قریب ہی میاؤں کی آواز سنائی دی تھی
اس آواز کو سن کر میرے جسم کا رواں رواں کانپ جاتا ہے۔'' صابرہ نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے
ہوئے کہا۔''میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔''

اکبر نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا اسے کچھ نظر نہیں آیا۔اس نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے
کہا۔''امی آپ کو وہم ہو گیا اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں شاید وہم ہی ہو گیا ہو۔'' صابرہ نے کہا لیکن اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا کیوں
کہ اس نے صاف اور واضح طور پر ''میاؤں'' کی آواز سنی تھی اور یہ آواز سیّد پور کے جن کے سوا
کسی کی نہ تھی۔

رات کو بابر علی شوروم سے گھر پہنچا تو راشدہ نے گیٹ کھولتے ہی املی والے بابا سے ملاقات کی
خبری سنا دی۔

پھر کھانا کھاتے ہوئے اکبر نے وہ ساری روداد جو وہ صابرہ کو سنا چکا تھا من و عن بابر علی کے سامنے
دہرا دی۔

بابر علی یہ سن کر بہت خوش ہوا اسے یوں محسوس ہوا جیسے عذاب کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہوں۔بہار آ گئی
اور ہر طرف خوشی کا سا سماں ہو۔

رات کو اکبر بیڈ پر لیٹا تو اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔

وہ بیڈ پر کروٹیں بدلتا رہا اور تصور میں وہ کچھ دیکھتا رہا جس کیلئے وقت پڑا تھا۔

املی والے بابا سے ملاقات کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہوگیا تھا۔ بابا کے وہ جملے جن میں نوید مسرت دی گئی تھی اس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے، گونج رہے تھے۔

''ہم تیرے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہم ایک دو دن میں اپنا ایک سپاہی بھیجیں گے، ہوسکتا ہے نیاز محمد کو ہی بھیج دیں۔ نہیں تجھے اپنے گھر کا پتہ بتانے کی ضرورت نہیں تیرا گھر اب بھی ہماری آنکھوں میں ہے، جا اب تُو جا تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہوئے، تُو جشن منانے کی تیاری کر۔''

ان جملوں کو یاد کر کے اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ ان مسرت بھرے پیغام کو نیلم تک پہنچا دے۔

نیلم کا خیال آتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، جانے وہ کیسی ہوگی۔ اس پر کیا گزرتی ہوگی، وہ شعلوں کی قیدی تھی جانے کس کرب میں اس کی زندگی بیت رہی ہوگی۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہوگیا اس پر تھکن طاری ہوگئی وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا تب اسے اچانک محسوس ہوا جیسے اس کے سرہانے کوئی آبیٹھا ہے۔

کسی کی موجودگی کا احساس کر کے وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ اُٹھ کر اس نے کمرے کی لائٹ جلائی تب اس نے روشنی میں دیکھا کہ نیلم اس کے سرہانے افسردہ بیٹھی ہے۔

وہ جلدی سے اس کے قریب آیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بہت محبت سے بولا۔ ''نیلم تم کیسی ہو؟''

''اکبر تم کیسے ہو؟'' وہ بڑی بے قراری سے بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے آگئیں اس جن نے کیا تمہیں آزاد کر دیا۔''

''میں کہاں ہوئی ہوں آزاد، اکبر میں جل رہی ہوں، اس گیلی لکڑی کی طرح جو جلتی کم ہے دھواں زیادہ دیتی ہے، میرے جسم سے بھی دھواں اُٹھ رہا ہے اور تم یہاں آرام سے سو رہے ہو، تمہیں میری بالکل فکر نہیں۔ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ اس جن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے کس قدر ظالم ہو تم اکبر۔''

''نہیں نیلم ایسا نہ کہو میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں تم میری بیوی ہو تم ہر لمحہ میری آنکھوں میں رہتی ہو اب تم میری آنکھوں سے اسی وقت نکل سکتی ہو جب یہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں۔'' اکبر نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''اللہ نہ کرے اکبر، کیسی بات کرتے ہو۔'' نیلم نے یہ کہہ کر اپنا نرم ملائم ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

تب ہی وہ کالا بلا کہیں سے بیڈ پر کودا اور میاؤں کی آواز نکالنے کے بجائے انسانی آواز میں بولا۔ نیلم تم یہاں بیٹھی ہو، میں وہاں تمہیں تلاش کر رہا تھا۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو، میں اب تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں تمہارے ساتھ نہیں جانا اہتی۔ میں اب اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔'' نیلم نے سخت لہجے ں کہا۔

لیکن کالے بلے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا وہ خاموشی سے بیڈ پر کھڑا ہوا اسے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''خیریت اسی میں ہے کہ تم واپس میرے ساتھ چلی چلو۔''

''میں نے تم سے ایک بار کہہ دیا نا، میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' اچانک کالے بلے کو غصہ آگیا۔ ''کیا تم جانتی نہیں ہو کہ کس سے بات کر ہی ہو۔''

''ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کس سے بات کر رہی ہوں، میں سیّد پور کے جن سے ت کر رہی ہوں۔''

''تم اگر سیّد پور کے جن سے واقف ہو تو پھر یہ بات بھی جانتی ہوگی کہ میں اپنی ضد کا کس قدر پکا وں، بہتر ہوگا کہ تم خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلو۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' نیلم نے بڑے غصے میں کہا۔

تب کالے بلے نے اپنی لال لال آنکھوں سے نیلم کو گھور کر دیکھا نیلم نے ایک زوردار چیخ ماری۔

نیلم کی چیخ کے ساتھ ہی کمرے کا منظر بدل گیا۔

اب وہاں نیلم تھی اور نہ کالا بلا لیکن پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز آرہی تھی کہیں سے۔

اکبر نے چاروں طرف دیکھا تب اسے ایک سلاخوں والی کھڑکی نظر آئی اس نے اندر جھانک کر یکھا وہاں ایک کبوتری کے پاؤں میں ایک زنجیر بندھی ہوئی اور اس زنجیر کے سرے پر لوہے کا ایک ھاری گولا تھا اور کبوتری آزاد ہونے کیلئے اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

اس کبوتری کو دیکھ کر اکبر کو فوراً نیلم کا خیال آیا وہ چیخ کر بولا۔ ''نیلم یہ تم ہو؟''

اس کبوتری نے اپنی خوبصورت گردن موڑ کر اکبر کی طرف دیکھا وہ سہمی ہوئی تھی اس کی حالت قابل رحم تھی، اکبر کی چھٹی حس نے بتایا کہ یہی نیلم ہے۔

اکبر نے اس کھڑکی کی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی پھر اس نے خود کو ہاتھی کی سونڈ پر محسوس کیا وہ کوئی بہت بڑا ہاتھی تھا جو اسے سونڈ پر اُٹھائے جنگل میں بھاگ رہا تھا۔

ہاتھی سے بچنے کیلئے اس نے ایک درخت کی شاخ پکڑ لی اور اس سے جھول گیا، ہاتھی آگے نکل گیا

لیکن درخت کی شاخ کمزور تھی وہ اس کا وزن نہ سہار سکی ٹوٹ گئی اکبر زمین پر گرا۔

تب خوف سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے خود کو بیڈ کے نیچے قالین پر پایا۔

کمرے میں اندھیرا تھا، اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا اس نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی سرہانے رکھا ہوا ایک گلاس پانی پیا۔

اب بھی اس کے جسم میں لرزش تھی وہ خوفزدہ نظروں سے کمرے کی دیواروں کو گھور رہا تھا۔

زنجیر میں جکڑی ہوئی کبوتری کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی یہ کیسا بھیانک خواب تھا۔

پھر اسے نیند نہ آئی، وہ صبح تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی یہ بھیانک خواب اس کیلئے کانٹوں کی سیج بن جاتا اور کبھی املی والے بابا سے حوصلہ افزا ملاقات پھول بھری زندگی کی نوید دیتی۔ رات بھر دو متضاد کیفیتیں اس پر طاری رہیں وہ سونے کی کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔

صبح کو راشدہ جب اسے اُٹھانے آئی تو وہ بے خبر سونے کے بجائے دیدے پھاڑے چھت کو گھور رہا تھا۔ راشدہ نے کمرے میں داخل ہو کر اسے غور سے دیکھا پھر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

''اکبر بھائی، آپ جاگ رہے ہیں، میں تو آپ کو اُٹھانے آئی تھی۔'' راشدہ نے کہا......

''ٹھیک ہے میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تم اُٹھاؤ۔'' یہ کہہ کر اکبر نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اکبر بھائی یہ آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا ایک دم لال انگارہ ہو رہی ہیں۔''

''راشدہ میں رات کو سو نہیں سکا۔'' اکبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور تھوڑی بہت دیر جو نیند آئی اس میں ایک بھیانک خواب دیکھ لیا۔''

''کیسا خواب، اکبر بھائی۔'' رشدہ نے فکر مندی سے کہا۔

''میں نے نیلم کو قید میں دیکھا ہے۔ نیلم کو کالے بلے نے کبوتری بنا دیا ہے وہ ایک کوٹھری میں بند ہے۔ اس کے پاؤں میں زنجیر ہے اور اس زنجیر کے سرے پر ایک بھاری گولا ہے وہ اڑنے کیلئے پر پھڑ پھڑا رہی ہے۔ راشدہ خواب کا یہ منظر میری آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گیا ہے۔ کبوتری کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے جانے اس خالی گھر میں نیلم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' اکبر نے افسردگی سے کہا۔

''اکبر بھائی آپ پریشان نہ ہوں، بس دو چار دن کی اور بات ہے اللہ نے چاہا تو نیلم بھابھی کو اس جن سے نجات مل جائے گی۔'' راشدہ نے پر امید لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے۔'' اکبر نے پوچھا۔

''ارے بھول گئے، املی والے بابا نے آپ سے نہیں کہا کہ تیری زندگی کے دکھ اب ختم ہونے کو

جشن منانے کی تیاری کر۔'' راشدہ نے بتایا۔

''ہاں کہا تو تھا لیکن راشدہ کیا واقعی ایسا ہو جائے گا۔'' اکبر پر بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔

''ہاں اکبر بھائی کیوں نہیں ہو گا، اللہ والے لوگوں کے پاس بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

''اچھا یہ تجھے کس نے بتایا۔'' اکبر نے مسکرا کر پوچھا۔

''اکبر بھائی میرا انداق نہ اڑائیں۔'' راشدہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پتہ ہے اکبر بھائی جب نیلم بھابھی خالی گھر سے آجائیں گی تو میں انہیں دوبارہ دلہن بناؤں گی۔ ہم ساری رسمیں پھر سے کریں گے، گیت گائیں گے۔ گھر پر روشنی کروائیں گے، خوب جشن منائیں گے، خوب ہلا گلا کریں گے۔''

''جب اتنا کچھ ہو گا تو باراتی بچاروں نے کیا قصور کیا ہے، انہیں بھی اکٹھا کر لینا۔''

''چلیں ٹھیک ہے بلکہ ایسا کریں گے جتنے لوگ اس وقت بارات میں شامل تھے، ان سے اسٹیشن جانے کو کہہ دیں گے پھر ہم لوگ بس میں بارات لے کر گھر واپس آئیں گے۔''

''تو پھر ایک کام اور کرو۔''

''نکاح بھی دوبارہ پڑھوا دینا۔''

''اکبر بھائی اب اتنا نہ پھیلیں۔'' راشدہ نے مسکرا کر کہا۔

''کچھ زیادہ پھیل گیا۔''

''اور کیا۔''

''اچھا چلو سکڑ جاتا ہوں......'' اکبر نے اپنا جسم سمیٹتے ہوئے کہا...... ''بھئی ایسا تو ہو سکتا ہے کہ اس جشن میں خالہ خالو کو بھی شامل کر لیا جائے۔''

''کیوں نہیں، ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم لاہور فون کر دیں گے، وہ لوگ آجائیں گے۔''

''کتنا مزہ آئے گا۔'' اکبر نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

''بہت مزہ آئے گا، اتنا مزہ آئے گا کہ میں سوچ سوچ کر دیوانی ہوئی جا رہی ہوں۔''

''راشدہ ابھی سے اتنی دیوانی نہ ہو، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ جانے کیا ہو جائے۔ کہیں ہمارے خواب ٹوٹ کر بکھر نہ جائیں۔''

''اکبر بھائی خدا کے واسطے......'' راشدہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کوئی بد فال نہ نکالیں۔ اچھی سوچ رکھیں۔''

''راشدہ، میری سوچ تو اچھی ہے لیکن میری سوچ سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو اب تک یہی دیکھا ہے کہ خوشیاں میرے نزدیک آ آ کر واپس لوٹ گئیں...... اور میں حسرت سے اپنا دامن پھیلائے، رہ

گیا......" اکبر نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"انشاء اللہ، اب ایسا نہیں ہوگا، اکبر بھائی جانے کیوں میرا دل اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا......" راشدہ نے بڑے یقین سے کہا۔

"تُو بہن ہے میری، تیرا دل پکار پکار کر نوید نہیں دے گا تو اور کس کا دے گا......"

"اچھا، اب اُٹھ جائیں، امی ناشتہ تیار کر چکی ہوں گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ مجھے اتنی دیر غائب دیکھ کر یہاں آنے ہی والی ہوں۔"

"پھر تو مجھے فوراً باتھ روم کا رخ کر لینا چاہیے۔" اکبر نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اکبر باتھ روم میں گھسا تو راشدہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اکبر نے منہ ہاتھ دھوتے ہوئے آئینے پر نظر ڈالی تو اسے اپنی شکل بدلی بدلی سی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں واقعی خاصی سرخ ہو رہی تھیں۔ رات کی جگار نے اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے بھر دیے تھے۔ اس کا رنگ بھی کچھ پژمردہ سا ہو رہا تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی اداسی پھیلی تھی۔ جانے کیوں اسے اپنی شکل اجنبی سی لگی۔

اکبر نے جلدی جلدی برش کر کے گرم پانی کے چھینٹے منہ پر مارے لیکن چہرے کی بشاشت واپس نہ آئی۔ اس نے سوچا کچھ دیر گرم پانی کا شاور لے لے۔

ابھی وہ گرم پانی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازہ بجایا۔

"کون ہے؟" اکبر نے اپنا سر شاور کے نیچے سے ہٹا کر پوچھا۔

"میں ہوں۔" راشدہ کی باہر سے آواز آئی۔

"راشدہ میں آرہا ہوں بس نہا چکا۔"

"اکبر بھائی فوراً باہر آجائیں، کوئی آیا ہے۔" راشدہ نے اطلاع دی۔

"کون آیا ہے؟ ماموں آئے ہیں کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"نہیں، دروازے پر کوئی اور ہے، وہ آپ کو پوچھ رہا ہے۔"

"راشدہ، ابو کہاں ہیں، ان سے کہو ان کو اندر بلا کر بٹھائیں۔"

"ابو گئے تھے دروازے پر، لیکن وہ اندر نہیں آیا۔ وہ بس آپ کو بلائے جا رہا ہے۔"

"اچھا میں آرہا ہوں۔" پھر وہ پورا نلکا کھول کر نلکے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے سر اور جسم پر صابن لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی جسم دھویا اور چند سنٹ میں باتھ روم سے باہر آگیا۔

اس کی سمجھ میں ابھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اتنی صبح اس سے ملنے کون آپہنچا۔ اگر اس کا کوئی دوست ہوتا تو وہ اندر آجاتا۔ ابو اس کے سارے دوستوں سے واقف تھے۔ پھر راشدہ بھی بتا دیتی کہ آپ کا

فلاں دوست آیا ہے، دروازے پر آنے والا کوئی اجنبی تھا۔ ایسا اجنبی جسے صرف اکبر جانتا تھا۔ تب اکبر کا دھیان فوراً املی والے بابا کی طرف گیا۔

انہوں نے اپنا کوئی سپاہی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا ان کا سپاہی آگیا۔

یہ سوچ کر اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک جوش سا بھر گیا۔

کمرے کے دروازے پر بابر علی اس کا منتظر تھا۔ اکبر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "ابو، باہر کون ہے؟"

"کوئی اجنبی ہے۔" بابر نے کہا۔ "نہ اپنا نام بتاتا ہے اور نہ کام۔ وہ ایک ہی بات کہتا ہے اکبر کو بھیجو وہ کہاں ہے؟"

"کوئی ملنگ قسم کا آدمی ہے۔"

"سفید شلوار اور ایک روئی کی صدری پہنے ہوئے ہے۔ وہ ملنگ تو نہیں دکھائی دیتا۔" بابر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" اکبر نے تیزی سے گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اسے یاد آیا کہ کلفٹن پر اسے جو ملنگ ملا تھا جس کا نام املی والے بابا نے نیاز محمد بتایا تھا، اس نے تو اس دن محض ایک تہبند باندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے سردی محسوس ہو رہی ہے، اس وقت جو دروازے پر تھا وہ نیاز نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ ابو کے بقول وہ سفید شلوار اور ایک روئی کی صدری پہنے ہوئے تھا۔ ہوسکتا ہے املی والے بابا نے کسی اور شخص کو بھیج دیا ہو کیوں کہ انہوں نے یہ بات یقین سے نہیں کہی تھی کہ وہ کس کو بھیجیں گے۔ البتہ سپاہی بھیجنے کی بات ضرور کی تھی۔

اکبر انہی خیالات میں الجھا جب گیٹ پر پہنچا اور اس نے اچک کر گیٹ کے اوپر سے دیکھا تو سے اپنے سامنے ایک سر نظر آیا۔ وہ جو بھی تھا اس کا چہرہ سڑک کی طرف تھا۔ اکبر دیکھ نہیں پایا کہ وہ کون شخص ہے۔

پھر اکبر چھوٹے گیٹ سے باہر نکلا اور پھر بولا۔ "ہاں جناب۔"

اکبر کی آواز سن کر وہ شخص پلٹا۔ کالی داڑھی اور گردن پر پڑے بال، نکلتا ہوا قد، چمکتا ہوا چہرہ وہ اکبر کو دیکھ کر مسکرایا۔

"آگیا تُو۔"

"ارے، آپ۔" اکبر نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ نیاز محمد ہی تھا۔ سمندر کے کنارے ملنے والا ملنگ۔ اس لباس میں وہ آج بالکل ملنگ نہیں لگ رہا تھا۔

''ہمارے ساتھ چل۔'' نیاز محمد نے کہا۔

''کہاں بابا؟'' اکبر بولا۔

''سوال نہ کر، دیر نہ کر۔'' نیاز محمد نے اس کی پیشانی پر انگشت رکھی۔

''کہیں دور چلنا ہے تو گاڑی نکال لوں۔'' اکبر نے پوچھا۔

''خالی گھر تک جانا ہے۔ آج وہاں تماشا ہوگا۔ گاڑی کو چھوڑ پیدل چل پیدل۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹ لے آؤں اپنا۔''

گیٹ کے پیچھے بابر علی موجود تھا، اس نے کوٹ کا ذکر سنا تو فوراً بولا۔ ''بیٹے میں لاتا ہوں تمہارا کوٹ۔ تم یہیں ٹھہرو۔''

''تجھے بہت سردی لگتی ہے؟'' ملنگ نے پوچھا۔

''نہا کر نکلا ہوں، اس لئے کچھ محسوس ہو رہی ہے ویسے نہیں لگتی۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''ہمارے بابا کا دیا ہوا سکہ تُو نے باندھ لیا۔'' نیاز محمد نے پھر سوال کیا۔

''جی ہاں، میں نے باندھ لیا۔'' اکبر نے کہا۔

''دکھا، بازو۔'' نیاز محمد نے حکم دیا۔

اکبر نے قمیص کی آستین اوپر کر کے بازو پر بندھا ہوا سکہ دکھایا نیاز محمد نے اس سکے پر اپنی انگلی رکھی اور بولا۔ ''معلوم ہے یہ کیا ہے؟''

''سکہ ہے پانچ پیسے کا۔''

''یہ سکہ نہیں ہے، یہ ایٹم بم ہے، ایٹم بم۔''

''لو بیٹے یہ کوٹ۔'' بابر علی نے چھوٹے گیٹ سے اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ میرے والد ہیں۔'' اکبر نے اپنے باپ کا تعارف کرایا۔

''جانتا ہوں میں۔'' نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔ ''اور ابو یہ نیاز محمد صاحب ہیں۔ وہی جو سمندر کے کنارے ملے تھے۔''

''اچھا اچھا۔'' بابر علی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''چل بھئی اکبر جلدی کر دیر نہ کر۔''

''اکبر کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟'' بابر علی نے پوچھا۔

''ہم اکبر کے ساتھ ہیں اب کسی کو اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔'' نیاز محمد نے تڑخ کر کہا۔

''جی بہتر ہے۔'' بابر علی نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور پھر اکبر سے مخاطب ہوئے۔ ''جاؤ بیٹے

خدا حافظ۔''

بابر علی نے یہ کہہ کر گیٹ بند کر لیا تو نیاز محمد نے آگے قدم بڑھائے۔ اکبر بھی اس کے پیچھے چلا۔ یاز محمد نے پہلے بہت تیزی سے آگے قدم بڑھائے اتنی تیزی سے کہ اکبر کو یہ گمان ہوا جیسے وہ وڑنے لگا ہو۔

جتنی تیزی سے وہ آگے گیا تھا اتنی ہی تیزی سے پیچھے آیا۔ اب وہ گھوم رہا تھا، رقص کر رہا تھا، اس کے پاؤں سے چھن چھن کی آواز آ رہی تھی۔

اکبر کو اس چھن چھن کی آواز پر بڑی حیرت ہوئی اس نے بغور ملنگ کے پاؤں دیکھے وہ ننگے پاؤں مرور تھا لیکن اس کے پاؤں میں گھنگھرو نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

وہ ملنگ تیزی سے رقص کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، اس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی می اگرچہ اس کرائے کے گھر سے خالی گھر کا فاصلہ زیادہ نہ تھا لیکن اتنا کم بھی نہ تھا کہ چند منٹوں میں طے کر لیا جاتا۔

اس ملنگ نے یہ راستہ رقص کرتے ہوئے طے کیا۔

رقص کرتے اس ملنگ کے ساتھ چلتے ہوئے اکبر کو شرم آ رہی تھی اس لئے رقص کرتے ہوئے اس نک کو دیکھنے کیلئے راہ گیر رک جاتے تھے ایک دو گاڑی والوں نے بھی اس تماشے کو رک کر دیکھا۔

اکبر ذرا پیچھے رہ جاتا تو وہ ملنگ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کر لیتا۔

ان لمحات میں اکبر کو بڑی شرم آتی ایک پڑھا لکھا لڑکا ایک فقیر کے ساتھ کیوں لگا ہوا تھا۔

رقص کرتا ملنگ اور اس کے ساتھ چلتا ایک نوجوان لڑکا راہ گیروں کیلئے تماشا بن جاتا وہ اسے پلٹ ٹ کر دُور تک دیکھتے جاتے۔

خالی گھر جیسے جیسے نزدیک آ رہا تھا۔ نیاز محمد کے رقص میں تیزی آتی جا رہی تھی، اس پر ایک عجیب ب کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے پیروں سے آتی ہوئی گھنگھروؤں کی آواز اکبر کو مسلسل حیران کر ی تھی۔

پھر خالی گھر آ پہنچا۔ خالی گھر کے سامنے پہنچتے ہی نیاز محمد نے ایک نعرہ مستانہ مارا اور تیز تیز دھمال رنے لگا۔ وہ انگلی اُٹھائے ''حق حق'' کر رہا تھا، اس کے پیروں میں گھنگھرو بج رہے تھے۔

جب اچانک ہی اکبر کو خیال آیا کہ وہ خالی گھر کے گیٹ پر پڑے تالے کی چابی لانا تو بھول گیا۔

وہ سوچنے لگا کیا کرے نیاز محمد کو بتا کر گھر سے جا کر چابی لے آئے یا نیاز محمد خود اس سے مخاطب ہو تو روہ اسے چابی کے متعلق بتائے۔

ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک نیاز محمد نے رقص بند کر دیا اور پھر وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے تالا ہاتھ میں پکڑا تو وہ اس طرح کھل گیا جیسے بند ہی نہ تھا۔

کنڈا کھول کر نیاز محمد نے گیٹ کے دونوں پٹوں کو زور سے دھکیلا۔

گیٹ کھلتا چلا گیا۔

نیاز محمد نے گیٹ کے درمیان کھڑے ہو کر خالی گھر پر نظر ڈالی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ خالی گھر میں مچنے والی ہلچل کی سن گن لینا چاہتا ہو۔

کچھ توقف کے بعد اس نے نعرہ مستانہ لگایا۔ ''حق حق۔''

اور پھر خالی گھر کے دروازے پر آنکھیں گاڑ دیں اور کانوں سے کچھ سننے کی کوشش کی لیکن نیاز محمد کو کچھ دکھائی دیا نہ سنائی دیا۔

''بھاگ گیا کیا۔'' نیاز محمد نے جیسے خود سے سوال کیا۔

پھر گیٹ کے اندر داخل ہوا اور چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ کھڑے کھڑے گردن گھمائی اور اکبر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جب وہ اس کے نزدیک آ گیا تو نیاز محمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''ڈر تو نہیں لگ رہا۔''

''نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ڈر کیسا؟'' اکبر نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بس، پھر گیٹ بند کر دے اور آ جا میرے ساتھ۔'' نیاز محمد نے اکبر کو حکم دیا۔

''اکبر نے جلدی سے گیٹ کے دونوں پٹ ملا کر اندر سے کنڈا چڑھا دیا۔

نیاز محمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اکبر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ شعلے پر رکھا گیا ہو۔ اتنی تپش تھی اس ملنگ کے ہاتھ میں۔

نیاز محمد نے گھر کے دروازے کی طرف رخ کرنے کے بجائے۔ لان میں داخل ہو گیا۔ لان کے درمیان پہنچ کر اس نے ایک جگہ منتخب کی اور ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ اس نے اکبر سے اشارے سے کہا کہ وہ اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ جائے۔

اکبر اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ گیا بلکہ چھپ گیا۔

نیاز محمد نے آلتی پالتی مار کر آسن جما لیا...... چند لمحے کچھ پڑھا...... اور ایک انگلی اُٹھا کر اپنے چاروں طرف گھمائی...... شاید اس نے اپنے اور اکبر کے گرد حصار باندھا تھا۔

حصار باندھ کر اس نے خالی گھر کے دروازے پر نظریں جما دیں...... دروازہ بند تھا۔

جب یہ لوگ گیٹ میں داخل ہوئے تھے تو فرش دھلا ہوا محسوس ہوا تھا...... لان کے اطراف میں

جو پھول لگے ہوئے تھے، وہ بھی تر و تازہ تھے...... لگتا تھا جیسے انہیں باقاعدگی سے پانی ملتا رہا ہو۔

دروازہ ابھی تک بند تھا...... اکبر نیاز محمد کے کندھے سے جھانک کر مکان کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا...... اچانک اکبر کو ایسا محسوس ہوا جیسے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہو۔

''بابا، کیا آپ نے دیکھا؟'' اکبر نے سرگوشی میں کہا۔ ''دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔''

''ہاں، وہ جھانک کر گیا ہے۔'' نیاز محمد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

نیاز محمد نے ٹھیک کہا تھا...... وہ واقعی دروازے پر آیا تھا...... اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا تھا...... وہ دونوں سامنے ہی بیٹھے تھے۔

اس نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر دبے پاؤں واپس ہو گیا...... اس نے بیڈروم کا رخ کیا۔

نیلم بیڈ پر لیٹی محو خواب تھی...... اس کے چہرے پر ویرانی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔

سیّد پور کے جن نے جو اس وقت کالے بلے کے رُوپ میں تھا...... بیڈ پر چھلانگ لگائی اور اس کے منہ کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر زور سے ''میاؤں'' کی آواز نکالی۔

اس خوفناک آواز کو سن کر نیلم کی فوراً آنکھ کھل گئی...... وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی...... وہ کالا بلا نہ تھا...... شہزادے کے رُوپ میں آ چکا تھا...... اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

''کیا ہوا قرل؟'' نیلم، سیّد پور کے جن سے مخاطب ہوئی۔

''نیلم وہ لوگ باہر بیٹھے ہیں۔'' سیّد پور کے جن کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''کون لوگ؟'' نیلم نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک تمہارا شوہر ہے اور دوسرا اللی والے بابا کا ایک چیلا ہے۔ نیلم تم فکر نہ کرو، میں اس نیاز محمد کا وہ حشر کروں گا کہ یہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔''

اکبر کا ذکر سن کر نیلم کے چہرے پر ایک دم رونق سی آ گئی۔ ''وہ آئے ہیں؟''

''ہاں وہ آئے ہیں۔'' سیّد پور کے جن نے غصے سے کہا...... ''ان کے ابھی تک ہوش ٹھکانے نہیں آئے...... آج انہیں بھی تھوڑا سا سبق سکھائے دیتا ہوں۔''

''میرے اکبر کو کچھ نہ کہنا، ورنہ یاد رکھو، میں خودکشی کر لوں گی۔'' نیلم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا...... اور بیڈ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

یہ سن کر سیّد پور کے جن نے قہقہہ لگایا۔

سیّد پور کے جن کا قہقہہ بڑا بھیانک تھا۔

''تم کرو گی خودکشی۔ ہاہاہا۔'' سیّد پور کا جن بے تحاشا ہنستے ہوئے بولا۔ ''ذرا کر کے دکھاؤ۔''

''ہاں میں جانتی ہوں کہ میں اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتی۔ تم مجھے مرنے نہیں دو گے، لیکن قرل

کیا تم سمجھتے ہو کہ میں زندہ ہوں۔ اگر یہی زندگی ہے تو پھر موت کیا ہوگی۔ اب یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں اس تنہا مکان میں کسی آسیب کی طرح منڈلاتی رہتی ہوں۔ قرل میں انسان ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ یہ آگ، یہ بڑھکتے ہوئے شعلے، یہ دہکتا تنور، میری تو روح تک جھلس گئی ہے اس میں مجھے اب معاف کردو۔ مجھے جانے دو۔ دیکھو میرا اکبر مجھے لینے آپہنچا ہے۔" بولتے بولتے نیلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سیّد پور کے جن نے نیلم کے آنسوؤں کی پروا نہ کی۔ وہ تھوڑا اس کے نزدیک ہوا اور اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر بولا۔ "تمہارا اکبر تمہیں لینے نہیں آیا، یہاں مرنے آیا ہے۔"

"نہیں قرل، خدا کے واسطے ایسا نہ کرنا۔" نیلم کانپ اٹھی۔

"مجھے سبق نہ پڑھاؤ، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم بیڈ پر آرام سے لیٹ جاؤ اور اس وقت تک باہر نہ نکلنا جب تک میں تم سے باہر آنے کو نہ کہوں۔" یہ کہہ کر قرل نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "تم کہاں جارہے ہو، قرل۔"

"میں ان لوگوں کے سامنے جارہا ہوں، اب گھمسان کا رن پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ نیاز محمد کوئی معمولی انسان نہیں ہے لیکن میں بھی کوئی معمولی جن نہیں ہوں۔ بہت زبردست ہوں اب زبردست کا زبردست کا مقابلہ ہے، لیکن تم فکر نہ کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ میرا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔ یہاں سے روتا ہوا بھاگے گا۔ اب میں جارہا ہوں۔ تم کمرے میں آرام کرو۔" یہ کہہ کر سیّد پور کے جن کمرے سے نکل گیا۔

جاتے جاتے وہ دروازہ بھی بند کرگیا۔ نیلم تڑپ کر دروازے تک آئی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ نہ کھلا۔ سیّد پور کا جن باہر نکلتے نکلتے دروازہ مقفل کرگیا تھا۔

نیلم اب کمرے میں تنہا رہ گئی۔

اس وقت اس کی بہت بری حالت تھی۔ دل میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دل پھٹ جائے گا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ کر آرہے تھے، اس کے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

اکبر اسی گھر کے احاطے میں تھا اور وہ اس سے مل نہیں سکتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ یہ کیسی بے بسی تھی۔ یہ کیسی قید تھی۔

"اے اللہ مجھ پر رحم کر۔" اس کے ہاتھ بے اختیار دعا کیلئے اٹھ گئے۔ آنسو بھری آنکھوں اور دکھے ہوئے دل سے اس نے اللہ کو پکارا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر اپنی رہائی کی دعا مانگی۔

"اے اللہ مجھے اس جن سے نجات دلا دے، مجھے میرے شوہر سے ملا دے، اے اللہ مجھ پر رحم کر۔"

دعا مانگتے مانگتے اس کی آنکھوں میں غنودگی اترنے لگی۔ اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ وہ سجدے حالت میں تھی۔ بس اسی طرح روتے روتے دعا مانگتے سوگئی۔

سیّد پور کا جن نیلم کے کمرے سے نکلتے ہی کالا بلا بن گیا۔ پھر وہ غصے میں بپھرا ہوا گھر کے بڑے ازے کی طرف چلا۔ اس نے اپنے ایک پیر سے دروازہ کھولا اور پھر باہر نکل گیا۔

"آ گیا۔" نیاز محمد نے کالے بلے کو دروازے سے نکلتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔

اکبر نے جلدی سے اس کے کندھے سے جھانک کر دیکھا۔ کالا بلا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں، یہی ہے وہ۔" اکبر نے کالے بلے کو دیکھ کر تصدیق کی۔

"اب دیکھ تماشا۔" نیاز محمد نے جھوم کر کہا۔ پتہ نہیں اس نے یہ بات اکبر سے کہی تھی یا کالے بلے کو ی کہی تھی۔

نیاز محمد نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر اس طرح ہاتھ کو جھٹکا دیا کہ جیسے کالے بلے پر پتھر کھینچ مارا ہو۔ ر کے ہاتھ میں کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔

ہ نادیدہ پتھر کالے بلے کو ٹھاہ کر کے لگا۔ وہ بلبلا گیا۔ اس نے غرّا کر نیاز محمد کو دیکھا۔

ب ہی نیاز محمد کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔

نیاز محمد چلا جا، تیری خیریت اسی میں ہے۔"

میں چلا جاؤں۔" نیاز محمد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اب تجھے جانا ہوگا۔ تجھے یہ گھر چھوڑنا ۔ تجھے اس معصوم لڑکی کی جان چھوڑنا ہوگی۔"

بہت مشکل ہے۔" نیاز محمد کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔

ں مرتبہ نیاز محمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر ہاتھ اوپر اٹھایا اور ایک نادیدہ لے بلے پر کھینچ مارا۔ پتھر لگتے ہی کالا بلا کئی قلابازیاں کھا گیا۔

و کیھ نیاز محمد اب بھی مان جا۔"

محمد نے زور سے کہا۔ "ڈرتا کیوں ہے، آگے کیوں نہیں آتا میں بھی دیکھوں تو کتنا زبردست ہے۔"

تو میرے سامنے مچھر جیسا ہے۔ تجھے املی والے بابا نے کیوں بھیج دیا۔ وہ میرے مقابلے پر خود نہیں آیا۔" ادھر سے آواز آئی۔

پہلے تو مجھ سے مقابلہ کرلے۔ پھر میرے پیر کی بات کرنا۔ تیرے لئے املی والے بابا کا ایک بہت ہے۔" نیاز محمد نے زور سے کہا۔ "لے سنبھل۔"

محمد نے پھر ایک نادیدہ پتھر اس کی طرف پھینکا۔ پتھر کھاتے ہی کالا بلا لڑھک کر کئی قدم پیچھے

چلا گیا۔لیکن پھر وہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی لال لال انگارہ آنکھوں سے نیاز محمد کو گھور کر دیکھا۔

پھر نیاز محمد اور اکبر پر پتھر برسنے لگے۔

یہ بڑے بڑے پتھر تھے۔خلا میں اچانک نمودار ہو کر ان پر برس رہے تھے،لیکن کوئی پتھر ان کو نہیں لگا۔پتھر ان کے آس پاس گر رہے تھے،سروں سے گزر رہے تھے بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پتھر اب لگا تب لگا۔

اکبر ان پتھروں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔وہ پتھر اتنے بڑے تھے کہ اگر ایک بھی سر پر لگ جاتا تو یقینی طور پر بھیجا باہر آ جاتا۔

چند منٹ تک پتھروں کی یہ بارش جاری رہی۔ان کے آس پاس پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔پھر خود بخود پتھروں کی یہ برسات تھم گئی۔

اب اپنی طاقت دکھانے کا نیاز محمد کا نمبر تھا۔

نیاز محمد نے جلدی جلدی اپنی انگلیوں پر کچھ پڑھا اور انگشت شہادت کو منہ کے قریب لا کر زور سے پھونک ماری۔

تب ہی اچانک کالے بلے کے ارد گرد آٹھ دس موٹے موٹے چوہے نمودار ہو گئے وہ نمودار ہوتے ہی کالے بلے پر حملہ آور ہوئے۔کسی نے اس کی ٹانگ پکڑی کسی نے دم میں کاٹا،کسی نے اس کا کان کترا۔کالا بلا ناچ ناچ گیا۔وہ ایک چوہے کو پکڑ کر اس کے تھپڑ لگاتا تو اتنی دیر میں دوسرا چوہا اس کی اچھی خاصی مزاج پرسی کر دیتا۔

نیاز محمد اور اکبر دُور بیٹھے اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔اکبر نے اب تک بلی کو تو چوہے کے پیچھے بھاگتے دیکھا تھا،لیکن وہ آج چوہوں کو بلے کے پیچھے بھاگتے دیکھ رہا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ چوہے بلے سے خوفزدہ نہ تھے بلکہ کالا بلا ان سے خوفزدہ تھا۔چوہے اس پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔کالا بلا کہیں کہیں سے زخمی ہو گیا تھا۔اس کے جسم سے خون بہتا دکھائی دے رہا تھا۔

کالے بلے کے پنجے میں جو بھی چوہا آ جاتا وہ اسے پکڑ کر جھنجھوڑ دیتا۔اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اب تک اس طرح وہ کئی چوہے ختم کر چکا تھا۔

جب آخر میں دو تین چوہے رہ گئے تو وہ اپنی جان بچا کر ادھر ادھر پودوں میں گھس گئے۔

کالا بلا چوہوں کو بھاگ جانے کے بعد اپنے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور اپنے رستے زخموں کو اپنی لمبی اور سرخ سرخ زبان سے چاٹنے لگا۔جیسے جیسے وہ چاٹتا جاتا،ویسے ویسے اس کے زخم بھرتے جاتے۔ چند منٹ کے اندر اندر اس کے زخم بالکل صاف ہو گئے۔وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

تب وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔اب اس نے گھور کر نیاز محمد کو دیکھا اور فضا میں ایک قلابازی

کھائی۔اب کالا بلا حملہ کرنے کیلئے بالکل تیار تھا۔اب اس کا شعبدہ شروع ہوا۔

نیاز محمد نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ اژدھا چلا آتا ہے وہ زور سے پھنکار رہا تھا اور جہاں جہاں اس کی پھنکار پڑتی گھاس جل کر راکھ ہو جاتی۔

اکبر نے نیاز محمد کے کندھے سے اچک کر اژدھے کو دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔وہ نیاز محمد کے کان میں آہستہ سے بولا۔''بابا وہ اژدھا۔''

''ہاں میں دیکھ رہا ہوں تم پریشان مت ہو۔یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' نیاز محمد کی نظریں بدستور اس اژدھے پر جمی ہوئی تھیں۔

اژدھا نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔

''بابا،اس پھنکار سے تو گھاس بھی جل رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں،تم ڈرو مت۔میں آگے ہوں پہلے یہ مجھے نقصان پہنچائے گا پھر تم تک پہنچے گا۔'' نیاز محمد نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اب اژدھا ان سے صرف سات فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔پھر جانے کیا ہوا کہ وہ ایک دم رک گیا،ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے آگے کوئی دیوار آ گئی ہو۔وہ دائیں جانب مڑ گیا۔اب وہ ان کے چاروں طرف گھوم رہا تھا لیکن سات فٹ دُور تھا۔

وہ اژدھا جیسے جیسے گھومتا جاتا ویسے ویسے نیاز محمد بھی گھومتا جاتا۔نیاز محمد کے پیچھے اکبر بھی گھوم رہا تھا۔

''ہاں،بھئی اکبر اب تو ڈر نہیں لگ رہا۔'' نیاز محمد نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں بالکل نہیں۔'' اکبر بڑے اطمینان سے بولا۔

''اس کا کیا حشر کروں۔'' نیاز محمد نے پوچھا۔

''اس کا منہ رگڑ دیں۔'' اکبر نے غصے میں کہا۔

''منہ رگڑ دوں یا جلا کر راکھ کر دوں۔'' نیاز محمد نے پوچھا۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔'' اکبر خوش ہو کر بولا۔

''تو پھر دیکھ تماشا۔''

نیاز محمد نے یہ کہہ کر اپنا ایک ہاتھ اوپر اُٹھایا اور غصے سے بولا۔''جل جا۔''

نیاز محمد کی زبان سے ابھی یہ لفظ ادا ہی ہوئے تھے کہ اس اژدھے میں آگ لگ گئی۔

یوں محسوس ہوا جیسے اژدھے کے جسم پر پیٹرول ڈال کر آگ لگا دی گئی ہو۔آناً فاناً اس کا جسم جل کر راکھ ہو گیا۔

نیاز محمد نے مڑ کر اکبر کو دیکھا اکبر نے خوش ہو کر کہا۔ ''بہت اچھا۔''

کالا بلا اپنا شعبدہ دکھا چکا تھا۔ اب نمبر تھا نیاز محمد کا۔ نیاز محمد نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے سے پہلے اکبر سے پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

''اس خبیث کالے بلے کی پٹائی۔'' اکبر نے فوراً کہا۔

لیکن پھر اکبر کو خیال آیا کہ اس بلے پر لاٹھی تو اثر کرتی نہیں۔ سیّد پور میں جب اس پر لاٹھی برسائی گئی تھی تو لاٹھی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔

''لیکن بابا، اس پر لاٹھی تو اثر کرتی نہیں۔'' اکبر نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''کیوں نہیں کرے گی۔'' نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا پھر ہاتھ اوپر کیا تو اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی نمودار ہو گئی۔ نیاز محمد لاٹھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ اللہ کی لاٹھی ہے۔ یہ اس خبیث کی کمر کے ٹکڑے کر دے گی۔''

''اچھا۔'' اکبر نے کہا۔ ''پھر بسم اللہ کیجیے۔''

''یہ لو۔'' یہ کہہ کر نیاز محمد نے اس لاٹھی کو فضا میں اچھال دیا۔ ''جا اس خبیث کی خبر لے۔''

اب وہ لاٹھی اس کالے بلے پر برس رہی تھی اور وہ کالا بلا لاٹھی کی زد سے بچنے کیلئے ادھر ادھر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ جیسے یہ لاٹھی اس کی کمر یا سر پر لگتی وہ بلبلا جاتا اور غرا کر لاٹھی کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔

وہ لاٹھی تڑاتڑ اس پر برس رہی تھی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لاٹھی کسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ نشانہ لے لے کر بلے کو مار رہا ہو۔

کالے بلے کی پٹائی ہوتے دیکھ کر اکبر کی آنکھوں میں خوشی رقصاں تھی۔ اس کالے بلے نے ا... بڑا تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ اب وہ کالا بلا خود تگنی کا ناچ ناچ رہا تھا۔

وہ کالا بلا ادھر ادھر کونے بچالوں میں اپنا سر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لاٹھی مسلسل اس کے سر پر برس رہی تھی، اس کا بھیجا ہلا رہی تھی۔ اس کی کمر ٹوٹ رہی تھی اور کالے بلے کی اچھل کود، اس کی غراہٹ، اس کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی۔

''بس اکبر۔'' نیاز محمد نے پوچھا۔

''نہیں بابا ابھی اور۔'' اکبر نے غصے سے کہا۔ ''اس خبیث نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میری بیوی کو قید کیا۔ میری ماں کی چوٹی کاٹی، میرے ماموں کو کوڑھ میں مبتلا کیا۔ ان کا کاروبار تباہ کیا۔ بابا اس کے جرائم کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اسے اتنی آسانی سے نہ چھوڑیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ پھر کچھ دیر اور تماشا دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر نیاز محمد نے لاٹھی کو حکم دیا۔ ''برسے جا۔''

''اور زور زور سے برس، جلدی جلدی برس۔'' اکبر نے ٹکڑا لگایا۔

''چل بھئی لاٹھی زور زور سے برس، جلدی جلدی برس۔'' نیاز محمد نے اکبر کی خواہش کو حکم میں بدل

حکم ملتے ہی لاٹھی میں تیزی آ گئی۔ وہ بہت تیزی سے اس پر برسنے لگی۔

کالے بلے کی پٹائی ہوتے دیکھ کر اکبر کی آنکھوں میں سکون بھر رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر آسودگی اتی جا رہی تھی۔

جب اس کی پٹائی ہوتے کافی دیر ہو گئی تو اکبر نے نیاز محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بس بابا۔''

''بس۔'' نیاز محمد نے پوچھا۔ ''ہو گیا تیرا جی خوش۔''

''ہاں، بابا۔'' اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر نیاز محمد نے لاٹھی کو حکم دیا۔ ''اے لاٹھی غائب ہو جا۔''

اس حکم کے گونجتے ہی لاٹھی غائب ہو گئی۔ کالا بلا نڈھال ہو کر ایک طرف گر گیا۔ جیسے اس کی کمر ٹ گئی ہو۔

''کیا مر گیا۔'' اکبر نے کالے بلے کو فرش پر پڑے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''یہ بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ یہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔'' نیاز محمد نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی ہنا یہ چند منٹ بعد اُٹھے گا اور ہم پر حملہ کرے گا۔''

نیاز محمد کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہوئی۔

پانچ منٹ کے بعد کالا بلا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے چاروں پاؤں چاٹے اور پھر اس طرح ڑا ہوا جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو کوئی حکم دینے سے پہلے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس نے کھڑے ڑے فضا میں ایک قلابازی کھائی اور پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔

اب اس نے نیاز محمد کو گھورنا شروع کیا۔

اکبر اسے بغور دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب دیکھیں یہ کالا بلا کیا کرتا ہے۔ کون سا شعبدہ دکھاتا ہے۔ اب تک جتنے شعبدے اس نے دکھائے تھے وہ نیاز محمد نے ناکام کر دیے تھے۔

تب ایک کالا پرندہ اس کے جسم سے برآمد ہوا۔ اکبر نے دیکھا وہ کوّے جیسا تھا، لیکن اس کے سر دو اور اس کے پنجوں میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔

وہ ایک تیز دھار کا چمکتا ہوا خنجر تھا۔

آناً فاناً وہ کوّے جیسا پرندہ ان کے سروں پر پہنچا اور اس خنجر کو چھوڑ دیا، نیاز محمد نے جلدی سے کچھ ا اور غصے سے بولا۔ ''رک جا۔''

وہ خنجر ان کے سروں پر سات فٹ اوپر خلا میں معلق ہوگیا۔ وہ خنجر اتنا بڑا اور تیز دھار کا تھا کہ جسم کے کسی حصے پر گرتا فوراً پیوست ہو جاتا۔

وہ کوّا ان کے سروں پر کائیں، کائیں کرتا منڈلاتا رہا تھا۔

نیاز محمد نے پھر کچھ تیزی سے پڑھا اور بولا۔ ''اے خنجر پلٹ۔''

نیاز محمد کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی معلق خنجر میں حرکت ہوئی وہ واپس اوپر اُٹھا اور سر پر منڈلاتے کوّے کے پیچھے اس طرح چلا جیسے گائیڈڈ میزائل۔

پھر وہ اڑتے کوّے کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ خنجر کے آر پار ہوتے ہی کوّا پٹ سے زمین پر گرا اور کسی بم کی طرح پھٹ گیا لیکن آواز کوئی نہ ہوئی۔ بس اس کے چیتھڑے اڑ گئے۔

سیّد پور کا جن جو کالے بلے کے رُوپ میں بڑے اطمینان سے بیٹھا خنجر بردار کوّے کو دیکھ رہا تھا اسے پوری اُمید تھی کہ چند لمحوں میں نیاز محمد کا کام تمام ہو جائے گا لیکن جب اس نے اپنے کوّے کے چیتھڑے اڑتے دیکھے تو وہ خود اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اسے معلوم تھا کہ اب نیاز محمد کی باری ہے۔ ادھر سے کوئی ایسی مصیبت نازل ہوگی کہ وہ پریشان ہو جائے گا۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے نیاز محمد کو دیکھنے لگا۔

نیاز محمد نے تیزی سے کچھ پڑھا اور اپنی انگشت شہادت پر زور سے پھونک ماری۔

اس پھونک کے ساتھ ہی انگشت شہادت سے دھویں کا ایک مرغولہ نکلا۔ اس دھویں کے بادل سے ایک کالا کتا برآمد ہوا۔ یہ کالا کتا گدھے جتنا تھا۔ اس کی زبان ایک فٹ باہر نکلی ہوئی تھی جو تیزی سے اندر باہر ہو رہی تھی۔ اس کے بڑے بڑے نوکیلے دانت جبڑوں سے جھانک رہے تھے۔

اس کالے کتے نے زور سے چھلانگ لگائی اور کالے بلے کی طرف چلا۔

کالا بلا اسے دیکھ کر ایک دَم سہم گیا۔ یہ کیا مصیبت اس پر نازل ہوگئی۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کالا کتا کسی خرگوش کی طرح اس کی گردن دبا تا کالے بلے نے ایک چھلانگ لگائی اور اس گملے پر چڑھ گیا جو ایک رسّی سے لٹکا ہوا تھا اب وہ گملا جھول رہا تھا۔

کالا بلا گملے پر چڑھ تو گیا، لیکن اسے یہ اندازہ نہ ہوا کہ اس میں وزن کتنا ہے۔ اس میں گدھے جتنا وزن تھا۔ گملے کی رسّی فوراً ٹوٹ گئی۔ وہ گملے کے ساتھ دھاڑ سے زمین پر گرا۔

اسے زمین پر گرتے دیکھ کر کالے کتے نے اس پر فوراً حملہ کر دیا۔ کالا بلا بھی چوکنا تھا۔ وہ زمین پر گرتے ہی اُٹھا اور کالے کتے کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی جھکائی دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اب کالا بلا آگے آگے اور کالا کتا پیچھے پیچھے۔

یہ لوگ لان کے درمیان بیٹھے تھے۔ کتے اور بلے کے درمیان ریس لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے

کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کالا بلا پودوں کے درمیان چھپ رہا تھا لیکن کتا اسے ڈھونڈ نکالتا۔

یہ کھیل کافی دیر جاری رہا پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ کالے کتے نے اس پر جھپٹا مار دیا۔

اکبر نے دیکھا کہ کالے بلے کے ایک کان سے خون نکلنے لگا ہے۔ اس کا آدھا کان کتے نے اُڑا دیا تھا۔

''بابا اس کالے بلے کا دوسرا کان بھی کٹنا چاہیے، اس نے کئی انسانوں کے کان کاٹے ہیں۔'' اکبر جوش میں بولا۔

نیاز محمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا البتہ کتے کو حکم دیا۔ ''دوسرا کان بھی کاٹو۔''

کالے کتے نے بھاگتے بلے کو پھر دبوچ لیا اور اس مرتبہ اس کا دوسرا کان بھی کاٹ لیا۔

کالے بلے کے دونوں کانوں سے خون جاری ہوگیا۔ وہ تیزی سے مکان کے عقب کی طرف بھاگا۔ کتے نے اس کا پیچھا کیا پھر وہ دونوں آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

نیاز محمد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اکبر کا خیال تھا کہ کالا کتا اس سیّد پور کے جن کو دیکھ کر مکان کے عقب سے پھر میدان جنگ میں لے آئے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔

کئی منٹ گزر گئے۔

تب اس نے بے چینی سے نیاز محمد سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بابا؟ کدھر گیا وہ خبیث؟''

''وہ پیچھے آم کے درخت پر چڑھ گیا ہے اور اپنے پیروں سے اپنے کان سے بہنے والے خون کو صاف کر رہا ہے۔'' نیاز محمد نے آنکھیں بند کیے کیے بتایا۔

''اور وہ کالا کتا۔'' اکبر نے پوچھا۔ ''وہ کدھر گیا؟''

''وہ درخت کے نیچے بیٹھا ہے اس کے آنے کا منتظر ہے۔'' نیاز محمد نے بتایا۔

''ہاں کیا آپ کو نیلم بھی دکھائی دے رہی ہے؟''

''ہاں میں اسے دیکھ رہا ہوں، وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی ہے۔''

''بابا اسے کمرے سے باہر بلائیں۔''

''نیلم کو کمرے سے باہر بلانا کوئی مشکل کام نہیں لیکن ابھی میں چاہتا نہیں ہوں۔''

''کیوں بابا۔'' اکبر نے بے قراری سے پوچھا۔

''ابھی اسے باہر بلایا تو نقصان کا احتمال ہے۔ میں جلد بازی میں کام خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تم ذرا آرام سے بیٹھو اور دیکھتے جاؤ کہ کیا ہوتا ہے؟'' نیاز محمد نے اسے سمجھایا۔

''بابا کیا میں کوئی اچھی اُمید رکھوں۔''

''ہاں، کیوں نہیں، اچھی اُمید نہ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟''

''یہ جن ابھی تک کسی کے قابو میں آیا نہیں ہے۔''

''اب آجائے گا'' نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا۔ ''اول تو میں اسے کیلئے بہت ہوں۔ اگر مجھ سے کہیں چوک ہوگئی تو پھر پیر صاحب سے مدد لی جائے گی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ املی والے بابا۔''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' نیاز محمد نے کہا۔ ''اچھا اب خاموش ہو جاؤ اس خبیث نے درخت سے مکان کی چھت پر چھلانگ لگائی ہے۔ وہ چند لمحوں میں سامنے ظاہر ہونے والا ہے۔''

''اور وہ کتا۔''

''اسے میں نے غائب کر دیا ہے، اس کا کام ختم ہوا؟''

''اب کیا ہوگا؟''

''اب جو کچھ ہوگا وہ تمہارے سامنے آجائے گا لیکن ایک بات میں تمہیں ضرور بتانا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''ہمیں اب بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔ یوں سمجھو کہ اب ہم پل صراط پر کھڑے ہیں، ہماری ذرا سی بھی بھول ہمیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

''کیا وہ خبیث اب مجھ پر حملہ کرے گا۔'' اکبر نے گھبرا کر پوچھا۔

''اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تم پر حملہ کرے۔ میں جب تک تمہارے ساتھ ہوں اور بابا کی نشانی تمہارے بازو پر بندھی ہے۔ یہ سیّد پور کا جن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی نے باہر کے گیٹ پر کھٹکا کیا۔

''یہ اس وقت گیٹ پر کون آگیا؟''

نیاز محمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔

پھر وہ گیٹ جو اندر سے بند تھا خود بخود کھلا اور گیٹ کے اندر کوئی داخل ہوا۔ اکبر انہیں دیکھ کر بے قرار ہوگیا۔ اس نے خوشی سے اُٹھ کر بھاگنا چاہا۔ ''ارے ماموں آپ۔''

نیاز محمد نے فوراً اکبر کا ہاتھ پکڑ لیا اور غصے سے بولا۔ ''کیا کرتا ہے؟''

''وہ ماموں فرقان آئے ہیں۔''

''بے وقوف ابھی تجھے سمجھایا تھا کہ بہت ہوشیار رہنا ہوگا لیکن تو فوراً ہی بھول گیا۔ یہ ماموں واموں کوئی نہیں ہیں، یہ وہی خبیث ہے، سیّد پور کا جن۔ یہ لوگ شکل بدلنے کے ماہر ہوتے ہیں ایک لمحے میں جو رُوپ چاہیں اختیار کر لیں۔''

''اوہ یہ وہ ہے، معاف کرنا بابا غلطی ہوگئی۔''

ادھر ماموں فرقان جس طرح آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔ گیٹ پھر سے بند ہوگیا اور اس کالے بلے نے گیٹ کے اوپر ظاہر ہو کر زمین پر چھلانگ لگائی۔

پھر وہ دوڑتا ہوا لان میں داخل ہوا اور نو فٹ کے فاصلے پر نیاز محمد کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ پھر وہ اپنی پچھلی ٹانگوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔

''نیاز محمد تو کیا چاہتا ہے؟'' سیّد پور کے جن کی آواز نیاز محمد کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میں جو چاہتا ہوں اُسے میں پورا کر کے رہوں گا تو بول تو کیا چاہتا ہے۔''

''میں یہ چاہتا ہوں نیاز محمد تو یہاں سے چلا جائے۔''

''ہاں، میں چلا جاؤں گا، میں یہاں رہنے نہیں آیا لیکن میں تجھ سے اس گھر کو پاک کر کے جاؤں گا۔ تیرے سر سے عشق کا بھوت اتار کر جاؤں گا۔ اس معصوم بچی کی جان چھڑا کر جاؤں گا۔''

''تو بہت بھولا ہے۔'' سیّد پور کا جن طنزیہ ہنسی ہنسا۔

''میں بہت بھولا سہی لیکن تُو تو سیانا ہے تو تھک ہار کر کیوں بیٹھ گیا۔ مجھ پر حملہ کیوں نہیں کرتا۔'' نیاز محمد نے کالے بلے کی طرف دیکھ کر کہا۔

اکبر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اسے نیاز محمد کی آواز تو سنائی دے رہی تھی لیکن وہ کس سے بات کر رہا تھا، کس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سیّد پور کا جن نیاز محمد کے دماغ میں بول رہا تھا جبکہ نیاز محمد اپنی زبان سے اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ اکبر نے درمیان میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموشی سے نیاز محمد کی بات سنتا رہا۔

''میں حملہ ضرور کروں گا، تجھے چھوڑوں گا تھوڑے ہی۔'' جن کی آواز نیاز محمد کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہاں، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تیری کوئی حسرت دل میں نہ رہے۔ اسی لئے میں یہاں آکر بیٹھا ہوں۔ تو اپنی طاقت آزما لے پھر میری طاقت دیکھ۔ تجھے معلوم نہیں کہ میں انسان ہوں، اللہ نے ہمیں سب سے اشرف بنایا ہے۔ ہمارے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا۔'' نیاز محمد نے بڑے فخر سے کہا۔

''نیاز محمد تو چراغ کی بات کرتا ہے، میں نے اس گھر میں ایک شمع روشن کر دی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نیاز محمد نے جواب دیا۔

''تو جانتا ہے تو اسے بجھا کر دکھا۔'' سیّد پور کے جن نے چیلنج کیا۔

''میں اسے بجھاؤں گا نہیں ویسے میں اسے بجھانے کی طاقت رکھتا ہوں لیکن میں بجھاؤں گا نہیں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' نیاز محمد نے کہا۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے بابا کے پاس، اپنے پیر کے پاس۔'' نیاز محمد نے جواب دیا۔

''کیوں۔'' اس نے پوچھا۔

''ان کا یہی حکم ہے۔'' نیاز محمد نے کہا۔

''اچھا، نیاز محمد اگر مجھے بھگانے کیلئے تجھے اپنی طاقت کا مظاہرہ نہ کرنا پڑے۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں تو......؟''

''پھر میں تجھے معاف کر دوں گا، تجھے سزا سے بچالوں گا۔'' نیاز محمد نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں نیلم کو آزاد کر دیتا ہوں، تم اسے لے جاؤ۔''

پھر اچانک یہ کالا بلا اُٹھا اور تیزی سے گھر کے اندر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد نیلم دروازے سے برآمد ہوئی اور اس نے بے قراری سے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

''اکبر۔''

''بابا نیلم آ گئی...... بابا نیلم آ گئی۔'' اکبر خوشی سے جھوم اُٹھا۔ ''میری نیلم آ گئی۔''

نیلم کو دیکھ کر بے قرار ہو کر اُٹھنا، فطری بات تھی۔

وہ اس کی بیوی تھی جسے سیّد پور کے جن نے اسے شجرِ ممنوع بنا دیا تھا۔ اب وہی شجرِ ممنوع لہکتا مہکتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نیلم کو کالے بلے نے اپنے پنجے سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ سامنے اپنی دونوں بانہیں پھیلائے کھڑی تھی اور اکبر، اکبر پکار رہی تھی۔

''اکبر آؤ، اکبر آؤ۔''

تب اکبر سے نہیں رہا گیا تھا، وہ بے قابو ہو کر نیاز محمد کی پیٹھ کے پیچھے سے بھاگ اُٹھا۔

''میں آ رہا ہوں، نیلم۔''

اور یہ سب اتنی جلدی، اتنی آناً فاناً ہوا کہ نیاز محمد دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اکبر کو پکڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بھی بڑھایا لیکن وہ اس کی پہنچ سے دُور ہو چکا تھا پھر نیاز محمد بھی اس کے پیچھے بھاگا کیوں کہ اسے سیّد پور کے جن کا کھیل سمجھ میں آ گیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اکبر اس کے فریب میں آ جائے۔

نیلم، اکبر کو اپنے قریب آتا دیکھ کر فوراً پلٹ گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

نیلم کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر اکبر چیخا۔ ''نیلم ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔''

''اکبر ٹھہرو۔'' پیچھے سے نیاز محمد نے آواز دی اور چند قدم آگے جا کر اس نے اکبر کی قمیض پیچھے سے پکڑ لی۔

''چھوڑ دیں بابا مجھے، وہ نیلم واپس چلی جائے گی۔'' اکبر نے بڑی بے قراری سے کہا۔

''بے وقوف۔'' نیاز محمد نے غصے سے کہا۔ ''وہ نیلم نہیں ہے۔''

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، سیّد پور کے جن کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔

اس نے نیاز محمد کو حصار سے نکال لیا تھا، اس کا حصار توڑ دیا تھا۔ اس کی توجہ تقسیم کر دی تھی۔ خیر یہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اکبر کی جان بچ گئی۔

اگر وہ جوشِ محبت میں، نیلم کے پیچھے خالی گھر میں داخل ہو جاتا تو وہ سیّد پور کے جن کے زیرِ اثر آ جاتا۔ وہ اس طرح کی چالیں چلتا کہ اکبر خود بخود اپنے بازو سے اس سکے کو اتار کر پھینک دیتا۔ سکہ پھینکتے ہی اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا، وہ اسے زندگی بھر یاد رہتا۔

نیاز محمد نے اسے اپنی جان پر کھیل کر بچا لیا۔ حصار ٹوٹ چکا تھا۔ ارتکاز باقی نہ رہا تھا۔ اب نیاز محمد اس سپاہی کی طرح ہو گیا تھا جس کا اسلحہ ناکارہ ہو گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ دشمن اسے کچھ نقصان پہنچاتا اس نے مورچے سے فوراً بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔

نیلم دروازے میں داخل ہو کر، دروازہ بند کر چکی تھی۔

''اکبر، اب یہاں سے نکل چلو، اسی میں ہماری عافیت ہے۔'' نیاز محمد نے اکبر کی کلائی تھام کر اپنی طرف کھینچی۔

''بابا، اب کچھ بھی ہو، میں نیلم کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' اکبر نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔

''بے وقوف، نہ بن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں۔''

''لیکن، بابا آپ نے کہا تھا......''

''بے وقوف جب دو دشمن ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں تو کسی ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ ویسے ابھی ہم ہارے نہیں ہیں۔ بس تمہاری حماقت نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ میں دفاعی حالت میں آ گیا ہوں۔ میں اپنا دفاع تو کر سکتا ہوں لیکن حملہ نہیں کر سکتا۔ یہ سیّد پور کا جن بہت چالاک ہے۔ اس سے کسی دن میں اکیلا نمٹوں گا۔ آؤ، یہاں سے نکل چلیں۔''

یہ کہہ کر نیاز محمد نے اکبر کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف لے چلا۔

تب ہی پیچھے سے آواز آئی۔ ''بس نیاز محمد بھاگ لئے۔''

''ان آوازوں پر کان مت دھرو، بس یہاں سے جلدی نکلو۔'' نیاز محمد نے اکبر سے کہا۔

''ارے نیاز محمد، تم تو ہمیں اس گھر سے نکالنے آئے تھے۔'' یہ کہہ کر سیّد پور کے جن نے قہقہہ لگایا۔

''اب خود ہی یہاں سے بھاگے جا رہے ہو، میں نے ٹھیک ہی کہا تھا نا کہ تم کتنے بھولے ہو۔''

وہ سیّد پور کا جن خوشی سے سرشار اور جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن ان دونوں نے پیچھے آتی اس آواز پر کان نہیں دھرے، وہ بہرے ہو گئے۔

پھران دونوں نے جلدی سے گیٹ بند کیا، کنڈا بند کیا، کنڈے میں لٹکے تالے کو نیاز محمد نے اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تو وہ فوراً بند ہو گیا۔

''آجاؤ'' نیاز محمد نے اکبر کا پھر ہاتھ پکڑ لیا اور وہ سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔

اکبر کی عجیب حالت تھی۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وہ جیتتے جیتتے ہار گیا تھا، اتنی دیر میں جانے اس نے کتنے خواب دیکھ لئے تھے۔

نیلم کی ایک جھلک نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ نیاز محمد سے اپنا ہاتھ چھڑا کے دندناتا ہوا، خالی گھر میں داخل ہو جائے پھر جو ہو سو ہو۔

''تُو جو سوچ رہا ہے، غلط سوچ رہا ہے۔ جس کی جھلک دیکھ کر تُو ایک دَم دیوانہ ہو گیا تھا وہ نیلم نہیں تھی، وہ سیّد پور کا جن تھا۔ اس نے تیری سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھالیا، خیر دیکھا جائے گا۔ میں پھر آؤں گا تو ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا جا۔''

سامنے سے آتی ہوئی خالی ٹیکسی کو نیاز محمد نے ہاتھ دے کر روکا۔ اکبر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو نیاز محمد نے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''سیّدھے گھر جانا اور کسی احمقانہ خیال کو دل میں مت لانا۔ اگر تم خالی گھر میں داخل ہوئے تو وہ تمہیں شدید نقصان پہنچا دے گا۔ وہ بہت کمینہ ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا، میں اِدھر نہیں جاؤں گا لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں، آپ ٹیکسی میں آجائیں نا، گھر چلیں، کھانا وانا کھا کر چلے جایئے گا۔'' اکبر نے بڑے خلوص سے کہا۔

''نہیں، تُو کھانے کی فکر نہ کر، ہم دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔'' نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔

''پھر میں آپ کو، آپ کی مطلوبہ جگہ پر چھوڑ دوں گا، آپ ٹیکسی میں آجائیں۔'' اکبر بولا۔

''نہیں، ہم خود چلے جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔''

''اچھا، بابا جیسی آپ کی مرضی۔''

اب نیاز محمد سے بحث فضول تھی۔ اکبر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ نیاز محمد اس کے ساتھ گھر جانا چاہتا ہے اور نہ ہی چاہتا ہے کہ وہ اسے ٹیکسی میں اس کی مطلوبہ جگہ چھوڑ دے۔ نیاز محمد بس یہیں سے اس سے جدا ہو جانا چاہتا تھا۔

اکبر کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر افسوس تھا لیکن اس سے جو کچھ سرزد ہوا، اس پر اسے اختیار نہ تھا۔ وہ بے اختیار ہو گیا تھا۔ اکبر کو احساس تھا کہ اس کے جذباتی پن نے جیتی جتائی بازی اُلٹ دی تھی۔ یوں بظاہر نیاز محمد نے کسی شدید غصے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ نیاز محمد اس کی حرکت کی وجہ سے ناراض ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں، اب وہ دوبارہ لوٹ کر بھی آئے گا یا نہیں۔

یہ سوچ کر اکبر فوراً ٹیکسی سے اُتر آیا اور نیاز محمد کا ہاتھ بڑی عقیدت سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''بابا، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔''

''ارے، نہیں بچہ ایسا تُو نے کیوں سوچا۔''

''پھر آپ لوٹ کر آئیں گے نا، مجھے اس عذاب سے نجات دلانے۔''

''تُو فکر نہ کر بچہ جو کچھ ہو گا، تیرے حق میں بہتر ہی ہو گا۔'' نیاز محمد نے یہ کہہ کر انگشت شہادت اس کی پیشانی پر رکھی اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا ایک طرف چلا گیا۔

اکبر چند لمحے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ مزید کھڑے رہنا فضول تھا۔ اِدھر ٹیکسی والا بھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیکسی میں آبیٹھا اور ٹیکسی والے سے بولا۔ ''چلو۔''

گھر پہنچ کر جب وہ ٹیکسی سے اُترا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے سارے نشے ہرن ہو گئے تھے۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے، کرچی کرچی ہو گئے تھے وہ اندر سے جیسے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اور یہ سب اس کی ذرا سی غفلت سے ہوا تھا۔

اب وہ راشدہ کو کیا جواب دے گا جو نیلم کی رہائش کی خبر سننے کی منتظر تھی۔ اس نے بھی جانے کیا کیا خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ وہ ارمان جو دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئے تھے اور جن کے پورے ہونے کی کچھ آس بندھی تھی، وہ ایک مرتبہ پھر خزاں ہو گئے تھے۔

یہ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جاتا تھا۔ اس کے دل میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ بس اچانک ہی اس پر شدید ڈیپریشن کا دَورہ پڑا تھا۔

اس نے ٹیکسی سے اُتر کر دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

گھر کے اندر ''ڈنگ ڈونگ'' کی آواز گونجی تو گھر کے ہر فرد کے چہرے پر خوشی بکھر گئی۔ اکبر ایک مخصوص انداز میں گھنٹی بجاتا تھا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ اکبر دروازے پر ہے۔

سب سے پہلے راشدہ بھاگی۔ ''امی، اکبر بھائی آگئے۔''

''ہاں، جا دروازہ کھول۔'' صابرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

بابر علی بھی گھر پر ہی تھا وہ آج شوروم نہیں گیا تھا۔ وہ اکبر کا انتظار کر رہا تھا اس کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ وہ فوراً گیٹ کھولنے کیلئے اُٹھا لیکن گیٹ کی طرف بھاگتی ہوئی راشدہ نے روک دیا۔

''ابو، میں جا رہی ہوں، گیٹ کھولنے۔''

''اچھا بھئی جاؤ، تم ہی گیٹ کھولو۔'' بابر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، اکبر کیا خبر لایا ہے۔'' صابرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، کیسی خبر لایا ہوگا۔''

''میں ماں ہوں، میں تو اچھی ہی خبر کی توقع رکھوں گی۔''

''میں باپ ہوں، میں کیا بری خبر کی توقع رکھوں گا؟'' بابر علی نے ہنس کر کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں، میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔''

راشدہ گھنٹی کی آواز سن کر فوراً ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ لیکن گیٹ تک پہنچتے پہنچتے کچھ وقت لگ گیا تھا۔ اکبر کی حالت اس وقت کچھ ایسی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ فوراً گیٹ کھل جائے، بے قرار ہو کر اس نے دوبارہ گھنٹی بجا دی۔

راشدہ گیٹ تک پہنچ چکی تھی اس نے دوبارہ گھنٹی کی آواز سنی تو گیٹ کے اس طرف سے بولی۔

''اکبر بھائی، کھول رہی ہوں دروازہ۔ اس قدر بے قرار نہ ہوں۔''

اکبر نے اِدھر سے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

راشدہ نے جلدی سے گیٹ کھولا، وہ اکبر کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اکبر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں چمک نہ تھی، وہ بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا اکبر بھائی؟'' راشدہ گیٹ بند کر کے پلٹی، اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اکبر نے بڑی مایوسی اور اداسی سے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں راشدہ۔''

اکبر کے حلق میں جیسے کوئی چیز پھنسنے لگی۔ اس کا گلا رندھنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنے چھلکتے آنسوؤں پر کنٹرول حاصل کیا۔

لیکن جب وہ اپنی ماں کے سامنے پہنچا اور ماں نے اپنے بیٹے کی اُڑی ہوئی رنگت دیکھ کر بے قراری سے کہا۔ ''ہائے، میرے بیٹے کو کیا ہوا؟''

تو بیٹے کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ اپنی ماں سے بے اختیار لپٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ صابرہ نے اس کا سر اپنے کاندھے سے اُٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے بولی۔ ''روتا کیوں ہے، اکبر، حوصلے سے کام لے۔ جو قسمت میں لکھا ہے، اسے ہر قیمت پر بھگتنا پڑے گا۔''

''آخر ہوا کیا، کچھ پتہ تو چلے۔'' بابر علی نے پوچھا۔

''جو ہوا ہے، وہ اس کے آنسوؤں سے ظاہر ہے۔'' صابرہ نے بابر علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''پوچھ لینا۔ فی الحال اسے آرام کرنے دو۔ اری راشدہ جا بھائی کیلئے چائے بنا کر لا، اس میں تھوڑا گلوکوز ڈال دینا'' صابرہ نے راشدہ کو ہدایت کی۔

''جی، اچھا امی، میں ابھی لائی۔'' راشدہ فوراً کچن کی طرف لپکی۔

صابرہ، اکبر کو بیڈ روم میں لے گئی۔ اس نے اسے آرام سے بیڈ پر لٹا دیا۔ اکبر بیڈ پر لیٹ کر خاموشی سے چھت کو گھورنے لگا۔

☆......☆......☆

خالی گھر سے ناکام ہو کر جب املی والے بابا کا سپاہی نیاز محمد، املی والے بابا کے سامنے پہنچا، تو املی الا بابا، اسے اپنی بڑی بڑی اور سرخ آنکھوں سے چند لمحے گھورتا رہا۔ پھر ایک دَم غصے میں بولا۔

''تجھے ہم نے اس لئے بھیجا تھا کہ تُو وہاں سے ناکام ہو کر لوٹے۔''

''بس جی غلطی ہوگئی۔'' نیاز محمد گردن جھکا کر بولا۔ ''ویسے میں نے بازی جیت لی تھی......''

''بازی جیت کر آیا ہوتا تو اس وقت تیری گردن جھکی نہ ہوتی۔'' املی والے بابا نے اس کی بات کاٹی۔

''بس جی، وہ لڑکا اس کے فریب میں آگیا اور حصار سے نکل بھاگا۔''

''اس میں لڑکے کا کوئی قصور نہیں، تم اس لڑکے کی جگہ ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔ میں پوچھتا وں، اس لڑکے کو اپنے ساتھ اندر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' املی والے بابا نے دریافت کیا۔

''بس جی، یہی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اکیلا اندر جانا چاہئے تھا۔'' نیاز محمد نے سر جھکا کر جواب یا۔ ''ویسے میرا خیال تھا کہ لڑکا سمجھدار ہے۔ خاموشی سے میرے پیچھے بیٹھا تماشا دیکھتا رہے گا۔''

''دیکھ لیا نا تماشا۔'' املی والے بابا نے غصے سے کہا۔ ''وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔''

''اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔'' نیاز محمد نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیسا مذاق اُڑاتا ہوگا، ہم انسانوں کا۔ نیاز محمد تُو نے تو ہماری لٹیاں ڈبو دی۔ آخر تُو نے اس پر تبار کیوں کر لیا۔'' املی والے بابا نے غصے اور تاسف سے کہا۔

''میں سمجھا وہ واقعی تائب ہوگیا ہے۔ اس نے سزا سے بچنے کیلئے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میں نے چا اگر خون خرابے کے بغیر معاملہ نمٹ رہا ہے تو میں کیوں خواہ مخواہ اسے سزا دوں۔ ہمارا مقصد تو کی کو اس کے پنجے سے آزاد کرانا تھا۔'' نیاز محمد نے دلیل دی۔

''تو پھر کروالی لڑکی آزاد۔'' املی والے بابا نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

''بس جی چوک ہوگئی۔ مجھے معاف کر دیں۔'' نیاز محمد نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ تُو نے انسانوں کی توہین کی ہے۔ ہم نے تجھے اپنا سپاہی بنا کر پا تھا لیکن تُو نے حماقت کا ثبوت دیا۔ تجھے اس حماقت کی سزا ملے گی۔ ہم تجھ سے تیری پیٹی چھین گے، تجھے لائن حاضر کر دیا جائے گا، تجھ سے تیری بصارت چھین لی جائے گی۔ اب تُو دیواروں آر پار نہیں دیکھ سکے گا۔'' املی والے بابا نے آگ برساتے لہجے میں کہا۔

''نہیں بابا مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں، مجھ سے میری طاقت نہ چھینیں۔'' نیاز محمد لرز اُٹھا۔

''جو طاقت دے سکتا ہے، وہ طاقت چھیننے کا بھی حق رکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر املی والے بابا نے وہ پتھ چھوڑ دیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔

یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوگی۔ جو فیصلہ کر دیا گیا ہے اسے ہ صورت میں ماننا ہوگا، قبول کرنا ہوگا۔

نیاز محمد نے بالآخر املی والے بابا کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ پیر کے سامنے کس نے سر اُٹھایا ہے

☆......☆......☆

اکبر کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے کسی صورت قرار نہ تھا۔ اس کا دل کسی فیصلے کو ماننے کیلئے تیار نہ تھا بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سیدھا اُٹھ کر خالی گھر جائے اور سیّد پور کے جن کی دھجیاں بکھیر دے۔

لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ ایک تو نیاز محمد جاتے جاتے تنبیہہ کر گیا تھا۔ دوسرے وہ یہ بات اچھ طرح جانتا تھا کہ جن کے آگے اس کی حیثیت ایک تنکے سے زیادہ نہیں۔

اس نے اپنے گھر والوں کو خالی گھر میں جو کچھ ہوا تھا، بتا دیا تھا۔ جیتی جتائی بازی ہارنے کا سب ا دکھ تھا۔ راشدہ کچھ زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔

''بھائی اکبر، آپ تھوڑا صبر نہیں کر سکتے تھے اگر تھوڑا صبر کر لیتے تو اس وقت نیلم بھابھی ہمار درمیان بیٹھی ہوتیں۔'' راشدہ نے کہا۔

''بس، راشدہ کیا بتاؤں، اس وقت میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔'' اکبر بڑے افسوس سے بولا

''ویسے، بیٹا ہوا برا...... ایک بہت اچھا موقع ہاتھ آیا تھا، اس سے نجات کا۔''

''امی، اب میں کیا کروں، کیا املی والے بابا کے پاس پھر جاؤں۔''

''وہاں جانے سے پہلے ماموں فرقان سے مل آؤ۔ انہیں سارے حالات بتاؤ، ان سے مشو طلب کرو۔''

شام کو اکبر جب ماموں فرقان کے گھر پہنچا تو وہ اسے گھر پر نہیں ملے۔ وہ ابھی دکان سے نہیں آ تھے۔ اس نے سوچا کہ گھر پر انتظار کرنے کے بجائے دکان کا رخ کرے، لیکن گھر سے فوراً ہی نکل جا مناسب نہ تھا۔ وہ کچھ دیر شمسہ اور ممانی ریحانہ سے گپ شپ کرتا رہا۔ شمسہ اُٹھ کر کچن میں چا بنانے لگی تو اکبر نے اسے روک دیا۔

''نہیں پھوپھی جان شکریہ، میں چائے نہیں پیوں گا۔''

''کیوں بھتیجے، ایسی کیا ناراضگی ہے۔'' شمسہ نے بڑے پن سے کہا۔ ''چائے نہیں پیتے تو کو ڈرنک منگوا دوں۔''

''ایسی سردی میں کولڈ ڈرنک پلوائے گی تُو اکبر کو۔'' ممانی ریحانہ نے مداخلت کی۔

''چلئے، پھر کافی بنا دیتی ہوں۔'' شمسہ نے ہنس کر کہا۔

''نہیں بھئی شکریہ، میں اب چل رہا ہوں۔'' اکبر نے جانے کیلئے پَر تولے۔

''دیکھا امی، ابو گھر پر نہیں ہیں تو ان سے بیٹھا نہیں جا رہا۔ یہ یہاں ابو سے ملنے آتے ہیں ہم سے ں۔'' شمسہ نے طنز کیا۔

''ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اکبر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''تو پھر بیٹھ جائیں اور آج کھانا کھائے بغیر نہ جائیں۔'' شمسہ نے ہنس کر کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔''

''دیکھا امی، انہوں نے ٹھیک بھی کیسے مرے ہوئے لہجے میں کہا ہے۔'' شمسہ بولی۔

''اری لڑکی تُو تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔'' ممانی ریحانہ نے اسے ڈانٹا۔

''شکر کریں امی، ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑتی ہوں، گندے ہاتھوں سے نہیں۔''

''توبہ ہے۔'' ممانی ریحانہ نے کہا۔

''ممانی جان، اس کی بڑی زبان چلنے لگی ہے۔'' اکبر نے شمسہ کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے، اے ذرا تمیز سے، میں پھوپھی ہوں آپ کی اس نہیں ہوں۔'' شمسہ بگڑ کر بولی۔

''اچھا، محترمہ پھوپھی جان صاحبہ اچھا۔''

''اور یہ آپ کی ممانی نہیں، دادی ہیں۔'' شمسہ نے اپنی ماں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جانتا ہوں۔'' اکبر بولا۔

''تو پھر مانتے کیوں نہیں ہو۔'' شمسہ نے کہا۔

''مانتا ہوں۔'' اکبر بولا۔

''تو پھر کہتے کیوں نہیں ہو۔'' شمسہ نے کہا۔

''ممانی جان، اسے کیا ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے دماغ کو سردی لگ گئی ہے۔'' اکبر ہنسا۔

''شمسہ زیادہ بکواس نہ کر، جا کر کافی بنا۔'' ممانی ریحانہ نے اسے ڈانٹا۔

''نہیں ممانی جان، کافی نہیں چاہئے۔'' اکبر نے کہا۔

تب شمسہ ہنسی اور اکبر کو انگوٹھا دکھاتی باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس تھوڑی سی نوک جھونک سے اکبر کو بڑا فائدہ ہوا۔ دوپہر سے اس پر جو ڈیپریشن کی کیفیت طاری ں اس میں افاقہ ہوا، اس کا ذہن کھلا، کچھ اُداسی کم ہوگئی۔

تب اکبر نے دکان پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ممانی ریحانہ سے پوچھا۔ ''ماموں کب تک ئیں گے؟''

''بس آنے ہی والے ہوں گے۔'' ممانی ریحانہ نے کہا۔ ''کیوں خیر تو ہے کوئی خاص بات ہے۔''

''ہاں، ممانی جان خاص بات ہے، ان سے ذرا مشورہ کرنا تھا۔''

''مشورہ۔'' ممانی ریحانہ نے کہا۔ ''وہ کس سلسلے میں۔''

''ممانی جان، وہ جو جن ہے نا سیّد پور کا، اس نے ایک مرتبہ ماموں کو چوٹ دی تھی۔ ان کے سارے کئے کرائے پر چند سیکنڈوں میں پانی پھیر دیا تھا، ان کا وظیفہ مکمل نہ ہو سکا تھا۔ وہ محلے کے ایک لڑکے رضوان کی شکل میں آکر انہیں غلیظ پانی سے وضو کروا گیا تھا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا، آج بھی اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک دی۔'' اکبر نے کہا۔

اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی اکبر خود اُٹھ کر دروازے پر گیا۔ دروازے پر اس کے خیال کے مطابق ماموں فرقان ہی تھے۔

''اوہو، اکبر صاحب آئے ہیں۔'' ماموں فرقان اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

''جی ماموں۔'' اکبر نے اُداس لہجے میں کہا۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر اس پر جانے کیوں اُداسی چھا گئی۔

ماموں فرقان نے ایک گہری نظر اکبر پر ڈالی اور اندازہ کر لیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ اس کمینے نے پھر کوئی نقصان پہنچایا ہے۔

ماموں فرقان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر لے آئے۔ اسے محبت سے بٹھایا اور بولے۔ ''اکبر کب آئے؟''

''بس ماموں تھوڑی دیر ہوئی ہے۔''

''ابو، یہ تو جا رہے تھے، انہیں بڑی مشکل سے روکا ہے۔'' شمسہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''اب تم لوگ اسے سوکھی چائے پر ٹرخاتے ہو، تو وہ جائے نہیں تو اور کیا کرے۔'' ماموں فرقان نے کھانے پینے کی اشیا سے بھری ٹرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابو، یہ سوکھی چائے ہے۔'' شمسہ چہک کر بولی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر مختلف کھانے کی چیزیں اکبر کے سامنے پھیلائیں۔

''اب دیکھیں نا، میرا ارادہ تھا کہ میں کھانا کھا کر جاؤں لیکن یہ چائے کے ساتھ اتنی چیزیں اُٹھا لائی ہے کہ میں انہیں کھا کر کھانے سے دستبردار ہو جاؤں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کھانا نہ کھلانے کا شریفانہ طریقہ ہے۔'' اکبر نے ہنس کر کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر میں یہ ساری چیزیں واپس لے جاتی ہوں، آپ صرف سوکھی چائے پئیں۔'' یہ کر شمسہ بڑی بے تکلفی سے ساری پلیٹیں ٹرے میں دوبارہ رکھنے لگی۔

''اے شمسہ، کیا کر رہی ہو؟'' ماموں فرقان نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

تب وہ ہنستی ہوئی، ساری پلیٹیں میز پر پھیلا کر چلی گئی۔

''لو بھئی، اکبر کچھ کھاؤ پیو۔'' ماموں فرقان نے بسکٹ کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''جی، ماموں۔'' اکبر نے ایک بسکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ماموں اس کتاب کا کیا بنا۔ وہ ملی نا پھر؟''

''وہ مل گئی تھی؟'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''مل گئی تھی سے کیا مراد ہے، کیا پھر گم ہو گئی۔'' اکبر نے پوچھا۔

''گم تو نہیں ہوئی لیکن ملنا نہ ملنا اس کا برابر ہی ہے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' اکبر کی سمجھ میں بات نہ آئی۔

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اس کتاب کو ہم نے کتنا ڈھونڈا تھا لیکن وہ کہیں نہیں ملی تھی۔ اس کی میں پورا گھر چھان مارا تھا، آخر میں الماری بھی دیکھ لی تھی۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''پھر کہاں سے ملی؟'' اکبر نے بے تابی سے پوچھا۔

''اسی الماری سے۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''لیکن وہ الماری تو ہم لوگوں نے بہت اچھی طرح دیکھ لی تھی، ایک ایک کتاب نکال کر تلاش کیا'' اکبر نے حیرت سے کہا۔

''اس وقت نظر نہیں آئی، پھر دوسرے یا تیسرے دن میں نے الماری کھولی تو وہ اوپر ہی رکھی تھی ی نے بعد میں رکھ دی ہو۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''حیرت ہے۔'' اکبر واقعی حیرت زدہ تھا۔

''اس سے زیادہ حیرت کی بات ایک اور ہے۔'' ماموں فرقان بولے۔

''وہ کیا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''اس کتاب میں سے کچھ صفحات غائب ہیں۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''ارے نہیں۔'' اکبر نے حیرت سے کہا۔

''اور یہ صفحات وہی ہیں جن میں جنات سے متعلق کچھ عملیات درج تھے۔''

''ماموں یہ کیسے ہوا؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''یا تو یہ ہوا ہے کہ میں نے خود وہ صفحات نکال کر

کہیں اور حفاظت سے رکھ دیئے ہیں یا پھر ان صفحات کو کسی نے نکال لیا ہے۔''

''دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور یہ سیّد پور کے جن کے علاوہ کسی کی حرکت نہیں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' ماموں فرقان نے لاپروائی سے کہا۔

''ماموں، آج میری ذرا سی غلطی سے وہ بچ گیا، ورنہ اُڑ گیا تھا۔'' اکبر نے بتایا۔

''وہ کیسے؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں، ساری بات تفصیل سے، سنیں گے تو آپ کو بھی دُکھ ہوگا۔''

''آخر ہوا کیا؟'' ماموں فرقان بولے۔

تب اکبر نے املی والے بابا سے ملاقات سے لے کر نیاز محمد کے خالی گھر میں داخل ہونے اور ان سے مقابلہ اور پھر نیلم کے ظاہر ہونے تک سارے واقعات پوری تفصیل سے سنا دیئے۔

جب اکبر ساری داستان سنا چکا، تو کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ ماموں فرقان نے نظریں اُٹھائیں اور اکبر کی آنکھوں میں دیکھا تو ان کے دل پر چوٹ سی لگی۔

اکبر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''ارے، پروا نہ کر۔'' ماموں فرقان نے بے نیازی سے کہا۔ ''ایک بار وہ مجھے دھوکا دے گیا، ایک بار وہ نیاز محمد کو جل دے گیا۔ آخر وہ کب تک ہم لوگوں کو جل دیتا رہے گا۔ ایک نہ ایک دن پکڑا جائے گا۔''

''ماموں مجھے تو وہ دن کہیں دور تک نہیں دکھائی دے رہا؟'' اکبر نے اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں مایوس نہیں ہوا ہوں۔'' ماموں فرقان بولے۔ ''میں خود املی والے بابا سے جا کر ملاقات کروں گا۔''

''ہاں، ماموں چلیں، املی والے بابا سے ملاقات کرلیں، ہوسکتا ہے، وہ آپ کو کوئی عمل بتا دیں۔''

''وہ آدمی تو کام کے معلوم ہوتے ہیں، ہم وہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر اُٹھیں گے۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں، پھر کب چلیں گے۔'' اکبر نے پوچھا۔

''تم ایسا کرو، کل صبح گاڑی لے کر آجاؤ، ہم صبح ہی صبح یہاں سے نکل چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے ماموں۔'' اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

دوسرے دن وہ گاڑی لے کر صبح ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ ماموں فرقان اور اکبر نے ناشتہ کیا اور دونوں گھر سے نکل گئے۔

ملیر پہنچے۔ اس جنگل کے شروع میں جو ہوٹل تھا، وہ کھلا ہوا تھا، ریکارڈنگ جاری تھی، ہوٹل کے مالک نے اکبر کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا وہ بولا۔ ''اب کیسے آنا ہوا اِدھر۔''

''ہم اندر جا رہے ہیں، یہ میرے دادا ہیں، اُنہیں لے کر جا رہا ہوں۔ میری گاڑی کھڑی ہے، ذرا خیال رکھنا۔'' اکبر نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آپ بے فکر ہو کر اندر جائیں اور پتھر کھا کر واپس آجائیں، گاڑی آپ کو یہیں کھڑی ملے گی۔'' ہوٹل والے نے ہنس کر کہا۔

جنگل میں کار کے داخل ہونے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی لئے گاڑی جنگل کے باہر چھوڑنا پڑی۔ جنگل میں ایک چھوٹی پگڈنڈی تھی جس پر موٹر سائیکل چل سکتی تھی، اکبر کے پاس موٹر سائیکل نہ تھی ورنہ وہ لے آتا۔

موٹر سائیکل وہ طارق سے بھی مانگ سکتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ موٹر سائیکل مانگ کر کیا فائدہ ہوگا کیونکہ موٹر سائیکل املی کے درخت تک نہیں جا سکتی تھی۔ آگے جا کر پتھروں سے بھرا راستہ آجاتا تھا جسے پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا تھا۔ جب پیدل ہی چلنا تھا تو کچھ دور کیلئے موٹر سائیکل پر سفر بے کار تھا۔ یہی سوچ کر اکبر نے اپنی گاڑی لے لی تھی۔

''یہ ہوٹل اچھے لوگوں کا نہیں معلوم ہوتا۔'' ماموں فرقان نے جنگل میں داخل ہو کر کہا۔

''جی ماموں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں پر بڑی عجیب عجیب شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔''

''ہماری گاڑی تو محفوظ رہے گی۔'' ماموں فرقان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''جی ہاں۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں نے اسی لئے ہوٹل کے مالک سے گاڑی کا خیال رکھنے کو کہہ دیا ہے۔ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔''

''وہ ہوٹل والا کہہ رہا تھا کہ بے فکر ہو کر جائیں اور پتھر کھا کر آجائیں۔''

''اصل میں بات یہ ہے کہ املی والے بابا نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ میں کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہ کروں۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ خواہ مخواہ اُنہیں پریشان کریں گے۔ جب میں املی والے بابا سے ملاقات کر کے آیا تو ہوٹل والے نے مجھ سے پوچھا کہ ہو گئی ملاقات۔ میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ ملاقات نہیں ہوئی۔ املی والے بابا نے پتھر مار کر بھگا دیا۔ جب ہم املی والے بابا سے ملنے جا رہے تھے تو ہوٹل والے نے منع کیا تھا، اس نے کہا تھا کہ املی والا بابا کسی سے نہیں ملتا۔ وہ پتھر مار کر بھگا دیتا ہے۔ جب ہم املی والے بابا سے مل کر واپس آئے تو ہم نے بھی یہی بیان دیا۔ اب اس نے دوبارہ جنگل میں جاتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اسی لئے اس نے ہنس کر کہا کہ بے فکر ہو کر جائیں اور پتھر کھا کر واپس آجائیں۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں معلوم کہ میری ملاقات

املی والے بابا سے ہو چکی ہے۔"

"اگر اسے یہ بات معلوم ہو جائے تو......" ماموں فرقان نے بات ادھوری چھوڑی۔

"تو میرے خیال میں یہاں بیٹھنے والا ہر شخص ان کی قدم بوسی کیلئے پہنچ جائے۔ طرح طرح ک خواہشیں کر کے اُنہیں پریشان کرے۔ اسی لئے بابا جی کسی دنیا والے کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔" اکبر نے کہا۔

"لیکن تم اس معاملے میں خاصے خوش قسمت ہو۔"

"ہاں، ماموں واقعی، مجھ پر انہوں نے خاصی مہربانی کی۔"

چلتے چلتے وہ خاصے اندر نکل آئے ابھی تک وہ پگڈنڈی چل رہی تھی۔ جب چلتے ہوئے خاصی د ہوگئی اور ماموں فرقان کو کوئی نہر نہ دکھائی دی تو وہ کچھ پریشان ہو کر بولے۔ "اکبر کیا ہم صحیح راستے جا رہے ہیں؟"

"جی، ماموں راستہ تو یہ ٹھیک ہے، ابھی ہمیں مزید چلنا پڑے گا۔"

"چلنے کی تو خیر کوئی بات نہیں۔" ماموں فرقان نے اعتماد سے کہا۔ "مجھے پیدل چلنے میں مزہ آ ہے، میں میلوں پیدل چل سکتا ہوں۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں ہم غلط سمت میں نہ جا رہے ہوں۔"

"اس کی آپ پروا نہ کریں، میں ایک مرتبہ یہاں پہلے آ چکا ہوں اور جس راستے کو میں ایک با دیکھ لوں، اسے بھولتا نہیں۔"

"بشرطیکہ راستہ سچائی کا ہو" ماموں فرقان نے ہنس کر بات کا رُخ موڑا۔

"راستہ صرف راستہ ہوتا ہے، یہ چلنے والے پر ہے کہ وہ اس پر چل کر سچ کو اختیار کرے یا جھو کے فریب میں مبتلا ہو جائے۔" اکبر نے فلسفہ جھاڑا۔

"ہم دنیا والے جب تک جیتے ہیں فریب میں مبتلا رہتے ہیں۔ مر کر پتہ چلتا ہے کہ ہم کہاں تے ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔"

"ماموں یہ دنیا کیا ہے؟" اکبر نے سوال چھیڑا۔

"یہ دنیا...... بیٹے یہ دنیا ایک خواب ہے، ایک پُر فریب لمحہ۔"

"صرف ایک لمحہ ہے اور وہ بھی پُر فریب ایک خواب جیسا" اکبر بولا۔

"جو زندگی ہم نے گزارنا ہے، اس زندگی کا یہ دنیا ایک لمحہ ہے۔"

"اس ایک لمحے کیلئے ہم کیا کچھ نہیں کرتے۔"

"وہی بات ہے کہ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔ ہزاروں خواہشیں اور ہر خواہش ایسی ا خواہش پر دم نکلے۔ زندگی صرف ایک لمحے کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہماری دنیا صرف ایک لمے

ر خواہشیں سمندر جیسی۔ پھر آدمی کیا کرے۔ وہ ہر طرف ہاتھ مارتا ہے۔ یہ بھی مل جائے وہ بھی مل ئے۔ اکبر اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں ہمیں باندھ کر پھینکا گیا ہے۔ نظر ر دود، ایک حد سے ہم آگے نہیں دیکھ سکتے۔ دماغ محدود، ایک حد سے آگے ہم نہیں سوچ سکتے۔ اعت محدود، ایک حد سے آگے ہم سن نہیں سکتے۔ اسی طرح ہمارا چھونا، چکھنا محدود، دیکھنا محدود، ری طاقت محدود۔ ہمارے چاروں طرف حد بندی ہے۔ ایک حصار کھنچا ہوا ہے، لیکن اکبر یہ ری اصل نہیں ہے۔"

"ہماری اصل کیا ہے۔" اکبر نے پوچھا۔

"ہماری اصل ہمارے جسم سے وابستہ نہیں ہے۔ ہماری روح سے وابستہ ہے۔" ماموں فرقان نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "جب ہم زندگی کے اس پُر فریب لمحے سے نکلتے ہیں تو ہمیں معلوم تا ہے کہ ہم کس جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ کس فریب میں مبتلا تھے۔ جسے ہم زندگی سمجھ کر اپنی جان ں نچھاور کرنے کیلئے تیار تھے۔ اصل میں وہ زندگی تھی ہی نہیں۔ زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ حد ری ٹوٹ گئی ہے۔ حصار ختم ہو گیا ہے، اب کوئی چیز محدود نہیں رہی۔ ہم پھیل کر کائنات بن گئے ں۔ ایک لمحہ پھیل کر اَبد بن گیا ہے۔" ماموں فرقان اپنے جذب میں بولے جا رہے تھے اور اکبر انہیں یکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

"ماموں، آپ بڑی بھاری باتیں کر رہے ہیں۔" بالآخر وہ بولا۔

"ہاں، اس عمر میں یہ باتیں سب ہی کو بھاری لگتی ہیں۔ ابھی تم نو عمر ہو، جب تم میری عمر کو پہنچو گے یہ باتیں تمہاری خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔ بھاری نہیں لگیں گی۔"

"اچھا ماموں یہ بتائیں موت کیا ہے؟" اکبر نے سوال کیا اسے معلوم تھا کہ ماموں فرقان اس ت بولنے کے موڈ میں ہیں۔ منزل ابھی دور تھی۔ جنگل کا راستہ تھا اس نے سوچا ماموں سے گفتگو ری رکھے۔ بہرحال وہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ اگرچہ اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آ رہا تھا لیکن ان باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

"موت بہت خوبصورت چیز ہے۔" ماموں نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوبصورت چیز ہے، ماموں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اکبر نے حیران ہو کر کہا۔

"آدمی مر کر، مرتا نہیں بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ محدود سے لامحدود ہوتا ہے۔" وہ بولے۔

"ماموں مجھے تو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔" اکبر نے کہا۔

"ابھی تم دنیا کے فریب میں مبتلا ہو جب اس سے نکلو گے تو ڈرنا چھوڑ دو گے۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں خاصے اندر نکل آئے تھے۔ اب ہموار راستہ ختم ہو گیا تھا اور پتھروں

سے بھرا راستہ شروع ہوگیا تھا۔

وہ دونوں پتھروں پر چلتے ہوئے بالآخر نہر پر نکل آئے۔ اتفاق کی بات وہ ایسی جگہ نکلے جہاں انہوں نے کچھ پتھروں کو رکھ کر ایک نشانی بنادی تھی۔ یہ نشانی اب بھی جوں کی توں تھی۔

اکبر کے قدموں میں اب تیزی آگئی۔ وہ ماموں فرقان سے مخاطب ہوکر بولا۔ "ماموں، بس اب ہم نزدیک آگئے ہیں، املی کا درخت قریب ہی ہے۔"

کچھ دور چلے تو درمیان میں کھڑا ہوا املی کا بھاری سا درخت نظر آنے لگا۔ درخت کے سامنے پہنچے تو اُنہیں املی والا بابا کہیں نظر نہ آیا۔ پتھر بھی خالی تھا اور درخت کے تنے میں بنا ہوا وہ مگر املی کھوکھا بھی خالی تھا۔

"یہاں تو بابا جی کہیں نظر نہیں آرہے۔" اکبر نے پریشان ہوکر کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ درخت کے پیچھے ہوں۔" ماموں فرقان نے رائے ظاہر کی۔

"میں جا کر دیکھوں۔" اکبر نے کہا۔

"ہاں جاؤ، اگر وہ درخت کے اس طرف ہیں تو مجھے اشارہ کردینا میں آجاؤں گا۔"

اکبر نے جوتے موزے اُتار کر ایک طرف رکھے۔ پینٹ کے پائنچے جہاں تک لپیٹ سکتے تھے لپیٹ لئے اور پانی میں پہلا قدم رکھا۔

ابھی اس نے دوسرا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ آواز آئی۔ "ٹھہر جا۔"

اکبر نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ املی والا بابا اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا تھا اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف آنے سے روک رہا تھا۔

اکبر کا اُٹھا ہوا قدم فوراً جم گیا۔ وہ جیسے پتھر کا ہوگیا۔

"تُو واپس جا، اسے ہمارے پاس بھیج جو تیرے ساتھ آیا ہے۔" املی والے بابا نے حکم دیا۔

یہ حکم سن کر اکبر فوراً پانی سے نکل آیا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہوکر بولا۔ "جائیں، ماموں، بابا جی آپ کو بلا رہے ہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے جوتے موزے اُتارے، شلوار اونچی کی اور پانی میں گھس گئے۔ ٹھنڈے پانی میں سے گزر کر اونچی نیچی سیڑھیوں پر پہنچے پھر چبوترے پر چڑھ گئے۔

اکبر نے دیکھا کہ املی والا بابا پلٹ کر جا چکا تھا۔ اب اس نے پتھر پر بیٹھ کر آسن جمالیا تھا، آنکھیں بند تھیں۔ ماموں فرقان اس کے سامنے دوزانوں ہوکر مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گئے۔

املی والے بابا نے چند سیکنڈ بعد اچانک آنکھیں کھولیں۔ اپنی ان لال انگارہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو گھورا۔ یہ انگارہ آنکھیں دیکھ کر ماموں فرقان کو کالے بلے کی آنکھیں یاد آگئیں۔ جانے کیا

بات تھی کہ بابا کی آنکھیں دیکھ کر جانے کالا بلا کیوں یاد آجاتا تھا۔ اکبر کو بھی املی والے بابا کی لال انگارہ آنکھیں دیکھ کر کالے بلے کی خوفناک آنکھیں یاد آگئی تھیں۔

"کیوں آیا ہے، ہم نے اس لڑکے سے منع کردیا تھا کہ کسی اور کو ہمارا پتہ نہ بتائے مگر یہ نہیں مانا۔ یہ تجھے یہاں لے آیا ہے۔ کل کو تُو کسی اور کو بھیج دے گا اور پھر یہاں سر ہی سر دکھائی دیں گے۔ یہاں قوالیاں شروع ہوجائیں گی۔" املی والے بابا نے ناراضگی سے کہا۔

"نہیں بابا، ایسا نہیں ہوگا، آپ ناراض نہ ہوں۔ میں یہاں اپنی کسی غرض سے نہیں آیا بلکہ اکبر کے سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اجازت ہوتو کچھ عرض کروں۔" ماموں فرقان نے التجا کی۔

"ہاں بول، زیادہ تکلف نہ تول۔" املی والے بابا کی ناراضگی برقرار تھی۔

"آپ کے سپاہی نیاز محمد اور سیّد پور کے جن کا جو مقابلہ ہوا، اس کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا۔" ماموں فرقان نے بات شروع کی۔

"ہاں، آگے چل۔" املی والے بابا نے کہا۔

"سیّد پور کا جن، نیلم کی شکل میں باہر آیا، اکبر اسے دیکھ کر جذبات پر قابو نہ پاسکا اور کھیل بگڑ گیا۔ دراصل سیّد پور کا جن بہت چالاک ہے، وہ اپنے شعبدوں سے ہی انسان کو نہیں مارتا بلکہ نفسیاتی حربے بھی آزماتا ہے۔ میں نے اسے قابو کرنے کیلئے قبرستان میں ایک عمل کیا تھا لیکن اس نے آخری وقت میں چالاکی سے اس عمل کو ناکارہ کردیا اور پھر مجھے نقصان پہنچایا۔ میرے......"

"مختصر بول۔" املی والے بابا نے بات کاٹی۔

"اس مرتبہ بھی اس نے نیاز محمد کی توجہ تقسیم کردی اور اسے حصار چھوڑنے پر مجبور کردیا۔"

"نیاز محمد کی بات نہ کر اپنی بات کر۔"

"بابا جی، میرے پاس عملیات کی ایک نادر کتاب تھی پہلے تو وہ گم ہوئی۔ جب ملی تو اس میں صفحات اُڑے ہوئے تھے۔"

"کتاب کی بات نہ کر، اپنی بات کر۔"

"میں اکبر کیلئے کچھ کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے اس کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا۔"

"اب کیا ہوسکتا ہے جو بے وقوفی ہونا تھی وہ ہوگئی۔" املی والے بابا کا اشارہ نیاز محمد کی طرف تھا۔ "خودنمائی جسم کا کوڑھ ہوتی ہے، ہم نے بھیجا تھا نجات دلانے وہ وہاں اپنے شعبدوں کی نمائش کرانے بیٹھ گیا۔ ہم یہاں دنیا سے چھپ کر بیٹھے ہیں۔ ہم چاہیں تو روز قوالیاں کرواسکتے ہیں، دیگیں پکواسکتے ہیں، لیکن ہم نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ ہم خاموشی سے بیٹھ کر اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ خیر نیاز محمد کو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے۔ آئندہ ایسی حماقت نہ کرے گا۔"

ماموں فرقان میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ املی والے بابا سے پوچھتے کہ نیاز محمد کو کیا سزا ملی اور کیوں ملی۔ ان کی نظر میں غلطی اکبر کی تھی۔ اگر وہ نیلم کو دیکھ کر بے اختیار نہ بھاگتا تو نیاز محمد کی توجہ بٹتی نہ وہ حصار سے نکلتا۔ بہر حال یہ معاملہ بابا اور نیاز محمد کا تھا۔ وہ درمیان میں بولنے والے کون تھے۔ وہ یہاں بابا سے بات کرنے آئے تھے۔ جن سے نجات کا کوئی عمل معلوم کرنے آئے تھے۔

املی والے بابا اپنی بات کہہ کر چپ ہو گیا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی لال انگارہ آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب لکیریں رہ گئی ہیں، انہیں پیٹتے رہو سانپ تو نکل گیا۔“

ماموں فرقان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو انہوں نے سوالیہ مگر التجا آمیز نظروں سے بابا کو دیکھا۔

”میں کہہ رہا ہوں سانپ تو نکل گیا اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ۔“ بابا پھر بولا۔

”بابا جی، میں سمجھا نہیں۔“

”میں نے یہاں کوئی مکتب نہیں کھول رکھا۔ جو میں لوگوں کو سمجھاتا رہوں جا اب تُو جا یہاں سے، تُو نے میرا اخاصا وقت برباد کر دیا۔“

”بابا جی، مجھے کوئی عمل بتا دیں، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔“

”کس چیز کیلئے عمل بتا دوں، پہلے حاضرات کروا کر دیکھ لے۔ تُو تو جانتا ہے حاضرات کرنے والے بندے کو۔“ املی والے بابا نے ماموں فرقان کو غور سے دیکھا۔

ماموں فرقان کو فوراً دادا غفور کا خیال آیا۔ ایک وہی ایسے آدمی تھے جنہیں حاضرات کا عمل آتا اور وہ ان سے واقف بھی تھے۔

”تیرے دماغ میں جو نام آیا ہے ٹھیک آیا ہے تُو وہاں جا۔“ املی والا بابا بولا۔ ”جا وقت برباد نہ کر۔“

اب املی والے بابا سے بحث بیکار تھی۔ ماموں فرقان فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”ٹھیک ہے بابا جی، میں جاتا ہوں، اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“ ماموں فرقان نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

املی والے بابا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جواب میں آنکھیں بند کر لیں۔ ماموں فرقان چند لمحے وہاں رکے۔ شاید جواب میں املی والا بابا کچھ کہے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا آنکھیں بند کئے کئے اس نے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

”خدا حافظ۔“ ماموں فرقان نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف چل دیئے۔

اکبر نہر کے اس پار بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ماموں فرقان کو واپس آتے دیکھ کر وہ ان کی

طرف بڑھا۔ اس نے ماموں فرقان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اندازہ لگانا چاہا کہ ماموں فرقان کچھ لے کر لوٹ رہے ہیں یا تہی دامن واپس آ رہے ہیں۔

ماموں فرقان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

جب وہ پانی سے گزر کر کنارے پر آئے تو اکبر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر انہیں اوپر کھینچ لیا۔ ماموں فرقان نے اپنے پیر جھاڑ کر موزے اور جوتے پہنے۔ انہوں نے مڑ کر املی والے بابا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے اور آسن جمائے بیٹھا تھا۔

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ تھاما اور بولے۔ ”آؤ اکبر واپس چلیں۔“

”کیا ہوا ماموں کیا بات ہوئی۔“ اکبر نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”آگے چل کر بتاتا ہوں، یہاں سے نکل چلو۔“ ماموں فرقان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

پتھروں کی نشانی کو دیکھ کر وہ دونوں جنگل میں داخل ہو گئے۔ پھر پتھریلا راستہ ختم ہوا یہاں سے وہ پگڈنڈی شروع ہو گئی جو سیدھی ہوٹل پر نکلتی تھی۔

ماموں فرقان نے املی والے بابا سے ہونے والی گفتگو من وعن دُہرا دی۔

ساری بات سن کر اکبر نے بڑے تاسف سے کہا۔ ”نیاز بابا، بے چارہ خواہ مخواہ مارا گیا۔“

”ہاں، کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔“ ماموں فرقان نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ ”کھیل تو تمہاری وجہ سے بگڑا تھا۔ خیر ہو گی کوئی بات، بابا نے نیاز محمد کو بلاوجہ سزا نہ دی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس نے ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔“

”املی والے بابا نے ساری باتیں اُلجھا دیں۔ جب میں آیا تھا تو انہوں نے بڑے صاف صاف باتیں کی تھیں۔ مجھے تسلی دی تھی۔ دُکھ بھرے دن ختم ہونے کی نوید سنائی تھی۔ جشن منانے کی باتیں کی تھیں۔“ اکبر نے کہا۔

”ایسے لوگ ہمیشہ ایک جیسی باتیں نہیں کرتے۔ بس ان کی ذہنی رو ہوتی ہے جس طرف چل پڑے آج تو انہوں نے معاملے کی کوئی بات ہی نہیں کی حالانکہ میں نے کئی مرتبہ عمل کی طرف توجہ دلائی۔ زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے دادا غفور کا ذکر کر دیا۔ حاضرات کراؤ۔“ ماموں فرقان نے کہا۔ ”اب دادا غفور سے بات کرنا ہو گی، ممکن ہے وہاں کوئی بھید کھلے۔“

اب وہ دونوں باتیں کرتے کرتے اس مقام پر آ پہنچے تھے جہاں ان کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچے تو بابر علی شوروم جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ رک گیا۔

”ماموں کیا ہوا؟“ بابر علی نے پوچھا۔

''ماموں ذرا آپ ساری بات تفصیل سے بتا دیں، میں ہاتھ منہ دھولوں اور راشدہ تم ذرا اچھی سی چائے بناؤ۔''

اکبر یہ کہہ کر اُٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی راشدہ اُٹھ گئی، پھر وہ چولہے پر کیتلی رکھ کر فوراً ہی واپس آ گئی، ماموں فرقان کی باتیں سننے کیلئے۔

ماموں فرقان نے ابھی کہانی شروع ہی کی تھی، سب لوگ توجہ سے ان کی بات سننے لگے۔

تھوڑی دیر بعد اکبر بھی منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔ وہ بھی اس حیران کرنے والے قصے میں شامل ہو گیا۔ جہاں ماموں فرقان بھولتے وہاں اکبر ٹکڑا لگا تا۔

ماموں فرقان نے جب ساری داستان دہرادی تو محفل پر کچھ دیر کیلئے سناٹا چھایا رہا۔

''راشدہ چائے کا کیا ہوا؟'' اکبر نے اس خاموشی کو توڑا۔

تب راشدہ کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''اوہ میں تو چولہے پر کیتلی رکھ کر ہی بھول گئی۔ پانی تو پک پک کر پاگل ہو گیا ہوگا۔''

''اب اسی میں پتی نہ ڈال دینا۔''

''معلوم ہے مجھے، میں دیہات سے نہیں آئی ہوں۔'' راشدہ جواب دیتی ہوئی کچن کی طرف بھاگی۔

راشدہ چند منٹوں میں چائے دوبارہ دَم دے کر لے آئی۔

چائے پیتے ہوئے بھی خاموشی طاری رہی۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔

''ماموں اب کیا ہوگا؟'' بابر علی نے بالآخر خاموشی توڑی، وہ فرقان ماموں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہم لوگ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے، املی والے بابا کی طرف اُمید کی کرن باقی تھی۔ اب وہ بھی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے ٹال دیا۔''

''ہوسکتا ہے بابر علی تمہارا خیال درست ہو، ایسے لوگ زیادہ جھنجھٹوں میں نہیں پڑتے ویسے انہوں نے حاضرات کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے کچھ اُمید بندھتی ہے اور حاضرات کے ماہر تو ہمارے دادا غفور ہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دادا غفور کے پاس بھیجنے کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے۔ بہر حال یہ بات تو وہاں جا کر ہی کھلے گی۔'' ماموں فرقان نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

کافی دیر اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی لیکن اس بحث کا نتیجہ کچھ نہ نکلا نتیجہ نکل بھی نہیں سکتا تھا کسی کو مکمل حقائق کا علم نہیں تھا۔ جس کو جتنا معلوم تھا، وہ اسی حوالے سے بات کر رہا تھا۔ دلائل دے رہا تھا بہر حال اس بات کا سب کو افسوس تھا کہ اکبر کی ایک جذباتی سے غلطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ نیاز محمد کا بھی یہی خیال تھا کہ اکبر کی جلد بازی سے بساط اُلٹ گئی لیکن املی والے بابا کا کچھ اور خیال تھا۔

ملی والے بابا نے اپنے سپاہی کی پٹی اُتروا دی۔ اسے لائن حاضر کر دیا تھا کیونکہ بابا کے نزدیک قصوروار نیاز محمد تھا جس نے اکبر کو اپنے ساتھ اندر لے جانے کی بے وقوفی کی تھی۔

باتیں کرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تو اکبر نے کہا۔ ''ماموں کیا خیال ہے چلیں۔''

''اب کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب کہاں جائیں گے کھانا کھا کر جائیں۔'' بابر علی نے کہا۔

پھر ماموں فرقان نے ظہر کی نماز پڑھی اس کے بعد کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا پھر وہ دونوں برنس روڈ کیلئے نکل گئے۔

برنس روڈ پہنچے تو عصر کا وقت نزدیک تھا، وہ دونوں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

''ہم بڑے اچھے وقت پر پہنچ گئے ہیں؟''

''اچھا۔'' اکبر نے کہا۔

''ہاں حاضرات کے عمل کیلئے یہ وقت بہترین ہوتا ہے۔ دادا غفور عصر کی نماز پڑھ کر فوراً ہی اس عمل کیلئے بیٹھ جائیں گے۔'' ماموں فرقان بولے۔

''ماموں پہلے تو انہیں ساری روداد سنانی ہوگی۔'' اکبر نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

دادا غفور کے فلیٹ کا دروازہ سامنے تھا۔ اکبر نے گھنٹی بجائی۔ دادا غفور خود دروازے پر آئے ان کی آستین چڑھی ہوئی تھی شاید وہ وضو کرنے جا رہے تھے۔

دونوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ بولے ''اخا، بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آج تو۔''

ماموں فرقان اور اکبر نے باری باری اُنہیں سلام کیا۔ دادا غفور نے خوش دلی سے جواب دیا اور کہا۔ ''آؤ بھئی اندر آؤ۔''

پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر چوکی پر بیٹھ گئے۔ ماموں فرقان نے ایک کرسی سنبھالی اور اکبر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''ہاں بھئی، اکبر تم کیسے ہو؟''

''بس ٹھیک ہوں دادا۔'' اکبر نے دھیرے سے کہا۔

''اور تم فرقان۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، اللہ کا فضل ہے۔''

''کیسے آنا ہوا؟''

''آپ شاید وضو کرنے جا رہے تھے۔''

''ہاں ارادہ تو یہی تھا۔''

''آپ وضو کر آئیں، مجھے آپ سے جو بات کرنا ہے، اس کا پس منظر سمجھانے میں دس پندرہ

منٹ لگیں گے۔"

"تم اپنی بات کرو میں وضو کرلوں گا، ابھی تو اذان بھی نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے ساری روداد بیان کردی۔

دادا غفور پوری توجہ اور خاموشی سے سارا قصہ سنتے رہے۔ اُنہیں نیاز محمد کی ناکامی کا سن کر بہت دُکھ ہوا۔ وہ بولے۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"اس سے زیادہ بُرا یہ ہوا کہ املی والے بابا نے ہمیں ٹال دیا، میرا خیال تھا کہ میں ان سے کوئی عمل وغیرہ معلوم کرلوں گا لیکن اُنہوں نے معاملے کی کوئی بات ہی نہیں کی۔ جب میں نے عمل کا ذکر کیا تو وہ بولے کس چیز کیلئے عمل بتادوں، پہلے حاضرات کروا کر دیکھ تو، تو جانتا ہے حاضرات والے بندے کو۔ حاضرات کا نام سن کر میرا خیال فوراً آپ کی طرف گیا تو وہ بولے، تیرے دماغ میں جو نام آیا ہے، وہ ٹھیک ہے، بس یہ آخری بات کی۔ اس کے بعد ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"بندہ تو پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔" دادا غفور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اشارہ املی والے بابا کی طرف تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" ماموں فرقان نے فوراً تصدیق کی۔

"پھر دیکھتے ہیں حاضرات کر کے۔" دادا غفور نے کہا اور پھر وضو کرنے باتھ روم چلے گئے۔

نماز کے بعد دادا غفور نے شیشے کے گلاس میں اندر سے پانی منگوایا، اسے اپنے سامنے رکھا اور تسبیح ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھنے لگے۔

دس پندرہ منٹ تک کچھ پڑھنے کے بعد انہوں نے گلاس اپنے نزدیک سرکایا اور ایک سفید چادر سے خود کو ڈھک لیا۔

پھر چند منٹ تک "دلہن" بنے بیٹھے رہے اس کے بعد انہوں نے وہ چادر سر سے اُتار کر ایک طرف پھینک دی۔ ان کا پورا چہرہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، وہ چادر سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ "فرقان معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"کیا مطلع ابر آلود ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"نہیں، دھواں نہیں ہے۔" دادا غفور نے بتایا۔

"تو پھر کیا معاملہ ہے۔" ماموں فرقان بولے۔

"دھواں نہ ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔" دادا غفور نے وضاحت کی۔

"دادا، آپ دیکھ کیا رہے ہیں؟" اس مرتبہ اکبر نے مداخلت کی۔

"اکبر تم......" ماموں فرقان نے اکبر سے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن دادا غفور نے ہاتھ کے اشارے سے ماموں فرقان کو روک دیا۔ پھر انہوں نے گہری نظروں سے اکبر کو دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ "میں سیّد پور کے جن کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"مطلع صاف ہونے کے باوجود کچھ نہیں دکھائی دے رہا۔ پھر تو معاملہ گمبھیر ہے۔" ماموں فرقان نے اظہار خیال کیا۔ "ایک مرتبہ اور کوشش کر دیکھیں۔"

"چلو ٹھیک ہے ایک مرتبہ اور کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

دادا غفور نے یہ کہہ کر ایک تسبیح گھمائی اور پھر گلاس کو اپنے سامنے سرکا کر چادر اپنے سر پر ڈال لی۔

چند منٹ کے بعد جب اُنہوں نے چادر ہٹائی تو ان کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ انہوں نے چادر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"کیا دادا؟ میں سمجھا نہیں۔" اکبر کی سمجھ میں ان کی بات نہ آئی۔

"اکبر تم......" ماموں فرقان نے اکبر کو پھر کوئی تنبیہہ کرنا چاہی لیکن اس مرتبہ پھر دادا غفور نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اُنہوں نے مسکرا کر گہری نظروں سے دیکھا اور بولے۔ "یعنی نتیجہ وہی صفر۔"

"پھر دادا۔" اکبر نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ مجھے بتاؤ کہ تم دونوں کیسے آئے ہو میرا مطلب ہے ٹیکسی، رکشہ سے یا اپنی گاڑی سے۔"

"گاڑی سے۔" اس مرتبہ ماموں نے جواب دیا۔

"پھر میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" دادا غفور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"دادا کہاں جائیں گے۔" اکبر نے پوچھا۔

"بھئی گلشن چلتے ہیں چل کر ذرا تمہارا گھر دیکھ لیں۔" دادا غفور نے ہنستے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ماموں فرقان کا ماتھا ٹھنکا۔ دادا غفور اس قدر آسانی سے گھر سے نکلنے والے نہ تھے۔ اب وہ فوراً ہی گلشن جانے کیلئے تیار ہو گئے تھے تو معاملہ ضرور سنگین تھا۔

ماموں فرقان نے ان سے کوئی سوال نہ کیا وہ دادا غفور کے ساتھ خود بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"آیئے چلیں۔"

تینوں بلڈنگ کی سیڑھیاں اُتر کر فٹ پاتھ پر آئے تو سامنے ہی گاڑی موجود تھی۔ اکبر نے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

دادا غفور اور ماموں فرقان دونوں ایک ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گاڑی نے گلشن کا راستہ اختیار کیا۔

جب گاڑی خالی گھر تک پہنچی تو اکبر کو خیال آیا کہ گھر کے گیٹ پر تو تالا پڑا ہے اور اس کی چابی اس وقت اس کے پاس نہیں تھی۔

اس نے داداغفور سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’دادا گیٹ پر تالا ہے اور چابی گھر پر ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں بیٹے ایسا کرو ہمیں یہاں خالی گھر پر اُتار دو اور خود جا کر چابی لے آؤ۔‘‘

’’بہتر۔‘‘ یہ کہہ کر اکبر نے گاڑی خالی گھر کے سامنے روک دی۔

داداغفور اور ماموں فرقان گاڑی سے اُتر گئے۔

’’میں چابی ابھی لے کر آیا۔‘‘ یہ کہہ کر اکبر نے گاڑی بھگائی۔

گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی گاڑی کا ہارن دیا اور پھر اُتر کر گھنٹی بجائی۔

چند سیکنڈوں کے بعد گیٹ صابرہ نے کھولا۔ صابرہ کو کچھ کہنے سے پہلے ہی اکبر بولا۔ ’’امی خالی گھر کی چابی لا دیں، جلدی کریں۔‘‘

’’میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔‘‘ صابرہ نے پریشان ہو کر کہا۔

’’ارے امی وقت ضائع نہ کریں، داداغفور اور ماموں وہاں میرا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

’’ماموں اور دادا وہاں موجود ہیں تو میں لائے دیتی ہوں چابی، لیکن یہ داداغفور کس طرح آ گئے گلشن۔ وہ تو گھر سے نکلتے نہیں۔‘‘

’’امی یہ باتیں بعد میں، پہلے اندر جا کر چابی لا دیں۔‘‘

’’اچھا لاتی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر صابرہ تیزی سے گھر میں گئی۔

کچھ ہی سیکنڈ میں چابی اکبر کے ہاتھ میں تھی۔ اکبر نے چابی جیب میں ڈال کر گاڑی گھمائی اور تیزی سے خالی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

داداغفور اور ماموں فرقان اس کے انتظار میں گیٹ پر کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے گیٹ پر لگا تالا کھولا اور پیچھے ہٹ گیا۔

ماموں فرقان نے گیٹ کا کنڈا کھول کر اسے زور سے دھکا دیا، گیٹ کے دونوں پٹ تیزی سے کھلتے چلے گئے۔

داداغفور نے کچھ پڑھ کر قدم آگے بڑھایا۔ ماموں فرقان ان کے ساتھ چلے۔

ان دونوں کے پیچھے اکبر نے قدم بڑھایا تو ماموں فرقان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولے۔ ’’اکبر تم گیٹ پر ہی ہم لوگوں کا انتظار کرو۔‘‘

اکبر نے ماموں فرقان کو کوئی جواب نہ دیا، اس نے التجا بھری نظروں سے داداغفور کو دیکھا۔

’’فرقان ٹھیک کہہ رہے ہیں، تمہارا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر داداغفور نے ماموں

رقان کا ہاتھ پکڑا اور خالی گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

اکبر گیٹ پر کھڑا انہیں خاموشی سے اندر جاتے دیکھتا رہا، اور سوچنے لگا اللہ جانے ان دونوں کا کیا شر ہونے والا ہے۔

اکبر کو نہیں معلوم تھا کہ داداغفور یہاں کیوں آئے ہیں لیکن اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ سیّد پور کے کے سلسلے میں ہی یہاں آئے ہیں۔ اس کے دل سے فوراً دعا نکلی۔ ’’اے اللہ داداغفور کو اپنے مقصد ں کامیاب کر۔‘‘

داداغفور اور ماموں فرقان جب گھر کے دروازے پر پہنچے تو ماموں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے دیکھ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ وہ کھلے گیٹ کو بند کر دے اور کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرے۔

اکبر نے اشارہ پاتے ہی گیٹ کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ پٹ بند کرنے سے پہلے اس نے گھر دروازے پر ایک نظر ڈالی۔ داداغفور اندر جا چکے تھے۔ ماموں فرقان دروازے میں داخل ہو رہے پھر اس نے گھر کا دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ تب اکبر نے بھی گیٹ بند کر دیا اور گیٹ کے ستون سے لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اکبر کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ جانے کیا نے والا تھا۔

داداغفور اور ماموں فرقان گھر میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا طاری تھا۔ فرش پر ریت پڑی تھی، کافی عرصے سے اس گھر کی صفائی نہ ہوئی ہو۔ ٹی وی لاؤنج بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ یہاں کوئی تھی۔ فرش پر قالین تھا، نہ ٹیلیویژن، نہ ٹرالی اور نہ ٹرالی میں رکھا ہوا وی سی آر۔ ٹی وی لاؤنج بالکل تھا۔ پھر ماموں فرقان نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ڈرائنگ روم بھی بالکل خالی تھا۔ بس پر ریت جمی ہوئی تھی۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر ماموں فرقان نے کچن کا رُخ کیا، وہاں بھی کچھ نہ تھا۔

اب ان دونوں نے ایک ایک کمرہ دیکھنا شروع کیا۔ سارے کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے، پڑے تھے، خالی تھے۔

ں اب ایک کمرہ دیکھنا باقی رہ گیا تھا اور یہ تھا اکبر کا بیڈروم۔ ماموں فرقان اس گھر کے چپے چپے قف تھے اور اب تک جو واقعات پیش آئے تھے ان سے بھی آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا اُسی ے میں وہ شمع موجود ہے جسے سیّد پور کے جن نے روشن کیا تھا اور جسے کسی طرح بھی بجھایا نہ جا سکا ہیں معلوم تھا اسی کمرے میں ایک شمع اور موجود ہے جو پگھل پگھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتی

جارہی تھی۔

وہ تھی نیلم۔

نیلم کا کمرہ کھولنے سے پہلے ماموں فرقان نے داداغفور کو دیکھا اور آہستہ سے بولے۔ ''یہ نیلم کا کمرہ ہے۔''

''اچھا، تم پیچھے ہٹو، میں دیکھتا ہوں اندر جا کر۔'' داداغفور نے آگے آتے ہوئے کہا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' ماموں فرقان پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔

داداغفور نے گردن کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

ان کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے اور تسبیح کے دانے اُنگلیوں میں رقصاں تھے۔

کچھ پڑھنے کے بعد انہوں نے بند دروازے پر پھونک ماری اور پھر ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

ماموں فرقان کو معلوم تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہوگا، نہیں کھلے گا کیونکہ اب تک کی روایت سے یہی بات ثابت تھی کہ سب کمرے کھل جاتے تھے لیکن یہ کمرہ کسی سے نہ کھلتا تھا۔ اگر کوئی اسے کھولنے یا اندر جھانکنے کی کوشش کرتا تو اس کا انجام بڑا بھیانک ہوتا۔

ماموں فرقان کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب دروازہ ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہی کھلتا چلا گیا۔ داداغفور نے کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو زور سے دھکا دیا، وہ دیوار سے جا لگا۔

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا، ماموں فرقان نے دروازے پر کھڑے کھڑے کمرے میں چاروں طرف نظریں گھمائیں لیکن اُنہیں سیّد پور کے جن کی شمع کہیں نہ دکھائی دی۔ کمرے میں نیلم بھی موجود نہ تھی۔ کمرے میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' ماموں فرقان حیران تھے۔ یہ جو کچھ ہوا تھا ان کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ ''نیلم کہاں گئی؟''

داداغفور نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا، ان کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

''آؤ اندر چلیں۔'' داداغفور نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

ماموں فرقان بھی ان کے ساتھ چلے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کمرے کی ساری بتیاں روشن کر دیں۔ کمرے میں اُجالا پھیل گیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ ماموں فرقان نے آگے بڑھ کر وہ بھی کھول دیا۔ باتھ روم میں کوئی نہ تھا۔

داداغفور نے کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ان کی نظریں درواز

نہیں۔ ماموں فرقان بھی خاموشی سے کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دل میں ایک دھڑکا سا تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ اب کالے بلے کی آواز سنائی دی کہ تب سنائی دی لیکن کچھ نہ ہوا۔ ہر سُو سناٹا چھایا رہا۔

داداغفور نے پڑھنے کے بعد انگشت شہادت اپنے سر پر دائرے کی شکل میں گھمائی اور غصے سے بولے۔ ''کہاں ہے تُو، چھپ کیوں گیا، سامنے کیوں نہیں آتا۔''

اس للکار کے جواب میں کوئی للکار سنائی نہ دی۔ ماموں فرقان نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا اور داداغفور کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کیا وہ چلا گیا، اس گھر کو چھوڑ گیا۔''

''ہاں۔'' داداغفور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور نیلم کہاں ہے؟'' ماموں فرقان نے سوال کیا۔ ''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''کہیں وہ اسے اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا۔'' ماموں فرقان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ممکن ہے۔'' داداغفور نے سوچتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

''اگر ایسا ہوا تو بُرا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ہے، نیلم کی غیر موجودگی بتاتی ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

''املی والے بابا کی بات اب سمجھ میں آئی۔''

''وہ کیا۔''

''انہوں نے مجھے عمل بتانے سے آنا کانی کی تو اس کی وجہ کیا تھی۔'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''اب اس جملے کا مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے جو انہوں نے اس وقت کہا تھا۔''

''وہ کیا۔'' داداغفور نے پوچھا۔

''انہوں نے کہا تھا، سانپ تو نکل گیا، اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ۔ انہیں سب معلوم تھا۔ اسی لئے انہوں نے عمل بتانے سے گریز کیا۔'' ماموں فرقان کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ بڑے تاسف سے بولے۔ ''اب معاملہ اور پیچیدہ ہو گیا ہے، پہلے تو یہ تھا کہ وہ ہمارے سامنے تھا، ہم اس کے لئے کوئی نہ کوئی توڑ کر سکتے تھے، لیکن اب کیا کریں گے۔''

''وہ یہاں سے بھاگا ہی اسی لئے ہے کہ ہم لوگوں نے اس کا ناک میں دَم کر دیا تھا۔ اسے سکون سے نہیں رہنے دیا تھا۔'' داداغفور نے کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل آئے۔

ماموں فرقان نے کمرے کی بتیاں بجھا دیں اور خاموشی سے سر جھکائے وہ بھی داداغفور کے ساتھ ہو گئے پھر وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

"کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ سیّد پور کا جن گھر چھوڑ چکا ہے۔"

"ہاں، اب اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو اب تک ظاہر ہو چکا ہوتا اور اس بات کا کسی حد تک یقین مجھے حاضرات کے عمل کر کے ہی آ گیا تھا۔ دھواں نہ ہونے کے باوجود کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو گھر کے پیچھے چکر لگا آؤں۔" ماموں فرقان ابھی تک تذبذب میں تھے۔

"وہ کس لئے۔"

"ہو سکتا ہے، نیلم وہاں ہو۔"

"اچھا، دیکھ آؤ، اپنی تسلی کر لو، میں گیٹ کی طرف چلتا ہوں۔"

"آپ ایک منٹ یہیں ٹھہریں، میں ذرا گارڈن میں دیکھ آؤں، پھر آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ اکبر کے سامنے نہیں ہو سکے گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، تم گارڈن کا چکر لگا آؤ۔"

ماموں فرقان تیز تیز قدموں سے گھر کے پچھلے حصے میں پہنچے۔ وہاں انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ نیلم تھی، نہ نیلم کا کوئی نشان تھا۔

وہ شرمندہ شرمندہ سے واپس آئے اور بولے۔ "اِدھر کوئی نہیں۔"

"اِدھر کیا، اب اُدھر بھی کوئی نہیں۔"

"کیا اکبر کو نیلم کے بارے میں صاف صاف بتا دیں، یہی بات میں آپ سے کرنا چاہ رہا تھا"

"میرے خیال میں تو بتا دینا چاہئے۔" دادا غفور نے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اسے بہت صدمہ ہوگا۔" ماموں فرقان نے کہا۔ "ابھی تک تو اسے یہ تسلی تھی کہ نیلم خالی گھر میں موجود ہے، کسی بھی وقت آزاد ہو سکتی ہے۔ اب جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ نیلم اس گھر سے جا چکی ہے اور وہ بھی کسی نامعلوم سمت تو وہ بے حد پریشان ہوگا۔"

"پھر تم اسے کیا کہو گے؟"

"ہم اسے اتنا بتا دیں کہ سیّد پور کا جن یہ گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

"یہ سن کر سب سے پہلا سوال وہ یہ کرے گا کہ نیلم کہاں ہے۔"

"ہاں، یہ بات بھی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس سے حقیقت مت چھپاؤ۔ وہ بڑے حوصلے اور بڑے صبر کا لڑکا ہے

برداشت کر جائے گا پھر ہم دونوں مل کر اسے تسلی دے دیں گے۔" دادا غفور نے کہا۔

"جھوٹی تسلی۔" ماموں فرقان نے مسکرا کر کہا۔

"جھوٹی تسلی دینے میں کوئی حرج نہیں۔" دادا غفور بولے۔ "ہم کوشش کریں گے کہ کسی طرح اس جن کا پتہ و نشان مل جائے اگر مل گیا تو وہ تسلی جھوٹی نہ رہے گی۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گیٹ تک آ گئے۔ گیٹ بند تھا۔

"بے چارہ باہر کھڑا ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا۔" دادا غفور بولے۔

"کسی خوشخبری کا منتظر ہوگا۔"

"اس لڑکے کی قسمت ہی خراب ہے۔ کام بنتے بنتے بگڑ جاتا ہے۔"

ماموں فرقان نے آگے بڑھ کر گیٹ کو ہلایا۔ گیٹ باہر سے بند تھا۔

گیٹ کو ہلتے دیکھ کر اکبر چونکا اس نے فوراً گیٹ کا کنڈا کھول دیا۔ پھر اس نے دونوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ دونوں صحیح سلامت تھے۔ اکبر کو انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"اکبر گیٹ میں تالا لگا دو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

اکبر نے گیٹ بند کر کے اس میں تالا لگا دیا۔ اس اثنا میں دادا غفور اور ماموں فرقان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ مجبوراً اسے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا پڑی۔

وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد اسے معلوم ہو جائے کہ اندر کیا ہوا؟ لیکن دونوں بزرگ کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ چاہتا نہیں تھا کہ خود سے پوچھے۔ اگر یہاں صرف ماموں فرقان ہوتے تو وہ کب کا ان سے کئی تابڑ توڑ سوالات کر چکا ہوتا۔

جب اکبر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا تو ماموں فرقان نے کہا۔ "مجھے اپنے گھر چھوڑ دو اور پھر دادا غفور کو چھوڑ آنا۔"

"دادا غفور کو تو میں چھوڑ آؤں گا، لیکن اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دادا غفور کو اپنے ساتھ گھر لے چلتے ہیں، کچھ دیر گھر بیٹھ کر پھر چلے جائیں گے۔ اس طرح امی ابو سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ امی کو جب معلوم ہوا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے فوراً گھر کی چابی دے دی ورنہ وہ چابی دینے کیلئے تیار نہ تھیں۔" اکبر نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں برخوردار اب میں سیدھا گھر جاؤں گا۔ اپنے امی ابو کو میرا سلام کہہ دینا۔" دادا غفور نے فیصلہ سنایا۔

جب گھر آ گیا تو ماموں فرقان گاڑی سے نیچے اُتر گئے، انہوں نے دروازہ بند کر کے کھڑکی سے

داداغفور سے ہاتھ ملایا۔ ''اچھا خدا حافظ، میں ایک آدھ دن میں آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ راستے میں اکبر کو ذرا سمجھا دیجئے گا۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔'' داداغفور نے بڑے اطمینان سے کہا۔ پھر اکبر سے مخاطب ہو کر بولے۔

''چلو، میاں۔''

جب گاڑی آگے بڑھی اس وقت تک ماموں فرقان گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ چکے تھے۔ وہ جس بات سے پریشان تھے۔ وہ مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ ان میں ہمت نہ تھی، اکبر سے بات کرنے کی۔ اسے یہ بتانے کی کہ نیلم اب خالی گھر میں نہیں ہے۔ داداغفور اسے بتا بھی دیں گے اور سمجھا بھی دیں گے۔

گاڑی تھوڑا آگے بڑھی تو داداغفور نے کہا۔ ''اکبر میاں، ذرا گاڑی روکو۔''

اکبر نے فوراً گاڑی روک کر سڑک کے ایک طرف کر لی اور حیرت سے داداغفور کو دیکھا۔ ''خیریت۔''

''ہاں، خیریت ہے، میں ذرا تمہارے پاس آجاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے باہر آئے اور اگلا دروازہ کھول کر اکبر کے برابر بیٹھ گئے۔ ''اب چلو...... تم سے بات کرنا تھی، پیچھے بیٹھ کر نہ ہوتی۔''

''جی فرمائیں۔'' اکبر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''اکبر میں تمہیں ایک اچھی اور ایک بری خبر سنانا چاہتا ہوں...... سن لو گے؟''

''جی بالکل۔'' اکبر نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جو اچھی خبر ہے، وہ بھی بری خبر کے اندر دب گئی ہے، اس لئے خاصے حوصلے کی ضرورت ہے، میں تمہیں ایک سمجھدار اور بڑے حوصلے کا لڑکا پاتا ہوں...... تم نے اب تک جس بردباری کا مظاہرہ کیا ہے...... وہ تمہارا ہی حصہ ہے۔ سمجھدار بھی ہو، عقلمند بھی اور صابر و شاکر بھی۔''

''جی داداشکریہ، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اطمینان سے کہیں۔'' اکبر نے بظاہر اطمینان سے کہا لیکن اندر سے اس کا اطمینان اُڑ گیا تھا۔

''تم کو کچھ اندازہ ہے کہ میں خالی گھر میں کیوں گیا تھا۔'' داداغفور نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔'' اکبر نے فوراً جواب دیا۔

''میں اس خالی گھر میں ایک بات کی تصدیق کرنے گیا تھا۔'' داداغفور نے بتایا۔

''کس بات کی۔'' اکبر نے پوچھا۔

''حاضرات کرنے پر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے جن نے اس گھر کو چھوڑ دیا ہو۔''

''پھر دادا۔'' اکبر نے بڑے جوش سے کہا۔

''جب میں اور فرقان خالی گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ سیّد پور کا جن اس گھر کو خالی کر گیا ہے۔'' داداغفور نے بتایا۔

''واقعی دادا۔'' اکبر نے خوشی کا اظہار کیا۔

''وہ گھر بالکل خالی ہو گیا ہے۔ سارے کمرے کھلے ہوئے تھے حتیٰ کہ وہاں جن کی جلائی ہوئی شمع بھی نہیں تھی۔'' داداغفور نے مزید بتایا۔

''دادا، یہ خبر آپ نے مجھ سے اب تک چھپا کر کیوں رکھی، مجھے وہیں کیوں نہ بتائی۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ نیلم اس ظالم کے پنجے سے آزاد ہو گئی۔'' پھر اچانک اکبر کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ ایک بجلی سی گری۔ اگر سیّد پور کا جن گھر چھوڑ گیا ہے۔ وہاں اس کی جلائی ہوئی شمع بھی نہیں ہے تو پھر نیلم کہاں ہے؟ جب وہ آزاد ہو گئی ہے تو یہ لوگ اسے اپنے ساتھ باہر کیوں نہیں لائے۔ اسے وہاں کیوں چھوڑ آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''دادا۔'' اکبر کی آنکھوں میں جن کے چلے جانے سے جو چمک پیدا ہو گئی تھی وہ فوراً ہی ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ وہ بڑی بدحواسی سے بولا۔ ''اب وہ بری خبر بھی سنا دیجئے۔''

''نیلم اس گھر میں نہیں ہے۔'' داداغفور نے صاف اور دوٹوک لہجے میں کہا۔

''نیلم بھلا وہاں سے کہاں جا سکتی ہے۔'' اکبر نے داداغفور پر شبہے بھری نظر ڈالی۔ ''دادا، خدا کے واسطے جو سچ ہے وہ فوراً بتا دیجئے۔ مجھ میں بڑا حوصلہ ہے میں سب کچھ برداشت کر لوں گا۔''

''بس، یہی سچ ہے۔'' داداغفور نے کہا۔

''جب جن اس گھر کو چھوڑ کر چلا گیا ہے تو نیلم وہاں سے کہاں غائب ہو گئی۔ یہ ناممکن ہے دادا، کیا نیلم مر گئی ہے...... آپ لوگوں نے وہاں اس کی لاش دیکھی ہے؟''

''نہیں اکبر بیٹے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آؤ تم واپس چلو، اس گھر کے اندر جا کر دیکھ لو۔''

''پھر وہ آخر کہاں گئی؟''

''میرا خیال ہے کہ جن اسے اپنے ساتھ لے گیا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا دادا، اب ہم اسے کہاں ڈھونڈیں گے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا، تم مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ نیلم کے جانے کا دل پر اثر نہیں لو گے...... ویسے ہی صبر کا مظاہرہ کرو گے جیسا کہ اب تک کرتے آئے ہو...... ٹھیک ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اکبر نے اُداسی سے کہا۔

''فرقان کو ساتھ لے جا کر املی والے بابا سے ملو، اُنہیں سارے حالات بتاؤ، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں

پھر آ کر مجھے بتانا، میں اپنے طور پر بھی کچھ کرتا ہوں۔'' دادا غفور نے کہا۔

پھر اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ دونوں کے ہونٹ جیسے سختی سے سِل گئے۔ دادا غفور نے اسے خبر سنانے کو تو سنا دی اور اپنی طرف سے سمجھا بھی دیا لیکن خود ان کا دل اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا۔ جن کا فرار اور نیلم کی گمشدگی ایک سانحہ تھی۔

اس خبر کو سننے کے بعد اکبر پر افسردگی کا حملہ ہوا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح برنس روڈ پہنچا۔ دادا غفور کو ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑا اور کس طرح وہ واپس اپنے گھر گلشن پہنچا۔

گھر پہنچا تو سب نے اسے فکرمندی سے دیکھا۔ اکبر نے کوشش کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ خاموشی سے ایک صوفے میں دھنس گیا۔

صابرہ اُٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ ''چھوڑ آئے دادا غفور کو۔''

''جی امی۔'' اکبر نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''دادا غفور نے کیا کہا۔'' ماموں فرقان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''وہی جو آپ نہ کہہ سکے۔'' اکبر نے صاف لہجے میں کہا۔

''ناراض ہو مجھ سے۔'' ماموں فرقان اُٹھ کر اس کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔

''نہیں، میں کسی سے ناراض نہیں، ہاں البتہ تقدیر مجھ سے ضرور ناراض ہے۔''

''پریشان مت ہو بیٹا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' صابرہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔

''امی، اب مجھے لگتا ہے کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' اکبر نے مایوسی سے کہا۔

''اکبر بھائی حوصلہ رکھیں۔'' راشدہ بولی۔

''بیٹا، اس طرح ہمت ہار بیٹھو گے تو کس طرح کام چلے گا۔'' بابر علی نے کہا۔

''دادا غفور نے کوئی مشورہ دیا۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو لے کر املی والے بابا سے ملوں۔'' اکبر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، پھر ہم دونوں صبح اُدھر چلیں گے۔''

''اچھا۔'' اکبر نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اصل میں اب تک اس نے جن کے فرار اور نیلم کی گمشدگی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک خیال اس کے دل میں آیا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوا۔

''امی، گھر کی چابیاں کہاں ہیں۔''

''چابی تو تمہارے ہی پاس تھی، بیٹا۔''

''امی، وہ تو صرف گیٹ کے تالے کی چابی ہے، میں کمروں کی چابیاں مانگ رہا ہوں۔''

''الماری کی دراز میں پڑی ہیں، لاؤں۔''

''ہاں، امی۔''

''کیا کرو گے۔'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ماموں میں خالی گھر تک جاؤں گا۔ تمام کمروں کے تالے بند کر کے دیکھوں گا، اگر وہ سارے تالے بند ہو گئے تو سمجھوں گا کہ وہاں اب کوئی نہیں ہے کیونکہ جب ہم نے گھر خالی کیا تھا تو دروازے کا ایک بھی تالا باوجود کوشش کے بند نہیں ہو سکا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم جا کر تالے بند کر آؤ، پورا گھر کھلا ہوا ہے۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

راشدہ نے لا کر چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ پر رکھا اور بولی۔ ''اکبر بھائی، آپ وہاں اکیلے جائیں گے۔''

''اکیلے جانے میں کیا ہے، جب وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔'' اکبر افسردگی سے بولا۔

''ماموں کو ساتھ لے جاؤ یا کہو تو میں چلوں۔'' بابر علی نے کہا۔

''ارے نہیں ابو، آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں ابھی آیا۔''

یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا، گاڑی ابھی گیٹ کے باہر ہی کھڑی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے خالی گھر کی طرف رخ موڑا۔

رات ہو چکی تھی۔ وہ خالی گھر پہنچا تو گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس گھر کو دیکھ کر ایک خوف کی لہر اس کے جسم میں داخل ہوئی۔ اس نے ہمت کر کے گیٹ پر پڑے تالے کو کھولا اور گیٹ کے دونوں پٹوں کو زور سے دھکا دیا۔ گیٹ کھلتا چلا گیا۔

وہ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔

سب سے پہلے اس نے گیٹ اور گھر کے دروازے کی بتیاں روشن کیں پھر وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔ اب وہ ہر کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلاتا جا رہا تھا۔ پھر سب سے آخر میں وہ اپنے بیڈروم کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے کھولنے سے پہلے اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔

اس کمرے سے بہت بھیانک اور دہشت ناک یادیں وابستہ تھیں۔

پھر اس نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا اور کمرے میں داخل ہو کر بتیاں روشن کیں۔ سارے کمروں کی طرح سے یہ بھی کمرہ بھی خالی پڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ بس ایک فرق تھا۔ اب اس کمرے کے فرش پر شمع نہیں رکھی تھی۔

اس نے کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کی نظریں کچھ

ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نوشتہ دیوار پڑھنا چاہتا تھا لیکن دیوار پر کچھ لکھا ہوتا تو اس کی نظر میں آتا۔

پھر وہ باتھ روم میں داخل ہوا۔ لائٹ روشن کی۔ باتھ روم میں بھی کچھ نہ تھا۔ اس نے ایسے ہی دروازے کے پیچھے جھانکا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دروازے کے پیچھے لگی کھونٹیوں پر نیلم کا کوئی کپڑ وغیرہ رہ گیا ہو۔

کھونٹیوں پر کچھ نہ تھا، وہ خالی پڑی تھیں۔

لیکن پھر وہ جیسے چونک اُٹھا۔ دروازے کے پیچھے کچھ لکھا ہوا تھا۔

یہ نیلم کی تحریر تھی۔ شاید اس نے اپنی لپ اسٹک سے قلم کا کام لیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔“

اس تحریر کو دیکھ کر اکبر کے دل پر ایک برچھی سی لگی۔ اس کے سینے کے سارے زخم کھل گئے، وہ جو بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ضبط کئے ہوئے تھا۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اس نے دروازے کو پکڑ لیا اور اپنی پیشانی اس تحریر پر رکھ دی۔

اب وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور دُکھ آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

”نیلم، میری نیلم ...... تم کہاں چلی گئیں ...... تم مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گئیں ...... اب میں کیا کروں ...... نیلم میں کیا کروں ...... نیلم، میری نیلم۔“

اس کے آنسو، اس کی آہ و بکا، اس کی پکار اگر کوئی سن لیتا تو اس کا دل دہل جاتا۔

وہ دروازے سے چپکا جانے کتنی دیر روتا رہا۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے کسی نے اپنا نرم ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہو۔

اکبر نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔

اب وہ اپنے آنسو پونچھتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ وہ کمرے میں کھڑا ہوا پھر اس نے کمرے کی بھی بتی بند کی اور باہر آ گیا۔ اسکے بعد اس نے تالے میں چابی لگائی، گھمائی تالا بند ہو گیا۔

پھر اس نے ایک ایک کر کے سارے گھر کی بتیاں بجھا دیں اور سب کمروں کو مقفل کر دیا۔ پھر اس نے کمرے کے بڑے دروازے میں چابی گھمائی وہ بھی بند ہو گیا۔

تھکے قدموں سے چلتا اور بھیگی آنکھوں سے دیکھتا اور ٹوٹے ہوئے دل سے سوچتا وہ گیٹ تک آیا، گیٹ بند کر کے گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس خالی گھر میں جن ہے نہ نیلم۔

گاڑی چلاتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے نیلم کی تحریر آ رہی تھی۔

”اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔“

کریم کلر کے دروازے پر لکھی ہوئی یہ سرخ تحریر اس کے دل پر چھریاں چلا رہی تھی، اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

وہ بمشکل اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا، گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اندر جا کر پارک کی اور گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔

چابیوں کا گچھا صابرہ کے ہاتھ پر رکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صابرہ نے اکبر کے پیچھے جانا چاہا تو بابر اور ماموں فرقان دونوں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔

”اسے مت چھیڑو۔“

”اس کا چہرہ تو دیکھو کیسا ستا ہوا ہے لگتا ہے جیسے بہت رو کر آیا ہو۔“ صابرہ نے بڑے دُکھ سے کہا۔

”اسے اب تنہا چھوڑ دو، تم اس کے پاس جاؤ گی تو وہ اور روئے گا اور دُکھی ہو گا۔“ بابر نے کہا۔

”جاؤ، دیکھ آؤ۔“ ماموں فرقان نے اجازت دی۔ وہ جانتے تھے کہ صابرہ اپنی ممتا سے مجبور ہے۔

صابرہ نے فوراً اکبر کے کمرے کا رُخ کیا۔ یہ اچھا تھا کہ اس نے اپنا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

اکبر نے اپنے جوتے بھی نہیں اُتارے تھے، وہ بیڈ پر چت لیٹا، چھت کو گھور رہا تھا، بہت گہری سوچ میں تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سے اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر ماں کو پایا تو آہستہ سے بولا۔ ”آ جائیں امی۔“

تب صابرہ نے پورا دروازہ کھول دیا۔ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ”آرام کر رہے ہو۔“

”ہاں امی اب زندگی میں آرام ہی آرام رہ گیا ہے۔ جس سے زندگی کی ہلچل مچی تھی وہ تو چلی گئی۔“

”بیٹا فکر کیوں کرتے ہو۔“ صابرہ نے اسے تسلی دی۔ ”کیا ہوا، گھر کے سارے تالے بند ہو گئے؟“

”ہاں امی، کمرے سے شمع بھی غائب تھی۔“ اکبر نے کہا۔ ”امی مجھے اس گھر میں نیلم کا ایک پیغام ملا ہے۔“

”کیسا پیغام؟“ صابرہ یہ کہہ کر اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

”باتھ روم کے دروازے کے پیچھے لپ اسٹک سے لکھی ہوئی نیلم کی تحریر موجود ہے۔“

”ہائے۔“ صابرہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ ”کیا لکھا ہے وہاں۔“

''امی......امی۔'' پھر اکبر سے کچھ بتایا نہ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رو دیا۔

پھر صابرہ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا بس خاموشی سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی اور اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد راشدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے صابرہ کے نزدیک آ کر آہستہ سے کہا۔ ''امی آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔''

''تم چلو، میں آتی ہوں۔'' صابرہ نے اسے جواب دیا۔

تب اکبر نے اپنا سر صابرہ کی گود سے اُٹھا کر تکیے پر رکھ لیا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صابرہ جب ٹی وی لاؤنج میں آئی تو بابر نے قدرے ناراضگی سے کہا۔ ''اسی لئے میں تمہیں وہاں جانے سے روک رہا تھا تم وہاں جم کر ہی بیٹھ گئیں۔''

صابرہ نے بابر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ماموں فرقان سے مخاطب ہوئی۔ ''ماموں آپ کو کچھ معلوم ہے کہ نیلم نے اکبر کے نام کیا پیغام چھوڑا ہے؟''

''نہیں، مجھے تو نہیں معلوم۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''باتھ روم کے دروازے کے پیچھے وہ کچھ لکھ کر گئی ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ ماموں فرقان کا لڑکا عرفان حیدر آباد کے ایک بینک میں منیجر تھا وہ گھر میں داخل ہوا۔

عرفان یہاں اپنے باپ کی تلاش میں آیا تھا۔

ماموں فرقان صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچے تھے۔ عرفان گھر پہنچا تو اسے سارے حالات کا علم ہوا۔ ماموں فرقان ایک مرتبہ جن کے ہاتھوں زک اُٹھا چکے تھے، اس لئے گھر کا کوئی فرد چاہتا نہ تھا کہ ماموں فرقان اس معاملے میں خود کو ملوث کریں لیکن یہ بات کسی میں کہنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ معاملہ رشتہ داری اور انسانی ہمدردی کا تھا۔ ممانی ریحانہ خاموش ہی رہتی تھیں ویسے وہ جانتی تھیں کہ ماموں فرقان ضد کے کس قدر پکے ہیں۔ ایک مرتبہ جو دل میں سما جائے اسے کر کے ہی چھوڑتے تھے۔

عرفان کچھ ماموں فرقان کے سامنے بول دیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی حیدر آباد سے آتا، فون کرتا یا وہاں سے خط لکھتا، اپنے باپ کو اس معاملے میں تنبیہ کا ایک آدھ جملہ ضرور لکھ دیتا، بول دیتا تھا۔

آج بھی جب اسے معلوم ہوا کہ ماموں فرقان مہم پر نکلے ہوئے ہیں تو دل ہی دل میں وہ بہت کڑھا لیکن اس نے ممانی ریحانہ کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔

گلشن کے اس گھر میں فون نہ تھا، اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گھر جا کر خیریت معلوم کی جائے۔ ممانی ریحانہ خاصی پریشان ہو رہی تھیں اور ان کا پریشان ہونا بھی بجا تھا۔ ملیر کوئی اتنی دور نہ تھا۔ ان لوگوں کو دوپہر تک گھر واپس آ جانا چاہئے تھا، مگر اب شام گہری ہو چکی تھی اور ماموں فرقان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تب عرفان نئے گھر کا پتہ لے کر نکل پڑا۔

عرفان کو دیکھ کر ماموں فرقان مسکرائے اور بولے۔ ''تمہاری امی سے صبر نہ ہو سکا۔''

''ابا، آپکو دیر بھی تو بہت ہو گئی۔'' عرفان نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

اکبر کو جب معلوم ہوا کہ عرفان آیا ہے تو وہ اپنے کمرے سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اکبر کو دیکھ کر عرفان حیرت زدہ رہ گیا۔ ''اکبر تم یہاں ہو۔''

عرفان کی حیرت کا اکبر نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنے غم میں مبتلا تھا۔ دھیرے سے بولا۔ ''اور مجھے کہاں ہونا چاہئے تھا۔''

''شبہ تو مجھے امی کی بات سے ہی ہو گیا تھا لیکن اب تمہیں یہاں دیکھ کر شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا ہے۔'' عرفان نے بڑے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''بھائی عرفان کیا ہوا؟ آپ کو کس بات کا یقین ہو گیا؟'' راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے آج اکبر کو حیدر آباد اسٹیشن پر دیکھا تھا نیلم کے ساتھ۔'' عرفان نے بالآخر حیران کرنے والی خبر سنائی۔

یہ خبر واقعی بڑی دھماکہ خیز تھی۔ سب کے سب چونک گئے اور حیرت سے عرفان کو دیکھنے لگے۔

''تم نے اکبر کو نیلم کے ساتھ دیکھا تھا۔'' ماموں فرقان نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

''جی ابا۔'' عرفان نے بڑے یقین سے کہا۔

''پوری بات تفصیل سے بتاؤ۔'' بابر علی نے بے چین ہو کر کہا۔

''میں حیدر آباد سے کراچی ہمیشہ اپنی گاڑی پر آتا ہوں، آج گاڑی خراب تھی تو میں نے سوچا کہ بہت دن سے ٹرین سے سفر نہیں کیا ہے۔ آج ٹرین سے سفر کیا جائے۔ اسٹیشن پہنچا میری گاڑی آنے میں دیر تھی۔ میں پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں کراچی سے آنے والی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر رکی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا۔ گاڑی رکتے ہی میری نظر نیلم پر پڑی۔ وہ برتھ پر بیٹھی تھی اور اس کی نظریں اوپر تھیں۔ شاید وہ کھڑکی کھولنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے کھڑکی میں اکبر کا چہرہ نظر آیا۔ نیلم کی شکل دیکھتے ہی میں کھڑکی کی طرف بڑھ چکا تھا۔ جب میں نے اکبر کو کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تو میں نے اسے آواز دی۔ اپنا نام سن کر اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں دیکھ کر میں ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔ وہ انسانی آنکھیں نہیں تھیں اور اب میں یقین

سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بلے کی آنکھیں تھیں۔ اس وقت کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں اکبر کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اس لئے میں نے اس کی آنکھوں پر اتنا غور نہیں کیا۔ لیکن اب جبکہ مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ وہ اکبر نہیں تھا تو وہ آنکھیں اپنے تمام اسرار کے ساتھ میرے سامنے ہیں۔ بہر حال اکبر نے اپنا نام سنتے ہی فوراً کھڑکی گرالی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ یہ اکبر نے کیا کیا۔ میری طرف دیکھ کر بھی کھڑکی بند کرلی۔ کیا اس نے مجھے پہچانا نہیں یا اگر پہچان لیا تھا تو پہچان کر انجان بن جانا چاہتا ہے۔ پھر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے طے کیا کہ یہ اکبر مجھے نہیں پہچاننا چاہتا تو نہ پہچانے۔ یہ اجنبی بن گیا ہے تو میں بھی کیوں نہ اجنبی بن جاؤں۔ بس پھر یہ سوچ کر میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی پلیٹ فارم سے چلی گئی۔ گھر آیا تو سب سے پہلے امی سے میں نے اکبر کی شکایت کی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ لاہور جا رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے اسٹیشن پر بات تک نہ کی۔ بلکہ مجھے پہچان کر فوراً کھڑکی بند کرلی۔ میری شکایت سن کر امی حیرت زدہ رہ گئیں۔ انہوں نے بڑے یقین سے کہا کہ وہ اکبر نہیں ہو سکتا کیونکہ اکبر تو آج صبح تمہارے ابا کے ساتھ طیرا املی والے بابا سے ملنے گیا ہے پھر شام تک ابا گھر نہیں پہنچے تو اور فکر لاحق ہو گئی۔ عجیب عجیب وسوسے دل میں پیدا ہونے لگے، تب امی نے گھبرا کر مجھے یہاں بھیج دیا کہ صحیح صورتحال معلوم کروں۔" یہ کہہ کر عرفان خاموش ہو گیا۔

عرفان کیا خاموش ہوا گویا سب کی زبانیں سلب ہو گئیں۔ کسی میں ہمت نہ رہی کہ سوال کرے۔ اب سوال کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی سب کچھ سامنے آ گیا تھا۔ املی والے بابا کے جملے سے عرفان کے بیان تک۔ ایک ہی داستان تھی۔ کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی، اسرار کھلتے جا رہے تھے، اب یہ بات سب پر اچھی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ سید پور کا جن خالی گھر کو "خالی" کر گیا تھا اور وہ اکیلا نہ گیا تھا اپنے ساتھ نیلم کو بھی لے گیا تھا اور کس طرح لے گیا تھا۔ یہ بات بھی اب سامنے آ گئی تھی۔

دادا غفور نے کہا تھا کہ املی والے بابا سے رجوع کیا جائے۔ دادا غفور کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ماموں فرقان اور اکبر نے ایک مرتبہ پھر طیر کے جنگل کا رخ کیا تھا۔

جنگل میں داخل ہو کر جلد ہی وہ اس پگڈنڈی پر پہنچ گئے جو ان کی جانی پہچانی تھی اور جس کے ذریعے آسانی سے نہر تک پہنچا جا سکتا تھا۔

جنگل بالکل سنسان پڑا تھا۔ اکبر بڑا چوکنا ہو کر چل رہا تھا، اس کی نظریں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ گاہے گاہے وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا۔

"اکبر، کیا پریشانی ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"جی، کوئی نہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

پگڈنڈی والا راستہ ختم ہوا تو پتھریلا راستہ شروع ہو گیا، پھر وہ ختم ہوا تو اکبر کو اپنی بنائی ہوئی پتھروں کی نشانی دکھائی دینے لگی، نہر آ گئی تھی۔

پھر وہ بائیں گھوم گئے، کچھ دور چلے تو املی کا تناور درخت نظر آنے لگا۔ تھوڑا اور آگے بڑھے تو انہیں املی کے درخت میں بنا ہوا وہ محرابی کھوکھا خالی نظر آیا۔ اس کے کھوکھے کے سامنے پڑا وہ بھاری پتھر جس پر املی والا بابا آسن جما کر بیٹھتا تھا وہ بھی خالی پڑا تھا۔

املی والے بابا کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

پچھلی مرتبہ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا کہ بابا کہیں نظر نہ آیا تھا لیکن جب اکبر نے پانی میں جانے کی تیاری کی تو بابا املی کے پیچھے سے نکل آیا۔

اب بھی یہی قیاس کیا گیا کہ وہ تنے کے اس طرف ہوگا۔

"ماموں کیا کرنا چاہئے۔" اکبر نے پوچھا۔

"مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔ خیر تم ذرا چبوترے پر جا کر دیکھو۔"

"کس قسم کی گڑبڑ ماموں۔"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے املی کے درخت کے پیچھے اب کوئی نہیں۔"

"میں ابھی دیکھتا ہوں جا کر۔" اکبر نے اپنے جوتے موزے اتارے، پینٹ کے پائنچے اوپر چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ ابھی اس نے پہلا قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ ایک بندر درخت کے پیچھے سے برآمد ہوا اور اچک کر بھاری پتھر پر بیٹھ گیا۔

اکبر نے دوسرا قدم آگے بڑھایا تو ایک اور بندر درخت کی اوٹ سے نکلا اور پتھر پر بیٹھے ہوئے بندر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

اکبر نے تیسرا قدم بڑھایا تو ایک اور بندر درخت کے پیچھے سے نکلا۔

اب اکبر جیسے قدم بڑھاتا ہر قدم پر ایک بندر درخت کی اوٹ سے نکلتا اور باہر آ کر زمین پر بیٹھ جاتا۔ پہلا بندر پتھر کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور باقی آنے والے بندر دائرے کی شکل میں اس کے سامنے نیچے بیٹھتے جا رہے تھے۔

اکبر کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اوپر چبوترے پر کیا ہو رہا ہے۔ چبوترہ اکبر کے قد سے خاصا اونچا تھا، اسے وہاں کی صورتحال سیڑھیاں چڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

ماموں فرقان نہر کے کنارے کھڑے تھے۔

انہوں نے بندروں کی پراسرار آمد دیکھ لی تھی۔ بندروں کا درخت کی اوٹ سے نکلنا اب بھی جاری تھا۔ ماموں فرقان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان بندروں کے عزائم کیا ہیں۔

تب انہوں نے اکبر کو آواز دی۔ ''اکبر۔''

''جی ماموں۔'' اکبر نے بڑھتا ہوا قدم روک کر ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔

''واپس آ جاؤ بیٹا۔''

''کیوں ماموں؟''

''جو مجھے نظر آ رہا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آ رہا، بحث مت کرو، فوراً پلٹ آؤ۔'' اس مرتبہ ماموں فرقان کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اکبر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ جلدی سے نہر سے نکل آیا۔

اور جب اس نے کنارے پر چڑھ کر درخت کے نیچے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ارے ماموں یہ اتنے سارے بندر کہاں سے آ گئے۔''

''بس، اب واپس چلو۔'' ماموں فرقان نے تنبیہ کی۔

''لیکن ماموں......'' اکبر نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ لیکن ویکن کا وقت نہیں ہے۔ اگر بندروں نے ہم پر حملہ کر دیا تو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔''

ماموں فرقان نے اکبر کا ہاتھ پکڑا اور اسے جنگل کی طرف کھینچنے لگے۔

پھر جب وہ بندروں کی زد سے نکل آئے تو ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''یہ سب کیا تھا ماموں؟'' اکبر نے پوچھا۔

''یہ جنگل کا اسرار ہے۔'' ماموں فرقان نے گول مول بات کی۔

''اور املی والے بابا۔''

''وہ اس وقت درخت کے نیچے نہیں تھے۔ اگر تھے تو ہم سے ملنا نہیں چاہتے تھے......؟''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' اکبر نے پوچھا۔

''یہ میرا اندازہ ہے، تم جانتے ہو کہ میرے اندازے کس قدر صحیح ہوتے ہیں۔'' ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔

ماموں فرقان کا اندازہ صحیح تھا یا غلط اس کی تصدیق ممکن نہ تھی۔

وہ دونوں طیر کے جنگل سے مایوس لوٹ آئے۔ ان کی ملاقات املی والے بابا سے نہ ہو سکی۔

اکبر کے دل پر گھٹا سی چھا گئی۔ ہر سُو اندھیرا پھیل گیا۔

نیلم خالی گھر میں موجود تھی تو کم از کم اس بات کی اُمید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن آزاد ہو جائے گی

اب وہ اُمید کی کرن بھی ختم ہو گئی تھی۔ سیّد پور کا جن نیلم کو لے اُڑا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ سیّد پور کا جن نیلم کو کہاں لے گیا ہے۔ اب وہ اسے کہاں تلاش کرے گا، کیسے حاصل کرے گا۔

جس سے مدد کی اُمید تھی وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ املی والے بابا کی جگہ بندروں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ماموں فرقان اور دادا غفور جیسے بے بس ہو گئے تھے۔

ان کے پاس جھوٹی تسلیاں رہ گئی تھیں۔

جن کے خالی گھر سے چلے جانے اور اس بات کی شہادت مل جانے کے بعد کہ نیلم جن کے ساتھ گئی ہے، اس بات کی ضرورت تھی کہ نیلم کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع دے دی جائے۔

بابر نے اپنے فرنیچر کے شوروم سے لاہور فون کیا۔ فیاض حسین اپنے دفتر جا چکا تھا۔ واجدہ گھر پر موجود تھی۔ اس نے چیختے فون کا ریسیور اُٹھایا۔ ''ہیلو۔''

''ہاں، واجدہ میں بابر بول رہا ہوں۔''

''بابر بھائی کیا حال ہیں۔'' واجدہ نے پوچھا۔

''واجدہ ادھر ایک حادثہ ہو گیا ہے۔'' بابر علی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''یا اللہ خیر۔'' واجدہ نے فوراً اپنا دل تھام لیا۔ ''کیا ہوا بابر بھائی، نیلم تو خیریت سے ہے؟''

''واجدہ، نیلم کو جن لے اُڑا ہے۔''

''ہائے اللہ۔'' یہ خبر سن کر واجدہ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ''وہ اسے کہاں لے گیا ہے۔ ہائے میری بچی۔''

''کچھ نہیں معلوم۔'' بابر علی نے مایوسی سے کہا۔ ''ماموں فرقان کے لڑکے عرفان نے نیلم کو حیدرآباد اسٹیشن پر کراچی سے جانے والی ایک گاڑی پر دیکھا تھا، جن نے اکبر کا روپ دھارا ہوا تھا۔''

''اوہ میرے خدا، اب کیا ہو گا۔'' واجدہ پر لرزہ طاری تھا۔

''فیاض کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی اپنے آفس کیلئے نکلے ہیں، میں ابھی انہیں اطلاع دیتی ہوں۔'' واجدہ نے کہا۔

''واجدہ، تم لوگ کراچی کیوں نہیں آ جاتے۔'' بابر علی بولا۔

''بابر بھائی، اگر سیٹ مل گئی تو ہم آج شام ہی کراچی پہنچ جائیں گے۔''

''ہاں تم لوگ آ جاؤ تو پھر مل بیٹھ کر سوچیں کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔''

واجدہ اور فیاض حسب پروگرام چھ بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچ گئے۔ سہ پہر کو فیاض نے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی، اس لئے اکبر نے انہیں ایئر پورٹ پر ریسیو کر لیا۔

وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے لیکن یہ بات نہ طے ہوسکی کہ نیلم کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ ماموں فرقان بھی اس مجلس مشاورت میں شامل تھے لیکن کسی کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ مختلف تجاویز پیش ہوئیں، کسی نے کہا کہ نیلم کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروادی جائے لیکن سوال یہ تھا کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کرسکتی تھی۔ دو پولیس افسر پہلے ہی خالی گھر سے سزا پا چکے تھے۔ پھر سوچا کہ اخباروں میں نیلم کی تصویر کے ساتھ ایک اشتہار دیا جائے جس میں نیلم سے مخاطب ہوکر کہا جائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، فوراً اپنے پتے سے آگاہ کرے پھر یہ تجویز بھی مسترد ہوگئی کیونکہ یہ کیا ضروری تھا کہ نیلم اس اشتہار کو دیکھ لے گی، جانے جن نے اسے کہاں لے جاکر رکھا ہوگا۔ نیلم میں اتنی عقل تو ہے کہ وہ اگر اس پوزیشن میں ہوئی تو خود ہی اپنے پتے سے آگاہ کردے گی۔ اس نے اگر اپنے پتے سے آگاہ کر بھی دیا تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ وہ اتنے دن خالی گھر میں رہی تو کسی نے سیّد پور کے جن کا کیا بگاڑ لیا۔

واجدہ اور فیاض دو دن کراچی رہ کر واپس لاہور چلے گئے۔ واجدہ کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اس تصور سے ہی کانپ جاتی تھی کہ جن اس کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے، جانے اس نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

کراچی سے لاہور تک اس کی آنکھوں سے اشک رواں رہے۔

واجدہ اور فیاض حسین کے لاہور جانے کے بعد ان لوگوں نے کرائے کا گھر چھوڑ دیا اور خالی گھر میں واپس آ گئے۔

خالی گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے دادا غفور کو بلوایا گیا۔ اُنہوں نے اس گھر میں جھاڑ پھونک کی، اس گھر کا چپہ چپہ دُھلوایا گیا، ہر کمرے میں اگربتی جلائی گئی۔ قرآن خوانی کروائی گئی تب جاکر یہ لوگ اپنے مکان میں واپس آئے۔

پہلی رات اس مکان میں بڑی بے چین گزری۔ یہ لوگ اس مکان میں شفٹ تو ہوگئے تھے، جھاڑ پھونک اور دوسری احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلی گئی تھیں، پھر بھی ساری رات دھڑکا لگا رہا کہ جانے کدھر سے میاؤں کی آواز آ جائے اور سارا معاملہ تلپٹ ہوجائے۔

اکبر نے اپنے بیڈروم میں سونا چاہا تھا لیکن کسی نے اسے سونے نہیں دیا تھا۔ ''نہیں، اکبر ابھی تم وہاں نہ سونا۔''

تب اکبر مجبوراً گیسٹ روم میں جاکر سو گیا تھا۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔

پھر تمام راتیں خیریت سے گزرنے لگی تھیں۔

کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تھی، کالا بلا دکھائی دیا تھا نہ کوئی اور ڈراؤنی شکل نظر آئی تھی۔ گھر میں سکون پھیل گیا تھا۔

گھر میں تو سکون پھیل گیا تھا لیکن اکبر کا سکون لٹ گیا۔

اب وہ اپنے بیڈروم میں سونے لگا تھا۔ اس بیڈروم سے بڑی دہشت ناک یادیں وابستہ تھیں۔ ان اذیت ناک یادوں کے باوجود اسے اسی کمرے میں سکون ملتا تھا۔ نیلم کا زیادہ تر وقت اسی کمرے میں گزرا تھا۔ وہ اسی بیڈ پر سوئی تھی۔ اس کمرے کی ہر چیز کو اس نے چھوا تھا۔ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوتا تو جانے کیوں اسے یہ احساس ہوتا کہ نیلم اسکے آس پاس ہی ہے۔

باتھ روم کے کواڑ پر لکھی ہوئی اس کی تحریر ''اکبر، میں تمہاری ہوں۔ مجھے بھول نہ جانا۔'' بڑا اثر پاتی۔ وہ جب بھی باتھ روم میں جاتا تو دروازہ بند کرکے لپ اسٹک سے لکھے ہوئے ان سرخ لفظوں کو دھڑکتے دل سے دیکھے جاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ تحریر ہلکی ہوتی جارہی تھی۔

اس تحریر کے علاوہ اس کے پاس نیلم کا ایک خط بھی تھا جو اس نے اس گھر میں آتے ہوئے لکھا تھا۔ اپنی مجبوریاں ظاہر کی تھیں اور پیچھا نہ کرنے کی تنبیہ کی تھی۔

دیوار اور کاغذ پر لکھی ہوئی یہ تحریریں اکبر کی زندگی کا اثاثہ تھیں۔ وہ جب بھی اکیلا ہوتا نیلم کے لکھے لفظ اس کے اردگرد رقص کرنے لگتے، جلنے بجھنے لگتے۔

وہ بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیتا اور ان محبت بھرے لفظوں کو رقصاں دیکھ کر سو جاتا۔

پھر اس نے نیلم کی اس تصویر کو جس میں وہ دلہن بنی ہوئی تھی، خاصا بڑا کروالیا تھا اور اس دو فٹ چوڑے اور ڈھائی فٹ لمبے خوب صورت فریم کو اپنے بیڈ کے سامنے دیوار پر آویزاں کروالیا۔ وہ لیٹتا تو نیلم کا مسکراتا ہوا پورٹریٹ اس کے سامنے ہوتا۔ نیلم کا حسین چہرہ دیکھتے دیکھتے وہ بے اختیار پکار اُٹھتا۔

''نیلم تم کہاں ہو؟''

نیلم کہاں تھی، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ان دو تین مہینوں میں وہ مختلف شہروں میں دکھائی دی تھی۔ مختلف لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔

کراچی سے گئے ہوئے نیلم کو ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے۔ سیّد پور کا جن سب سے پہلے اسے اس کے شہر لے کر پہنچا تھا۔

نیلم اس شہر میں پلی بڑھی تھی، جوان ہوئی تھی۔ اس کے یہاں والدین تھے۔ ڈھیر ساری سہیلیاں تھیں۔ سمن آباد کا وہ گھر جس کے آنگن میں اس نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا اور اس آنگن سے ڈولی میں بٹھایا گیا۔ اسکول، کالج، بچپن کی معصوم شرارتیں، جوانی کی شوخیاں۔

یہاں کیا نہیں تھا۔ اس شہر کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو وہ جھوم سی گئی۔ لاہور سے رخصت ہوئے اگر چہ ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سال دو سال کے بعد لاہور واپس پلٹی ہے۔ بے شمار یادوں نے اسے آ گھیرا۔ ہر طرف سے خوشبوئیں سی آنے لگیں۔

پلیٹ فارم پر اتر کر اس نے سیّد پور کے جن کی طرف دیکھا۔ وہ اکبر بنا ہوا تھا۔ وہ ہو بہو اکبر تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اکبر نہیں ہے۔ بس وہ اپنی آنکھوں سے مار کھاتا تھا۔ ان آنکھوں کو چھپانے کیلئے اس نے سیاہ چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔

”قرل۔“ نیلم اس سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں۔“ سیّد پور کے جن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”میں اپنے گھر جاؤں گی۔“

”کہاں، کراچی؟“ سیّد پور کے جن نے سوٹ کیس اُٹھایا اور آگے بڑھا۔ نیلم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”نہیں، اپنے ماں باپ کے گھر۔“

”لیکن یہ بات تو راستے میں طے ہو چکی ہے کہ تم اپنے والدین کے گھر نہیں جاؤ گی۔“

”کیا ہو جائے گا اگر چلی جاؤں گی تو۔“

”اب بے وقوفی کی باتیں نہ کرو، تم اپنے گھر گئیں تو بہت خرابی پیدا ہو جائے گی۔ وہ لوگ تم پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب تم پر میرے سوا کسی کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ٹھہریں گے تم جہاں کہو گی میں تمہیں لے چلوں گا، خوب گھومو پھرو، عیش کرو، ہم اس لئے کراچی سے نکلے ہیں۔“

یہ سن کر نیلم خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ سیّد پور کا جن بہت ضدی ہے، جس بات کی ٹھان لیتا ہے وہ کر کے چھوڑتا ہے۔

ٹیکسی لے کر وہ شہر کے ایک بڑے ہوٹل پہنچے۔ کمرے میں پہنچ کر نیلم نے چائے منگوائی۔ چائے پی کر وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ سیّد پور کے جن نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور جب وہ واپس پلٹا تو کالا بلا بن چکا تھا۔ وہ اچھل کر بیڈ پر آیا اور نیلم کے خوب صورت پیروں سے لپٹنے لگا۔

دوسرے دن وہ اسے جہانگیر کے مقبرے کی سیر کرانے لے گیا۔ نیلم کا وہاں دل نہ لگا تو وہ اسے راوی کنارے لے گیا۔ کشتی میں بٹھایا۔

سیّد پور کے جن نے انسانی روپ ضرور دھار لیا تھا لیکن وہ انسان نہ تھا۔ اس لئے اس سے کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ چشمہ لگانا بھول جاتا تو نیلم اسے ٹوکتی۔

اس وقت وہ کشتی کو چپوؤں سے چلاتے چلاتے جن بن گیا۔ نتیجے میں کشتی خود بخود حرکت میں آ گئی اور اس طرح چلنے لگی جیسے موٹر بوٹ چلتی ہے۔ کنارے پر کھڑے لوگوں نے اس کشتی کو بڑی حیرت سے دیکھا جو بغیر چپوؤں کے چل رہی تھی۔

تب نیلم نے گھبرا کر اسے ٹوکا۔ ”قرل، یہ کیا کر رہے ہو؟“

سیّد پور کے جن کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ انسان بن کر اپنے ہاتھوں سے کشتی کھینے لگا۔

راوی سے واپسی پر سیّد پور کے جن نے انارکلی کا رخ کیا۔ وہ نیلم کو کچھ شاپنگ کرانا چاہتا تھا۔ نیلم نے انارکلی کے بانو بازار میں اپنی پرانی دکان کا رخ کیا۔ یہ کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ واجدہ ہمیشہ یہیں سے کپڑا خریدتی تھی۔ اس دکان کا مالک ریاض اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ نیلم نے کچھ سوچ کر ہی اس دکان کا رخ کیا تھا۔

نیلم دکان میں داخل ہوئی تو دکان کا مالک ریاض اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

”آیئے نیلم بی بی، اچھا صاحب بھی ساتھ ہیں۔“

پھر ریاض نے سیّد پور کے جن کو سلام کیا اور ہاتھ ملانے کیلئے آگے بڑھایا۔

سیّد پور کے جن نے بڑی خوش اخلاقی سے اس کے سلام کا جواب دیا لیکن پتلون کی جیب سے اپنا ہاتھ نہ نکالا تب ریاض نے جھینپ کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور نیلم سے مخاطب ہوا۔

”آپ کب آئیں نیلم بی بی؟“

”میں کل آئی اور سنائیں آپ کیسے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، کل ہی تو بیگم صاحبہ سے فون پر بات ہوئی ہے۔ ان کے مطلب کا کپڑا آیا ہوا ہے اس لئے میں نے فون کیا تھا کہ آ کر دیکھ جائیں۔ انہوں نے آج آنے کا وعدہ کیا ہے لیکن بیگم صاحبہ نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔“

”بھول گئی ہوں گی۔“ نیلم نے یہ کہہ کر سیّد پور کے جن کی طرف دیکھا جو بت بنا کرسی پر بیٹھا تھا۔

”آپ کو کیا دکھاؤں بی بی؟“ ریاض بولا۔

”کوئی نیا کپڑا آیا ہو تو بتائیں۔“

پھر نیلم نے دو سوٹوں کا کپڑا خریدا، ادائیگی کی اور وہ دونوں بانو بازار سے نکل آئے۔

بازار کی ایک گلی سے یہ دونوں باہر نکلے تو دوسری گلی سے واجدہ اور فیاض داخل ہوئے۔

سیّد پور کے جن کو انسانوں کے درمیان رہ کر بے چینی شروع ہو جاتی تھی۔ انارکلی میں خاصا رش تھا۔ اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے نیلم کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے مال روڈ کی جانب نکل گیا۔ پھر ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل کا رخ کیا۔

سیّد پور کا جن نیلم کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لاہور کا چپہ چپہ اسے دکھایا تھا۔ وہ جگہیں بھی دکھا دی تھیں جنہیں اس نے لاہور میں رہتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نیلم کے منہ سے نکلا ہوا لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ذرا بھی خواہش کرتی سیّد پور کا جن فوراً اس کی فرمائش پوری کر دیتا لیکن نیلم کے دل کی کلی پھر بھی نہ کھلتی۔ بس وہ اس کا دل رکھنے کیلئے مسکرا دیتی۔

کراچی سے نکلے ہوئے اور لاہور میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ سیّد پور کا جن ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ اس وقت بھی وہ ہوٹل کے کمرے میں اس کی ناز برداریوں میں مصروف تھا۔ نیلم کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سامنے بیٹھا اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اس وقت وہ شہزادے کے روپ میں تھا اور اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

''کیوں دیکھ رہے ہو ایسے مجھے کھا جانے کا ارادہ ہے۔''

''نیلم میں تمہیں کھا جانے والی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہا۔''

''اچھا پھر۔'' نیلم نے طنزاً کہا۔

''میں تو بڑی محبت کی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔''

''محبت کی نظر۔'' نیلم نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''دنیا کا کوئی انسان تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکتا جو میں نے تمہیں دیا ہے لیکن پھر بھی تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آتی۔ نیلم میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔ مجھے بتاؤ میں ایسا کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ، اچھا ٹھہرو۔''

پھر سیّد پور کا جن اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے پیر سے چپل اتار کر ایک طرف رکھے۔ اس کے خوب صورت پیروں کو اس طرح دیکھا جیسے سیلز مین جوتوں کے سائز کا اندازہ کرنے کیلئے دیکھتا۔

سیّد پور کے جن نے ایک ہاتھ خلا میں پھیلایا تو اسی لمحے اس کے ہاتھوں پر موتیوں کی مالا ظاہر ہو گئی۔ پھر اس نے دوسرا ہاتھ پھیلایا اس ہاتھ پر بھی موتیوں کی ایک لمبی سی مالا آ گئی۔

''نیلم یہ دنیا کی بیش قیمت موتی ہیں جو میں تمہارے ان حسین پیروں کی نذر کر رہا ہوں۔'' سیّد پور کے جن نے یہ کہہ کر موتیوں کی مالائیں اس کے پیروں میں ڈال دیں۔

نیلم نے تھوڑا آگے ہو کر اپنے پیروں کو دیکھا اور ایک جھٹکا دے کر ان موتیوں کو پرے کر دیا۔

''مجھے نہیں چاہئے کچھ۔'' اس نے بڑی تمکنت سے کہا۔

تب سیّد پور کے جن نے اس کے پیر پکڑ لئے اور اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔

نیلم تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''یہ کیا کرتے ہو؟''

''پھر میں کیا کروں، کس طرح تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاؤں۔ مجھے بتاؤ میں اور کیا کروں؟''

''مجھے آزاد کر دو۔'' نیلم نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر سیّد پور کے جن کے تیور بگڑ گئے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور اس نے ایک ہاتھ گھما کر نیلم کے منہ پر مارا۔ نیلم تھپڑ کھا کر کرسی سے ٹکرائی اور بیڈ پر گر گئی۔

''آج کے بعد سے تمہارے منہ سے یہ جملہ نہ سنوں اور اگر آئندہ تم نے آزادی کی بات کی تو ایسی سزا دوں گا کہ لوگ تمہیں دیکھ کر عبرت پکڑیں گے۔ یاد رکھو اب تم نے میرے ساتھ ہی مرنا جینا ہے۔''

نیلم نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر بہت دیر تک سسکتی رہی۔

اور جب تک وہ روتی رہی تب تک سیّد پور کا جن ہاتھ جوڑے اس سے بڑی عاجزی سے معافیاں مانگتا رہا۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ نیلم اور سیّد پور کا جن کہیں گھوم کر ہوٹل واپس آئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ یہ لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے تو نیلم کی نظر اچانک سامنے پڑی۔

اگرچہ واجدہ اور فیاض کی اس طرف پشت تھی لیکن نیلم کو اپنے والدین کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔

نیلم نے بڑی بے قراری سے آواز دی۔ ''ابو''

سیّد پور کے جن نے بھی واجدہ اور فیاض کو دیکھ لیا تھا۔ فیاض حسین اس شہر کا ایک بڑا فلم ڈسٹری بیوٹر تھا۔ وہ اس ہوٹل میں کسی فلمی تقریب میں شریک ہونے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ نیلم بھاگ کر ان دونوں کے نزدیک جاتی یا وہ اس کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوتے، سیّد پور کے جن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نیلم کا وہ قدم جو اپنے والدین کی طرف اُٹھنے والا تھا، رک گیا۔

سیّد پور کے جن نے پھر اسے گھور کر دیکھا تب نیلم کو کچھ ہوش نہ رہا۔

جب اس کو ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ خود کو ہوٹل کے کمرے میں پا کر وہ ایک دم تڑپ کر اُٹھی اور ہذیانی انداز میں چیخی۔ ''ابو، میرے ابو۔''

''نیلم یہ کیا پاگل پن ہے، یہ کیا پاگل پن تھا۔ اگر وہ لوگ تمہاری پکار سن لیتے، پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو کیا ہوتا۔''

''اے کاش! وہ میری آواز سن لیتے۔'' نیلم نے بڑی حسرت سے کہا۔

''وہ اگر تمہاری آواز سن لیتے، پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو کیا ہوتا کچھ نہیں ہوتا، بس ایک تماشا ہوتا، وہ

تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو نقصان اُٹھاتے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مزید اس شہر میں نہیں رہیں گے۔“

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کیا جواب دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ سیّد پور کے جن کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ وہ نیلم کو لاہور لا سکتا تھا تو لاہور سے لے جانے کا حق بھی رکھتا تھا۔

نیلم اپنے شہر میں ایک دھندلی آس کے سہارے چلی آئی تھی۔ کیا پتہ وہاں کیا صورت حال پیش آئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور اس کی جان سیّد پور کے جن سے چھوٹ جائے۔

والدین سے ملنے اور گھر نہ جانے کا وعدہ جن نے نیلم سے لے لیا تھا۔ اس نے وعدہ کر بھی لیا تھا لیکن یہ سچا وعدہ نہ تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ لاہور میں جب بھی کوئی آزادی کی کرن دکھائی دے گی وہ فوراً اس کے پیچھے لپکے گی۔ اس قفس کی تتلیاں توڑنے کی کوشش کرے گی، کوئی راہ فرار تلاش کرے گی اور ایسا اس نے کر بھی لیا تھا۔

اس نے اپنے والدین کو اس شہر میں موجودگی کی خبر بھجوا دی تھی۔

وہ انار کلی کے بانو بازار میں شاپنگ کی غرض سے نہ گئی تھی، وہ وہاں ریاض کو اپنا چہرہ دکھانے گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ واجدہ اس دکان پر اکثر چکر لگاتی رہتی ہے یا پھر ریاض خود ہی کسی نئے کپڑے کی آمد پر اسے فون کر دیتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ریاض اسے اپنی دکان پر دیکھے گا تو اس کی آمد کا ذکر ضرور کرے گا۔ اس طرح واجدہ اور فیاض حسین کو اس کے لاہور میں ہونے کا علم ہو جائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

اس کی یہ ترکیب کامیاب ہو گئی تھی۔ دکان پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ واجدہ آج دکان پر آنے والی ہے۔ اگر وہ کچھ دیر اور وہاں ٹھہر جاتی، سیّد پور کا جن اس بازار سے نکلنے کی کوشش نہ کرتا تو دکان پر اس کی واجدہ اور فیاض سے ملاقات یقینی تھی۔ اس دن وہ ایک گلی سے نکلے تھے تو دوسری گلی سے اس کے والدین داخل ہوئے تھے۔

ریاض نے انہیں خوش آمدید کہنے کے بعد سب سے پہلے نیلم کا ذکر کیا۔

”بیگم صاحبہ، نیلم بی بی آئی تھیں۔ ان کے صاحب بھی ساتھ تھے۔ وہ ابھی دو سوٹوں کا کپڑا لے کر گئی ہیں۔“

”نیلم بی بی!“ واجدہ نے بڑی حیرت سے کہا اور پھر فیاض کی طرف دیکھا۔

فیاض نے آنکھوں آنکھوں میں واجدہ کو اشارہ کیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ دکان کے مالک ریاض کو نیلم کے بارے میں کسی بات کا علم ہو۔

پھر اُنہوں نے باتوں باتوں میں ساری تفصیل جان لی لیکن اس تفصیل میں کوئی ایسی بات نہ تھی

جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ نیلم کہاں ٹھہری ہے اور ظاہر ہے اس بات کا معلوم ہونا ممکن نہ تھا۔ واجدہ اور فیاض نے یہ بات سمجھ لی کیونکہ سیّد پور کا جن اس کے ساتھ تھا اور اس کے سامنے وہ کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس دکان تک آ گئی تھی یہی اس نے خاصا عقل مندی کا کام کیا تھا۔

اس نے کم از کم اس شہر میں اپنی موجودگی کا احساس تو دلا دیا تھا۔

وہ کہاں تھی؟ اس بارے میں جان لینا آسان نہ تھا۔ لاہور کوئی چھوٹا شہر نہ تھا۔ اس شہر میں نیلم کا پتہ چلا لینا کسی طرح ممکن نہ تھا پھر یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ کچھ دن لاہور میں قیام کرے گی یا جن اسے صبح ہی کسی اور شہر کی سیر کرانے لے جا چکا ہوگا۔

گھر پہنچ کر واجدہ نے سب سے پہلے کراچی فون پر بات کی۔ اتفاق سے اکبر نے ریسیور اُٹھایا۔

”اکبر، نیلم یہاں لاہور میں ہے۔“ واجدہ نے دھماکہ خیز خبر سنائی۔

”کیا وہ آپ کے گھر پہنچ گئی۔“

”نہیں وہ یہاں نہیں آئی اور اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ آج شام وہ ایک کپڑے کی دکان پر آئی تھی۔ اس دکان کا مالک ہمارا پرانا واقف ہے۔ اس دکان سے اس نے دو سوٹوں کا کپڑا خریدا اور چلی گئی۔“

”کیا وہ اکیلی تھی؟“

”نہیں اس کے ساتھ سیّد پور کا جن تھا اور دکان کے مالک نے اسے تمہاری شکل میں دیکھا۔ دکان کا مالک ریاض، نیلم کی شادی میں موجود تھا۔ اس نے تمہیں دیکھا ہوا ہے۔ وہ تمہیں پہچانتا ہے۔“

”اچھا خالہ، آپ میرا انتظار کریں۔ میں لاہور پہنچ رہا ہوں۔“

پھر اکبر دوسرے دن لاہور پہنچ گیا۔

اُدھر اکبر لاہور پہنچا اِدھر نیلم کو فون کرنے کا موقع مل گیا۔

جب سے نیلم، ریاض کی دکان سے ہو کر آئی تھی اس کے دل میں کھلبلی سی مچی تھی۔ وہ پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ اس کے والدین کو اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ نیلم کو کہاں ڈھونڈیں، ہو سکتا ہے اُنہوں نے اکبر کو بھی فون کر دیا ہو اور اکبر لاہور بھی پہنچ چکا ہو۔

سیّد پور کا جن ہر وقت اس پر سوار رہتا تھا۔ کبھی وہ شہزادے کے روپ میں ظاہر ہو جاتا تھا کبھی کالا بلا بن جاتا، ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلتا تو اکبر کی شکل اختیار کر لیتا غرض کسی نہ کسی روپ میں وہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا۔

ریاض کی دکان سے آنے کے بعد نیلم اس فکر میں تھی کہ کسی طرح گھر فون کر کے بتا دے کہ وہ

اس وقت کہاں ہے؟ وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ سیّد پور کا جن کچھ دیر کیلئے کمرے سے غائب ہو تو وہ فون کرے۔

پھر اسے موقع بھی مل گیا۔ سیّد پور کا جن نیلم کے ناشتہ کرنے کے بعد سے کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی پھری۔ کبھی لیٹ جاتی کبھی ٹہلنے لگتی، باتھ روم بھی گئی لیکن اسے کہیں اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔

کمرے میں کہیں سیّد پور کا جن موجود نہ تھا۔

تب اس نے جلدی سے ریسیور اُٹھا کر آپریٹر کا نمبر ملایا اور اس کو اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور فوراً ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

چند سیکنڈ کے بعد گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اُٹھایا۔ آپریٹر نے بتایا کہ بیل جا رہی ہے۔

پھر ادھر سے کسی نے ریسیور اُٹھایا اور آہستہ سے ''ہیلو۔'' کہا۔

اس آواز کو سن کر نیلم کے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ ادھر سے فون اُٹھانے والا اکبر تھا۔

''اکبر تم۔''

''نیلم تم۔''

''تم کب آئے؟''

''تم کہاں ہو؟ اپنا پتہ بتاؤ۔''

''اکبر میں......''

نیلم ہوٹل کا نام اور پتہ بتانے لگی تھی کہ اچانک کہیں سے نمودار ہو کر کالے بلے نے نیلم پر چھلانگ لگائی۔ کالے بلے کا گدھے جیسا وزن وہ برداشت نہ کر سکی۔ بیڈ سے نیچے قالین پر گری، اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

''نیلم، نیلم خدا کے واسطے اپنا پتہ بتاؤ تمہیں کیا ہوا۔'' اکبر نے بے قراری سے کہا۔ ''تم کہاں ہو۔''

جواب میں ٹیلیفون پر کالے بلے کی غراہٹ سنائی دی۔

''ہیلو، ہیلو......نیلم......نیلم......تم کہاں ہو نیلم۔'' اکبر چیخا۔

سیّد پور کے جن نے انسانی شکل اختیار کر کے ریسیور خاموشی سے کریڈل پر رکھ دیا۔

فون بند ہوتے ہی اکبر کے دل پر دھواں سا چھا گیا۔ نیلم کی آواز سن کر جو اُمید بندھی تھی، جو خوشی ہوئی تھی، وہ آناً فاناً ختم ہو گئی۔

نیلم فون پر پتہ نہ بتا سکی تو کیا ہوا اکبر نے اس کال سے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہ کہاں سے ہو سکتی ہے۔ نیلم کسی کے گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کے گھر جن نیلم کو لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ فون کسی پبلک

بوتھ سے بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ فون کسی ایسی جگہ سے کیا گیا تھا جہاں نیلم اکیلی تھی، جن کہیں گیا ہوا تھا اور یہ جگہ کسی ہوٹل کا کمرہ ہی ہو سکتی تھی۔

اگلے دو دنوں میں اکبر اور فیاض حسین نے مل کر لاہور کے کئی بڑے چھوٹے ہوٹل چھان مارے۔ کاؤنٹر پر نیلم نام کی لڑکی کا پتہ کیا مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رات کو ایک بڑے ہوٹل میں کوئی فلمی تقریب تھی۔ فیاض اور واجدہ وہاں چلے گئے۔ اکبر کو بھی اُنہوں نے لے جانا چاہا مگر اکبر نے انکار کر دیا۔ اس کے سر میں درد تھا، اس نے گھر پر رہنا بہتر سمجھا۔

یہاں واجدہ اور فیاض کی ملاقات نیلم سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دوسرے دن صبح ہی سیّد پور کے جن نے لاہور چھوڑ دیا۔

فیاض اور اکبر نے لاہور کے تمام قابل ذکر ہوٹل چھان مارے تھے اور اب ایک ہی ہوٹل رہ گیا تھا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔

اب تک وہ صرف نیلم کا نام بتا کر اس کے بارے میں معلومات کرتے رہے تھے۔ آج فیاض نے کاؤنٹر پر نیلم کی تصویر رکھی اور اس کے بارے میں معلومات چاہیں۔

ریسپشنسٹ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑا اور بولا۔ ''یہ لوگ آج ہی تو یہاں سے گئے ہیں۔''

پھر اس کی نظر اکبر پر پڑی۔ اکبر کی صورت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ ایک نظر اس نے فیاض کو دیکھا پھر اکبر کو دیکھا، اس کے بعد نیلم کی تصویر پر نظر ڈالی اور گھبرا کر بولا۔ ''سر یہ آپ لوگوں کو پوچھ رہے ہیں۔''

''میں وہ نہیں ہوں۔'' اکبر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اس لڑکی کے ساتھ جانے والا میرا ہم شکل ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔''

''اوہ۔'' ریسپشنسٹ ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ ''نہیں، سر وہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔''

یہ جواب سن کر دونوں کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔

نیلم کے کپڑے کی دکان پر دیکھے جانے اور فون کی آمد سے اس بات کی توقع ہو گئی تھی کہ وہ اسی شہر میں ہے اور ایک نہ ایک دن مل جائے گی۔

تمام ہوٹلوں کی خاک چھاننے کے بعد نیلم کا پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ لاہور چھوڑ گئے۔

اب وہ کہاں گئے، یہ کون بتا سکتا تھا۔

اکبر دلبر داشتہ ہو کر لاہور سے کراچی واپس آ گیا۔

پھر نیلم اسلام آباد میں دیکھی گئی۔ نیلم کی ایک دوست بینا نے اسے ایک جنرل اسٹور سے نکلتے دیکھا۔ وہ ایک کالی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس چادر سے اس کی پیشانی بھی ڈھکی ہوئی تھی۔

بینا نے اسے دیکھ کر کئی آوازیں دیں مگر وہ رکی نہیں۔

وہ رکتی کیسے؟

جیسے ہی بینا نے اسے پکارا سیّد پور کے جن نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تیزی سے کھینچتا ہوا اس گاڑی میں جا بیٹھا جو ہوٹل سے کرائے پر لی گئی۔

پھر نیلم آناً فاناً بینا کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ بینا کو اس کی اس بے اعتنائی پر بڑا دکھ ہوا، شادی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی اپنے دوستوں کو بھول جائے۔

تین، چار دن کے بعد جب بینا لاہور واپس پہنچی تو اس نے نیلم کے گھر فون کیا۔ واجدہ نے فون اُٹھایا، بینا نے واجدہ سے اسلام آباد میں نیلم سے ملاقات کا ذکر کیا اور اس کے رویے کی شکایت کی۔

فیاض کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ نیلم اسلام آباد میں دیکھی گئی ہے، وہ فوراً اسلام آباد پہنچا۔ اس مرتبہ اس نے نیلم کی تلاش فائیو اسٹار ہوٹلوں سے کی۔

ایک ہوٹل میں ان کا پتہ چل گیا لیکن پتہ چلنا بے کار ہی رہا کیونکہ ایک رات پہلے وہ ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔ فیاض نے دو، تین ہوٹل اور چیک کیے کہ شاید کسی اور ہوٹل میں شفٹ ہوگئے ہوں لیکن یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔

سیّد پور کا جن اسلام آباد چھوڑ چکا تھا۔

پھر فیاض کے ایک دوست نے نیلم کو مری میں دیکھا۔ وہ ''اکبر'' کے ساتھ ایک ہوٹل سے نکل رہی تھی۔

جب فیاض کو یہ معلوم ہوا کہ نیلم مری میں ہے تو اس نے فوراً مری کا رخ کیا۔ بڑے ہوٹلوں سے اس کی تلاش شروع کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

مری کے کسی ہوٹل میں ان کا اندراج نہ تھا۔ اس مرتبہ وہ شاید ہوٹل میں نہیں ٹھہرے تھے یا پھر فیاض کا دوست فریب نظر کا شکار ہوا تھا۔

فیاض دو چار دن رہ کر مری سے مایوس لوٹ آیا۔

سیّد پور کا جن اور نیلم مری میں موجود تھے۔ سیّد پور کے جن نے اس مرتبہ کسی ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے ایک ایسے بنگلے کا رخ کیا جو ایک خوب صورت مقام پر اور بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ بنگلہ کراچی کے ایک بزنس مین کا تھا جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہ بنگلہ سارا سارا سال خالی ہی رہتا تھا، کبھی کبھار بزنس مین اور اس کے بیوی بچے ادھر کا رُخ کرتے تھے۔ آتے بھی تھے تو دس بارہ دن سے زیادہ نہ رہتے، پھر سارا سال یہ بنگلہ مقفل رہتا۔

سیّد پور کے جن نے اس بنگلے میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ یہ بڑا موزوں بنگلہ تھا۔ نیلم کا یہاں رہ کر بیرونی

دُنیا سے رابطہ ممکن نہ تھا۔ اس بنگلے میں ٹیلی فون تھا نہ آس پاس کوئی گھر تھا۔ بنگلہ بھی کافی اونچائی پر تھا۔ یہاں سے فرار ہو کر (اوّل تو یہاں سے فرار ہونا ممکن ہی نہ تھا) لوگوں کے درمیان پہنچنا اتنا آسان نہ تھا۔

سیّد پور کا جن اس پرفضا مقام پر آکر بہت خوش تھا۔ انسانوں سے دُوری اور مکمل تنہائی۔ یہاں دادا غفور تھے نہ ماموں فرقان، نیاز محمد تھا نہ املی والا بابا۔ وہ بڑے سکون سے یہاں زندگی گزار سکتا تھا۔

شروع کے ایک دو دن سیّد پور کا جن مری کے پُررونق علاقے میں گھوما تھا۔ نیلم کو شاپنگ بھی کرائی تھی، ہوٹلوں میں بھی بیٹھے تھے، اس کے بعد اس نے نیلم کو انسانوں کے درمیان لے جانے سے احتراز کیا تھا۔ وہ گھر سے نکلتے اب بھی تھے لیکن سیّد پور کے جن کی کوشش ہوتی کہ کسی انسان کی ان پر نظر نہ پڑے۔

سیّد پور کا جن بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا، پریوں جیسی ایک حسین ترین لڑکی اس کے گھر میں تھی۔ پرفضا مقام تھا، یخ بستہ ہوائیں تھیں، چاندنی راتیں تھیں، خوشبوئیں تھی، ریشمیں بدن کی مہک تھی۔ کیا نہیں تھا یہاں سب کچھ تھا۔

عذاب میں تو نیلم تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ ہر وقت شعلوں میں گھری رہتی تھی، تپش تھی، بدن کو جھلسا دینے والی آگ تھی۔ سیّد پور کا جن ایک عذاب کی صورت میں اس پر مسلط تھا۔ وہ اپنے پیاروں سے دُور تھی اور تنہائی کے دوزخ میں جھلس رہی تھی یہاں کیا تھا، کچھ نہیں تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ سیّد پور کے جن کو نیلم سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس کی زلف کا اسیر تھا، اس سے بے پناہ عشق تھا، وہ نیلم کو خوش رکھنا چاہتا تھا لیکن آگ اور پانی کا بھی کبھی ملاپ ہوا ہے۔

سیّد پور کا جن صحرا کی آگ تھا تو نیلم بادل کے ایک ٹکڑے سے برستی بارش۔ آگ، پانی کو چاٹے جا رہی تھی۔ آہیں اور کراہیں، رونا اور سسکنا بس یہی شب و روز تھے نیلم کے۔

اس آگ میں جلتے ہوئے اسے کئی ماہ ہوگئے تھے۔ شعلوں نے اس کا بدن چاٹ لیا تھا، روح تک جھلس گئی تھی اس کی بات کوئی سننے والا نہ تھا، وہ کس سے اپنا دُکھڑا روتی۔

اس کا دل دُکھ سے بھر گیا تھا۔

تنہائی تیر بن کر اس کے کلیجے میں ترازو ہوگئی تھی۔

وہ تکیے پر اپنا سر پٹک پٹک کر رہ جاتی تھی، آنکھوں سے آنسو بہتے تو رُکنے کا نام نہ لیتے۔ سیّد پور کا جن اسے روتے ہوئے دیکھتا تو فوراً شہزادے کے رُوپ میں اس کی طرف بڑھتا۔

نرم ملائم رومال سے اس کی آنکھوں کے موتی احتیاط سے جمع کرتا اور کہتا۔

''نیلم روتی کیوں ہو؟''

"نیلم روئے نہیں تو اور کیا کرے؟" نیلم اپنا خوب صورت چہرہ نرم ملائم تکیے میں چھپا لیتی۔

"تمہیں کیا دکھ ہے۔" سیّد پور کا جن انجان بن کر پوچھتا۔

"تم نہیں جانتے قرل مجھے کیا دکھ ہے، جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہو۔ یہ سنگدلی کی انتہا ہے۔" وہ غصے سے کہتی۔

"تم مجھ پر حکومت کرتی ہو، میرے دل پر راج کرتی ہو۔ جو کہتی ہو وہ ایک لمحے میں ہو جاتا ہے۔ میں نے دُنیا کے بیش قیمت ہیرے جواہرات تمہارے قدموں میں ڈال دیئے ہیں۔ تمہاری ہر فرمائش کو میں نے حکم سمجھ کر پورا کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" سیّد پور کے جن نے اس کی زلفوں میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں چاہئیں تمہارے ہیرے جواہرات۔"

"میں نے تمہیں ہیرے جواہرات ہی نہیں دیئے تمہیں محبت بھی دی ہے۔"

"تم نے محبت دی نہیں، تم نے کسی کی محبت چھینی ہے۔" نیلم نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"اسے بھول جاؤ، اسے اب تم زندگی بھر نہ پا سکو گی۔"

"قرل کیا، میں ہمیشہ تمہاری قید میں رہوں گی، کیا میں کبھی آزاد نہ ہو سکوں گی۔"

"نہیں، کبھی نہیں۔" سیّد پور کے جن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"میں مر جاؤں گی۔"

"مر کر بھی چین نہ پا سکو گی۔" وہ ہنسا۔

"کیا تم نے میری روح کو بھی خرید لیا ہے؟" وہ اداسی سے کہتی۔

"ہاں ایسا ہی سمجھو۔"

ان دونوں کے درمیان اسی طرح کی گفتگو جاری رہتی۔ نہ وہ کچھ سمجھتی نہ وہ کچھ اسے سمجھا پاتا۔ وہ دریا کے دو کنارے تھے جو کبھی آپس میں نہیں ملتے لیکن اس آگ کے دریا میں آگ نے کناروں کو ملا رکھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک آگ پھیلی ہوئی تھی۔

ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

لاہور میں نیلم کے والدین واجدہ اور فیاض اس آگ میں جھلس رہے تھے۔

تو کراچی میں اکبر اس آگ میں تپ رہا تھا۔

کواڑ کے پیچھے لکھی ہوئی تحریر تین ماہ بعد خاصی دھندلی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک موجود تھی۔ وہ باتھ روم میں جا کر گھنٹوں اس تحریر کو دیکھتا رہتا۔

"اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔"

ان لفظوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

اب موسم بدل گیا تھا۔ سردی نے گرمی کیلئے جگہ چھوڑ دی تھی لیکن اکبر کے دل کا موسم نہ بدلا تھا۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تب سے اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھائی ہوئی تھی جو کھلتی تھی نہ برستی تھی۔

ماموں فرقان گلشن آتے رہتے تھے۔

دادا غفور سے بھی ان کی ملاقاتیں جاری تھیں۔

لیکن کہیں سے ابھی تک اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تھی۔

وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو نیلم کی من موہنی صورت اس کے سامنے آتی۔ وہ خیال ہی خیال میں اس سے باتیں کرنے لگتا۔ خود ہی سوال کرتا، خود ہی جواب دیتا۔

نیلم، نیلم کرتے وہ خود ہی نیلم ہو گیا تھا۔

نیلم کو گھر سے گئے ہوئے جب تین ماہ ہو گئے اور اس کی کوئی خبر نہ ملی، سب تھک ہار کر بیٹھ گئے تو صابرہ کے دل نے پھر انگڑائی لی۔

اکبر، صابرہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے اِدھر اُدھر گرے پڑے دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکبر، نیلم کی جدائی کے غم میں خود کو بیمار ڈال دے۔

تب صابرہ نے ایک دن اپنے شوہر سے بات کی۔

"اب کیا کرنا ہے جی؟"

"کس بات کا؟" بابر نے پوچھا۔

"میں اکبر کی بات کر رہی ہوں۔"

"کیا ہوا اسے؟"

"آپ تو بعض اوقات اتنے معصوم بن جاتے ہیں کہ نظر اُتارنے کو جی چاہتا ہے۔" صابرہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"پھر کھل کر اور صاف صاف بات کریں۔" بابر علی نے ہنس کر کہا۔

"اکبر کی حالت دیکھی ہے آپ نے۔" صابرہ نے بڑے دُکھ سے کہا۔

"ہاں، روز ہی دیکھتا ہوں۔"

"مجھ سے اس کی شکل نہیں دیکھی جاتی، اس کی صورت دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ وہ دن بدن سوکھتا جا رہا ہے، چہرے کی رنگت بالکل زرد ہو گئی ہے۔ ہر وقت خلاؤں میں گھورتا نظر آتا ہے۔ اب تو اس نے بولنا بھی ترک کر دیا ہے۔ شوروم سے آتا ہے تو اپنے کمرے میں جا گھستا ہے۔

اس طرح تو یہ لڑکا بالکل تباہ ہوجائے گا۔''

''ہاں میں اس کی حالت دیکھ رہا ہوں، وہ شوروم پر بھی کھویا کھویا بیٹھا رہتا ہے۔ گاہک کچھ پوچھ رہا ہوتا ہے وہ جواب کچھ اور دے رہا ہوتا ہے۔'' بابر علی نے فکرمندی سے کہا۔

''پھر اس کیلئے کچھ کریں نا۔''

''میرے ہاتھ میں اگر کچھ ہوتا تو اب تک کب کا کر چکا ہوتا۔ اسے نیلم چاہئے، میں نیلم کہاں سے لاؤں۔'' بابر نے حقیقت بیان کی۔

''آپ کوئی اور نیلم تلاش کیوں نہیں کرتے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس کی دوسری شادی کر دی جائے۔''

''ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے وہ دوسری شادی کیلئے راضی ہوجائے گا؟''

''اسے ہونا پڑے گا۔'' صابرہ نے بڑے یقین سے کہا۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو، اپنی بے وقوفی میں بیٹے سے ہاتھ نہ گنوا بیٹھنا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' صابرہ نے فوراً اپنا کلیجہ تھام لیا۔ ''کیوں بدفال منہ سے نکالتے ہیں۔''

''تم زبردستی اس کی شادی کروگی تو کیا وہ گھر میں رہے گا۔'' بابر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہ شادی کیلئے راضی نہ ہوگا؟''

''ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔'' بابر علی نے صاف گوئی سے کہا۔

''تمہارا خیال غلط ہے۔'' صابرہ بڑے یقین سے بولی۔

''پھر اپنے بیٹے سے بات کر کے دیکھ لو۔'' بابر علی نے کہا اور رُخ پھیر کر سو گیا۔

صابرہ نے ایک دن موقع دیکھ کر اکبر سے بات کی۔ وہ شادی کا نام سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

''امی، آپ کیا بات کرتی ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''نیلم کی آس چھوڑ دو وہ چلی گئی ہے، وہ اب واپس نہیں آئے گی۔''

''امی ایسی مایوسی کی بات نہ کریں، میرا دل نہ توڑیں، میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن ضرور واپس آئے گی۔'' اکبر نے کہا۔

''اکبر، کچھ عقل کی بات کر۔'' صابرہ نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ ''خدا کا شکر ادا کر کہ وہ سیّدپور کا جن اس گھر کو چھوڑ گیا۔''

''ہاں، وہ اس گھر کو تو چھوڑ گیا لیکن میرا سب کچھ لے گیا۔''

''کچھ نہیں گیا، تجھے نیلم جیسی ہزار لڑکیاں مل جائیں گی۔ وہ کون سی واجدہ کی سگی بیٹی تھی۔

ملازمہ کی اولاد تھی۔ ایسی لڑکیوں کا کیا غم کرنا۔'' صابرہ نے نیلم کو اس کے دل سے اُتارنے کی کوشش کی۔

''امی، میں آپ کو ایک بات بتادوں اگر نیلم مجھے نہ ملی تو میں زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باتھ روم میں چلا گیا۔

اس نے دروازہ دھاڑ سے بند کیا تو نیلم کی تحریر اس کے سامنے آگئی۔

''اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔''

''ہاں نیلم، تم میری ہو۔ میں تمہیں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' اکبر کی آنکھوں میں سیلاب اُمڈ آیا۔

اگر سیّدپور کے جن کو سچی محبت کا دعویٰ تھا تو اکبر کا بھی عشق سچا تھا۔ سیّدپور کے جن نے اپنے عشق میں نیلم کو برباد کر دیا تھا تو اکبر نے اپنے عشق میں خود کو برباد کر لیا تھا۔

عشق وہی سچا ہوتا ہے جس میں عاشق کا خانہ خراب ہو محبوب کا نہیں۔ اگر محبوب تباہ ہوجائے اور عاشق دندناتا پھرے تو اسے سچی محبت نہیں کہتے، خودغرضی کہتے ہیں۔

محبت وہ چراغ ہے جس سے اپنے گھر کو آگ لگتی ہے، یہ وہ شمع ہے جو خود جل بجھتی ہے۔

جب سے نیلم اس گھر سے گئی تھی، اکبر کی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ ادھر اُدھر مارا پھرتا، کہیں بیٹھا ہے تو بس بیٹھا خلا میں گھورے جاتا۔

سب اس کی حالت دیکھ رہے تھے۔ ماموں فرقان خاص طور سے اس کیلئے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد نیلم کا کھوج مل جائے۔

وہ اپنی دکان پر بیٹھے ہوتے تو اپنی جان پہچان کے گاہکوں سے تذکرہ کرتے رہتے۔ ایک دن اُنہیں ایک ایسے بندے کا پتہ چل گیا جو گمشدہ چیزوں اور کھوئے ہوئے انسانوں کا پتہ بتا دیتا تھا۔

وہ اللہ کا بندہ لیاقت آباد میں ہی موجود تھا۔ ماموں فرقان پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور بندہ بغل میں موجود تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

اس بندے کا نام و پتہ لے کر اُنہوں نے اکبر کو فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ دکان پر آجائے، اس کیلئے ایک خوش خبری ہے۔

اکبر مقررہ وقت پر ماموں فرقان کی دکان پر پہنچ گیا۔ ماموں فرقان اسے دیکھ کر فوراً ہی کھڑے ہوگئے اور بولے۔ ''چار نمبر تک چلنا ہے، گاڑی لائے ہو؟''

''جی ہاں۔'' اکبر نے کہا اور پھر وہ دونوں مارکیٹ سے نکل کر گاڑی میں آبیٹھے۔

راستے میں اُنہوں نے اکبر کو اس شخص کے بارے میں بتایا۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ اسے اُمید ہو چلی کہ اب ضرور نیلم کے بارے میں معلوم ہوجائے گا کہ وہ کہاں ہے۔

اس شخص کا نام ضرغام تھا۔ پتہ ٹھکانہ معلوم کرتے بالآخر اس کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔

ماموں فرقان نے دروازے پر دستک دی۔

فوراً ہی اندر سے آواز آئی۔ ''آ جاؤ، بھئی کون ہے؟ دروازہ کھلا ہے۔''

وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ یہ ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا۔ کمرے کے سامنے تھوڑا سا صحن تھا اور صحن میں ایک طرف غسل خانہ اور باورچی خانہ تھا۔

کمرے میں چارپائی بچھی تھی جس پر میلی سی چادر پڑی تھی۔ ایک کونے میں ٹرنک رکھا تھا۔ ٹرنک کے اوپر ایک ٹوکری تھی۔ دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی تھی۔ اس میں الم غلم چیزیں بھری تھیں۔

ضرغام چارپائی پر لیٹا آرام سے سگریٹ پی رہا تھا۔

وہ دو اجنبیوں کو دیکھ کر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اکبر کو اس شخص کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ ایک اول جلول سا بندہ تھا۔ اسے خود اپنا نام ونشان معلوم نہ تھا، وہ بھلا کسی اور کا کیا پتہ بتائے گا۔

''کیسے آنا ہوا؟'' اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھوں سے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''ہم جی، ایک گمشدہ لڑکی کا پتہ معلوم کرنے آئے ہیں۔''

''اچھا'' اس نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

وہ ایک دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے۔ وہ چارپائی سے ایک جھٹکے سے اٹھا، الماری کے سامنے کھڑا ہوا پھر اس نے ایک ڈبے میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔

اور جب وہ ان کی طرف مڑا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل کا چاقو تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

یہ ایک خطرناک چاقو تھا۔

ماموں فرقان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی حرکت کا مطلب کیا ہے، وہ اس وقت دکان سے آرہے تھے۔ ان کی جیب میں اس وقت اچھا خاصا کیش تھا۔ ایک لمحے کو ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

اکبر کو وہ شخص صورت سے ہی چرسی لگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ وہ غلط پھنس گئے ہیں۔ کسی نے ماموں فرقان کو کسی غلط آدمی کا پتہ بتا دیا ہے۔

ابھی وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل ہی دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کریں، اتنے میں ضرغام نے چاقو کے اشارے سے دونوں کو بیٹھنے کو کہا۔ ''آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔ چارپائی پر بیٹھ جائیں۔''

ضرغام کی آواز میں کوئی بات نہ تھی جس سے غلط عزائم کا اندازہ ہوتا۔ اس کے لہجے سے خلوص

جھانک رہا تھا۔

وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اس میلی چادر پر بیٹھ گئے جو اس کمرے کی واحد چارپائی پر بچھی ہوئی تھی۔ ضرغام نے ٹرنک سے ٹوکری اُٹھا کر نیچے زمین پر رکھی اور خود ٹین کے بکس پر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

اس نے چاقو کی نوک کو ہتھیلی کے نیچے کلائی پر رکھ دیا۔ کلائی پر جہاں اس نے چاقو کی نوک گاڑی، وہاں موٹے موٹے دانے اُبھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ چاقو کو بار بار کلائی میں گاڑنے کی وجہ سے ہوگئے تھے۔

چاقو کی نوک کو اس نے کلائی میں گاڑ کر آنکھیں بند کرلیں اور دھیرے سے بولا۔

''لڑکی کا نام بتائیں۔''

''نیلم۔'' ماموں فرقان فوراً بولے۔

''عمر کیا ہے؟'' ضرغام نے سوال کیا۔

''بیس، بائیس سال ہوگی۔'' ماموں ارقان نے جواب دیا۔

''جب لڑکی گم ہوئی تو کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھی؟''

اس سوال پر ماموں فرقان نے اکبر کو دیکھا۔ اکبر کیا جواب دیا۔ اس کے نزدیک نیلم اس وقت گم ہوگئی جب وہ خالی گھر میں چلی گئی۔ اس رات کو جن اسے لینے آیا تھا اور ایک بگھی میں اسے بٹھا کر لے گیا تھا۔ اس رات اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے، یہ اسے یاد نہ تھا۔

''یاد نہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''معلوم نہیں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''کس علاقے سے گم ہوئی؟''

''گلشن اقبال سے۔''

''کتنے دن ہوگئے؟''

''تین ماہ۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''لڑکی کنواری ہے؟''

''نہیں، شادی شدہ۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''شوہر کا نام؟''

''اکبر۔''

''اچھا'' یہ کہہ کر ضرغام خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھیں مسلسل بند تھیں لیکن پتلیاں متحرک تھیں۔

خود وہ بالکل ساکت تھا، چاقو کی نوک کلائی میں گڑی ہوئی تھی اور وہ کسی مجسمے کی طرح بیٹھا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اس مجسمے کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔

''میں سرسبز شاداب درخت دیکھ رہا ہوں، یہ کوئی پہاڑی علاقہ ہے۔ ان درختوں میں گھرا ہوا مجھے ایک مکان نظر آ رہا ہے۔''

''نیلم کہاں ہے؟ وہ کہیں دکھائی دے رہی ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا نیلم اس مکان کے اندر ہے؟''

''ہاں۔''

''یہ مکان کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں۔''

''کوشش کریں، اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھیں۔''

''اچھا کرتا ہوں۔''

لیکن چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں اور نڈھال سا ہو کر پیچھے دیوار سے ٹیک لگالی۔ اس نے چاقو کلائی سے ہٹالیا تھا اور دیوار سے لگا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ وہ نیم مُردہ سا ہو گیا تھا۔

ماموں فرقان اور اکبر اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ضرغام نے انہیں پریشان ہوتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور چند منٹ انتظار کرنے کیلئے کہا۔

اکبر نے صحن میں گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکے سے ایک گلاس پانی نکالا اور ضرغام کو دیا۔

لیکن ضرغام نے ہاتھ کے اشارے سے فوراً گلاس اس کے سامنے سے ہٹانے کیلئے کہا۔

''کیوں؟'' اکبر نے تعجب سے کہا۔ ''پانی پی لیں، آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

''اگر...... میں نے...... پانی...... پیا تو...... مرجاؤں...... گا۔'' ضرغام نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

یہ سن کر اکبر فوراً پانی کا گلاس باہر مٹکے کے پاس رکھ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ضرغام کی حالت خود بخود سنبھل گئی۔ دیوار سے ہٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاقو اس نے الماری کے خانے میں اُچھال دیا۔

پھر وہ ٹرنک پر اپنی گردن گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا اور ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں جیسے چمک نہ تھی۔ ویران اور اُداس آنکھیں۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''آپ کو کیا ہوا تھا؟'' اکبر نے سوال کیا۔

''ہر عمل کے بعد میں اسی طرح نڈھال ہو جاتا ہوں، یہ معمول کی بات ہے۔ میرے جسم سے جیسے جان سی نکل جاتی ہے اسی لئے یہ عمل میں بہت کم کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کے چہروں پر پریشانی اور شرافت دیکھ کر میں یہ عمل کرنے کیلئے فوراً راضی ہو گیا، پھر معاملہ لڑکی کا بھی تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو میرا کس نے پتہ بتایا تھا۔ خیر جس نے بھی بتایا ہو اس علاقے کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے، اس نے پتے کے ساتھ یہ ضرور بتایا ہوگا کہ میں اس عمل کے ڈھائی سو روپے لیتا ہوں۔''

''ہم ڈھائی سو کی جگہ پانچ سو روپے دیں گے بلکہ ابھی لے لیجئے، بس ہمیں نیلم کا پتہ بتا دیجئے۔''

ماموں فرقان نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر ادب سے اس کے سامنے پیش کیا۔

لیکن ضرغام جس طرح بیٹھا تھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اس نے نوٹ پکڑنے کیلئے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

''میں ڈھائی سو روپے ہی لوں گا لیکن یہ پیسے میں اس وقت لوں گا جب آپ کا کام ہو جائے گا۔ ابھی آپ کا کام نہیں ہوا ہے۔ میں ناکام ہو گیا ہوں، ویسے ایسا میرے ساتھ آج تک نہیں ہوا۔ آپ لوگ بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ لڑکی، کیا نام بتایا اس کا ہاں، نیلم وہ کن حالات میں گھر سے گئی ہے۔''

''بس جی حالات نہ پوچھیں۔'' ماموں فرقان نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور اُداس ہو کر بولے۔

''اس کم بخت نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ ایسا اس کے پیچھے پڑا ہے کہ کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑتا ہی نہیں۔ اس کیلئے ہم نے کیسے کیسے جتن نہ کئے، خود میں قبرستان میں جا کر اس کیلئے عمل کر چکا ہوں لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔''

''کوئی آسیب ہے؟''

''آسیب نہیں کوئی آسیب ہوتا تو کب کا جل مرا ہوتا۔ وہ ایک جن ہے بڑا زبردست جن...... کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اب تک تو وہ لڑکی کے ساتھ گلشن والے گھر میں مقیم تھا لیکن اب وہ وہاں سے غائب ہو گیا ہے، ساتھ میں لڑکی کو بھی لے گیا ہے۔''

''ہوں۔'' ضرغام نے اپنی مُردہ آنکھوں سے فرقان کو دیکھا۔ ''تو یہ بات ہے، تبھی تو میں کہوں کہ یہ جھٹکے مجھے کیوں لگ رہے ہیں، خیر کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ کل اسی وقت آ جائیں، میں رات کو کچھ کارروائی کرتا ہوں۔ کل آپ لوگ جب آئیں گے تو میرے ہاتھ میں نیلم کا پتہ ہوگا۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور اس نوٹ کو اپنی جیب میں ڈال لیں، جن بزرگ نے مجھے یہ علم عطا کیا ہے اس نے ہدایت کی تھی کہ بغیر کام کئے پیسے نہ لینا۔''

ماموں فرقان نے پانچ سو کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا اور ممنونیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''اچھا، جناب کل حاضر ہوں گے۔''

یہ کہہ کر وہ دونوں اس مکان سے باہر آ گئے۔''

''عجیب شخص ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''ہاں، بہت عجیب ہے۔'' ماموں فرقان نے اس کی تائید کی۔

دوسرے دن جب وہ دونوں وقت مقررہ پر ضرغام کے گھر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ ماموں فرقان نے آہستہ سے ہاتھ سے دروازہ بجایا۔

لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

ماموں فرقان نے تب دروازے کو آہستہ سے اندر کی طرف دھکیلا، دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ فوراً کھل گیا۔ ماموں فرقان نے اندر جھانک کر دیکھا تو ضرغام چارپائی پر لیٹا نظر آیا۔

وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

ضرغام چارپائی پر بے سدھ پڑا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، منہ کھلا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت گہری نیند سو رہا ہو۔

اس کے دائیں ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو اور بائیں ہاتھ میں ایک مڑا ہوا کاغذ تھا۔

''ضرغام صاحب..... ضرغام صاحب۔'' ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

ماموں فرقان نے اس کا ہاتھ چھوا تو وہ ایک دم یخ بستہ محسوس ہوا۔ اُنہوں نے چونک کر اکبر کو دیکھا اور اپنے جبڑے سختی سے بند کر لئے۔

''ماموں کیا ہوا؟''

ماموں فرقان نے کوئی جواب دیئے بغیر ضرغام کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اس کا سینہ ٹٹولا۔ پپوٹے کھول کر دیکھے اور پھر اس طرح پیچھے ہٹے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ماموں کیا ہوا؟'' اکبر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''یہ مر چکا ہے۔''

''ہیں۔'' اکبر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''اب کیا ہوگا۔''

''یہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کیسا ہے؟'' ماموں فرقان نے یہ کہہ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ نکالا۔

جب اُنہوں نے کاغذ کی تہہ کھولی تو ان کے اندر سناٹا اُتر گیا، اکبر نے بھی اس کاغذ کو دیکھ لیا تھا اس کاغذ پر جو کچھ تھا اس نے بھی غور سے دیکھ لیا تھا۔

اس کاغذ پر ایک کالے بلے کا چہرہ تھا جو منہ پھاڑے غرا رہا تھا۔

ماموں فرقان نے اس کاغذ کو ضرغام کی لاش پر پھینکا اور اکبر کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ ''اکبر جلدی کرو یہاں سے نکل چلو۔''

بس پھر وہ اس گھر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

گاڑی میں بیٹھے اور ہانپتے کانپتے دکان پر پہنچے۔ ماموں فرقان نے دو ٹھنڈی بوتلیں منگوائیں اور وہ دونوں ان بوتلوں کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگے۔

اب تک اُنہوں نے ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات نہ کی تھی۔ اب وہ بات بھی کیا کرتے جو کچھ تھا، سامنے تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی انہیں معلوم تھا کہ کیونکر ہوا۔

''ماموں اس لاش کا کیا ہوگا؟'' اکبر نے راز داری سے کہا۔

''کوئی محلے والا دیکھ لے گا اور اس طرح اسے قبرستان پہنچا دیا جائے گا۔''

''لیکن ماموں یہ کیا ضروری ہے کہ کوئی پڑوس کا آدمی ضرور اس کے گھر پہنچے۔ اگر کوئی کل تک اس کے گھر میں داخل نہیں ہوا تو اس کی لاش سڑ جائے گی۔ جانے اس کا انتقال کب ہوا ہو۔''

''پھر کیا کرنا چاہئے؟''

''کیوں نہ تھانے فون کر دیں۔''

''ہم لوگ بھی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ پولیس ایسے موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔''

''ہم اپنا نام پتہ کیوں بتائیں گے۔ فرضی فون ہوگا بس ضرغام کے گھر کا پتہ بتا دیں گے۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے تم ایسا کرو اپنے گھر جا کر فون کرو تھانے کے ساتھ ساتھ ایدھی سینٹر کو بھی فون کر دینا۔ پولیس اگر ٹھکانے پر نہ پہنچی تو ایدھی سینٹر کی ایمبولینس ضرور وہاں پہنچ جائے گی۔''

پھر اکبر نے ماموں فرقان کی ہدایت کے مطابق گھر جا کر فرضی نام سے تھانے اور ایدھی سینٹر میں فون کر دیئے۔

دوسرے دن شام کے اخباروں نے ضرغام کی موت کو خوب رنگ آمیزی کے ساتھ چھاپا۔ ایسی ایسی کہانیاں گھڑی گئیں کہ ماموں فرقان اور اکبر دانتوں تلے اُنگلیاں دبا کر رہ گئے۔

ابھی یہ خبر ٹھنڈی نہ ہوئی تھی کہ ایک ٹھنڈی خبر اور موصول ہوگئی۔

یہ خبر دادا غفور سے متعلق تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ دادا غفور نے ماموں فرقان کو فون کر کے حاضرات کے عمل کے بارے میں بتایا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا۔

''فرقان..... مجھے کچھ کامیابی ہوئی ہے۔''

"کہاں ہے وہ؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ابھی میں یہ نہیں بتا سکتا لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ پردے میں کچھ نہ رہے گا۔ ظاہر ہو کر رہے گا۔ میں مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔" دادا غفور بہت پُر اُمید تھے۔

"اب تک کیا معلوم ہوا، کیا دکھائی دیا؟"

"ابھی تو بس ایک مکان دکھائی دیا ہے...... وہ بھی دھندلا دھندلا۔" دادا غفور نے بتایا۔

"اور وہ مکان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ کوئی پہاڑی علاقہ محسوس ہوتا ہے۔" ماموں فرقان فوراً بولے۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... میں نے اس مکان کو درختوں میں گھرا ہوا دیکھا ہے۔ لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

تب ماموں فرقان نے اس عجیب آدمی ضرغام کا ذکر کیا۔

"اوہ۔" ساری بات تفصیل سے سننے کے بعد دادا غفور نے افسردہ لہجے میں کہا۔

پھر دادا غفور نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

اور دوسرے دن ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔

وہ فجر کی نماز پڑھنے فلیٹ سے نکلے تھے کہ اُترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا۔ سیڑھیوں پر زیادہ روشنی نہ تھی...... ان کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر پڑا اور وہ لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ ستر سال سے اُوپر کے تھے...... آخری سیڑھی پر پہنچ کر آخری سانس لی اور کلمہ پڑھ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ماموں فرقان کو دادا غفور کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔

اکبر جب قبرستان سے اپنے گھر پہنچا تو شدید ذہنی کھنچاؤ کا شکار تھا۔

اگرچہ اکبر کے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہ تھی کہ دادا غفور کی موت میں سیّد پور کا جن ملوث ہے لیکن جانے کیوں اس کا دل بار بار اس بات کی گواہی دیتا تھا، یہ سب کیا دھرا سیّد پور کے جن کا ہے۔

اس جن نے نہ صرف اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی بلکہ اب وہ مجرمانہ کارروائیوں پر اُتر آیا تھا...... وہ اب قاتل بن چکا تھا۔

ضرغام کی موت...... موت کہاں؟...... اسے قتل کہنا چاہیے۔ یہ قتل اسی کے ہاتھوں ہوا۔

وہاں تو اس نے اپنی منحوس صورت بھی چھوڑ دی تھی۔

دادا غفور کو بھی اسی نے مارا، وہ کیلے کا چھلکا آخر سیڑھی پر کہاں سے آیا۔ یہ سوال بار بار اس کے سر پر ہتھوڑے برساتا اور اس کا ذہن خود بخود سیّد پور کے جن کی طرف چلا جاتا۔

اکبر مغرب کے وقت اپنے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کسی سے بات نہ کی تھی...... وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا اور جوتے اُتار کر بیڈ پر دھم سے گر پڑا تھا۔

ذہن پر بوجھ تھا...... خیالات کی یلغار تھی...... نیلم اسے ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی...... اور اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔

کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا...... وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔

اچانک کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے ہٹایا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"بیٹے اکبر۔" صابرہ نے دھیرے سے پکارا۔

"جی امی۔" اکبر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو؟"

"امی، میرے لئے اب کیا اندھیرا، کیا اُجالا...... دونوں ایک ہیں۔"

"تم مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔" صابرہ نے بڑی محبت سے کہا۔

"پھر کس سے کروں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔

"اسی لئے کہتی ہوں شادی کر لو۔"

"امی مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔" اکبر نے ناراضگی سے کہا۔

"اچھا، اُٹھو تمہارے ابو تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"کیا معاملہ ہے؟"

"گھر میں اتنی لمبی رقم پڑی ہے، تمہارے ابو کہتے ہیں اس کا کچھ کرنا ہے۔"

"رقم کیسی رقم......" اکبر نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"بھول گئے۔" صابرہ نے اُٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی اور پھر واپس آ کر اکبر کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اکبر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ارے تمہیں وہ رقم یاد نہیں...... وہ پچیس لاکھ جو......"

"اچھا ٹھیک ہے، مجھے یاد آ گیا۔" اکبر نے صابرہ کو آگے نہ بولنے دیا۔ "امی ان روپوں کو آگ کیوں نہیں لگا دیتیں۔"

"تم اس معاملے پر اپنے ابو سے بات کر لو۔"

"وہ پیسے ہیں کہاں؟"

"سوٹ کیس میں ہیں اور سوٹ کیس پیٹی میں پڑا ہے اور اس کے اوپر لحاف گدے رکھے ہوئے

ہیں۔'' صابرہ نے بتایا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں، آ کر اس رقم کا حساب کتاب کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اکبر باتھ روم میں چلا گیا۔

باتھ روم میں داخل ہو کر جب اس نے دروازہ بند کیا تو حسب معمول اس کی نظر نیلم کی لکھی تحریر پر پڑی۔ ''اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔''

یہ تحریر روز بروز دھندلاتی جا رہی تھی۔ اس تحریر پر اکبر کی جب بھی نظر پڑتی، اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ نیلم کو اس گھر سے گئے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے اور وہ اس کیلئے اب تک کچھ نہ کر سکا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ نیلم جہاں بھی تھی اس مکان میں تھی جو درختوں سے گھرا ہوا تھا، وہ مکان دونوں نے دیکھا تھا۔ ضرغام نے بھی اور دادا غفور نے بھی۔

اور دونوں ہی اس مکان کے محل وقوع کو تلاش کرنے کی کوشش میں جاں بحق ہو گئے تھے۔

نہ جانے نیلم کس حال میں ہو گی۔ اس پر کیا بیت رہی ہو گی۔ وہ جن اس پر جانے کیسے کیسے ظلم توڑ رہا ہو گا۔ وہ نازک سی نیلم یہ سب کچھ کہاں تک برداشت کرے گی...... بالآخر ایک دن موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔

''نہیں، نہیں۔'' اس کا وجود شدت سے چیخ اُٹھا۔

''نیلم میری ہے، اسے کچھ نہیں ہو گا...... وہ مجھے مل کر رہے گی، میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔''

منہ ہاتھ دھو کر وہ کمرے سے باہر آیا تو ٹی وی لاؤنج میں بابر اس کا منتظر تھا...... بابر نے اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ ''ادھر آ جاؤ اکبر۔''

''جی ابو......'' اکبر، بابر کے برابر بیٹھ گیا۔

''راشدہ ذرا ٹی وی بند کر دو۔'' بابر علی، راشدہ سے مخاطب ہوا۔

راشدہ نے جلدی سے اُٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ پچیس لاکھ روپے گھر میں پڑے ہیں، اس کے بارے میں کیا سوچا۔'' بابر نے بات شروع کی۔

''ابو، آپ نے کیا سوچا؟'' اکبر نے پلٹ کر سوال کیا۔

''اتنی بڑی رقم، بے مصرف پڑی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسے کاروبار میں لگائیں۔''

''نہیں ابو، اس رقم پر ہمارا کوئی حق نہیں...... وہ حرام کی رقم ہے...... میرے خیال میں تو اسے نذر آتش کر دینا چاہئے۔'' اکبر نے دوٹوک فیصلہ دیا۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔''

''پھر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے، آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔'' یہ کہہ کر اکبر اُٹھنے لگا۔

''اچھا، زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں، تم ذرا پیٹی سے وہ سوٹ کیس تو نکال کر لاؤ۔''

''جی بہتر۔'' اکبر نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

پھر وہ اُٹھ کر اسٹور میں گیا۔ راشدہ اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نے مل کر پیٹی کے اُوپر پڑا سامان ہٹایا...... پھر پیٹی میں سے لحاف گدے باہر نکالے، وہ سوٹ کیس سب سے نیچے تھا۔

اکبر نے جھک کر پیٹی سے اسے نکالا...... اور ٹی وی لاؤنج میں واپس آ گیا۔

وہ سوٹ کیس اس نے نیچے قالین پر رکھ دیا۔ بابر علی صوفے سے نیچے اُتر آیا...... وہ قالین پر پاؤں پھیلا کر بیٹھا...... اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس کی چابی تھی۔ اس نے سوٹ کیس کے تالے میں چابی گھمائی۔ تالا کھل گیا۔

اکبر، راشدہ اور صابرہ سب کے سب سوٹ کیس کو گھیرے کھڑے تھے۔

بابر علی نے بڑے پیار سے سوٹ کیس کا ڈھکن اُٹھایا...... پھر جیسے ہی اس کی نظر سوٹ کیس کے اندر پڑی اس کے چھکے چھوٹ گئے...... وہ کود کر صوفے پر چڑھ گیا۔

راشدہ اور صابرہ کی چیخیں بلند ہوئیں...... وہ دروازے کی طرف سرپٹ بھاگیں۔

اکبر بھی سوٹ کیس کے پاس کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ جلدی سے صوفے پر چڑھ گیا۔

سوٹ کیس میں رقم نہ تھی...... بلکہ اس کی جگہ ایک کنڈلی مارے سانپ بیٹھا تھا۔ جیسے ہی سوٹ کیس کا ڈھکن کھلا۔ اس نے پھنکار کر اپنا پھن پھیلایا اور سرسراتا ہوا سوٹ کیس سے باہر آ گیا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ اس سانپ کا رخ صوفے کی طرف نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ان دونوں کے پاس اس وقت ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ اس کا مقابلہ کرتے۔

اس سانپ کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

صابرہ اور راشدہ اس کے پھن اُٹھاتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی تھیں...... اور اُنہوں نے اپنے کمرے میں جا کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

وہ سانپ سرسراتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔

سانپ کے کمرے سے نکلنے کے بعد اکبر نے اسٹور سے اپنی ہاکی نکالی اور سانپ کے پیچھے گیا۔

پھر اس نے پورا گھر چھان مارا، گھر کے آگے پیچھے پودوں میں بھی دیکھ لیا لیکن اس سانپ کا پتہ نہ چلا۔

گھر میں کئی دن تک اس سانپ کی دہشت چھائی رہی...... چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے بس یہی گمان ہوتا کہ سانپ اب یہاں سے نکلا، وہاں سے نکلا۔

خاص طور سے راشدہ اور صابرہ کی بری حالت رہی...... رات کو اُنہوں نے اکبر کو اپنے کمرے میں سلایا۔

خواب میں بھی اس سانپ نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کبھی وہ کھڑکی سے اندر آتا دکھائی دیتا تو کبھی جسم پر رینگتا ہوا محسوس ہوتا۔

ماموں فرقان کو معلوم ہوا تو وہ کہیں سے ایک سپیرا پکڑ لائے۔ اس نے گھر کے لان میں بیٹھ کر دو ڈھائی گھنٹے تک بین بجائی۔

وہ بے چارہ بین بجا بجا کر تھک گیا لیکن کہیں سے سانپ برآمد نہ ہوا۔ گھر میں سانپ ہوتا تو برآمد ہوتا۔ تب کہیں جا کر صابرہ اور راشدہ کے دل کو اطمینان ہوا اور اُنہوں نے بات بات پر سانپ سے ڈرنا چھوڑا۔

بابر علی کو رقم کے اس طرح نکل جانے پر بڑا صدمہ تھا۔ وہ اپنے دل میں جانے کیا منصوبے بنائے بیٹھا تھا جو اس کے دماغ سے لہراتے ہوئے نکل گئے تھے۔

کتنا اچھا ہوتا کہ وہ اس رقم کو فوراً ہی استعمال میں لے آیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

جبکہ اکبر سوٹ کیس سے رقم غائب ہونے پر بہت خوش تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے اس رقم کا مخالف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے فوراً نذرِ آتش کر دیا جائے۔

بالآخر اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ اگرچہ رقم کو نذرِ آتش کرنے کی نوبت نہ آئی لیکن وہ خود بخود غائب ہوگئی۔

اکبر کی اب عجیب حالت ہوگئی تھی۔

وہ گھر سے شوروم جاتا اور وہاں سے آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ وہ گھنٹوں نیلم کی تصویر کو تکے جاتا یا باتھ روم میں کھڑے ہو کر نیلم کی تحریر کو دیکھے جاتا۔

صابرہ سے بیٹے کی حالت چھپی نہ تھی۔ وہ اس طرح بیڈ پر لیٹے نیلم کی تصویر کو تکتے ہوئے اسے دیکھتی تو دل کٹ کر رہ جاتا۔

اس کا جی چاہتا کہ نیلم کی اس تصویر کو کمرے سے نکال کر پھینک دے۔

وہ جانتی تھیں کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے اس نے کبھی ایسا قدم نہ اُٹھایا۔

ایک رات اکبر نے نیلم کو خواب میں دیکھا...... اس نے دیکھا کہ نیلم گھر کے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ جن نے اسے خود بخود آزاد کر دیا ہے کیونکہ اب نیلم اس کے مطلب کی نہ رہی تھی۔ وہ شدید بیمار ہوگئی تھی۔

اکبر، نیلم کو اپنے گھر کے دروازے پر پا کر پھولا نہ سمایا۔ جب وہ گاڑی سے اُتر کر اس کے نزدیک

آیا تو نیلم دیکھتے ہی دیکھتے ہَوا میں تحلیل ہوگئی۔

اس خواب کے بارے میں وہ سارا دن سوچتا رہا۔ دن بھر نیلم اس کی نظروں میں رہی۔ اس کے خیالوں میں چھائی رہی۔ وہ خیال ہی خیال میں اس سے ہم کلام ہوتا رہا۔

شام کو جب وہ شوروم سے واپس آیا اور گاڑی کھڑی کر کے اپنے کمرے میں پہنچا تو اس نے وہاں کسی کو پایا۔

وہ لڑکی نیلم کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی اور تصویر کو محویت سے دیکھ رہی تھی۔

اکبر کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کے لمبے بال نیچے گھٹنے تک گئے ہوئے تھے۔ خوب صورت، پرکشش زلفیں، پتلی کمر، سڈول جسم۔

''کون ہیں آپ؟'' اکبر نے پوچھا۔

تب جواب میں اس نے گردن گھمائی اور مسکرا کر دیکھا۔

''ارے نیلم تم۔'' یہ کہہ کر اکبر بے قراری سے اس کی طرف بڑھا۔

نیلم کو روبرو پا کر اکبر کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دل حلق کے راستے باہر آ جائے گا۔ اس کا رواں رواں خوشی سے جھوم اُٹھا، چہرے پر شادابی آ گئی۔ آنکھیں چمک اُٹھیں، ہونٹوں پر پھول کھلنے لگے۔

اس کا مطلب تھا کہ اس نے جو خواب دیکھا تھا، سچا تھا۔ نیلم خود بخود گھر آ گئی تھی، اسے جن نے آزاد کر دیا تھا۔

وہ اس سے چھ سات قدم کے فاصلے پر تھی۔ مغرب کا وقت تھا، کمرے میں ملگجا سا اُجالا تھا۔

اکبر بانہیں پھیلائے نیلم کی طرف بے قراری سے بڑھا اور ابھی دو، تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک دم رک گیا۔

اسے کمرے میں پا کر اس نے اپنا پورا چہرہ اکبر کی طرف گھمایا۔ جب وہ مکمل طور پر گھوم کر سامنے آ گئی تو اکبر کو ٹھٹک جانا پڑا۔

وہ نیلم نہ تھی، نیلم کا سایہ تھی، پرتو تھی، نقل تھی۔

''ارے، آپ تو سچ مچ دھوکا کھا گئے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آنٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

اکبر نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔

روشنی میں اکبر نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ نیلم سے بڑی حد تک مشابہ تھی لیکن وہ نقل بمطابق اصل نہ تھی۔ اس کی آنکھیں نیلم جیسی نہ تھیں، ناک اور ہونٹوں کی بناوٹ میں بھی فرق تھا۔ چہرے کی رنگت اور آواز بھی ویسی نہ تھی البتہ اس کی زلفیں نیلم جیسی ضرور تھیں کہ آدمی ایک مرتبہ دیکھے تو بس

کے رہ جائے۔

پہلی نظر میں وہ نیلم لگتی تھی، پھر دوسری نظر سارا بھرم کھول دیتی تھی۔

اب یہ بات تو صاف ہوگئی تھی کہ وہ نیلم نہ تھی۔ نیلم نہ تھی تو وہ اس کے بیڈروم میں کس طرح آ گئی تھی۔ اسے یہاں تک کس نے پہنچایا تھا، وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی۔

اکبر نے اس سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہ دیکھا تھا، وہ رشتے کی تمام لڑکیوں سے واقف تھا۔ صابرہ اور بابر کے دوستوں کی لڑکیوں کو بھی اس نے دیکھا ہوا تھا۔ راشدہ کی سہیلیوں کو بھی جانتا تھا۔

یہ لڑکی بالکل نئی تھی، اجنبی تھی، پر کہاں سے آئی تھی۔

لڑکی اکبر کے تذبذب کو بھانپ گئی۔ پہلے تو وہ کھلکھلا کر ہنسی پھر ایک ادا سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا جیسے ہنسی روکنے کی کوشش ہو۔

”میں آپ کے پڑوس سے آئی ہوں، میرا نام سیماں شیخ ہے۔“ وہ بے حجابانہ بولی۔

”آپ آفتاب شیخ صاحب کے یہاں سے آئی ہیں؟“ اکبر نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن اس سے پہلے میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔“ اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ دیکھتے کیسے؟ میں یہاں رہی کب ہوں، میں پہلی مرتبہ کراچی آئی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔“ اکبر نے حیرت ظاہر کی۔ ”کہاں سے؟“

”مریخ سے۔“ سیماں نے ہنس کر جواب دیا۔

”جی، کیا فرمایا۔“ اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔

”اونچا سنتے ہیں کیا، میں مریخ سے آئی ہوں۔“

اب اکبر کو اندازہ ہوا کہ وہ مذاق کے موڈ میں ہے اس لئے اس نے سوچا کہ خاموشی بہتر ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

”چلی جاؤں؟“ سیماں نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”یہی مطلب ہے نا آپ کا۔“

”جی، میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اکبر نے گھبرا کر کہا۔

”پھر خاموش نگاہوں سے دروازے کی طرف کیوں دیکھا تھا۔“

اب اکبر کو احساس ہوا کہ یہ لڑکی مان نہ مان، میں تیرا مہمان قسم کی چیز ہے۔ اس کے ساتھ دوٹوک رویہ اختیار کرنا پڑے گا، تبھی بات بنے گی۔

”راشدہ۔“ اکبر نے زور سے آواز دی۔

”میں ایسے ہی چلی جاتی ہوں، کسی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر سیماں شیخ نے ٹاٹا کے

انداز میں ہاتھ ہلایا اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ راشدہ آ گئی۔ راشدہ کو دیکھ کر سیماں پلٹ آئی اور بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

”سیماں، اکبر بھائی سے ملیں تم۔“ اس نے سیماں سے پوچھا۔

”بہت بور بھائی ہیں تمہارے۔“

”ارے، ایسا تو نہ کہو۔“ راشدہ نے اکبر کی حمایت کی۔

”تمہارے بھائی نے مجھے کمرے سے نکال دیا۔“ اس نے بن کر کہا۔

”جھوٹ، بالکل جھوٹ۔“ اکبر نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر آپ نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔“ اس نے دلیل دی۔

”میں تو آپ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔“ اکبر نے بتایا۔

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے نیلم کہہ کر پکارا تھا۔“ سیماں شیخ کھلکھلا کر ہنسی، وہ اُسے شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اکبر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ اس کا تنہا بیڈروم میں چلے آنا، بے تکلفانہ گفتگو، جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ راشدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے تکلفانہ انداز میں کھڑے ہونا، یہ سب باتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اس لڑکی کی فطرت میں بے باکی اور جلد گھل مل جانے کی عادت ہے۔

اکبر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ راشدہ سے مخاطب ہوئی۔

”اچھا، رشی ہم اب چلتے ہیں، رات کو آئیں گے۔ کسی اچھی فلم کا کیسٹ منگوا کر رکھنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”میری امی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میری امی کے پاس، ڈرائنگ روم میں ہیں۔“ راشدہ نے جواب دیا۔

”اچھا، اکبر صاحب خدا حافظ، رات کو ملاقات ہوگی۔“ سیماں نے بڑی بے تکلفی سے کہا اور بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔

راشدہ بھی اس کے ساتھ جانے کیلئے مڑنے لگی تو اکبر نے اسے آواز دی۔ ”راشدہ۔“

”اکبر بھائی ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ سیماں کے ساتھ چلی گئی۔

اکبر نے اندازہ کر لیا کہ راشدہ اسے گیٹ تک رخصت کرنے گئی ہے۔ اتنی دیر میں اکبر نے اپنے کپڑے تبدیل کر لئے۔ ابھی وہ منہ دھونے کیلئے باتھ روم میں گھس ہی رہا تھا کہ راشدہ واپس آ گئی۔

”جی جناب۔“ راشدہ کے ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ تھی۔

''راشدہ، یہ کیا چیز تھی؟'' اکبر نے سوال کیا۔

''چیز...... چیز نہیں، وہ سیماں شیخ تھی۔'' راشدہ بولی۔

''یہ میرے کمرے میں کیسے آ گئی۔'' اکبر نے وضاحت چاہی۔

''میں لائی تھی، نیلم بھابھی کی تصویر دکھانے۔'' راشدہ نے بتایا۔

''لیکن جب میں کمرے میں آیا تو وہ اکیلی تھی۔''

''میں آپ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر گیٹ کھولنے گئی۔ گیٹ کھول کر واپس آ رہی تھی تو امی نے آواز دے دی۔ ابھی میں ان کی بات سن رہی تھی کہ آپ نے آواز لگا دی۔''

''اچھا، یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ میرے کمرے میں کیسے آئی تھی، لیکن یہ تھی کون؟''

''آپ کو کیسی لگی؟'' سوال کچھ جواب کچھ۔

''انتہائی بکواس۔'' اکبر نے اپنی رائے دی۔

''بالکل نیلم بھابھی جیسی تو ہے۔'' راشدہ نے ہنس کر کہا۔

''نیلم جیسی تو نہ کہو...... البتہ نیلم کی بھونڈی نقل ضرور ہے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔''

''خیر اب ایسا بھی نہ کہیں، امی کو تو وہ بہت پسند آئی ہے۔''

''اچھا تو یہ امی کی دریافت ہے...... ویسے وہ کیا کریں گی اس کا۔'' اکبر نے پوچھا۔

''اچار ڈالیں گی اور آپ کو کھلائیں گی۔'' راشدہ نے جل کر کہا۔

''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔'' اکبر تھوڑا سا مسکرایا۔

''پھر آپ اس کو کیوں برا کہہ رہے ہیں۔''

''اچھا، بھئی وہ بہت اچھی ہے، بالکل چاند جیسی۔''

''ابھی جا کر اس کیلئے کوئی اچھی سی فلم لے آیئے گا، وہ رات کو آئے گی۔''

''جہنم میں گئی وہ اور ساتھ میں تم بھی۔''

یہ کہہ کر اکبر باتھ روم میں گھس گیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔

راشدہ چند لمحے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اکبر نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ واقعی صابرہ کی دریافت تھی۔ آفتاب شیخ کا مکان ان کے گھر سے دو، تین مکان چھوڑ کر تھا۔ آفتاب شیخ کی بیوی سے صابرہ کی بھی دُور دُور سے سلام دُعا تھی۔ رات کو سڑک پر ٹہلتے ہوئے اکثر اس کی ملاقات، بیگم آفتاب سے ہو جاتی تھی۔

یہ دو، تین دن پہلے کی بات تھی۔

صابرہ نے گاڑی سے اُترتے ہوئے سیماں شیخ کو دیکھا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایک لمحے کو تو وہ یہی

سمجھی کہ یہ نیلم ہے۔ راشدہ اس کے ساتھ تھی، وہ دونوں ایسے ہی ٹہلتی ہوئی آگے نکل آئی تھیں۔ سیماں کو دیکھ کر راشدہ بھی ششدر رہ گئی۔

جب سیماں شیخ اپنی ماں کے ساتھ اندر مکان میں چلی گئی تو وہ دونوں ماں بیٹیاں بھی اس کے پیچھے لپکیں۔ بیگم آفتاب نے ان دونوں کا بڑا پرتپاک استقبال کیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان کے گھر آئی تھیں ورنہ اب تک دُور سے ہی سلام دُعا ہوتی رہی تھی۔

جب بیگم آفتاب کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اس کی بھانجی کے تعاقب میں اندر آئی ہیں تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ پھر جب بیگم آفتاب کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ان کی بہو کی ہو بہو نقل ہے تو اُنہیں مزید حیرت ہوئی۔

صابرہ نے باتوں باتوں میں جلدی جلدی سیماں شیخ کے بارے میں ساری معلومات اکٹھا کر لیں، سب سے اہم اطلاع تو ان کیلئے یہی تھی کہ وہ ابھی کسی کی نہیں ہوئی ہے۔

یہ اطلاع اس کیلئے بہت قیمتی تھی۔ صابرہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے غیب سے اس کی مدد ہوئی ہو۔ اللہ نے اکبر کیلئے دوسری نیلم بھیج دی ہو۔

سیماں کو دیکھ کر وہ بے پناہ خوش ہوئی لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ صابرہ جو کچھ سوچ رہی تھی، اگرچہ وہ اپنی سوچ میں مخلص تھی، وہ اپنے بیٹے کو جلتے جہنم سے نکالنا چاہتی تھی۔ پھر بھی سب کچھ آناً فاناً ہو جانے والا نہ تھا۔ اس کیلئے تھوڑے صبر اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔

سب سے پہلے تو کسی طرح اکبر کو سیماں کی طرف ملتفت کرنا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ سیماں شرمیلے مزاج کی لڑکی نہ تھی۔ وہ بڑی صاف گو، بولڈ اور شگفتہ مزاج لڑکی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگانا اس کا شیوہ تھا۔

اس لئے پہلے مرحلے پر صابرہ نے طے کیا کہ دونوں کی ملاقات کرا دی جائے۔ سیماں کو نیلم کے بارے میں بس اتنا بتایا گیا کہ وہ اکبر کی بیوی ہے، آج کل اپنے میکے لاہور گئی ہوئی ہے۔ سیماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نیلم سے بہت مشابہ ہے تو فطری طور پر اس کے اندر تجسس جاگا۔ ویسے بھی وہ مہم پسند لڑکی تھی، وہ فوراً اکبر کے گھر آ گئی۔

پھر راشدہ نے صابرہ کی ہدایت پر سیماں کے ساتھ ایک شرارتی منصوبہ بنایا۔ سیماں شیخ کو ایسی شرارتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بلا جھجک راضی ہو گئی اور یوں وہ اکبر کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

جب صابرہ نے سیماں کو نیلم کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے بڑے جوش سے یہ کہا تھا۔

''تمہاری شکل نیلم سے اس قدر ملتی ہے کہ وہ اگر تمہیں دیکھ لے تو دھوکا کھا جائے جیسے ہم خود تمہیں دیکھ

کر دھوکا کھا گئے تھے۔"

اور ہوا بھی یہی تھا۔

اکبر واقعی اسے اپنے بیڈروم میں دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا لیکن بس چند لمحوں کیلئے وہ اس طرف پشت کئے کھڑی تھی، جب وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی تو اکبر نے ہیرے اور پتھر میں فرق محسوس کر لیا۔

اکبر کا خیال تھا کہ سیماں ایسے ہی مذاق میں رات کو آنے کا کہہ گئی ہے، وہ بھلا کیسے آئے گی لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی جب وہ رات نو بجے اس کے گھر آدھمکی۔ اس مرتبہ اس کی امی بھی ساتھ نہ تھیں۔

یہ لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ سیماں اگرچہ کھانا کھا کر آئی تھی لیکن راشدہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھانے کی میز پر بٹھالیا۔ وہ کھانے کی میز پر بیٹھی تو اس نے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھی۔ اس نے دوبارہ شکم سیر ہو کر کھایا۔ اکبر بےچارہ اس کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

کھانا کھانے کے بعد سیماں نے کیسٹ کا پوچھا۔ "کوئی فلم منگائی ؟"

راشدہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے اکبر کو دیکھا، اکبر ابھی کوئی جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سیماں کھٹ سے بولی۔ "آؤ راشدہ، ہم خود جا کر فلم لے آتے ہیں۔ نزدیک ہی تو ہے دکان۔"

"نہیں آپ نہ جائیں دکان پر، میں جا کر لا دیتا ہوں۔ کون سی فلم دیکھنی ہے۔"

"کوئی اچھی سی انگلش فلم۔" سیماں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"نہیں، سیماں، امیتابھ کی ابھی نئی فلم آئی ہے۔ وہ دیکھ لیتے ہیں۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" سیماں نے فوراً اس کی بات مان لی اور پھر دھیرے سے راشدہ کے کان میں کچھ کہا۔

سیماں کی بات سن کر راشدہ نے سر ہلایا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

"اب کیا ہوا؟" اکبر نے راشدہ کو گھور کر دیکھا۔

"ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے، بہت دن سے آپ نے آئس کریم نہیں کھلائی ہے۔"

"چلو بابا چلو۔" اکبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن پیدل جانا ہوگا۔"

"نہیں، اکبر بھائی ہم پیدل نہیں جائیں گے، گاڑی میں۔" راشدہ نے کہا۔

مجبوراً اکبر کو گاڑی نکالنا پڑی، پہلے ان لوگوں نے ویڈیو شاپ سے اپنی پسند کی فلم کا کیسٹ لیا پھر یہ لوگ ایک کولڈ اسپاٹ پر پہنچے، وہاں آئس کریم کی بجائے قلفی کھائی اور ٹھنڈی بوتل کے مزے لئے۔

سیماں اور راشدہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ سیماں اسلام آباد سے آئی تھی، وہ اسلام آباد کا ذکر کر رہی تھی اور راشدہ اپنے شہر کی تعریفوں میں لگی تھی۔

اکبر خاموشی سے دونوں کی دلچسپ نوک جھونک سن رہا تھا۔

"ارے صاحب، آپ بھی کچھ بولیں۔" اچانک سیماں نے اسے ٹوکا۔

"میں کیا بولوں۔" اکبر نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔" ادھر سے فرمائش ہوئی۔

"شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔" دوٹوک جواب آیا۔

"اور راشدہ تمہیں۔" سیماں، راشدہ کی طرف پلٹ گئی۔

"مجھے تو ہے۔" راشدہ نے ہنس کر کہا۔

"آؤ پھر بیت بازی ہو جائے۔" سیماں نے خوش ہو کر کہا۔

"اے بھائی جلدی سے بوتلیں ختم کریں اور چلیں۔ یہ بیت بازی جا کر گھر کر لیں۔"

"بور آدمی۔" سیماں نے اگرچہ آہستہ سے کہا تھا لیکن اکبر نے پھر بھی سن لیا۔

وہ خاموش رہا اور کیا کرتا اس منہ پھٹ لڑکی کے منہ لگنا بےکار تھا۔

گھر جا کر فلم دیکھی گئی، کچھ دیر صابرہ اور بابر نے وہ فلم دیکھی پھر وہ نیند کا بہانہ کر کے اُٹھ گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد اکبر کو بھی جمائیاں آنے لگیں۔ فلم ایسی کوئی خاص نہ تھی، وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو سیماں شیخ نے اسے روک لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا ہم اکیلے فلم دیکھیں گے کیا؟"

مجبوراً اسے بیٹھنا پڑا وہ جمائیاں لیتا رہا اور فلم دیکھتا رہا۔

فلم ختم ہونے کے بعد اسے سیماں کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آنا پڑا۔

راستے میں فلم پر تبصرہ کرتے کرتے اچانک اس نے پٹری بدلی اور ایک غیر متوقع سوال اکبر سے کر دیا۔

"آپ کی بیگم کب تک آئیں گی۔"

"معلوم نہیں۔" اکبر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لڑ کر گئی ہیں کیا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"یہی سمجھ لیں۔"

"ابھی آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں، ابھی سے لڑائیاں بھی شروع ہو گئیں۔"

"لڑائی کا کیا ہے، لڑائی تو پہلے دن سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔"

"یہ شادی تو آپ کی پسند کی تھی۔"

"سارے سوالات آج ہی کر لیں گی، پھر کبھی سہی، اب آپ کا گھر آ گیا۔"

"مجھے فلم دکھانے، قلفی کھلانے اور گھر تک پہنچانے کا بہت شکریہ۔" سیماں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

اکبر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ محض مسکرا کر رہ گیا۔

سیماں کے گھر کے لوگ ابھی جاگ رہے تھے گھنٹی بجاتے ہی گیٹ کھل گیا اور وہ اکبر کو 'بائی' کہہ کر اندر چلی گئی گیٹ پر آنے والی اس کی امی تھیں۔

اکبر ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سیماں کی شکل دکھائی دے گئی وہ فوراً ناشتے کی میز سے اُٹھ گیا اور سیماں کو سرسری سا "ہیلو" کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابھی وہ کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی، دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اکبر کو اس میں سے سیماں کے کپڑوں کی جھلک نظر آ گئی۔

اس سے پہلے کہ اکبر اسے کمرے میں آنے کی اجازت دیتا، سیماں نے دروازہ کھول دیا اور مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"اوہو، کہاں کی تیاری ہے؟" وہ آتے ہی بے تکلفی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"شوروم جا رہا تھا۔" اکبر نے سادگی سے کہا۔

"کیا آپ گاڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، ہم فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں۔" اکبر نے جواب دیا۔

"کیا کیا بناتے ہیں۔" سیماں نے ہنس کر پوچھا۔

"بس ایک بے وقوف نہیں بناتے، باقی سب بناتے ہیں۔"

"یہ آپ نے مجھ پر چھینٹا مارا ہے آپ کا کیا خیال ہے، میں آپ کو بے وقوف بنا رہی ہوں، میں بھلا آپ کو کس لئے بے وقوف بناؤں گی۔" وہ غصے سے بولی۔

"میں نے آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی میں نے محض مذاق میں ایک بات کہی تھی۔"

"میں جانتی ہوں سب۔"

"یہ راشدہ کہاں ہے؟"

"وہ میرے لئے چائے بنا کر لا رہی ہے، تب تک اس نے کہا کہ میں آپ سے بات کر لوں۔"

"مجھ سے۔" اکبر نے حیرت سے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ "مجھ سے کیا بات کرنا ہے بھلا۔"

"ہم آپ کو آج شوروم نہیں جانے دیں گے۔ ہمیں سمندر پر لے چلیے۔"

اور پھر راشدہ اور سیماں نے واقعی اسے شوروم پر نہ جانے دیا وہ اسے لے کر سمندر پر چلی گئیں۔

سمندر پر جا کر سیماں نے خوب انجوائے کیا اگرچہ وہ پہلی مرتبہ کراچی آئی تھی اور اس نے پہلی مرتبہ سمندر دیکھا تھا لیکن وہ سمندر سے دہشت زدہ نہ ہوئی۔

ہاکس بے کے ساحل پر بے شمار لوگ موجود تھے، لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں، بچے سب سمندر کی لہروں سے کھیل رہے تھے۔ پہلے تو وہ دور سے سمندر کا نظارہ کرتی رہی پھر راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

"آؤ، سمندر میں چلیں۔"

"ہائے ڈر لگے گا۔"

"ڈر کیسا، میں جو تمہارے ساتھ ہوں، سچ بڑا مزا آتا ہے نہانے میں۔"

پھر راشدہ نے سمندر سے اس کا تعارف کرایا جب پانی اس کے پاؤں کو چھوتا ہوا دو تین بار گزر گیا تو پھر وہ اسے لے کر ذرا آگے بڑھی۔

تھوڑی دیر میں سیماں کا سارا ڈر جاتا رہا اور وہ سمندر سے اپنی عادت کے مطابق بے تکلف ہو گئی اب وہ بیٹھ کر سمندر کی لہروں سے کھیل رہی تھی۔

جب بھی پانی کی لہر اس کی طرف آتی تو وہ خوب شور مچاتی، خوب انجوائے کرتی۔

سیماں کو سمندر میں دیکھ کر اکبر کو نیلم بے اختیار یاد آ گئی۔

پھر اسے نیلم کا ہاتھ پکڑ کر سمندر میں بھاگنا یاد آیا پھر ایک بڑی لہر آئی اور اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ سب نیلم کو سمندر میں ڈھونڈتے رہے جبکہ وہ ہٹ میں بیٹھی ہوئی تھی پھر اکبر کو اس جن سے نیلم کا ہاتھ پکڑنے پر معافی مانگنا پڑی۔

اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑنے پر ایک غیر سے معافی کیسی دل جلانے والی بات تھی۔

"یہ آپ ہر وقت روٹھے روٹھے کیوں رہتے ہیں۔"

اکبر ایک دم چونک اُٹھا اس کے سامنے سیماں کھڑی تھی وہ ابھی سمندر سے نکل کر آئی تھی اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔

اکبر نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور بولا "نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اتنی دیر میں راشدہ بھی قریب آ گئی تھی پھر دونوں نے اس کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا سیماں اسے ریت سے اُٹھاتے ہوئے بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے تو پھر آئیے ہمارے ساتھ سمندر میں۔"

پھر وہ دونوں اس کا ہاتھ پکڑے تقریباً دوڑتی ہوئی سمندر میں لے گئیں۔

سمندر میں جاتے ہوئے جانے کس خیال نے اسے تڑپایا کہ ایک جھٹکے سے اس نے اپنے دونوں

ہاتھ ان سے چھڑا لئے اور کنارے کی طرف بھاگا۔
پھر وہ کنارے پر بھی نہیں رکا۔
وہ سیدھا ہٹ کی سیڑھیاں چڑھتا ہٹ میں آیا اور زمین پر بچھی دری پر بیٹھ گیا اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔
اس نے اپنا سر گھٹنوں کے درمیان دبا لیا اور ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا۔ کپڑوں کی طرح اس کی آنکھوں سے بھی پانی جاری تھا وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔
اسے بے اختیار نیلم یاد آ گئی تھی وہ اس کی یاد میں تڑپ اُٹھا تھا۔
سیماں نے اکبر کو اس طرح ہاتھ چھڑا کر بھاگتے دیکھا تو اس نے راشدہ سے پوچھا۔
''اُنہیں، کیا ہوا؟''
''پتہ نہیں۔'' راشدہ نے جواب دیا۔
''یہ ہٹ میں کیا کرنے گئے ہیں۔'' سیماں نے پھر سوال کیا۔
''کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' راشدہ بولی۔
''آؤ چل کر دیکھیں۔''
''کیا پتہ اندر سے کوئی کھانے پینے کی چیز لینے گئے ہوں، ابھی تھوڑا انتظار کر لیتے ہیں پھر چلیں گے اندر۔'' راشدہ نے کہا۔
راشدہ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ ہاتھ چھڑا کر کیوں بھاگا کچھ اسی طرح کا منظر تھا جب نیلم سمندر میں غائب ہو گئی تھی اس وقت ضرور اکبر بھائی کو نیلم یاد آ گئی ہو گی اور وہ ضرور اس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہوں گے۔
کچھ دیر انتظار کے بعد جب وہ دونوں اندر پہنچیں تو اکبر کے دل کا غبار نکل چکا تھا دل پر جو گھٹا چھائی تھی وہ برس کر جا چکی تھی۔
وہ ان دونوں کو سیڑھیاں چڑھتا دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کچھ مسکرانے کی بھی کوشش کی۔
''ہمیں سمندر میں اکیلا چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے۔'' سیماں نے شکایتاً کہا۔
''سیماں، یہ یہاں بیٹھے ضرور کچھ کھا رہے ہوں گے؟'' راشدہ نے لائن دی۔
''نہیں، میں نے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھ لیں ساری چیزیں جوں کی توں بندھی ہیں۔''
''پھر ادھر بھاگ کر کیوں آ گئے تھے۔'' سیماں پریشان تھی۔
''اکبر بھائی، کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکالیں بہت بھوک لگی ہے۔'' راشدہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئی، اکبر نے کھانے پینے کی اشیاء سے پُر بڑا تھیلا کھولا تو سیماں سب کچھ بھول بھال کر کھانے پینے میں لگ گئی۔
کچھ دیر بعد اسے یاد ہی نہ رہا کہ اکبر اُنہیں سمندر میں چھوڑ کر ہٹ میں آ گیا تھا۔
دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لوگ واپس چل پڑے۔
گھر پہنچ کر اکبر نہایا دھویا اور چائے پی کر سو گیا۔
ابھی سوئے ہوئے اسے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کسی کھٹکے پر اس کی آنکھ کھل گئی اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا، وہ دروازہ اندر سے بند کر کے لیٹا تھا۔
پھر اس کی نظر باتھ روم کے دروازے پر گئی تو وہ اچانک اُٹھا باتھ روم کا دروازہ کسی نے زور سے کھولا تھا، اتنے زور سے کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا تھا۔ دروازے کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔
دروازے پر نیلم کھڑی تھی۔
وہ اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
''نیلم تم۔''
''ہاں، میں۔'' نیلم کمرے میں آ گئی اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔
اکبر اُٹھ کر اس کے نزدیک گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا تھا تو وہ غصے سے ایک دم کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''خوب رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔''
''نیلم یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔''
''اب آپ کو میری کیا فکر ہو گی، آپ کو دوسری نیلم جو مل گئی۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔
''کیا بات کرتی ہو، وہ دوسری نیلم ہے، وہ تو تمہارے پاؤں کی دھول بھی نہیں۔''
''فلمیں دیکھی جا رہی ہیں، قلفی کھائی جا رہی ہے، سمندر کی سیریں ہیں۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ تم مجھے تو بالکل بھول گئے۔''
''میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں، میں تو تمہیں مر کر بھی نہیں بھول سکتا۔''
''پھر مجھے ڈھونڈتے کیوں نہیں۔''
''میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں۔''
''ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، میں تو پھر انسان ہوں۔''
''کچھ بتاؤ تو سہی تم کہاں ہو، کہاں چھپ گئی ہو۔''
''اکبر میرے چاروں طرف آگ ہے، میں مری جا رہی ہوں، خدا کے واسطے مجھے ڈھونڈ لو۔''
ابھی اکبر کوئی جواب دینے والا تھا کہ اچانک ایک خوفناک آواز کمرے میں گونجی۔

"میاؤں۔"

اکبر نے پلٹ کر دیکھا تو بیڈ پر کالے بلے کو پایا۔

کالے بلے کو دیکھ کر نیلم باتھ روم کی طرف بھاگی، کالے بلے نے بھی بیڈ سے چھلانگ لگائی اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔

باتھ روم کا دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔

تبھی اکبر کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ وہ اب تک خواب دیکھ رہا تھا وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اس نے اُٹھ کر پنکھا تیز کیا۔

کچھ دیر کے بعد جب پسینہ خشک ہوگیا اور دل کی دھڑکن قابو میں آگئی تو وہ اُٹھ کر باتھ روم میں گیا تاکہ منہ ہاتھ دھولے۔

دروازہ بند کر کے جب اس نے نیلم کی تحریر پر نظر کی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا وہ تحریر جو وقت کے ساتھ دھندلا گئی تھی اس وقت بالکل تازہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نیلم ابھی ابھی اس تحریر کو لکھ کر گئی ہو۔

وہ چکرا کر رہ گیا نیلم کو اس نے خواب میں دیکھا تھا یا وہ حقیقت میں یہاں موجود تھی۔

اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

رات کو سیماں اور اس کی امی اور بیگم آفتاب کو صابرہ نے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اکبر کو جب معلوم ہوا کہ سیماں رات کو ادھر ہوگی تو وہ گھر سے بہانہ کر کے نکل گیا۔

جب سے اس نے نیلم کو خواب میں دیکھا تھا، اسے قرار نہ تھا، دل پر گھبراہٹ طاری تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ نیلم کی تلاش میں نکل جائے۔

گھر سے نکل کر وہ سیدھا ماموں فرقان کے یہاں پہنچا۔ اس نے کھانا بھی وہاں کھایا وہ بہت دیر تک ماموں فرقان سے باتیں کرتا رہا۔

پھر وہ رات گئے وہاں سے لوٹا۔ اس کا دل مطمئن تھا، اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن جب شام کو سیماں، اکبر کے گھر آئی تو اس کا موڈ بہت خراب تھا وہ اکبر سے حساب لینے آئی تھی کہ وہ کل رات کو کہاں غائب ہوگیا جبکہ وہ لوگ اس کے گھر پر کھانے پر مدعو تھے۔

"اکبر آ گئے شوروم سے؟" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

"وہ تو گئے۔" راشدہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"گئے...... کہاں گئے؟"

"مری۔" راشدہ نے کہا اور سیماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آؤ اندر تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"مری۔" سیماں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" یہ بات اس نے خود کلامی کے انداز میں کہی۔ وہ گم صم سی ہوگئی۔

راشدہ نے محسوس کیا کہ سیماں پر اس خبر نے بجلی سی گرادی ہے۔ اندر ہی اندر کوئی چیز ٹوٹی ہے۔ ایک بے نام سی اداسی اس کے چہرے پر چھا گئی تھی۔

سیماں نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا لیکن راشدہ نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ سیماں کا ہاتھ نہ صرف ٹھنڈا ہو چکا ہے بلکہ کانپ بھی رہا ہے۔

"سیماں کیا ہوا تمہیں۔ خیریت تو ہے۔" راشدہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں مجھے کیا ہوگا۔" سیماں کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آئی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔"

"کیا یہاں تم اکبر بھائی سے ملنے آئی تھیں؟" راشدہ نے سوال کیا۔

"نہیں تو۔" سیماں نے جلدی سے کہا۔ "تم سے ملنے آئی تھی۔"

"پھر مجھ سے ملے بغیر کیوں جا رہی ہو، آؤ اندر آؤ، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"راشدہ، میں پھر آجاؤں گی۔ اس وقت میری کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو ابھی تو تم ٹھیک تھیں۔"

"چکر سے آرہے ہیں۔" سیماں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آؤ میں تمہیں اچھی سی چائے بنا کر پلاتی ہوں، تمہارے چکر ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر سیماں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اسے کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

راشدہ نے سیماں کو ڈرائنگ روم میں نہ ٹی وی لاؤنج میں نہ اپنے کمرے میں بٹھایا وہ اسے سیدھی اکبر کے بیڈ روم میں لے گئی۔

بیڈ کے سرہانے اس نے دو تین تکیے رکھ دیئے اور بولی۔ "تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

سیماں بڑی فرمانبرداری سے تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سامنے نیلم کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔

راشدہ چائے بناتے ہوئے الجھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ان دونوں میں جو کچھ ہوا تھا اکبر اور سیماں کی ملاقاتوں کے جو اثرات مرتب ہوئے تھے۔ وہ بہت حوصلہ افزاء تھے۔ سیماں بڑی تیزی سے اکبر کی طرف بڑھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اکبر شادی شدہ ہے اس کے باوجود لاشعوری طور پر وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔ ایک لڑکی دوسری لڑکی پر فتح حاصل کرنا

چاہتی تھی، میدان مار لینے کے جذبے نے اسے آگے بڑھایا اور پھر وہ واقعی اکبر کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

اکبر اگر مری نہ گیا ہوتا اور اس کی توجہ سیماں کی طرف ہوگئی ہوتی تو سیماں کا اکبر کی محبت میں گرفتار ہونا بجا تھا بلکہ دونوں ماں بیٹی کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

مشکل یہ تھی کہ راشدہ اپنے بھائی اکبر کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ سیماں کی صورت میں ان لوگوں نے جو اس کے دل پر تیر چلایا تھا وہ رائیگاں گیا تھا۔

اکبر نے سیماں کو محبت کی ایک نظر بھی عطا نہ کی تھی حالانکہ وہ نیلم کی بڑی حد تک ہم شکل تھی لیکن اسے نقل نہیں چاہئے تھی۔ اسے اصل درکار تھی۔ اسی لئے وہ سیماں کو خاطر میں لائے بغیر مری چلا گیا تھا۔

راشدہ دیکھ رہی تھی کہ اکبر کے مری چلے جانے سے سیماں پر خاصر خواہ اثر ہوا۔ وہ شاید اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے حقائق بتا دینے چاہئیں تا کہ وہ سنبھل جائے اور یہ جان لے کہ اکبر کا دل فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ابھی تک سیماں کو نیلم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ بس یہی بتایا گیا تھا کہ وہ لاہور گئی ہوئی ہے۔ صابرہ اور راشدہ کی غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر سیماں نے اپنے طور پر نیلم کے بارے میں یہ بات فرض کر لی تھی کہ اکبر اور نیلم کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ نیلم لڑ کر میکے چلی گئی ہے اور اب یہ دونوں ماں بیٹی چاہتی ہیں کہ نیلم کا قصہ پاک کر دیا جائے اور سیماں کو اس کی جگہ دے دی جائے۔

سیماں کو اکبر پہلی نظر میں اچھا لگا تھا اس لئے وہ انجام سے بے خبر محبت کی آگ میں کود پڑی تھی۔

راشدہ چائے کے دو کپ ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو سیماں، نیلم کی تصویر کو گھور رہی تھی۔ راشدہ نے اسے غور سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ سیماں کی محض آنکھیں نیلم کی تصویر کی طرف ہیں، ذہن کہیں اور ہے۔

''لو سیماں چائے پیئو۔'' راشدہ نے ایک کپ اس کی طرف بڑھایا۔

''آں۔'' سیماں، راشدہ کی آواز سن کر جیسے چونک اُٹھی۔ اس نے گھبرا کر کپ پکڑ لیا۔

وہ دونوں خاموشی سے چائے پیتی رہیں۔ راشدہ سوچ رہی تھی کہ وہ سیماں کو بتانے کیلئے کہاں سے آغاز کرے اور سیماں یہ سوچ رہی تھی کہ راشدہ اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ کرنا چاہتی ہے تو کرتی کیوں نہیں۔

''اکبر مری کیوں گئے ہیں؟'' سیماں نے بالآخر گفتگو کا آغاز کیا۔

''نیلم کیلئے!''

سیماں کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ ''نیلم تو لاہور میں ہے؟''

''لیکن اکبر بھائی کا خیال ہے کہ وہ مری میں ہے؟'' راشدہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' سیماں نے خالی کپ میز پر رکھا اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''سمجھ میں تو آج تک ہماری بھی نہیں آیا کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا کہنا چاہتی ہو راشدہ، جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔''

''ایک بات بتاؤ؟ سیماں تمہیں اکبر بھائی کیسے لگتے ہیں۔''

''صاف صاف بتا دوں۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''میں اُنہیں چاہنے لگی ہوں۔'' سیماں نے گہری نظروں سے راشدہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ راشدہ نے یہ سن کر گہرا سانس لیا۔ اس نے سیماں کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ صحیح نکلا، تب راشدہ ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی اس نے سیماں کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ اسے لے کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔

''کہاں لئے جا رہی ہو مجھے۔'' سیماں حیرت زدہ تھی۔

''آؤ تو۔'' راشدہ اسے لے کر باتھ روم میں داخل ہوئی اور پھر اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ بند کرنے پر سیماں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر نیلم کی لکھی ہوئی تحریر پر پڑی۔

''اکبر میں تمہاری ہوں، مجھے بھول نہ جانا۔''

''یہ کیا ہے؟'' سیماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں، یہ سب کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سیماں کو باتھ روم سے نکال لائی اور وہ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''سیماں کیا تمہارا جن بھوتوں پر یقین ہے۔'' راشدہ نے پوچھا۔

''ہائے جن بھوتوں سے مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔'' سیماں نے جواب دیا۔

''کیا تم جانتی ہو کہ جن خوبصورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتا ہے۔''

''ہاں میں جانتی ہوں ہماری امی کے دور کے رشتے داروں میں ایک واقعہ ہو چکا ہے۔ ایک جن نہ صرف لڑکی پر عاشق تھا بلکہ اس نے اس لڑکی سے شادی کرنے کیلئے اپنا رشتہ بھجوایا اور رشتہ نامنظور کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ والدین مجبوراً اس رشتے پر راضی ہو گئے پھر اس لڑکی کی باقاعدہ بارات آئی، نکاح ہوا، شادی کی تمام رسمیں ادا کی گئیں اور لڑکی کو رخصت کر دیا گیا۔ اس جن نے بستی

سے ہٹ کر ایک مکان لے لیا اب وہ لڑکی اس جن کے ساتھ رہتی ہے ماں باپ کے علاوہ اس لڑکی سے ملنے کوئی نہیں جا سکتا۔" سیماں نے بتایا پھر وہ خوف سے لرز کر بولی۔ "ہائے راشدہ یہ کیسی دل ہلانے والی بات ہے۔"

"ایسی ہی دل ہلانے والی بات اس گھر میں بھی ہوئی ہے۔"

"نہیں بھئی۔" سیماں فوراً سمٹ کر بیٹھ گئی۔ "کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"ہاں میں تمہیں تفصیل سے ساری بات سناتی ہوں۔" راشدہ نے کہا۔ "ہماری بھابھی نیلم پر ایک جن عاشق ہے۔"

پھر راشدہ نے قصے کو ٹرین سے شروع کیا اور شادی کے بعد ان چار مہینوں میں جو بھی واقعات رونما ہوئے ان کا تفصیل سے ذکر کیا۔ سیماں اس ساری کہانی کو دم بخود ہو کر سنتی رہی۔ جب قصہ ختم ہوا تو سیماں کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔

اس نے خوفزدہ ہو کر نیلم کی تصویر کو دیکھا پھر سنگھار میز کے آئینے میں خود کو دیکھا اس کی شکل نیلم سے کافی ملتی تھی۔ اس نے سوچا اکبر تو اس پر عاشق ہوا نہیں لیکن اگر کہیں جن نے اسے دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے۔

اس تصور نے اس کی سٹی گم کر دی۔

پھر جو وہ اس گھر سے بھاگی تو پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ سیماں واپس اسلام آباد چلی گئی حالانکہ اس کا یہاں کافی دن رہنے کا پروگرام تھا۔

صابرہ کو بڑی حیرت تھی کہ سیماں نے اچانک گھر میں آنا کیوں بند کر دیا اور کیوں اتنی جلدی کراچی چھوڑ گئی۔ راشدہ نے صابرہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اس نے سیماں کو بھی قسم دی تھی کہ وہ یہ قصہ کسی اور کو نہ بتائے۔

صابرہ، اکبر کے مری جانے کی وجہ سے بہت پریشانی تھی۔ بابر کا خیال تھا کہ یہ سب صابرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔

"لیکن میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے اس سے کب کہاں کہ وہ مری چلا جائے۔" صابرہ نے صفائی پیش کی۔

"تم نے اس پر سیماں کو جو مسلط کر دیا تھا۔" بابر نے خفگی سے کہا۔

"یہ سب میں نے اس کے بھلے کیلئے کیا تھا۔" صابرہ بولی۔

"سیماں کی وجہ سے نیلم کی یاد نے شدت اختیار کر لی اسی لئے وہ چلا گیا۔"

"اب کیا ہوگا۔" صابرہ نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔" بابر لاتعلقی سے بولا۔

"آپ نے اسے مری جانے کی اجازت کیوں دی۔" صابرہ الجھ پڑی۔

"میں اگر اسے اجازت نہ دیتا تو بھی وہ چلا جاتا۔"

"ایسا کریں آپ خود مری چلے جائیں وہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا۔" صابرہ نے تشویش سے کہا۔

صابرہ ماں تھی، اکبر اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے کا لخت جگر اس طرح مارا مارا پھرے۔ وہ سیماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے سیماں کو غیبی امداد جانا تھا اسے قوی امید تھی کہ اکبر، سیماں کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ پھر آگے شادی کی بات چلائی جائے گی لیکن اکبر بھی خوب چیز تھا اس نے سیماں کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا اور جوں جوں سیماں اس کی طرف بڑھتی چلی گئی توں توں وہ نیلم کے قریب ہوتا گیا۔

نیلم اسے شدت سے یاد آنے لگی وہ اسے دیکھنے کیلئے تڑپ اُٹھا۔

ضرغام اور دادا غفور سے جو معلومات نیلم کے بارے میں ملی تھیں اس کے مطابق نیلم درختوں سے گھرے ایک مکان میں تھی اور یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔

اگرچہ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ نیلم کس پہاڑی مقام پر ہے۔ یہ گھر پاکستان کے کسی بھی پہاڑی مقام پر ہو سکتا تھا لیکن قیاس یہ تھا کہ یہ مکان مری میں ہے۔

ماموں فرقان سے جب اکبر نے اس معاملے پر بات کی تو انہوں نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ نیلم مری میں ہو سکتی ہے اس قیاس کی اگرچہ کوئی ٹھوس بنیاد نہ تھی محض ایک خیال تھا اور یہ خیال بار بار ذہن میں اس لئے آتا تھا کہ نیلم آخری بار مری میں دیکھی گئی تھی۔

اکبر نے اس مسئلے پر زیادہ نہ سوچا اس نے اللہ کا نام لیا اور مری کی طرف پرواز کر گیا۔

مری پہنچ کر اس نے ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا اور سامان رکھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پاس سامان ہی کیا تھا ایک سفری بیگ تھا جس میں چند جوڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

پہلے دن اس نے کچھ نہ کیا صرف مری کی اکلوتی سڑک پر ادھر سے ادھر گھومتا رہا۔ وہ ایک ایک لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس نے ہوٹلوں کے چکر بھی لگائے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح کہیں نیلم دکھائی دے جائے۔

رات کو تھک ہار کر وہ اپنے ہوٹل لوٹ آیا۔ ہوٹل سے اس نے کراچی بابر کو فون کیا، اپنے خیریت سے مری پہنچنے کی اطلاع دی اور جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کا نام اور کمرہ وغیرہ بتایا پھر دن بھر کی کار

گزاری بیان کی اور دوبارہ فون کرنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔

کمرے کی لائٹ بجھا کر وہ بیڈ پر لیٹا تو اسے بستر کانٹوں بھرا محسوس ہوا۔

وہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنے لگا لیکن نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر اس نے اُٹھ کر لائٹ جلادی اور کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو شیشے کی کھڑکی سے چاند نے اپنا چہرہ دکھایا۔ پورا چاند تھا۔ ایک سحر انگیز منظر تھا، وہ کھڑکی کھول کر چاند کو تکنے لگا۔

چاند کو دیکھتے دیکھتے ایسے ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ کیا پتہ نیلم بھی اس وقت چاند کو دیکھ رہی ہو۔ کاش کوئی ایسا ذریعہ بن جائے کہ وہ نیلم تک پہنچ سکے۔

اکبر کا خیال سو فیصد درست تھا۔

نیلم واقعی کھڑکی میں کھڑی چاند کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ چاند اور چاندنی سے نیلم کو ہمیشہ سے دلچسپی تھی۔ چاندنی اس پر سحر پھونک دیتی تھی۔ اس کے جسم کے سمندر میں چاندنی راتوں میں جوار بھاٹا سا آجاتا تھا۔

لاہور میں وہ چاندنی راتوں میں دیر تک ٹہلا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ اس کو لاہور یاد آرہا تھا پھر لاہور سے اس کا ذہن شادی اور کراچی کی طرف منتقل ہوگیا۔ کراچی شہر یاد آیا تو اکبر کا چہرہ ابھرا۔

وہ چاند میں اس کا چہرہ تلاش کرنے لگی اور چاند دیکھتے دیکھتے اتنی محو ہوگئی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ قرل اس کے پیچھے آکھڑا ہوا ہے۔

سیّد پور کے جن نے جب اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ یکدم چونک اُٹھی۔

''اوہ، میں نے محویت توڑ دی، چاند میں ڈوبی ہوئی تھیں شاید۔'' وہ ہنسا۔

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے واپس پلٹی اور بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

''میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔'' سیّد پور کا جن بولا۔

''کافی دیر سے کھڑی تھی کھڑے کھڑے تھک گئی میں۔'' نیلم نے وضاحت کی۔

''کھڑے کھڑے تھک گئیں یا میرا کھڑکی کے قریب آنا پسند نہ آیا۔'' قرل نے طنز کیا۔

''میں کھڑکی میں کھڑی اکبر سے تو بات نہیں کر رہی تھی۔'' نیلم نے طنز کا جواب طنز میں دیا۔

''چاند کو تو دیکھ رہی تھیں۔'' قرل نے سوال کیا۔

''ہاں دیکھ رہی تھی۔''

''کیا پتہ چاند میں محبوب کی شکل دکھائی دے رہی ہو'' سیّد پور کے جن نے تیر چلایا۔

''کاش ایسا ہوتا۔'' نیلم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تمہارا جی تو چاہتا ہوگا کہ اکبر کسی طرح یہاں پہنچ جائے۔''

''کاش وہ پہنچ سکتا۔'' نیلم ضد پر اتر آئی۔

''خیر اس کا یہاں پہنچنا تو اتنا مشکل نہیں لیکن وہ یہاں پہنچ کر کرے گا کیا؟''

''وہ مجھے یہاں سے اپنے ساتھ لے جائے گا'' نیلم نے اسے جلایا۔

''وہ۔'' یہ کہہ کر سیّد پور کے جن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''وہ تمہیں کہاں لے جائے گا۔ میرے سامنے وہ کل کا لونڈا ہے تمہیں لے جانے کے بجائے کہیں خود نہ پھنس جائے۔''

''تم اس کا کیا بگاڑ لوگے۔'' نیلم غصے میں آگئی۔

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا ابھی سے کیا کہوں۔'' سیّد پور کے جن نے ہنس کر کہا۔

''اتنا تکبر نہ کرو، مت بھولو کہ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو مار گراتی ہے۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ تمہاری بھی کوئی کمزوری ہوگی۔''

''یہ تم نے ٹھیک کہا واقعی میری ایک کمزوری ہے۔''

''وہ کیا؟'' نیلم نے چونک کر پوچھا۔

''تم میری کمزوری ہو۔'' سیّد پور کے جن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ''اور تمہاری وجہ ہی سے میں نے اکبر کو برداشت کیا ہے ورنہ کب کا میں اسے اپنے راستے سے ہٹا چکا ہوتا۔''

''تم اسے کیا راستے سے ہٹاؤ گے۔ ایک دن وہ ضرور تمہیں راستے سے ہٹادے گا۔'' نیلم بھی جذباتی ہوگئی۔

''تمہارا یہ خواب قیامت تک پورا نہ ہوگا۔''

''یہ خواب نہیں ہے قرل، میرے دل کی آواز ہے۔ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... اگر قسمت میں مٹنا لکھا ہے تو مٹ جاؤں گا، تمہارے لئے مٹ جاؤں گا نیلم۔'' سیّد پور کے جن نے اس کا ہاتھ چھو کر کہا۔ ''اور مٹ کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کروں گا۔''

''بہت محبت ہے مجھ سے۔'' نیلم نے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔ ''ہاں بہت۔'' وہ بولا۔

''سچی محبت ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بادل سے برستی بارش کی طرح سچی۔'' قرل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میرا کہا مانو گے۔'' نیلم نے سوال کیا۔

''ہاں ایک بات کے سوا جو کہو گی کر گزروں گا، کر کے دکھادوں گا۔'' وہ بولا۔

''پھر تو یہ محبت نہ ہوئی خود غرضی ہوئی۔''

''اب تم جو بھی سمجھو، جو بھی کہو میں تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''آخر کب تک قید رکھو گے مجھے، قرل۔''

''تا قیامت۔'' سیّد پور کے جن نے مسکرا کر کہا اور پھر بیٹھے بیٹھے ہاتھ لمبا کر کے لائٹ بجھا دی۔

ادھر سیّد پور کے جن نے لائٹ بجھائی ادھر اکبر نے اپنے کمرے کی لائٹ بجھائی اور بیڈ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کس وقت اس کی آنکھوں میں نیند کی دیوی اتر آئی۔

سوتے سوتے اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔

اس نے نیلم کو شعلوں میں گھرا دیکھا، نیلم کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ آگ آگ پکارتی ادھر ادھر بھاگ رہی ہے۔

دریا کا کنارا ہے۔ نیلم ادھر ہے، اکبر ادھر ہے۔ دریا میں خطرناک جانور تیر رہے ہیں۔

''اکبر مجھے بچاؤ، اکبر مجھے بچاؤ۔''

نیلم کی دلخراش چیخیں اسے سنائی دیتی ہیں تو وہ خونخوار جانوروں کی پروا کئے بغیر دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

''میں آرہا ہوں، نیلم۔'' وہ زور سے چیختا ہے۔

وہ جیسے ہی دریا میں چھلانگ لگاتا ہے وہ پانی میں گرنے کے بجائے ریت پر گرتا ہے دریا اچانک خشک ہو جاتا ہے وہ دوسرے کنارے پر نیلم کو دیکھتا ہے اب وہ اسے نہیں دکھائی دیتی۔

تب وہ گھبرا کر ''نیلم نیلم'' پکارتا ہے۔

پھر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

کمرے میں اندھیرا ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر چاندنی پڑ رہی ہوتی ہے وہ فوراً بیڈ پر بیٹھ جاتا ہے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوتے ہیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا ہوتا ہے۔

وہ اُٹھ کر پانی پیتا ہے۔

پھر اسے نیند نہیں آتی۔ رات کا بقیہ حصّہ وہ آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دیتا ہے۔

صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور ہوٹل سے نکل گیا اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ پھر اس نے درختوں سے گھرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

دوپہر تک وہ ایک ایسے مکان کی تلاش میں سرگرداں رہا جو درختوں سے گھرا ہوا اور دور تک اس کے آس پاس کوئی مکان نہ ہو۔

ایسے کئی مکان اس نے دیکھے، کئی بنگلوں کے دروازے بھی اس نے کھٹکھٹائے مگر مایوسی ہوئی۔

دوپہر کو واپس ہوٹل آگیا اس نے کھانا کھایا۔ تھکا ہوا تھا کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا تو نیند آگئی۔

سہ پہر کو اُٹھا چائے پی پھر بازار کا ایک چکر لگایا۔

اس کے بعد اس نے اس مرتبہ مخالف سمت کا رخ کیا۔ اس نے ادھر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

درختوں سے گھرے اس مکان کی تلاش میں اسے شام ہوگئی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ہوٹل لوٹ آیا ابھی وہ بیڈ پر لیٹا آرام ہی کر رہا تھا کہ کراچی سے کال آگئی۔

پہلے بابر نے بات کی۔ اس نے نیلم کے بارے میں پوچھا اکبر نے جہاں جہاں اسے تلاش کیا تھا، بتایا پھر صابرہ نے فون لے لیا۔ اس نے اکبر کو قسمیں دیں کہ وہ فوراً کراچی واپس آجائے۔ صابرہ کو اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ اس کی طرف سے بہت پریشان تھی، فکر مند تھی۔

اکبر نے اپنی ماں کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ فکر نہ کرے میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت جلد کراچی لوٹ آؤں گا۔

دوسرے دن اس نے پھر نیلم کی تلاش شروع کر دی۔

اور وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔

سچ کہتے ہیں حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ سفر کرنے سے منزل قریب ہوتی ہے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر وہ ایک ایسے مکان کے پاس پہنچ گیا جو درختوں سے گھرا ہوا تھا اونچائی پر تھا اور اس کے آس پاس دور تک کوئی مکان نہ تھا۔

اس چھوٹے سے خوبصورت مکان کو دیکھ کر اکبر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اگرچہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ یہ وہی مکان ہے جہاں نیلم قید ہے کیونکہ ایسے تنہا مکان وہ کئی دریافت کر چکا تھا۔ ان کے دروازے کھٹکھٹا چکا تھا۔ ان مکانوں کے دروازوں سے نیلم برآمد نہ ہوئی تھی لیکن اس مکان کو دیکھ کر اکبر کا دل جانے کیوں بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

یہ مکان نیچے سڑک سے بالکل نظر نہ آتا تھا ایک دم الگ تھلگ تھا اور اس طرح درختوں میں چھپا ہوا تھا جیسے بادلوں میں چاند۔

اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔

نیلم مکان کے اندر اپنے بیڈ پر اداس لیٹی تھی۔ سیّد پور کا جن اس وقت کمرے میں نہ تھا پھر اچانک وہ تیزی سے شہزادے کے روپ میں کمرے میں داخل ہوا اور نیلم کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا۔ نیلم فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اب کیا ہے؟'' نیلم نے بیزاری سے کہا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے کمرے سے گیا تھا۔

’’وہ آ گیا ہے۔‘‘ سیّد پور کے جن نے اطلاع دی۔

’’کون؟‘‘ نیلم نے پوچھا۔

’’جسے تم ہر وقت یاد کرتی رہتی ہو۔‘‘ سیّد پور کے جن نے وضاحت کی۔

’’اکبر میرا اکبر۔‘‘ نیلم نے خوش ہو کر کہا وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ’’کہاں ہے وہ؟‘‘

’’باہر کھڑا ہے؟‘‘ قرل نے بتایا۔

’’قرل تمہیں میری قسم ہے تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔‘‘ نیلم نے سیّد پور کے جن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

’’اگر تم چاہتی ہو کہ وہ زندہ سلامت چلا جائے تو اس سے کہو وہ یہاں سے فوراً واپس چلا جائے۔‘‘

’’کیا میں اس سے مل سکتی ہوں۔‘‘ نیلم نے پوچھا بلکہ التجا کی۔

’’ہاں مل سکتی ہو، لیکن آخری بار آج کے بعد سے تم کبھی اکبر سے نہیں مل سکو گی، یہ یاد رکھنا۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ نیلم نے بڑی اداسی سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ابھی دروازے کے نزدیک ہی پہنچی تھی کہ دستک کی آواز سنائی دی۔

نیلم نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔ ’’کون ہے؟‘‘

اکبر نے فوراً نیلم کی آواز پہچان لی وہ بے قرار ہو کر بولا۔ ’’میں ہوں اکبر، نیلم دروازہ کھولو۔‘‘

تب نیلم نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کیا کھلا گویا مقدر کھل گیا، نیلم کو دیکھ کر اکبر کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

وہ بانہیں پھیلا کر نیلم کی طرف بڑھا۔ ’’میری نیلم۔‘‘

نیلم اس کی بانہوں میں جانے کا انجام جانتی تھی۔ وہ اس طرح پیچھے ہٹی جیسے وہ اکبر نہ ہو سیّد پور کا جن ہو۔

’’اکبر تم یہاں کیوں آئے ہو؟‘‘ نیلم نے بڑے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اکبر کی پھیلی ہوئی بانہیں پھیلی رہ گئیں اس کے ہونٹوں کی ہنسی پھیکی پڑ گئی۔ نیلم کے سرد رویے نے اسے اندر ہی اندر بڑی تکلیف پہنچائی اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی نیلم اسے دیکھے گی سب کچھ بھول کر اس کے قریب آ جائے گی۔

نیلم اسے دیکھ کر ایسا ضرور کرتی لیکن وہ سیّد پور کے جن سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکبر کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے، اسے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اکبر، سیّد پور کے جن کی قید سے اسے آزاد نہیں کرا سکے گا۔ وہ اس کی محبت میں یہاں تک آ گیا تھا، اتنا بہت تھا۔ نیلم اپنی محبت کو کسی قیمت پر نقصان پہنچنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

اسی لئے وہ اس کے ساتھ بے رُخی سے پیش آئی تھی اس سے سرد رویہ روا رکھا تھا۔

’’نیلم میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو، دیکھو نیلم میں تمہیں نہیں بھولا ہوں۔ تم نے لکھا تھا کہ میری ہو، تم اگر میری ہو تو اب میرے ساتھ چلو۔‘‘

اکبر کی یہ بات سن کر نیلم کا کلیجہ ہل گیا۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ اکبر کا ہاتھ پکڑے اور کہے ٹھیک ہے اکبر، چلو میں واقعی تمہاری ہوں۔

لیکن ایسا وہ صرف سوچ سکتی تھی کر نہیں سکتی تھی اور جو وہ کر سکتی تھی وہ اس نے کر دیا۔

اس نے اپنے محبوب کو بچا لیا۔ اس نے اپنے شوہر کو بچا لیا۔ اس نے اکبر کو اپنی قسم دے کر واپس لوٹا دیا۔ اکبر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا لیکن نیلم جانتی تھی کہ قرل اور اکبر کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اکبر اس کے سامنے چیونٹی کی طرح تھا جسے وہ اپنی ایک چٹکی میں مسل سکتا تھا۔ اس نے اکبر کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔

اکبر اس گھر سے مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ پھر اس نے ہوٹل سے اپنا بیگ اُٹھایا اور واپس کراچی کیلئے چل پڑا۔

اکبر بچہ نہ تھا، بے وقوف نہ تھا، وہ ساری باتیں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ نیلم نے اس کے ساتھ سرد رویہ کیوں رکھا، کیوں قسمیں دے کر اسے یہاں سے جانے کو کہا۔ وہ جانتا تھا کہ سیّد پور کے جن سے ٹکر لینا آسان نہ تھا۔ بڑے بڑے لوگ اس سے شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے تھے۔ وہ بیچارہ کس کھیت کی مولی تھا۔

اکبر کیلئے یہ خوشی کیا کم تھی کہ اس نے کئی ماہ بعد نیلم کا چہرہ دیکھ لیا تھا، اس نے وہ مکان دیکھ لیا تھا جہاں نیلم قید تھی۔ وہ کراچی جا کر نیلم کی رہائی کیلئے کچھ کر سکتا تھا۔

کراچی کینٹ اسٹیشن پہنچ کر جب وہ گاڑی سے باہر آیا تو ایک قلی نے لپک کر اس کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا، اکبر نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

تب اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

اکبر نے بڑی حیرت سے کہا۔ ’’نیاز بابا آپ۔‘‘

نیاز محمد اس کے سامنے کھڑا تھا...... اور جس حالت میں وہ اس کے سامنے کھڑا تھا وہ اکبر کو حیرت میں ڈالنے کیلئے کافی تھا۔

وہ لال قمیض پہنے تھا، وہ قلی بنا ہوا تھا۔

’’بابا، یہ سب کیا ہے، آپ...... آپ......‘‘

’’میں قلی کیوں بنا ہوا ہوں، یہ پوچھنا چاہتے ہو۔‘‘ نیاز محمد نے سوال کیا۔

"جی، میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ میں سزا کاٹ رہا ہوں، بس کچھ دن اور رہ گئے ہیں۔" نیاز محمد بولا۔

"سزا؟" اکبر اور حیران ہوا۔ "کس بات کی سزا؟"

"سیّد پور کے جن سے شکست کھانے کی سزا۔" نیاز محمد نے بڑی عقیدت سے کہا۔

"اوہ۔" اکبر کو یاد آیا جب وہ ماموں فرقان کے ساتھ املی والے بابا سے ملنے گیا تھا تو انہوں نے سزا کا ذکر کیا تھا......اس وقت وہ لوگ خوف کے مارے نیاز محمد کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکے تھے۔ ماموں فرقان کا تو جی بھی چاہا تھا کہ وہ املی والے بابا سے پوچھیں، نیاز محمد کو آپ نے کیا سزا دی لیکن پھر انہوں نے مداخلت بیجا سمجھ کر سوال نہ کیا۔

"یہ کس قسم کی سزا ہے؟" اکبر، نیاز محمد سے سوال کر سکتا تھا، اس نے سوال کیا۔

"جب میں شکست کھا کر اپنے مرشد کے سامنے پہنچا تو وہ جلال میں آ گئے، انہوں نے مجھ سے میری قوت پرواز چھین لی اور حکم دیا جا مسافروں کے سامان اُٹھا......بس تبھی سے میں قلی بنا ہوا ہوں......میں سامان اُٹھانے کے پیسے بھی نہیں لے سکتا......لہٰذا سامان میں اُٹھاتا ہوں اور پیسے ایک بوڑھے قلی کو دلوا دیتا ہوں......یہ قمیض بھی اسی کی ہے۔"

"بابا میں کیا کروں؟" اکبر نے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا......آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" نیاز محمد فکر مند ہو گیا۔

اکبر اور نیاز محمد اسٹیشن سے باہر نکل آئے اور ایک چائے کے ہوٹل میں جا بیٹھے۔

"اکبر، ہم تو اندھے ہوئے ہیں، ہمیں سب کچھ دکھائی دیتے ہوئے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا......اصل میں اندر کی آنکھ کا کچھ اور ہی مزہ ہے......ایک بار کھل کر بند ہو جائے تو اس اذیت کا تم اندازہ نہیں کر سکتے......اب تم خود ہی بتاؤ کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔"

"مری سے......" اکبر نے فوراً بتایا۔

"گھومنے گئے تھے۔" نیاز محمد نے سوال کیا۔

"نہیں بابا، وہ سیّد پور کا جن، نیلم کو یہاں سے لے اُڑا ہے......وہ آج کل مری میں ہے۔" یہ کہہ کر اکبر نے ساری داستان تفصیل سے نیاز محمد کو سنا دی۔

نیاز محمد نے ساری داستان سن کر ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر خبیث ہے......مجھے اگر معلوم ہوتا کہ اس قدر چالاک اور اس قدر ذلیل جن ہے تو اسے ذرا بھی موقع نہ دیتا......جلا کر راکھ کر دیتا۔"

"پر بابا، اب کیا ہو گا؟" اکبر نے اداس لہجے میں کہا۔ "آپ سے ملاقات ہونے کے بعد اُمید بندھ گئی تھی کہ اس کمینے سے نجات مل جائے گی لیکن مقابلہ ہارنے کے بعد آپ ایسے غائب ہوئے کہ آج نظر آئے ہیں......پھر املی والے بابا سے توقع تھی کہ وہ ضرور کچھ کریں گے لیکن انہوں نے غفور دادا کی طرف بھیج دیا اور خود غائب ہو گئے اب تو بیچارے غفور دادا بھی نہ رہے......ماموں فرقان کے بس کا معاملہ نہیں......اب میں کروں تو کیا کروں......جاؤں تو کہاں جاؤں......اس سرزمین پر کوئی ایسا انسان نہیں جو اس خبیث جن کو قابو میں کر کے میری نیلم مجھے دلوا دے۔"

"ہاں، ہے کیوں نہیں، ایسا انسان۔" نیاز محمد نے بڑے یقین سے کہا۔

"کہاں ہے وہ......کون ہے وہ؟"

"تم تو اچھی طرح جانتے ہو انہیں۔"

"نام بتائیں۔" اکبر نے بے قراری سے پوچھا۔

"میرے مرشد......املی والے بابا۔"

"وہ ہیں کہاں؟ املی کے نیچے تو بندر بیٹھے ہیں اور وہ خود غائب ہیں۔"

"مجھے اپنے مرشد کا پیغام ملا ہے، اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔"

"پیغام......کیا پیغام۔" اکبر نے پوچھا۔

"ایک تو میری سزا سے متعلق ہے......میری سزا جلد ختم ہونے والی ہے۔"

"اور دوسرا۔" اکبر نے سوال کیا۔

"دوسرا تم سے متعلق ہے۔" نیاز محمد نے بتایا۔

"وہ کیا؟" اکبر نے پوچھا۔

"املی والے بابا......خود تمہارے گھر پہنچیں گے ان کا چلّہ مکمل ہونے والا ہے اور یہ چلّہ انہوں نے صرف سیّد پور کے جن کیلئے کاٹا ہے......بس اکبر اب تم خوش ہو جاؤ......تمہاری زندگی میں بہار آنے والی ہے۔"

یہ نیاز محمد بھی عجیب آدمی ہے......اکبر نے سوچا......پہلی مرتبہ وہ اسے کلفٹن پر ملا تھا اس وقت اکبر پر شدید مایوسی طاری تھی اور وہ دیوار پر بیٹھا رو رہا تھا کہ نیاز محمد نے آ کر اس کے دل میں خوشی کی جوت جگا دی تھی......اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا......وہ مری سے شدید مایوسی کے عالم میں لوٹا تھا کہ پلیٹ فارم پر نیاز محمد مل گیا تھا اور پھر اسے نوید مسرت دے رہا تھا......اس کے دل سے مایوسی کے بادل ہٹا رہا تھا......وہ اندھیرے میں جگنو بن کر چمکا تھا......نیاز محمد اس کیلئے خوش بختی کی علامت بن گیا تھا۔

"جاؤ، اب تم گھر جاؤ اور ہمارا انتظار کرو۔" نیاز محمد نے کہا۔

"کیا املی والے بابا کے ساتھ آپ بھی آئیں گے۔" اکبر نے پوچھا۔

"اگر مرشد نے میری قوت پرواز بحال کر دی اور مجھے میری آنکھیں لوٹا دیں تو پھر میں ضرور ان کے ساتھ آؤں گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو جیسا آپ چاہتے ہیں...... اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکبر کھڑا ہو گیا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کے چہرے پر شادابی تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی...... نیاز محمد نے اسے ایسی نوید دی تھی کہ اس کے دل میں انار چھوٹنے لگے تھے۔

ایک مرتبہ وہ پھر خوابوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔

وہ نیلم کو اپنے نزدیک تر دیکھ رہا تھا...... معطر باد صبا چلتی تھی...... کلیاں چٹک رہی تھیں...... پھول مہک رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں رنگین خواب بسے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی وہ چونک جاتا تھا...... ڈر جاتا تھا...... سہم جاتا تھا...... اس نے نیلم کے سلسلے میں اتنے فریب کھائے تھے...... اتنی اذیتیں اُٹھائی تھیں وہ یہ سوچ کر دہل جاتا تھا کہ وہ پھر سے کہیں فریب نہ کھا رہا ہو۔

لیکن اس مرتبہ کوئی فریب نہ تھا، شاید سچی خوشیاں اسے ملنے والی تھیں۔

اس نے اپنے گھر والوں اور ماموں فرقان کو مری کا حال سنا دیا تھا اور اسٹیشن پر قلی کی صورت میں ملنے والے نیاز محمد سے ملاقات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔

اس ذکر پر سب کا دل خوش ہونے کو چاہا مگر جانے کیوں ہر شخص نے خوشی کا اظہار کرنے سے احتراز کیا اس لئے کہ خوشیاں اُنہیں راس نہیں آتی تھیں...... کام بنتے بنتے بگڑ جاتا تھا۔

آنے والے وقت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا...... جانے کیا ہو...... اس لئے قبل از وقت خوش ہونے سے ان لوگوں نے پرہیز کیا...... البتہ اچھے دن آنے کی دعا ضرور مانگی۔

نیاز محمد نے املی والے بابا کے بارے میں کوئی حتمی خبر نہیں دی تھی کہ وہ کب آئیں گے...... شاید یہ بات اسے خود بھی معلوم نہیں تھی...... وہ بیچارہ تو معتوب تھا...... املی والے بابا کا اتنا پیغام ہی مل گیا تھا یہ اس کیلئے بہت تھا۔

اور نیاز محمد نے املی والے بابا کے بارے میں اکبر کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر پہنچیں گے...... یہ پیغام اس کی زندگی میں جان ڈال دینے کیلئے کافی تھا...... اس لئے پیغام لانے والے سے نیاز محمد نے سوال کیا اور نہ اکبر نے نیاز محمد سے دونوں اپنی جگہ انتظار کر رہے تھے۔

پھر وہ انتظار ختم ہوا۔

ایک دن صبح ہی گھنٹی بجی، خیال ہوا کہ دودھ والا آیا ہے...... راشدہ نے گیٹ کھول کر دودھ کی دیگچی آگے بڑھانا چاہی لیکن پھر وہ فوراً ہی جھجک کر پیچھے ہٹ گئی اور گیٹ بند کر کے اندر سے بولی۔

"جی آپ کون ہیں؟"

"بیٹا میں نیاز محمد ہوں، اکبر کو اُٹھا کر باہر بھیجو۔"

نیاز محمد کا نام سن کر راشدہ چونکی اور پھر "اچھا" کہہ کر تیزی سے گھر کے اندر آئی۔

اکبر کے کمرے میں پہنچ کر اسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ "اکبر بھائی، اکبر بھائی اُٹھیں۔"

"بھئی کیا مصیبت آ گئی۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"مصیبت نہیں خوشی آئی ہے۔" راشدہ نے مسکرا کر کہا۔

"خوشی آئی ہے؟" اکبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ اُٹھ کر آنکھیں ملنے لگا۔

"باہر نیاز بابا آ گئے ہیں...... جلدی جائیے وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" راشدہ نے جلدی جلدی بتایا۔

نیاز محمد کا نام سن کر گویا اس میں اسپرنگ لگ گئے وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا...... اور بھاگتا ہوا گیٹ تک پہنچا...... گیٹ کھول کر دیکھا تو سامنے نیاز محمد کھڑا تھا...... مسکراتا ہوا نیاز محمد۔

"نیاز بابا آپ کیسے ہیں...... آپ اندر آ جائیں۔" اکبر نے اس کیلئے راستہ چھوڑا۔

نیاز محمد چھوٹے گیٹ سے اندر آ گیا۔ اندر آیا تو اسے سیّد پور کے جن سے اپنا مقابلہ یاد آ گیا ایک لمحے میں کئی رنگ اس کے چہرے پر آ کر گزر گئے۔

"سزا ختم ہو گئی اور میرا قلب بھی مجھے واپس مل گیا۔" نیاز محمد نے اپنی زبان میں بات کی۔

"املی والے بابا کہاں ہیں، وہ نہیں آئے؟" اکبر کو تشویش ہوئی۔

"وہ آنے والے ہیں، انہوں نے پہلے مجھے بھیج دیا ہے، تا کہ جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر دوں۔"

"لیکن یہاں تو کوئی جھاڑ جھنکاڑ نہیں ہے...... صاف ستھرا لان ہے۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" نیاز محمد نے چاروں طرف نظریں گھمائیں، پھر وہ لان میں داخل ہو گیا اور لان کے بیچوں بیچ اس جگہ جا کر رک گیا جہاں اس نے سیّد پور کے جن کا مقابلہ کرتے ہوئے حصار کھینچا تھا...... پھر وہ اس جگہ جوتے اتار کر بیٹھ گیا...... اس کا منہ شمال کی طرف تھا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" اکبر نے پوچھا۔

"بس تم گھر میں جا کر آرام کرو۔" نیاز محمد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"آپ ناشتہ وغیرہ نہیں کریں گے۔"

"نہیں...... اکبر میں مرشد کے آنے سے پہلے اپنا کام مکمل کر لینا چاہتا ہوں...... وہ اس گھر میں

تین دن تک رہیں گے...... ان تین دنوں میں نیلم کسی بھی وقت آزاد ہو کر آجائے گی یا یوں سمجھ لو کہ وہ خبیث نیلم کو یہاں لانے پر مجبور ہو گا۔"

"کیا آپ نے املی والے بابا کو بتا دیا کہ اس وقت نیلم کہاں ہے۔"

"مجھے اُنہیں کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے بھلا...... وہ بینا آدمی ہیں ان کی نظر دور تک دیکھتی ہے وہ چاہیں تو سیاروں پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں...... خیر تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ نیلم کے گھر میں آنے کے بعد تم لوگوں کو یہ گھر خالی کرنا پڑے گا یہاں بس میں اور مرشد رہیں گے۔ دیکھو ایک بات اور تمہیں سمجھا دوں جب مرشد یہاں آجائیں تو ان سے سوالات مت کرنا۔ یہ بات اپنے گھر والوں کو بھی بتا دینا...... اُنہیں کچھ معلوم کرنا ہو گا تو وہ خود سوال کریں گے...... سوال کرنا اُنہیں پسند نہیں ہے...... وہ خاموش طبع آدمی ہیں اسی لئے دنیا سے چھپے بیٹھے ہیں...... اب تم گھر میں جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"نیاز بابا کیا میں گیٹ کھول دوں۔"

"وہ کس لئے۔" نیاز محمد نے پوچھا۔

"املی والے بابا آئیں گے تو اُنہیں گھنٹی بجانا پڑے گی، پھر گیٹ کھولنے تک اُنہیں انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑے گی۔" اکبر بولا۔

"میرے مرشد نے کبھی انتظار نہیں کیا۔" نیاز محمد نے بے نیازی سے کہا۔ "اور بند دروازے ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے...... ویسے تم چاہو تو گیٹ کھول دو۔"

اکبر نے گھر کا پورا گیٹ کھول دیا...... اور گھر میں داخل ہو کر گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

گھر کا دروازہ بند ہوتے ہی نیاز محمد اُٹھا پھر وہ کچھ پڑھتا ہوا سات قدم آگے چلا پھر رک گیا، آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے ایک پھونک ماری۔ کچھ توقف کیا اور پھر کچھ پڑھتا ہوا دائیں جانب چلا۔ سات قدم چلنے کے بعد رکا آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر پھونک ماری چند لمحے رکا اس کے بعد پھر دائیں جانب سات قدم چلا اس طرح وہ ایک مربع شکل بناتا وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لان صاف نظر آتا تھا۔ اکبر نے جب بھی جھانک کر دیکھا نیاز محمد اسے چلتا ہوا، پڑھتا ہوا، پھونک مارتا ہوا نظر آیا۔

اکبر نے نیاز محمد کے آتے ہی ماموں فرقان کو فوراً فون کر دیا، وہ بھی بس پہنچنے ہی والے تھے۔

نیاز محمد کے یہاں پہنچنے کے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد ماموں فرقان آگئے وہ اپنے گھر والوں کو بتا آئے تھے کہ اب وہ تین چار دن تک اکبر کے گھر پر ہی رہیں گے۔

ماموں فرقان کھلے گیٹ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دور ہی سے نیاز محمد کو عمل کرتے دیکھ لیا تھا

لہٰذا وہ اس کی طرف نہ گئے، سیدھے گھر کی طرف گئے۔ گھر میں لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ صابرہ خاص طور سے پریشان تھی، وہ جن کی ستائی ہوئی تھی۔ لہٰذا اب وہ بہت ڈرنے لگی تھی۔ ماموں فرقان کا چہرہ دیکھ کر گھر والوں کی کچھ ڈھارس بندھی۔ ماموں فرقان نے پہلے اکبر کو علیحدہ لے جا کر اس سے بات کی اس نے نیاز محمد سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ من وعن دہرا دی تب ماموں فرقان نے گھر والوں کو تسلی دی اور کہا۔ "بھئی اس طرح پریشان ہو کر میز کے گرد بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایک لمبا عمل ہے دو تین دن میں کچھ ظاہر ہو گا تم لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔ یہ بات ذہن میں لاؤ ہی مت کہ باہر کچھ ہو رہا ہے۔"

ماموں فرقان کے سمجھانے اور تسلی دینے پر ان لوگوں کی پریشانی کچھ کم ہوئی تب صابرہ اور راشدہ کچن میں گئیں اور ناشتے کا بندوبست کرنے لگیں۔

بابر نے اخبار اُٹھایا...... اکبر باتھ روم میں نہانے گھس گیا اور فرقان ماموں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے نیاز محمد کو دیکھنے لگے۔

وہ ابھی تک سات سات قدم چلتا مربع میں گھوم رہا تھا۔

ٹھیک دن کے بارہ بجے املی والے بابا نے اس گھر کے دروازے پر قدم رکھا۔

وہ ایک کالے رنگ کی چادر اپنے جسم پر لپیٹے ہوئے تھے ان کے دونوں بازو ننگے تھے بڑی بڑی لال آنکھیں...... ہاتھ میں کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا اور دو انچ موٹا کالا سا ڈنڈا تھا۔

املی والے بابا نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی لان کی طرف رخ کیا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

نیاز محمد کے قریب پہنچ کر انہوں نے وہ کالا ڈنڈا اسے دے دیا اور کچھ بولے۔

یہ ڈنڈا لے کر نیاز محمد نے زمین پر نشان بنانا شروع کیا، گھاس پر ایک سات قدم کا مربع ابھر آیا پھر اس مربع کے درمیان نیاز محمد نے ایک چھوٹا دائرہ بنایا اور مربع سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔

املی والے بابا لکڑی کی کھڑاویں پہنے ہوئے تھے۔ وہ انہوں نے نشان زدہ علاقے سے باہر ہی چھوڑ دیں اور چھوٹے دائرے پر براجمان ہو گئے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے اور انہوں نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لئے۔

نیاز محمد نشان زدہ علاقے سے باہر املی والے بابا کی کھڑاویں اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

ماموں فرقان اور اکبر وقفے وقفے سے کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے رہے تھے۔ اُنہیں نیاز محمد مصروف عمل دکھائی دیتا تھا۔

ابھی تک املی والے بابا کا ظہور نہ ہوا تھا۔ بارہ بجے کے بعد جو اکبر نے کھڑکی کا پردہ کھسکایا تو اسے

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ املی والے بابا نہ صرف آ گئے ہیں بلکہ انہوں نے آسن بھی جمالیا ہے اور کچھ پڑھنے میں مصروف ہیں۔ اکبر نے جلدی سے ماموں فرقان کو بتایا۔ ''وہ آ گئے ہیں۔''

''ارے کب۔'' ماموں فرقان ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔

پھر باری باری سب نے املی والے بابا کا نظارہ کیا۔

کچھ پڑھتے پڑھتے اچانک املی والے بابا نے آنکھیں کھولیں تو صابرہ ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

ان کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر اسے کالا بلا یاد آ گیا۔ صابرہ فوراً ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ املی والے بابا پڑھتے ہوئے اسی طرح آنکھیں بند کرتے اور کھولتے رہے۔ نیاز محمد ان کی کھڑاویں گود میں رکھے بہت سعادت مندی سے نشان زدہ علاقے سے باہر بیٹھا رہا۔

دن گزرا...... پھر رات بھی گزر گئی۔

سب گھر کے لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے رہے ان کے دلوں پر خوف طاری تھا۔ اکبر اور ماموں فرقان وقفے وقفے سے کھڑکی سے ان کا نظارہ کرتے رہے۔

ماموں فرقان نے کوئی تین بجے کے قریب صابرہ اور راشدہ کو زبردستی سونے کیلئے بھیج دیا۔ چار بجے تک بابر بیٹھا رہا پھر اسے بھی ماموں فرقان نے آرام کرنے کیلئے کہا۔

اکبر اور ماموں فرقان ساری رات نہ سوئے۔

املی والے بابا دن کے بارہ بجے جس آسن میں بیٹھے تھے۔ سارا دن اور ساری رات وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ انہوں نے کچھ کھانے کو مانگا نہ پینے کو۔

البتہ نیاز محمد نے صرف دوپہر کا کھانا کھایا رات کا کھانا اس نے بھی نہ کھایا۔

دوسرے دن بارہ بجے پورے چوبیس گھنٹے کے بعد املی والے بابا نے چائے طلب کی اور وہ بھی بغیر دودھ اور شکر کی۔

نیاز محمد نے اکبر کو گھر سے بلا کر چائے کا کہا اور پھر بولا۔ ''جس کپ میں مرشد کو چائے دینی ہے پہلے وہ خالی کپ مجھے دکھا دو۔''

اکبر نے صابرہ سے کہہ کر گھر میں جو سب سے قیمتی کپ تھا وہ منگوایا اسے اچھی طرح دھلوایا اور نیاز محمد کے سامنے پیش کر دیا۔

نیاز محمد نے اس خالی کپ پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر اکبر کو اسے واپس کر دیا تھوڑی دیر بعد اکبر نے اس کپ میں بغیر دودھ اور چینی کی چائے نیاز محمد کے حوالے کر دی۔

چائے پینے کیلئے املی والے بابا نے اپنا مخصوص انداز نشست تبدیل کیا گھونٹ گھونٹ کر کے انہوں

نے چائے پی...... چائے پینے کے بعد پھر انہوں نے اپنا آسن جمایا اور تیزی سے کچھ پڑھنے لگے۔

پھر وہ عصر تک کچھ پڑھتے رہے۔ نیاز محمد حسب معمول ان کی کھڑاویں عقیدت سے گود میں لئے بیٹھا رہا۔

اچانک املی والے بابا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

انہوں نے گھور کر نیاز محمد کو دیکھا اور بولے۔ ''جا گیٹ کھول وہ آ گئی ہے۔''

یہ سن کر نیاز محمد تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگا۔ ماموں فرقان اور اکبر نے اسے گیٹ کی طرف بھاگتے دیکھا تو وہ گھر سے نکل آئے۔

نیاز محمد نے جلدی سے گیٹ کھولا نیلم گیٹ پر کھڑی تھی اس کی عجیب حالت تھی وہ چھپکلی کی طرح ایک دم زرد ہو رہی تھی۔

جیسے اس کے بدن کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

''اس کے سر پر ایک جگ ٹھنڈا پانی ڈالو۔'' املی والے بابا نے وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا۔

یہ سن کر اکبر فوراً گھر کے اندر گیا اور ایک جگ ٹھنڈا پانی لے آیا۔ وہ جگ اس نے ماموں فرقان کے حوالے کر دیا اور خود گھر کی دہلیز پر کھڑا رہا۔ ماموں فرقان نے اس مرتبہ بہت سختی سے تنبیہ کر دی تھی کہ نیلم کو دیکھ کر وہ اپنے حواسوں میں رہے گا...... وہ اس وقت تک اس کے نزدیک نہیں جائے۔ جب تک اسے اجازت نہ مل جائے۔ نیلم کو گیٹ پر دیکھ کر اکبر کا رواں رواں خوشی سے جھوم اُٹھا تھا۔ اس کا جی مچل اُٹھا تھا، وہ بھاگ کر نیلم کے نزدیک جانا چاہتا تھا لیکن اسے ماموں فرقان کی تنبیہ یاد آ گئی۔

ماموں فرقان جلدی سے ٹھنڈے پانی کا جگ لے کر گیٹ کی طرف بڑھے۔

نیلم گیٹ کے اندر آ چکی تھی اور نیاز محمد گیٹ بند کر چکا تھا۔

''رک جاؤ۔'' املی والے بابا نے زور سے کہا۔

ان کا حکم سن کر ماموں فرقان اپنی جگہ جم گئے...... نیلم کا بڑھتا قدم بھی رک گیا...... نیاز محمد بھی کھڑا ہو گیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ املی والے بابا نے کس کو رکنے کیلئے کہا۔

''نیلم تم اپنی جگہ سے ہلو گی نہیں۔'' املی والے بابا نے حکم دیا۔ ''اور فرقان، تم اس کے سر پر پانی ڈال دو۔''

ماموں فرقان جلدی سے آگے بڑھے اُنہوں نے پتھرائی ہوئی نیلم کے سر پر ٹھنڈے پانی کا جگ خالی کر دیا۔ پانی پڑتے ہی اس کے سر سے ''چھن چھن'' کی آواز آئی جیسے جلتے توے پر پانی گرے۔

پانی اس کے سر سے بہتا ہوا جسم پر گیا۔ جسم پر پانی پہنچتے ہی ایک دَم اس کے جسم سے دُھواں سا اُٹھا اور نیلم تیورا کر زمین پر گر پڑی وہ تو ماموں فرقان اس کے نزدیک ہی تھے، اُنہوں نے فوراً اُسے سنبھال لیا ورنہ نیلم اگر براہ راست زمین پر گرتی تو اس کا سر پھٹ جاتا۔

''اسے ادھر لے آؤ۔'' املی والے بابا نے حکم دیا۔

تب ماموں فرقان اور نیاز محمد نے مل کر نیلم کو اُٹھایا اور املی والے بابا کے سامنے لٹا دیا۔

وہ بیہوش ہو چکی تھی۔

املی والے بابا نے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا اور ماموں فرقان سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ایک بالٹی کھولتا ہوا پانی درکار ہے۔''

''ابھی لایا۔'' یہ کہہ کر ماموں فرقان گھر کے اندر بھاگے۔

انہوں نے دونوں چولہوں پر پانی گرم کرنے کیلئے رکھوا دیا..... گرمی تھی، تھوڑی دیر میں پانی اُبلنے لگا۔ ماموں فرقان نے سارا پانی ایک پلاسٹک کی بالٹی میں ڈالا اور گھر سے باہر آ گئے۔

املی والے بابا، نیلم کی پیشانی پر ہاتھ رکھے کچھ پڑھنے میں مشغول تھے۔ نیلم کی آنکھیں بالکل بند تھیں۔

ماموں فرقان نے کھولتے پانی کی بالٹی املی والے بابا کے نزدیک رکھ دی تب اُنہوں نے ڈونگے بھر بھر کر نیلم کے جسم پر پانی ڈالنا شروع کیا۔

گرم پانی کا پڑنا تھا کہ نیلم بلبلا گئی۔ اس کا جسم بن جل مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ پانی کے ہر ڈونگے پر اس کا جسم بری طرح تڑپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

املی والے بابا نے اس کے پورے جسم پر پانی ڈالا، جسم کا کوئی حصہ نہ چھوڑا۔ اس کا جسم تڑپتا رہا مگر اس کی اُنہوں نے پروا نہ کی جبکہ ماموں فرقان اس تڑپتے جسم کو دیکھ نہ سکے۔ اُنہوں نے منہ پھیر لیا۔

سب سے زیادہ بری حالت تو اکبر کی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے نیلم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تڑپتے جسم کو دیکھ کر اکبر کے دل پر چھری سی چل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو اور اسے سختی سے بھینچ رہا ہو۔

تب ہی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو بابر تھا۔ وہ اسے اندر لے گیا اور ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ بند کر دیا۔

اکبر اضطرابی کیفیت میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ماموں فرقان کمرے میں آئے اور بولے۔ ''چلو تمہیں املی والے بابا

بلا رہے ہیں۔''

''مجھے؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا اور فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جب اکبر، ماموں فرقان کے ساتھ گھر سے باہر آیا اور اس نے لان پر نظر ڈالی تو نیلم کو سر جھکائے املی والے بابا کے سامنے بیٹھے پایا اور اس کے گرد برف سی پڑی تھی۔ یہ وہ پانی تھا جو اس کے جسم سے بہہ کر جم گیا تھا۔

اکبر ان کے نزدیک پہنچا تو اُنہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

''اکبر اپنی بیوی کو لے جاؤ..... وہ خبیث اب اس پر کبھی قابض نہیں ہو سکے گا۔''

یہ سن کر اس نے بڑی ممنونیت سے املی والے بابا کو دیکھا اور تشکر کے طور پر اس نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ ان کے ہاتھ کو چومنا چاہتا تھا۔

املی والے بابا نے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا اور مسکرا کر کہا۔ ''بھائی میرا نہیں، اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور اب تم لوگ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ لیکن فرقان تم یہیں رہو گے۔''

ماموں فرقان نے پہلے ہی ان لوگوں کو جانے کیلئے تیار کر رکھا تھا۔ اب جیسے ہی جانے کا حکم ہوا، اکبر دو منٹ میں نیلم سمیت سب کو گاڑی میں بٹھا کر ماموں فرقان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اکبر کے جانے کے بعد ماموں فرقان، املی والے بابا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

املی والے بابا نے اُنہیں کچھ پڑھنے کو بتایا اور بولے۔ ''تم گھر میں جا کر اندر سے سارے دروازے بند کر لو..... اور جو میں نے بتایا اسے پڑھنا شروع کرو..... یاد رکھو گھر سے باہر کسی قیمت پر نہ نکلنا، نہ دروازہ کھولنا بے شک تم گھر میں آگ لگی ہوئی کیوں نہ دیکھو۔''

''جی بہتر۔'' ماموں فرقان نے بہت سعادت مندی سے کہا۔ وہ ایک تجربے کار آدمی تھے۔ عملیات سے واقف تھے، اس لئے ان سے کسی ایسی بات کی توقع نہ تھی جس سے بگاڑ پیدا ہوتا۔

املی والے بابا نے کچھ دیکھ کر ہی اُنہیں یہ ذمہ داری سونپی تھی۔

ماموں فرقان فوراً گھر کے اندر چلے گئے۔ اُنہوں نے گھر کا ایک ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر لی..... پھر اُنہوں نے وضو کر کے عصر کی نماز پڑھی اور تسبیح لے کر وہ پڑھنے لگے جو املی والے بابا نے بتایا تھا۔

باہر املی والے بابا کے حکم کے مطابق نیاز محمد گیٹ بند کر چکا تھا اور اس وقت وہ حصار کے اندر املی والے بابا کے دائیں جانب بیٹھا اُنگلیوں پر کچھ پڑھ رہا تھا۔

املی والے بابا آلتی پالتی مارے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے نہایت اطمینان اور پرسکون انداز میں آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔

ان کے اندر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور ان آنکھوں سے وہ جہاں تک چاہے دیکھ سکتے تھے۔

چند لمحوں بعد ان کے چہرے پر جو اطمینان تھا وہ غائب ہو گیا، اس کی جگہ سختی نے لے لی...... ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی، وہ مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔

تب ہی گھر کا گیٹ ایک دھماکے سے کھلا اور دو سفید گھوڑوں والی بگھی گیٹ میں داخل ہوئی۔ بگھی اندر آ کر رک گئی۔

املی والے بابا نے اپنی جلالی آنکھیں کھول دیں اور گھور کر بگھی کی طرف دیکھا۔

بگھی سے بڑی شان سے سیّد پور کا جن برآمد ہوا، وہ اس وقت شہزادے کے رُوپ میں تھا۔ وہ بگھی سے اتر کر دو قدم آگے چلا اور پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے املی والے بابا کو مسکرا کر دیکھا۔

''بہروپیا آ گیا۔'' املی والے بابا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''نیلم کہاں ہے؟'' سیّد پور کے جن نے سوال کیا، اس کے لہجے میں بڑا تحکم تھا۔

''نیلم جس کی تھی اس کے حوالے کر دی گئی...... تم اسے بھول جاؤ۔''

''نیلم میری ہے، میں اسے نہیں بھول سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اسے یہاں کھینچ بلایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ......''

''بہروپئے تو اپنے اصل روپ میں تو آ۔'' املی والے بابا نے اسے اپنی بات پوری نہ کرنے دی۔

''پھر کیا ہوگا۔''

''تیرا غرور پاش پاش ہوگا، یہ ہوگا، تو نے بہت تباہی پھیلائی ہے، بہت لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے بس اب یہ کھیل ختم ہوا میں جانتا تھا کہ تو آئے گا ضرور...... اب تو آ گیا ہے تو یاد رکھ واپس نہ جا سکے گا۔''

یہ سن کر سیّد پور کے جن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بابا تو میرا کیا کر لے گا۔''

''میں جہاں بیٹھا ہوں اس کے نیچے تجھے دفن کر کے جاؤں گا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے تو جہاں بیٹھا ہے وہ تیری اپنی قبر بن جائے۔''

''تو مجھے جانتا نہیں ہے ورنہ ایسی بات کبھی نہ کہتا۔''

''واقف تو خیر تو بھی مجھ سے نہیں ہے۔''

''تو اب واقف کرا دے۔'' املی والے بابا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''یہ تیرے برابر تیرا سایا ہی بیٹھا ہے، اس سے پوچھ۔'' سیّد پور کے جن نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بتائے گا تجھے میں کیا ہوں۔''

''تو جو ہے میرے سامنے ہے، میں نے نیلم کو تیرے چنگل سے نکال لیا ہے اب تیری باری ہے...... تیری موت تجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''اچھا تو پھر سنبھل۔'' یہ کہہ کر سیّد پور کے جن نے دونوں بازو پھیلائے۔

املی والے بابا تو دو دن سے سنبھلے بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے وہ چالیس دن کا ایک پر اثر وظیفہ پڑھ چکے تھے۔ پھر ان کی مدد کو نیاز محمد موجود تھا۔ ماموں فرقان بھی اس معرکے میں حصہ لے رہے تھے اور وہ کیل کانٹوں سے لیس ''قلعہ بند'' بیٹھے تھے۔ غرض املی والے بابا کی دفاعی لائن بہت مضبوط تھی۔

جب سیّد پور کے جن نے اُنہیں سنبھلنے کو کہا تو وہ صرف زیر لب مسکرائے اور انہوں نے اپنی نظریں سیّد پور کے جن پر گاڑ دیں۔

سیّد پور کے جن نے دونوں بازو پھیلا کر اپنے ہاتھ اوپر کر لئے اور پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین کی طرف جھکاتا چلا گیا۔ اور جیسے ہی اس نے اپنی دونوں ہاتھوں سے پاؤں چھوئے تو اس کے جسم سے ایک شعلہ برآمد ہوا۔

شعلہ برآمد ہوتے ہی اس کا بہروپ ختم ہو گیا۔ وہ شہزادے سے کالا بلا بن گیا اپنے روپ میں آ گیا۔

بلا بنتے ہی پیچھے کھڑی دو گھوڑوں والی بگھی ایک لمحے میں غائب ہوگئی۔

اور کھلا ہوا گیٹ خود بخود بند ہو گیا۔

سیّد پور کے جن کے جسم سے جو شعلہ برآمد ہوا تھا وہ جس چیز سے مس ہو رہا تھا اس میں آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔

سر سبز پودے اور ہری ہری گھاس اس طرح جل رہی تھی جیسے سوکھا ہوا بھس۔ گھاس سے بھرے لان میں آگ تیزی سے بڑھ رہی تھی پھیل رہی تھی جیسے لان میں پیٹرول بہایا جا رہا ہو۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شعلے نے گھر کے در و دیوار میں آگ لگا دی۔ کھڑکیاں اور دروازے سوکھی لکڑی کی طرح جلنے لگے۔

اب پورا گھر شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ دھواں بادل بن گیا تھا۔ ماموں فرقان گھر کے در و دیوار جلتے دیکھ رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ وہ جانماز پر بیٹھے بڑے آرام سے املی والے بابا کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

اس آگ نے گھر کے تمام پودوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن املی والے بابا جس چوکور حصار

میں بیٹھے تھے۔ آگ اس حصار کی حد سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

املی والے بابا نے بہت تیزی سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں غصہ آ گیا تھا۔ اب ان کے اندر بھی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ ان کے اندر جو آگ بھڑکی تھی، وہ مصنوعی نہ تھی۔

پھر وہ پڑھتے پڑھتے کھڑے ہو گئے۔ اپنی لال آنکھوں سے شعلوں میں دیکھا۔ اسے تلاش کرنے میں املی والے بابا کو زیادہ دیر نہ لگی۔

وہ شعلوں میں گھرا بڑے آرام سے بیٹھا، اپنے پاؤں چاٹ رہا تھا۔ املی والے بابا کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں کان کھڑے کیے اور املی والے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

بس آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا غضب ہو گیا۔

املی والے بابا اسی لمحے کے منتظر تھے۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندیں اور وہ کالے بلے کی آنکھوں میں جذب ہو گئیں۔ کالا بلا تیورا کر پیچھے گرا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کی دونوں آنکھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سیّد پور کے جن کی لگائی ہوئی آگ سرد پڑ گئی۔ وہ جس تیزی سے لگی تھی اسی تیزی سے بجھ گئی تھی۔ گھر کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچا۔ در و دیوار ویسے کے ویسے تھے۔ جو پودے جل گئے تھے وہ بھی سرسبز و شاداب نظر آ رہے تھے۔

لیکن کالے بلے کی بری حالت تھی۔ اس کی آنکھوں سے خون جاری تھا اور وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اس نے رحم طلب نگاہوں سے املی والے بابا کی طرف دیکھا اور ان کے دماغ میں بولا۔

”بابا مجھے معاف کر دو، یہ بجلیاں میرے جسم سے نکال لو، یہ مجھے جھلسائے دے رہی ہیں۔ میں اب کبھی ادھر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ نیلم کو بھول جاؤں گا، اس گھر کو بھول جاؤں گا۔“

”سیّد پور کے جن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ معافیاں مانگنے کا وقت گزر گیا۔ اب ان بجلیوں پر میرا اختیار نہیں رہا۔ یہ اپنا کام ختم کر کے ہی دم لیں گی۔“

”بابا، مجھ پر رحم کرو، میں تباہ ہو جاؤں گا۔“

”تم تو بڑی شان سے بگھی میں سوار ہو کر یہاں آئے تھے۔ شہزادے بنے ہوئے تھے اب دوبارہ شہزادہ بن کر دکھاؤ تو جانوں۔“

”بابا جی، میں تباہ ہو رہا ہوں۔ مجھے بچا لو۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”تم تو بڑے زبردست جن ہو، اب تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتے۔“ املی والے بابا نے غصے سے پوچھا۔

”بابا جی، میں ہار گیا۔ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گا۔“

”میرے پاؤں تک پہنچے تو تمہیں ٹھوکر کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

سیّد پور کا جن، کالے بلے کے روپ میں روتا تڑپتا رہا۔ معافیاں مانگتا اور گڑگڑاتا رہا لیکن املی والے بابا پتھر بنے اپنی جگہ کھڑے رہے، وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کسی پر ظلم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ایک ظالم سے اس کے ظلم کا حساب لیا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ظلم مٹ گیا۔ ظلم کا کلیہ ہی یہ ہے کہ بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔

پھر املی والے بابا نے نیاز محمد کو حصار سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماموں فرقان کو باہر بلایا۔ ماموں فرقان باہر آئے تو انہوں نے نیاز محمد سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ میرے مرشد سے ٹکر لینے چلا تھا، ان کا ایک وار نہ سہہ سکا۔ بڑا شہزادہ بن کر آیا تھا خود کو بڑا زبردست جن کہتا تھا۔ مرشد کے آگے ایک لمحہ نہ ٹھہر سکا۔ وہ باہر پڑا ہے آؤ آ کر دیکھ لو۔“ نیاز محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

ماموں فرقان نے یہ سن کر فوراً خدا کا شکر ادا کیا اور بھاگتے ہوئے باہر گئے۔

انہوں نے اسے دیکھا۔ وہ بے کسی کی صورت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور خون آنکھوں سے نکل کر چہرے پر جم گیا تھا۔ کچھ خون زمین پر بھی گرا ہوا تھا۔

پھر املی والے بابا نے حصار چھوڑ دیا۔ وہ نہ صرف دائرے سے نکل آئے بلکہ سات قدم والا چوکور حصار بھی چھوڑ دیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں ایک گڑھا کھودا گیا۔ یہ گڑھا ماموں فرقان نے اپنے ہاتھوں کھرپی سے کھودا۔

جب گڑھا کھد گیا تو املی والے بابا نے کالے بلے کو دم سے پکڑ کر اُٹھایا اور گڑھے میں ڈال دیا۔ پھر کچھ پڑھ کر انہوں نے مٹی گڑھے میں پھینکی اس کے بعد کھرپی ماموں کے ہاتھ میں دے دی۔

ماموں فرقان نے ساری مٹی گڑھے میں ڈال کر اسے بند کر دیا۔

گڑھا بند کرنے کے بعد ماموں فرقان نے ایک ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا۔ کتنی مصیبتوں کے بعد یہ دن دیکھنے کو ملا تھا انہوں نے ایک مرتبہ پھر خدا کا شکر ادا کیا۔

اور بڑی احسان مندی سے املی والے بابا کو دیکھنے لگے۔

”نیاز چلو۔“ املی والے بابا نے نیاز محمد سے کہا۔

”بابا جی، آپ کا بہت شکریہ۔“ ماموں فرقان نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

”ہمیں اس طرح کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن اس خبیث نے اس قدر اودھم مچایا ہوا تھا کہ اس کی سرکوبی کیلئے ہمیں اپنی جگہ سے نکلنا پڑا۔ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بچوں کو بلا لو۔ ہم

اب جاتے ہیں۔'' املی والے بابا نے قدم آگے بڑھایا۔

نیاز محمد نے ان کی کھڑاؤں سیدھی کیں۔ املی والے بابا نے کھڑاویں پہنیں اور کھٹ کھٹ کرتے تیزی سے گھر سے نکل گئے۔ نیاز محمد ان کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ماموں فرقان نے ایک نظر گڑھے کو دیکھا جو اب گھاس ملی مٹی سے پر ہو چکا تھا۔ اس بند گڑھے کو دیکھ کر ان کا رواں رواں خوشی سے جھوم رہا تھا۔

پھر اس گھر پر خوشی ٹوٹ کر برسی۔

اور کیوں نہ برستی۔ ظلم کا ایک عہد ختم ہو گیا تھا۔ اب دردناک عذاب سے نجات مل گئی تھی۔

ہر شخص نے اس دن کیلئے خواب دیکھ رکھے تھے۔ نجات کا دن آیا تو سب کی آنکھوں میں اپنے اپنے خواب جاگ اُٹھے۔ کچھ خواب اکبر کے تھے، تو کچھ خواب اکبر کی بہن اور اس کی ماں کے تھے۔ راشدہ ان سب میں پیش پیش تھی۔ وہ اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ شادی کی پھر سے تمام رسمیں ادا کی جائیں گی۔

راشدہ کی اس رائے سے سب کو اتفاق تھا۔ ایک اتفاق نہیں تھا تو اکبر کو۔ ظاہر ہے شادی کی دوبارہ رسمیں ادا کئے جانے کی وجہ سے نیلم اور اس کے درمیان فاصلے بڑھ جانے تھے۔

اکبر کیلئے تو اب ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔

ماموں فرقان نے نیلم کو اپنے گھر میں روک لیا۔ وہ لڑکی والے بن گئے۔ رات ہی کو لاہور فون کر دیا گیا۔ فیاض اور واجدہ دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔ وہ دونوں ماموں فرقان کے یہاں ٹھہرے۔ انہوں نے بارات کی آمد کے سلسلے میں اخراجات کی ذمہ داری لینا چاہی لیکن ماموں فرقان نے اُنہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ بارات کے تمام اخراجات انہوں نے نہ صرف خود اُٹھائے بلکہ نیلم کو ایک سونے کا سیٹ بھی اپنی طرف سے تحفے میں دیا۔

بارات میں تیس چالیس آدمی تھے۔ جلدی جلدی جو لوگ ساتھ آ سکے، اُنہیں ساتھ لے لیا گیا۔

ماموں فرقان نے گھر کے سامنے شامیانہ لگوا دیا۔ ایک چینی ریستوران سے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

جب بارات رخصت ہوئی اور نیلم کو ایک سجی سجائی کار میں بٹھایا گیا تو احساس نہ ہوتا تھا کہ نیلم کی چار ماہ پہلے شادی ہو چکی ہے بلکہ یہ احساس ہوتا تھا کہ نیلم کی آج ہی شادی ہوئی ہے اور وہ واجدہ فیاض کے بجائے جیسے ماموں فرقان کی بیٹی ہے۔

ماموں فرقان اس کو رخصت کرتے وقت کچھ اس طرح اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے تھے اور نیلم بھی کچھ اسی انداز میں ان سے لپٹ کر روئی۔

اس ''شادی'' میں دادا غفور کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ کاش! وہ آج زندہ ہوتے تو نیلم کو دلہن بنے دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے۔

بارات گلشن واپس پہنچی۔ یہ گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بابر نے اس روشنی پر دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔

دلہن کے گھر آنے پر راشدہ اور صابرہ نے اپنے خوب ارمان نکالے۔ ہر وہ رسم ادا کی گئی جس کے کئے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

راشدہ نے اپنی تمام سہیلیوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ گھر میں خوب ہنگامہ رہا۔ ہر چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ہر ہونٹ پر تبسم تھا۔ قہقہے تھے۔ ایک رنگ و نور کی بارش تھی۔ رواں رواں خوشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ وقت بھی آیا جب اکبر کو اندر جانے کا ''ویزا'' ملا۔

اکبر کے دل کی عجیب حالت تھی۔ خوشی سے دھڑکتے دل کو اس نے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ قابو میں نہ آیا تب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔

لرزتی انگلیوں سے اس نے دروازہ بند کیا اور جب پلٹ کر دیکھا تو نیلم گھونگھٹ نکالے جھکی ہوئی بیٹھی نظر آئی۔ خوشی سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

آنکھوں میں آنسو بھرے تو نیلم دھندلا گئی۔ اکبر نے فوراً اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔ اب وہ ایک لمحے کیلئے بھی نیلم کو اپنی آنکھوں سے دور کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دل میں طوفان چھپائے بیڈ پر بیٹھا پھر اس نے دھیرے سے نیلم کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

نیلم شرمانا بھول گئی۔ اس نے اپنی حسین آنکھوں سے اکبر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

دل میں جذبات کا سمندر تھا۔ ایک طوفان تھا جو روح کی گہرائیوں سے اُٹھ رہا تھا۔

دونوں بولنا چاہتے تھے، بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن زبانیں جیسے گنگ ہو گئی تھیں۔

اکبر نے نیلم کا ریشم جیسا گورا ہاتھ تھاما اور اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا۔ نیلم تڑپ کر اس کے نزدیک آ گئی۔

''اکبر...... مجھے اپنے سینے میں چھپا لو۔''

اکبر نے اسے محبت کے حصار میں لے لیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ اب ہونٹوں نے بولنا سیکھ لیا تھا۔

''اکبر تم کس قدر عظیم ہو۔'' نیلم بے تحاشہ رو رہی تھی۔ ''تم نے میرے لئے کس قدر دکھ اُٹھائے۔''

''نہیں نیلم ایسا نہ کہو، دکھ میں نے نہیں تم نے اُٹھائے ہیں۔'' اکبر نے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اب ان دکھوں کا ذکر ہی کیا۔ جو ہونا تھا ہوا، اب ان خوشیوں بھرے

لمحوں کو ماضی کی یاد میں ضائع مت کرو۔ گزرے ہوئے وقت کو ایک بھیانک خواب کی طرح بھول جاؤ۔ آؤ، اب ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ ایسی زندگی جو خوشیوں سے بھری ہے، پھولوں سے بھری ہے۔"

پھر اس رات سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

یہ آغاز قدر حسین تھا۔ ایسی کئی حسین راتیں آئیں اور گزر گئیں۔ زلفیں کھلتی رہیں، آنکھوں سے کاجل پھیلتا رہا، ہونٹوں پر لالی مچلتی رہی، خوشبو بھرے لمحے تیزی سے دامن چھڑاتے رہے......

اور پھر......!

یہ اکیسویں رات کا ذکر ہے۔

نیلم اور اکبر نیلگوں بلب کی روشنی میں محو گفتگو تھے۔ تبھی دیوار گیر گھڑی نے رات کے بارہ بجائے۔ دونوں نے گھڑی کو چونک کر دیکھا اور جانے کس خیال سے مسکرا دیئے۔

بارہ بجتے ہی، وہ زمین سے پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑھنے اور پھیلنے لگا۔

صبح کا اخبار اُٹھانے بابر باہر آیا تو سب سے پہلے اس نے دیکھا۔ وہ لان میں تھا اور اس جگہ تھا جہاں کالے بلے کو زمین میں دفن کیا گیا تھا۔

کل شام تک یہاں کچھ نہ تھا۔ کل وہ لوگ بہت دیر تک باہر بیٹھے رہے تھے۔ یہ بس رات ہی رات میں اُبھرا تھا۔ بابر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ ایک رات میں اتنا بڑا کیسے ہوگیا۔

بابر نے اندر آکر اخبار کو ربڑ بینڈ چڑھا کر ڈائننگ ٹیبل پر پھینکا۔ اب اخبار میں چھپنے والی خبروں کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی لان میں ہونے والے واقعہ کی تھی۔

اس نے سوئی ہوئی صابرہ کو اُٹھایا اور بغیر کچھ بتائے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لان میں لے آیا۔

وہ حیران و پریشان اس کے ساتھ خاموشی سے چلی آئی۔

جب بابر نے لان کے درمیان اشارہ کیا تو صابرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ کیا ہے؟...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

یہ وہ سوال تھا جو اسے دیکھ کر فوراً ذہن میں آتا تھا پھر یہ بات گھر کے کسی مکین سے چھپی نہ رہ سکی۔

آخر نیلم اور اکبر کو بھی اطلاع پہنچی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے ۔۔

"ارے...... ارے یہاں کس نے لگایا۔" نیلم نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"کسی نے لگایا نہیں، یہ خود بخود اگا ہے۔" صابرہ نے اسے بتایا۔

ابھی یہ لوگ دور ہی دور سے نظارہ کر رہے تھے۔ پھر اکبر آگے بڑھا نیلم اس کے ساتھ تھی۔

وہ ایک دو فٹ اونچا پودا تھا۔ اس کے پتے زرد اور لمبے تھے۔ نیچے سے اوپر بس ایک تنا تھا۔ سب

سے اوپر ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک گول سا پھول تھا۔ کالا مگر سرخی مائل۔ اس پھول میں دو بڑے بڑے سرخ دھبے تھے اور پھول کے اوپر دو کان سے نکلے ہوئے تھے۔

پھول کو قریب سے دیکھ کر ایک دم احساس ہوتا تھا کہ اس پھول کی شکل کسی بلے کے چہرے سے ملتی جلتی ہے۔ صرف یہی انکشاف نہیں ہوا بلکہ ایک اور حیرت میں ڈالنے والی بات بھی معلوم ہوئی۔

سورج مکھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سورج کے ساتھ ساتھ اپنا رخ تبدیل کرتا رہتا ہے لیکن یہ پھول جو بلے کی شکل کا تھا نیلم کو دیکھ کر اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔

نیلم جدھر جاتی، یہ پھول اس کی طرف اپنا منہ پھیر لیتا۔

پہلے تو اکبر نے اسے محض واہمہ سمجھا لیکن اپنے وہم کی تصدیق کرنے کیلئے اکبر نے نیلم کو اس پودے کا طواف کرنے کو کہا تو اس کا وہم یقین میں بدل گیا۔

نیلم جیسے جیسے گھوم رہی تھی ویسے ویسے وہ بلے نما پھول اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔

یہ دیکھ کر نیلم سہم گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر بھاگتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ اب اس بلے نما پھول کا چہرہ دروازہ کی طرف ہوگیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ٹکٹکی باندھے دروازے کو تک رہا ہو۔ اس پھول میں بنے ہوئے برابر برابر لال دھبے اب صاف آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔

نیلم کے اندر چلے جانے کے بعد اکبر نے راشدہ سے کہا کہ وہ اس پودے کے گرد چکر لگائے۔

راشدہ نے ڈرتے ڈرتے اس پودے کا طواف کیا لیکن وہ بلے نما پھول ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر اکبر نے صابرہ کو اس کے گرد پھرایا۔ خود گھوما اپنے باپ سے چکر لگوایا لیکن اس پھول نے جنبش نہ کھائی۔ اس کا رخ مسلسل دروازے کی طرف رہا۔

اب اس بات کا سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ اس "نیلم مکھی" پھول کا رخ محض نیلم کو دیکھ کر تبدیل ہوتا ہے۔ یہ بات شروع شروع میں تو نیلم اور گھر کے دوسرے افراد کیلئے الجھن کا باعث بنی۔ نیلم سہمی سہمی سی رہی۔ اس نے پودے کے سامنے آنے سے حتیٰ الامکان احتراز کیا لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی عادی ہوتی گئی۔

دو سال گزرنے کے بعد یہ پودا ایک عام سا پودا بن گیا۔ سب لوگ اس کے عادی ہوگئے۔ ان دو سالوں میں اس پودے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ پہلے دن جیسا رہا۔ نہ اس کا قد بڑھا اور نہ پھول پتوں میں اضافہ ہوا۔

وہی ایک پھول اور اسکے پھول میں دو سرخ بڑے بڑے دھبے جیسے وہ دھبے نہ ہوں، کسی کی

آنکھیں ہوں۔ عاشق کی آنکھیں، دید کو ترسے نین۔

وہ مر گیا تھا لیکن مر کر بھی شاید وہ نہیں مرا تھا۔ وہ اس پودے کے روپ میں زندہ تھا اور ''نیلم مکھی'' ہو گیا تھا۔

آج بھی جب لوگ اس گھر میں آتے ہیں تو ''نیلم مکھی'' کا یہ پودا ان کیلئے حیرت کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ گھر جو کبھی اس جن کے حکم پر خالی کیا گیا تھا، اب ''خالی گھر'' نہیں رہا۔ اب یہ خوشیوں بھرا گھر ہے۔ یہاں خوشیاں ٹوٹ کر برستی ہیں۔ ظلم کا عذاب ناک دور کب کا ختم ہو چکا ہے۔

(ختم شد)